قرآنِ کریم کے بیش قیمت علمی وادبی نکات واسرار۔ ۱۲۰۰ سوالات کے ہزاروں تشفّی بخش جوابات جو قرآنِ مجید کے علوم و معارف اور رموز کی تشریح و تفہیم میں بے مثال ہیں۔ مفسّرین علماء اور طلباء کے لیے ایک نایاب کتاب پہلی بار اردو کے پیرہن میں۔

نکات القرآن

(سوالاً۔ جواباً)

مسائل الرّازی واجوبتہا
مِن
غرائب آیِ التنزیل

شیخ زین الدین محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازیؒ (م ۶۶۶ھ)

اردو ترجمہ:
لجنۃ المصنّفین

ادارہ اسلامیات
لاہور۔ کراچی
پاکستان

نکات القرآن

(سوالاً۔ جواباً)

نظرثانی شدہ (جدید ایڈیشن)

قرآنِ کریم کے بیش قیمت علمی و ادبی نکات و اسرار۔ ۱۲۰۰ سوالات کے ہزاروں تشفی بخش جوابات جو قرآنِ مجید کے علوم و معارف اور رموز کی تشریح و تفہیم میں بے مثال ہیں۔ مفسرین، علماء اور طلباء کے لیے ایک نایاب کتاب پہلی بار اردو کے پیرہن میں۔

نکات القرآن

(سوالاً۔ جواباً)

مسائل الرازی واجوبتہا

مِن

غرائب آی التنزیل

شیخ زین الدین محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازیؒ (م ۶۶۶ھ)

اُردو ترجمہ:

لجنۃ المصنفین

مولانا خالد محمود صاحب ۔ مولانا محمد انس صاحب ۔ مولانا سید عبد العظیم صاحب

ادارہ اسلامیات
لاہور۔ کراچی
پاکستان

نام کتاب

نکات القرآن

نام مصنف

شیخ زین الدین محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازی (م ۶۶۶ھ)

اشاعت اول

ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مئی 2005ء

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۷۳۵۳۲۵۵ فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان........فون ۷۲۴۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان.....فون ۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، چوک لسبیلہ، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

سورتوں کی فہرست

نمبرشمار	سورت	صفحہ
	صاحب کتاب کا تعارف	۹
۱	سورۃ الفاتحہ	۱۲
۲	سورۃ البقرہ	۱۳
۳	سورۃ آل عمران	۴۱
۴	سورۃ النسآء	۶۲
۵	سورۃ المآئدہ	۸۸
۶	سورۃ الانعام	۱۱۰
۷	سورۃ الاعراف	۱۲۳
۸	سورۃ الانفال	۱۳۶
۹	سورۃ التوبۃ	۱۴۶
۱۰	سورۃ یونس	۱۶۰
۱۱	سورۃ ھود	۱۶۹
۱۲	سورۃ یوسف	۱۸۵
۱۳	سورۃ الرّعد	۱۹۴
۱۴	سورۃ ابراھیم	۱۹۶
۱۵	سورۃ الحجر	۲۰۶
۱۶	سورۃ النحل	۲۰۹
۱۷	سورۃ الاسرآء	۲۲۳
۱۸	سورۃ الکھف	۲۳۹
۱۹	سورۃ مریم	۲۵۱
۲۰	سورۃ طٰہٰ	۲۶۱
۲۱	سورۃ الانبیآء	۲۶۷
۲۲	سورۃ الحج	۲۷۳
۲۳	سورۃ المؤمنون	۲۷۸
۲۴	سورۃ النّور	۲۷۹
۲۵	سورۃ الفرقان	۲۸۴
۲۶	سورۃ الشعرآء	۲۸۷
۲۷	سورۃ النمل	۲۹۳
۲۸	سورۃ القصص	۲۹۹
۲۹	سورۃ العنکبوت	۳۰۲
۳۰	سورۃ الرّوم	۳۰۶
۳۱	سورۃ لقمان	۳۰۹
۳۲	سورۃ السّجدۃ	۳۱۲
۳۳	سورۃ الاحزاب	۳۱۵
۳۴	سورۃ سبا	۳۲۴
۳۵	سورۃ فاطر	۳۲۵
۳۶	سورۃ یٰس	۳۲۶
۳۷	سورۃ الصّٰفّٰت	۳۳۰
۳۸	سورۃ صٓ	۳۳۶
۳۹	سورۃ الزمر	۳۳۹
۴۰	سورۃ المؤمن	۳۴۳
۴۱	سورۃ حٰمٓ السجدہ	۳۴۷
۴۲	سورۃ الشورٰی	۳۴۹
۴۳	سورۃ الزخرف	۳۵۱
۴۴	سورۃ الدّخان	۳۵۳
۴۵	سورۃ جاثیہ	۳۵۵
۴۶	سورۃ الاحقاف	"
۴۷	سورۃ محمّد	۳۵۶
۴۸	سورۃ الفتح	۳۵۷
۴۹	سورۃ الحجرات	۳۵۹
۵۰	سورۃ قٓ	۳۶۲
۵۱	سورۃ الذّاریات	۳۶۴
۵۲	سورۃ الطّور	۳۶۷
۵۳	سورۃ النّجم	۳۶۸
۵۴	سورۃ القمر	۳۷۰
۵۵	سورۃ الرّحمٰن	۳۷۱
۵۶	سورۃ الواقعۃ	۳۷۴
۵۷	سورۃ الحدید	۳۷۷
۵۸	سورۃ المجادلۃ	۳۸۰
۵۹	سورۃ الحشر	"
۶۰	سورۃ الممتحنہ	۳۸۳
۶۱	سورۃ الصّف	"
۶۲	سورۃ الجمعہ	۳۸۵
۶۳	سورۃ المنافقون	"
۶۴	سورۃ التغابن	۳۸۶
۶۵	سورۃ الطّلاق	۳۸۷

نمبرشمار	سورت	صفحہ	نمبرشمار	سورت	صفحہ	نمبرشمار	سورت	صفحہ
۶۶	سورۃ التحریم	۳۹۰	۸۳	سورۃ المطفّفین	۴۱۱	۱۰۰	سورۃ العادیات	۴۲۳
۶۷	سورۃ الملک	۳۹۲	۸۴	سورۃ الانشقاق	۴۱۲	۱۰۱	سورۃ القارعہ	۴۲۴
۶۸	سورۃ القلم	۳۹۳	۸۵	سورۃ البروج	"	۱۰۲	سورۃ التّکاثر	"
۶۹	سورۃ الحآقّۃ	۳۹۴	۸۶	سورۃ الطارق	"	۱۰۳	سورۃ العصر	۴۲۵
۷۰	سورۃ المعارج	۳۹۶	۸۷	سورۃ الاعلی	۴۱۳	۱۰۴	سورۃ الھمزۃ	"
۷۱	سورۃ نوح	۳۹۷	۸۸	سورۃ الغاشیہ	۴۱۴	۱۰۵	سورۃ الفیل	"
۷۲	سورۃ الجن	۳۹۸	۸۹	سورۃ الفجر	۴۱۵	۱۰۶	سورۃ قریش	۴۲۶
۷۳	سورۃ المزمّل	۳۹۹	۹۰	سورۃ البلد	۴۱۶	۱۰۷	سورۃ الماعون	۴۲۷
۷۴	سورۃ المدّثر	"	۹۱	سورۃ الشّمس	۴۱۷	۱۰۸	سورۃ الکوثر	"
۷۵	سورۃ القیامہ	۴۰۱	۹۲	سورۃ اللّیل	"	۱۰۹	سورۃ الکافرون	۴۲۸
۷۶	سورۃ الدھر	۴۰۲	۹۳	سورۃ الضّحیٰ	۴۱۸	۱۱۰	سورۃ النصر	۴۲۹
۷۷	سورۃ المرسلات	۴۰۵	۹۴	سورۃ الانشراح	۴۱۹	۱۱۱	سورۃ تبّت	۴۳۰
۷۸	سورۃ النبآء	۴۰۶	۹۵	سورۃ التّین	۴۲۰	۱۱۲	سورۃ الاخلاص	"
۷۹	سورۃ النّازعات	۴۰۷	۹۶	سورۃ العلق	۴۲۱	۱۱۳	سورۃ الفلق	"
۸۰	سورۃ عبس	۴۰۸	۹۷	سورۃ القدر	"	۱۱۴	سورۃ النّاس	۴۳۱
۸۱	سورۃ التکویر	۴۰۹	۹۸	سورۃ البیّنۃ	۴۲۲			
۸۲	سورۃ الانفطار	۴۱۰	۹۹	سورۃ الزلزلۃ	"			

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایران کا قدیم قصبہ "رِی" ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہارون رشید بھی یہیں پیدا ہوا۔ اور عالم اسلام کی کئی نامور شخصیات تو بلاشبہ اسی قصبہ سے وابستہ ہیں اور رازی کے نام سے معروف ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) مشہور طبیب اور فلسفی ابو بکر محمد بن زکریا الرازیؒ متوفی ۳۱۳ھ (۲) مشہور حنفی فقیہ مفسر ابو بکر احمد بن علی الجصاص الرازیؒ (جو احکام القرآن کے مصنف ہیں) متوفی ۳۷۰ھ (۳) امام المتکلمین اور التفسیر الکبیر کے مصنف امام فخر الدین الرازیؒ متوفی ۶۰۶ھ (۴) مشہور عالم اور لغت کے امام زین الدین محمد بن ابی بکر الرازیؒ متوفی ۶۶۶ھ۔

یہ زین الدین محمد بن ابی بکر الرازی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بڑے امام تھے۔ لغت میں انکی مصنفہ کتاب "مختار الصحاح" آج بھی حوالہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے تفسیر، فقہ اور بیان و بدیع پر بھی کئی کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ "الذہب الابریز فی تفسیر الکتاب العزیز" کے نام سے انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر تحریر فرمائی تھی جو اب نایاب ہے۔

زیر نظر کتاب "مسائل الرازی و اجوبتھا" یا غرائب آی التنزیل" بھی اسی جید عالم دین کی وقیع علمی تحریر ہے جس میں انہوں نے قرآن مجید کی آیات پر پیدا ہونے والے بارہ سو (۱۲۰۰) سوالات کا جواب پیش کیا ہے۔ علم تفسیر میں یہ اپنے انداز کی شاید واحد تصنیف ہے جس میں سوال و جواب کے ذریعہ سے قرآنی علوم و نکات کو آشکار کیا گیا ہے۔

اس دور میں جبکہ سوالات و شبہات کا دور دورہ ہے اور عقل کے زور پر قرآنی آیات کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے امید ہے کہ یہ کتاب طلباء، علماء اور قرآنی علوم کے شائقین کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

اپنی مصروفیات کی بناء پر اگرچہ احقر ترجمہ کا مطالعہ نہیں کر سکا مگر مترجم حضرات چونکہ ذمہ دار علماء ہیں اس لئے امید ہے کہ ان کا کیا ہوا ترجمہ قابل اعتماد ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ترجمہ کو بھی اسی طرح نافع اور مقبول بنائیں جس طرح اصل عربی تحریر مفید عام و خواص ثابت ہوئی ہے۔ آمین

احقر محمود اشرف عثمانی غفر اللہ
۵ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صاحبِ کتاب کا تعارف

آپ کا نام شیخ زین الدین محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر بن عبدالمحسن الرزای الحنفی ہے۔
آپ امامِ کبیر، حافظ، علامہ، حجت، ثبت اور صاحبِ تصانیف مفیدہ ہیں۔ آپ کا اصل تعلق "رے" سے ہے، جس کی نسبت سے آپ رازی کہلاتے ہیں۔ آپ عظیم المرتبت، صاحبِ تحقیق واتقان اور کثیر معلومات رکھنے والے عالم ہیں، نیز آپ نیک سیرت، نیک نام اور یکتائے روزگار شخصیت کے حامل بزرگ ہیں۔ بہت سے علوم پر کامل دسترس تھی اور آپ فہم وذکاوت اور قوتِ حافظہ میں عجوبۂ روزگار تھے، تقویٰ وپرہیزگاری میں باکمال اور علومِ عربیہ، بالخصوص علم لغت اور علم ادب میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ زہد وعبادت، ولایت وانقطاع اور کشف وکرامات میں بھی حظِ وافر رکھتے تھے۔

آپ نے بہت سے علوم وفنون میں کتابیں تصنیف فرمائیں، خصوصاً تفسیر، فقہ، لغت اور وعظ میں یادگار اور بے مثال کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے علم کی تلاش میں مصر اور شام کا بھی سفر کیا، آخری سفر قونیہ کا ہوا جو ۶۶۶ھ کو پیش آیا، اسی سال آپ نے رحلت فرمائی۔ ہماری تحقیق کے مطابق آپ کا شمار ساتویں صدی ہجری کے بلند پایہ علماء میں ہوتا ہے۔

آپ کی چند تالیفات

۱۔ الذهب الابريز في تفسير الكتاب العزيز

۲۔ روضة الفصاحة في علم البيان والبديع

۳۔ مختار الصحاح (لغت میں) آپ اس کتاب کی تالیف سے رمضان کی اوّل شب ۶۶۶ھ کو فارغ ہوئے۔

۴۔ شرح المقامات الحريرية۔

۵۔ تحفة الملوك۔ یہ ایک مختصر کتاب ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کا آغاز طہارت سے ہوتا ہے، پھر نماز کا ذکر ہے، اس کے بعد زکوۃ کا، پھر روزے کا اور پھر حج کا اور پھر جہاد کا اور پھر شکار اور قربانی کا ذکر ہے، پھر ممنوع امور کا، پھر فرائض (میراث) کا ذکر ہے۔
علامہ بدرالدین محمود بن احمد العینی نے "منحة السّلوك فی شرح تحفة الملوك" کے نام سے اس کی ایک جلد میں شرح بھی لکھی ہے جس کی تحریر ۸۵۵ھ کو معرضِ وجود میں آئی۔

۶۔ حدائق الحقائق (وعظ میں) یہ بھی ایک مختصری کتاب ہے جس کے ساٹھ ابواب ہیں۔ مؤلفؒ نے اس کتاب میں احادیث و آثار اور مواعظ کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

۷۔ نموذج جليل فی أسئلة وأجوبة من غرائب آی التنزيل۔
(یہ وہی کتاب ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا محتاج بندہ محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازی عرض کرتا ہے:
اللہ تعالیٰ اس کی اور تمام مسلمانوں کی مغفرت فرمائے اور گناہ معاف فرمائے' یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں مَیں نے قرآنِ مجید سے متعلق چند سوالات و جوابات کا چھوٹا سا نمونہ جمع کیا ہے۔
کتاب کا کچھ حصہ تو علماء کی کتب سے ہی تنقیح و تہذیب کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور کچھ حصہ اس علمی مذاکرہ کی صورت میں سامنے آیا جو میرے اور میرے دینی مخلص بھائی کے مابین ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو سلیم الفطرت، نیک اور متقی بھی بنایا ہے اور ذہنِ رسا سے بھی نوازا ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا مجھ پر فضل ہوا کہ ان جیسا انسانی صفات کا مالک اور کریم الاخلاق شخص میری رہنمائی کے لئے مجھے میسر آیا، میرے اس دینی بھائی کو کتاب اللہ کے معانی و دقائق سے گہری وابستگی، تعلق اور شغف حاصل ہے، ہمارے اس علمی مذاکرہ کے نتیجہ میں ایسے بہت سے عجائب و غرائب سامنے آئے جن کا ذکر نہ کبھی کسی اہلِ علم سے سننے میں آیا اور نہ ہی وہ ان کی کتب میں پائے گئے، چنانچہ خیال پیدا ہوا کہ ان تمام فوائد کو جمع کر لیا جائے۔ یہ علمی سوالات بارہ سو سے متجاوز ہیں اور ان کے جوابات اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگرچہ قرآنِ حکیم کے عجائب و غرائب کی نسبت سے ہمارا یہ مجموعہ دریا کے ایک قطرہ کی طرح یا آسمانی ستاروں میں سُہا کی طرح ہے۔ نیز ہم نے اس کو مختصر اور عام فہم بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ اس سے انتفاع زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ اور وہ سوالات جن کا تعلق قرآن کریم کے وجوہِ اعراب یا ان معانی کے ساتھ ہے جو دقیق الفہم اور خفی المراد ہیں، اس کے لئے ہم نے ایک دوسرا مجموعہ تیار کیا ہے، اس مجموعہ میں اس کا کچھ نمونہ ذکر کر دیا گیا ہے، لہٰذا ایسے سوالات کے جوابات کے لئے اس کتاب کو دیکھ لیا جائے۔
میں اللہ تعالیٰ سے ہی امداد کا خواستگار ہوں، اسی پر توکل کرتا ہوں، آخر میں انتہائی تضرّع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ میرے علم اور عمل کو صرف اپنی کریم ذات کی رضا کا سبب بنا دے اور مجھے اور میرے نیک بھائی کو اپنی ردائے مغفرت میں ڈھانپ لے، بے شک وہ ذات بڑی بخشنے والی اور مہربان ہے۔

سورۃ الفاتحہ

سوال امام زجاجؒ کے قول کے مطابق لفظ ''الرّحمٰن'' وصفِ رحمت میں لفظ ''الرّحیم'' سے زیادہ بلیغ ہے تو ''الرّحمٰن'' کو ''الرّحیم'' پر کیسے مقدم فرمایا' جب کہ مدح وتعریف میں اہلِ عرب کی عادت یہ ہے کہ وہ پہلے ادنیٰ امر کو ذکر کرتے ہیں پھر اعلیٰ امر کو ذکر کرتے ہیں کیونکہ اس ترتیب میں ایک خاص اور نیا فائدہ حاصل ہوتا ہے جو کہ اس کی برعکس صورت میں حاصل نہیں ہوتا؟۔

جواب اول امام جوہریؒ وغیرہ فرماتے ہیں: ''رحمٰن'' اور ''رحیم' دونوں کا معنی ایک ہی ہے جیسے ندیم اور ندمان ہم معنی ہیں' لہٰذا کوئی سوال وارد نہیں ہوگا۔

جواب ثانی ''رحمٰن'' کو ''رحیم' پر اس لئے مقدم فرمایا ہے کہ ''اللہ'' کا لفظ ایسا ہے جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے' یعنی اللہ کے علاوہ کوئی بھی شخص نہ مفرد کی صورت میں اس لفظ کے ساتھ موسوم ہوسکتا ہے اور نہ ہی مضاف کی صورت میں۔ اس لئے ''اللہ'' کا لفظ سب سے پہلے لائے' پھر چونکہ ''الرحیم'' ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ غیر اللہ مفرد اور مضاف دونوں طرح موصوف ہوسکتا ہے اس لئے اس کو مؤخر کیا اور ''الرحمٰن'' ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ غیر اللہ مضاف ہوکر تو موصوف ہوسکتا ہے لیکن مفرد کی صورت میں صرف باری تعالیٰ کی ذات ہی موصوف ہوسکتی ہے' اس لئے اس لفظ ''الرحمٰن'' کو درمیان میں لائے۔

سوال عبادت کو استعانت پر کیوں مقدم فرمایا' حالانکہ استعانت اس کا مقدمہ ہے' اس لئے کہ بندہ پہلے اللہ تعالیٰ سے عبادت کے لئے مدد طلب کرے گا تب اللہ تعالیٰ عبادت پر اس کی مدد کریں گے؟

جواب اول واؤ ترتیب پر دلالت نہیں کرتا' **جواب ثانی** عبادت سے مراد توحید ہے۔ ظاہر ہے کہ توحید استعانت پر مقدم ہوتی ہے' کیونکہ جو شخص موحّد نہ ہو وہ عبادات کی ادائیگی کے لئے اعانت کا طلبگار نہیں ہوگا۔

سوال ''الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' سے مراد اسلام یا قرآن یا طریقِ جنّت ہے' جیسا کہ تفاسیر میں منقول ہے' جب کہ مسلمانوں کو اس کی ہدایت پہلے سے حاصل ہے' لہٰذا ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' میں طلبِ ہدایت سے کیا مراد ہے' یہ تو تحصیلِ حاصل ہے؟۔

جواب اول ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنی ہے۔ اے اللہ! ہمیں راہِ ہدایت پر استقامت

اور ثابت قدمی نصیب فرمانا' کیونکہ کچھ پتہ نہیں انجام کیسا ہو' نعوذ باللہ من ذلک۔ جیسے اہل عرب ٹھہرنے والے شخص کو کہتے ہیں: قف حتی اتیك: یعنی جب تک میں نہ آجاؤں تم یہیں ٹھہرنا۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ تم دوام اور ثبوت کے ساتھ یہیں ٹھہرے رہنا۔

جواب ثانی ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کا معنی ہے' مزید ہدایت طلب کرنا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے ''وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى'' نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى''۔

سوال ''وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' میں کلمہ ''لا'' لانے کا کیا فائدہ ہے' حالانکہ محض ''ضالین'' سے بھی مقصود ادا ہو جاتا ہے؟

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے وہ نفی مؤکد ہو جاتی ہے جس پر ''غیر'' دلالت کرتا ہے۔

سورۃ البقرۃ

سوال استغراق کے طور پر کیسے فرمایا ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' حالانکہ بہت سے گمراہ لوگ اس میں شک کرتے ہیں' اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے ''وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا''؟

جواب اول ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' کا معنی ہے' یہ قرآن پاک شک کا محل نہیں ہے۔

جواب ثانی ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' کا معنی ہے' یہ قرآن' اللہ' اس کے رسولؐ اور مومنوں کے نزدیک لاریب ہے۔

جواب ثالث یہاں نفی نہی کے معنی میں ہے' یعنی اس قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک نہ کرو' اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''وَاِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا''۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' جبکہ متقین تو پہلے سے ہی ہدایت یافتہ ہیں' اس سے تو تحصیل حاصل لازم آتی ہے؟

جواب اول ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کا مطلب ہے: وہ لوگ اس قرآن سے ہدایت حاصل کر کے متقی ہو گئے۔

جواب ثانی یا اس کا مطلب ہے یہ قرآن ان کے لئے ہدایت میں زیادتی اور ثبات کا ذریعہ ہے۔

جواب ثالث متقین کو خاص طور سے اس لئے ذکر کیا کیونکہ اس قرآن کے منافع سے وہی نفع اندوز ہونے والے ہیں' اس لئے کہ انہوں نے اس کا اتباع کیا اور اسے سینہ سے لگایا' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: ''اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا''۔

جواب رابع مراد تو دونوں فریق ہیں ایک متقی اور دوسرا غیر متقی' مگر ذکر صرف ایک فریق کا کیا گیا۔ جیسے اس فرمانِ خداوندی میں: ''سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ''۔

سوال ''یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ'' سے کیا مراد ہے' اس کا کیا معنی ہے' مخادعہ تو اس شخص کے حق میں متصور ہوسکتا ہے جس پر امور پوشیدہ ہوں تاکہ اس کے حق میں خداع (دھوکہ) کا معنی متحقق ہو' خَدعہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی کی لاعلمی میں اس کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے کہ کوئی شے اس سے مخفی نہیں' پھر کیسے فرمایا: ''یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ''؟

جواب اول ''یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ'' کا معنی ہے ''یُخٰدِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ'' یعنی اللہ کے رسولﷺ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ'' نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ''

جواب ثانی اصل میں ان کے نفاق کو فعلِ مخادع کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے خداع سے موسوم کردیا گیا۔

سوال ''اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ'' فرما کر فساد کو منافقین میں کیسے منحصر فرمادیا' حالانکہ یہ امر معلوم ہے کہ منافقین کے علاوہ بھی ایسے لوگ ہیں جو فساد مچانے والے ہیں؟

جواب یہاں فساد سے مراد نفاق کا فساد ہے جو انہیں کے ساتھ مخصوص تھا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے: ''اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ'' استہزاء تو عبث اور تحریہ کے باب (قسم) سے ہے' اور یہ قبیح ہے' اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے منزہ ہے؟

جواب اصل میں استہزاء کی جزاء کو صنعتِ مشاکلہ کے طور پر استہزاء کہہ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا''۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے استہزاء کی جزاء دیتے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کیا حکمت ہے: ''اَوْ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ'' جب کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ''صیّب'' (بارش) آسمان سے ہی ہوتی ہے' لہٰذا اس کا فائدہ کیا ہے؟

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ ''السَّمَآءِ'' کو معرفہ ذکر کرکے ''صیّب'' کی اس کی طرف اضافت کی گئی تاکہ یہ بات معلوم ہو کہ یہ ''صیّب'' آسمان کے جمیع آفاق سے ہے نہ کہ صرف ایک افق سے اس لئے کہ ہر افق کو ''سماء'' کہا جاتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے: ''وَمِنْ بُعْدِ اَرْضٍ بَیْنَنَا وَسَمَآءٍ''

سوال یہ کیسے فرمایا کہ: ”فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ“ مشرکین کو تو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے بلکہ وہ تو اللہ کے لئے شرکاء کا اعتقاد رکھتے تھے؟

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مشرکو! تم بھی یہ جانتے ہو کہ تمہارے یہ شریک کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے جیسے سابقہ آیت میں اس کا ذکر ہوا۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں بھی یہ بات معلوم ہے کہ تورات وانجیل میں بھی شریک بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ”فَاتَّقُوا النَّار“ یعنی یہاں تو ”النَّار“ معرفہ لایا گیا اور سورۃ التحریم میں اسے نکرہ لایا گیا ہے' اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اول یہاں چونکہ خطاب منافقین کو ہے اور منافقین قرآن حکیم کے مطابق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور ہر طرف سے جہنم کی آگ ان کو گھیرے ہوئے ہوگی اس لئے لام استغراق یا عہد ذہنی کے ساتھ ”النَّار“ کو معرفہ لایا گیا' اور جبکہ سورۃ التحریم میں خطاب مومنین کو ہے اور جو گنہگار مسلمان عذاب جہنم سے دوچار ہوں گے وہ جہنم کے صرف اوپر والے ایک حصہ میں ہوں گے' اس لئے قلیل ہونے کی بناء پر ”نار“ کو نکرہ لانا ہی مناسب ہوا۔

جواب ثانی سورۃ التحریم والی آیت اس آیت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی ہے لہٰذا یہ نار معروفہ نہ تھی جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے۔ پھر یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی اور اسے معرفہ لایا گیا تا کہ اس کے ذریعہ اس نار کی طرف اشارہ ہو جائے جس کو وہ پہلے پہچان چکے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ”وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَقَّ“ ایسا ہے کہ اس میں دونوں فعل متغایر نہیں ہیں کہ ان دونوں سے منع کیا جائے بلکہ ان دونوں میں سے ایک دوسرے میں داخل ہے یعنی الباس الحق بالباطل اور کتمانِ حق دونوں فعل متحد المعنی ہیں' متغایر نہیں ہیں؟

جواب یہ دونوں فعل معنی کے اعتبار سے متغایر ہیں۔ اس لئے کہ تلبیسِ حق بالباطل سے مراد ان کا تورات میں اس چیز کا لکھنا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ اور کتمانِ حق سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ ہم تورات میں محمد ﷺ کی صفات نہیں پاتے ہیں۔

سوال ”اَلَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ“ یہاں دوسرا جملہ لانے کا کیا فائدہ ہے خود پہلا جملہ اسی دوسرے جملہ کے مفہوم کا تقاضا کرتا ہے اور اس پر دلالت کر رہا ہے؟

جواب ”مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ“ کا معنی ہے کہ ان کو اس صبر اور صلوٰۃ پر اپنے رب کے پاس سے اجر و

ثواب ملے گا' اور ''وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' سے مراد ہے کہ وہ لوگ بعث بعد الموت کا یقین کرنے والے ہیں' لہٰذا اس آیت کا سارا مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں کو بعث بعد الموت اور موعود اجر و ثواب کے حصول کا یقین ہے' لہٰذا ان دو آیتوں میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ'' حالانکہ انہوں نے ''غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ'' کو تبدیل نہیں کیا' کیونکہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم "حِطَّةٌ" کہو تو انہوں نے کہا: ''حِنْطَةٌ''

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ جو قول اور لفظ ان سے کہا گیا تھا اس کو انہوں نے تبدیل کر دیا اور ایسا قول کہا جو ان سے نہیں کہا گیا تھا۔

سوال ''وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ'' میں ''عثو'' کا معنی ہے فساد' تو معنی بن جائیں گے: ''وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ''؟

جواب اس کا معنی ہے کہ تم کفر کر کے زمین میں نہ پھرو اور جب کہ تم باقی گناہوں کی وجہ سے فساد مچانے والے ہو۔ یعنی ''لاتعثوا فی الأرض بالکفر وانتم مفسدون بسائر المعاصی''۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ'' حالانکہ انہیں ایک طعام نہیں بلکہ دو طعام حاصل تھے یعنی من اور سلویٰ؟

جواب اس طعام سے مراد وہ کھانا ہے جو کبھی تبدیل نہ ہو اور ہمیشہ ایک ہی طرح کا ہو اگرچہ وہ طعام دو نوع کا ہو۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ'' حالانکہ نبیوں کا قتل ناحق ہی ہوتا ہے؟

جواب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ ان کے زعم اور اعتقاد کے مطابق ناحق ہے' نیز اس لئے کہ ان کے فعلِ قبیح کی صفت کو صراحۃً بیان کرنے میں ان کی خوب مذمت ہے اگرچہ یہ صفت فعل کو لازم ہے' جیسا کہ اس کی برعکس صورت میں ہے جیسے اللہ کا فرمان ہے: ''قَالَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ'' یہاں صفت کی تصریح میں مزید معنی کا حصول ہے۔ اس لئے کہ نبی کا قتل کبھی برحق بھی ہوتا ہے۔ جیسے ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے (اسماعیلؑ) کو قتل کرنا (یعنی قتل کا ارادہ کرنا) اگر وہ قتل واقع ہو جاتا تو وہ حق ہوتا ناحق نہ ہوتا۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ'' حالانکہ انسانی صورت سے بندر والی صورت کی طرف منتقل ہونا انسانی وسعت سے باہر ہے؟۔

جواب یہاں امر ایجادی ہے' ایجابی نہیں ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''كُنْ فَيَكُوْنُ''

سوال یہ کیسے فرمایا: ''عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ'' حالانکہ لفظ ''بین'' دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا مقتضی ہے لہٰذا لفظ ''بین'' کو ''ذلك'' مفرد پر لانا کیسے جائز ہوا؟

جواب ''ذٰلك'' کے ذریعہ مفرد، تثنیہ اور جمع سب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ''قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا''۔ نیز فرمانِ رب العالمین ہے: ''وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'' نیز فرمایا: ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ـــ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' لہٰذا اس کا معنی ہوا ''عوان بين الفارض والبكر'' یعنی بوڑھے اور بچہ کے درمیان۔ اس کی مکمل بحث اس آیت کے تحت: ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ'' عنقریب ان شاءاللہ تعالیٰ آ رہی ہے۔

سوال ''وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ط'' ان دونوں کلاموں کے درمیان کیا فرق ہے، بظاہر دونوں کلام متحد المعنی ہیں، دوسرے کلام کے لانے کا کیا فائدہ؟

جواب ''تفجر'' کا لفظ کثرت کے وصف کے ساتھ خروج کے معنی پر دلالت کرتا ہے، اور جب کہ دوسرا لفظ ''یشقق'' نفسِ خروج کے معنی پر دلالت کرتا ہے، ظاہر ہے دونوں چیزیں متغایر ہیں، متحد نہیں، لہٰذا ان میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ'' کتابت بالید کا لفظ بڑھانے میں کیا فائدہ ہے، کیونکہ کتابت ہاتھ سے ہی ہوتی ہے۔

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تحریف کا یہ عمل خود ان کا کیا ہوا ہے، اس سے ان کے فعلِ تحریف کی مزید قباحت ظاہر ہوئی، کیونکہ کسی کے بارے میں ''کتب فلان کذا'' کہنا بہر صورت صحیح ہے خواہ اس نے بذاتِ خود لکھا ہو یا کسی سے لکھوالیا ہو۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ'' حالانکہ ''تولّی'' اور ''اعراض'' دونوں کا معنی ایک ہے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ پھر تم نے ایفائے عہد سے تولّی کی اور اس کے انجام میں غور و فکر کرنے سے اعراض کیا۔

سوال ''وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَّمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا'' یہاں ''وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا'' کو خاص طور سے لانے میں کیا فائدہ ہے، حالانکہ یہ بھی ''الناس'' میں داخل ہے؟

جواب یہ اصل میں تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے، یعنی مشرکین کو بعد از عموم خاص طور پر ذکر کیا گیا' اس لئے کہ وہ ایمان بالبعث نہ ہونے کے سبب حیاتِ دنیوی کے شدید حریص تھے۔

سوال "وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ" اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دو فرشتوں پر سحر کا علم نازل کیا' لہٰذا یہ سحر و جادو حرام نہیں ہے؟

جواب سحر و جادو پر عمل کرنا حرام ہے' اس لئے کہ وہ دو فرشتے لوگوں کو اس سے بچنے کے لئے سحر سکھاتے تھے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ" اس کی نظیر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پوچھ لے کہ زنا کیا ہوتا ہے؟ تو زنا کی وضاحت ضروری ہوگی تا کہ وہ اس کی حقیقت جان کر اس سے اجتناب کر سکے۔

سوال "وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" اس کی کیا وجہ ہے کہ پہلے تو ان کے لئے علم کو لام قسم وغیرہ لا کر مؤکد طریقہ سے ثابت کیا اور پھر ان سے علم کی نفی کر دی؟

جواب جو بات ان کے لئے ثابت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اجمالی علم رکھتے ہیں کہ جو شخص سحر کو اختیار کرتا ہے آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا' اور جس بات کی ان سے نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ آخرت کی حسرت اور وہاں کی محرومی کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں' لہٰذا دونوں باتوں میں فرق واضح ہوگیا۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" حالانکہ یہ کہنا کہ یہ چیز اس سے بہتر ہے اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب دونوں چیزوں میں اچھائی اور بہتری ہو' جب کہ سحر میں تو کوئی خیر نام کی چیز نہیں ہے۔؟

جواب یہ خطاب ان سے ان کے زعم و اعتقاد کے مطابق کیا گیا ہے یعنی ان کے خیال کے مطابق چونکہ اس سحر سے دنیوی اغراض حاصل ہوتی ہیں اس لئے اس کے سیکھنے میں بہتری ہے۔

سوال یہاں تو (بصورتِ نکرہ) فرمایا: "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا" اور سورہ ابراہیمؑ میں فرمایا: "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا" اس میں کیا نکتہ پنہاں ہے؟

جواب پہلی دُعا کے موقع پر مکہ غیر آباد اور ویران جگہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اسے بَلَدًا اٰمِنًا (با امن شہر) بنا' اور دوسری دُعا کے موقع پر مکہ بلد (آباد جگہ) تو ہوگیا تھا لیکن آمن (با امن) نہیں ہوا تھا اس لئے اس کو معرفہ لا کر اس کے لئے امن مانگا گیا۔ یا وہ بلدِ آمن تھا لیکن اس امن و امان کے دوام و ثبات کے لئے دعا کی گئی' اور پھر اس سورت کا مدنی ہونا اور سورۃ ابراہیمؑ کا

مکی ہونا اس کے منافی نہیں ہے' اس لئے کہ ابراہیمؑ کا دعائیں کرنا مذکورہ ترتیب کے ہی مطابق تھا' اور قرآن میں اس کا ذکر اس ترتیب مذکور کے خلاف کیا گیا' یا پھر مکی سورت وہ ہے جو ہجرت سے قبل نازل ہوئی ہو' لہٰذا مدنی وہ ہوگی جو اس سے متاخر ہو۔ اور جبکہ قرآن کا کچھ حصہ وہ ہے جو فتح مکہ کے بعد نازل ہوا اب وہ مدنی سے متاخر ہوگا' پھر کیسے سوال ہوسکتا ہے کہ سورۃ ابراہیم وہ مکی سورت ہے جو قبل از ہجرت نازل ہوئی۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی میں ''وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ'' ابراہیمؑ کو رسالت وخُلّت (خلیل اللہ ہونا) کے علاوہ اور کونسا شرف وفضل حاصل ہے؟

جواب زجاج کہتے ہیں: ''مِنَ الصّٰلِحِیْنَ'' سے مراد ہے فائزین' یعنی فائز المرام لوگوں میں سے ہوں گے۔

سوال موت تو انسان کی قدرت وطاقت میں نہیں ہے کہ انسان کو اس کا حکم دیا جانا درست ہو یا کسی حالت میں اس سے منع کیا جانا صحیح ہو لہٰذا یہ کیسے فرمایا: ''وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''؟۔

جواب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم دینِ اسلام پر ثابت وقائم رہو یہاں تک کہ جب تمہاری موت کا وقت آئے تو تم دینِ اسلام کی حالت میں دنیا سے جاؤ' لہٰذا یہ آیت اصل میں اسلام پر دوام وثبات کا امر یا ترکِ اسلام سے نہی کے معنی میں ہے۔

سوال ''فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا''۔ اگر اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں تو اس کا تو کوئی مثل نہیں اور اگر اس سے مراد دینِ اسلام ہے تو اس کا بھی کوئی مثل نہیں' اس لئے کہ دینِ حق ایک ہی ہے؟۔

جواب یہاں کلمۂ مثل زائد ہے' معنی یہ ہے کہ ''فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ'' یعنی بمن امنتم بہ' مراد اللہ تعالیٰ ہیں' یا ''بمآ امنتم بہ سے مراد دینِ اسلام ہے۔ کلمۂ مثل کلام میں کبھی زائد ہوتا ہے۔ جیسے فرمانِ خداوندی ہے: ''لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ'' نیز فرمانِ الٰہی ہے: ''کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ''۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ''بمثل'' میں باء زائدہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں زائد ہے: ''بجذع النخلة'' خلاصہ یہ ہوا کہ آیت کا معنی ہے کہ اگر وہ لوگ تمہارے اللہ پر ایمان لانے یا دینِ اسلام پر ایمان لانے کی طرح ایمان لے آئیں تو یقیناً وہ راہِ ہدایت پاسکتے ہیں۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ

مَمَّنۡ يَّنۡقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيۡهِ" حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کا علمِ ازلی رکھتے ہیں؟

جواب اول "لِنَعۡلَمَ" کا معنی ہے تا کہ وہ امر جس کا ہمارے علم میں ہونا اور پایا جانا پہلے سے ثابت ہے وہ موجود ہو۔

جواب ثانی "علم" سے مراد ہے بندوں کے لئے ممتاز کرنا، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "لِيَمِيۡزَ اللّٰهُ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ"

سوال یہ کیسے فرمایا: "فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا" اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو بیت المقدس کی جانب رخ کرنا پسند نہیں تھا، حالانکہ اس کی طرف رخ کرنا اللہ ہی کے حکم کی وجہ سے تھا۔

جواب اس "رضا" سے مراد طبعی محبت ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری یا رضا و تسلیم مراد نہیں ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "وَمَاۤ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ" حالانکہ ان کے دو قبلے تھے یہود کا الگ قبلہ تھا اور نصاریٰ کا الگ قبلہ تھا؟۔

جواب چونکہ وہ دونوں قبلے باطل اور قبلہ حق کے خلاف تھے تو گویا وہ باطل ہونے کے اعتبار سے قبلہ واحد ہیں اور ایک قبلہ کے حکم میں ہیں۔

سوال یہود جیسے ظالموں کو مومنوں کے مقابلے میں حجت کیسے حاصل ہوگی، حتی کہ فرمایا: لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ"؟

جواب اول اس کا معنی ہے کہ کہیں وہ ظلم اور باطل طور پر نہ کہنے لگیں، جیسے کوئی شخص اپنے صاحب سے کہتا ہے: تیرا میرے ذمہ کوئی حق نہیں، ہاں اگر تم ظلم ہی کر دیا غلط بات کہنا چاہو تو اور بات ہے۔

جواب ثانی یہاں اصل میں "اِلَّا" واو عاطفہ کے معنی میں ہے یعنی وَالَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ مبارک ہے: "اِنِّىۡ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ"

جواب ثالث ان دونوں جگہوں میں "اِلَّا" "لٰكِنۡ" کے معنی میں ہے، اور جب نبی کریم ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو ان کی اس وقت حجت یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) کو تو اپنے قبلہ کا پتہ نہیں ہم ان کی اتباع کیسے کریں؟ نیز وہ کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے دین کی مخالفت کرتے ہیں اور ہمارے ہی قبلہ کی اتباع کرتے ہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کا حکم دیتے ہوئے کعبۃ اللہ کی طرف رخ کرنے کا فرمایا تو ان کی یہ حجت ختم ہوگئی اور زبان بند ہوگئی، پھر وہ کہنے

لگے کہ تم نے بیت المقدس کے قبلہ کو کیوں چھوڑ دیا؟ اگر وہ قبلہ غلط تھا تو آپ تو ایک زمانہ تک اس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے ہو اور اگر وہ قبلہ صحیح تھا تو پھر اس کو چھوڑ کر بیت اللہ کا رخ کیوں کیا؟ یہی معنی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے: ''اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ''۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارا قبلہ صرف حب الوطنی اور قومی دین کی خاطر ترک کیا ہے۔ اور بعض کہتے اس سے مراد مشرکین کا یہ قول ہے: محمد (ﷺ) ہمارے قبلہ کی طرف لوٹ آئے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارا دین برحق ہے' عنقریب ہمارے دین کی طرف بھی لوٹ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل امر کو حجت کہا اس لئے کہ وہ صورت میں حجت کے مشابہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ'' یعنی باطلۃ۔ اور فرمایا: ''فرحوا بما عندهم من العلم''۔

سوال ''وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ'' (اور شکر کرو واسطے میرے اور مت کفر کرو) یہاں پر ''وَاشْكُرُوْا لِیْ'' کے بعد ''وَلَا تَكْفُرُوْنِ'' کہنے میں کیا فائدہ ہے؟ شکر تو کفر کی نقیض (ضد) ہے' جب شکر پایا جائے گا تو کفر منتفی ہوگا؟

جواب اول ''وَاشْكُرُوْا لِیْ'' کا معنی ہے میری نعمت کے ذریعہ میری فرمانبرداری پر مدد چاہو' اور ''لَا تَكْفُرُوْنِ'' کا معنی ہے میری نعمت کے ذریعہ میری نافرمانی پر مدد نہ چاہو۔

جواب ثانی پہلے جملہ میں شکر کا حکم ہے اور دوسرے میں اس شکرگزاری پر ثبات و دوام کا امر ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ'' (اور آدمیوں کی سب کی) حالانکہ جو کافر اپنے دین پر مرتا ہے تو اس کے دین والے اس پر لعنت نہیں کرتے؟

جواب اول ''النّاس'' سے صرف مومنین مراد ہیں۔

جواب ثانی یہ لفظ اپنے عموم پر ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کے دین والے آخرت میں اس پر لعنت کریں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ثُمَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا'' (پھر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے)۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا''

سوال ''وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' (اور معبود تمہارا معبود ایک ہے) میں ''اِلٰهٌ'' کہنے میں کیا فائدہ ہے؟ اگر ''وَاِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ'' (اور تمہارا معبود ایک ہے) کہتے تو زیادہ مختصر ہوتا؟

جواب اگر یوں کہتے ''وَاِلٰـهُكُمْ وَّاحِدٌ'' تو اس کا ظاہری معنی صرف یہ ہوتا کہ وہ ذات' معبود ہونے میں ایک ہے یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں' مگر اللہ تعالیٰ کے متوحد فی الذات ہونے کا علم

نہ ہوتا' لیکن جب ''اِلٰہ'' کو مکرر ذکر کیا جائے تو اس سے متوحد فی الذات کا بھی علم ہوتا ہے۔ اور اس آیتِ کریمہ کا مقصد بھی اللہ تعالیٰ کی احدیت فی الذات کو ثابت کرنا اور نصاریٰ کے قول کی نفی کرنا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ اصول تین ہیں: ان میں سے ایک خدا ہے' جس طرح زید (مثلاً) ایک ہے لیکن اس کے اعضاء متعدد ہیں لہٰذا جب اللّٰہ واحدٌ کہا تو اس سے اللہ تعالیٰ کی احدیت فی الذات والصفت معلوم ہوئی' اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ''وَاحِدٌ'' کا قول احدیت فی الذات کا بھی احتمال رکھتا ہے اور احدیت فی الصفات کا بھی محتمل ہے خواہ ''اِلٰہ'' کا ذکر مکرر ہو یا نہ ہو' بناء بریں یہ جواب ناتمام ہے۔

سوال وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَالَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً' اور مثال ان لوگوں کی جو کافر ہوئے مانند مثال اس شخص کے کہ چلاتا ہے ساتھ اس چیز کے کہ نہیں سنتا مگر بلانا اور پکارنا) اس آیت میں تشبیہ ہونکر درست ہے؟ بظاہر کفار کی چرواہے کے ساتھ تشبیہ معلوم ہوتی ہے؟

جوابِ اول دراصل ضمیر مقدر ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: ''ومثلك يا محمد مع الكفار كمثل الراعى مع الانعام'' یعنی اے محمد! آپ کی ان کافروں کے ساتھ مثال ایسی ہے جیسے راعی (چرواہے) اپنے جانوروں کے ساتھ ہو۔

جوابِ ثانی تقدیر عبارت یہ ہے: ''مثل الذين كفروا كمثل بهائم الراعى''۔ یعنی ان کافروں کی مثال چرواہے کے جانوروں کی طرح ہے۔

جوابِ ثالث تقدیری عبارت یہ ہے: ''ومثل واعظ الذين كفروا كمثل الناعق بالبهائم'' یعنی کافروں کو وعظ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو جانوروں کے پیچھے چلّا تا ہو۔

جوابِ رابع تقدیری عبارت یہ ہے: ''ومثل الذين كفروا فى دعائهم الاصنام كمثل الراعى'' یعنی بتوں کو پکارنے والے کافروں کی مثال چرواہے کی طرح ہے۔

سوال اس میں اس جانور کی کیا تخصیص ہے کہ وہ بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا' ہر عاقل بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا ''لَا يَسْمَعُ'' سے کیا مراد ہے۔

جواب ''لَا يَسْمَعُ'' (نہیں سنتا) سے مراد ہے ''لَا يَفْهَمُ'' (نہیں سمجھتا)

سوال دو آیتوں میں بظاہر تعارض ہے' یہاں فرمایا: ''وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ'' (اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ دن قیامت کے) اور دوسری جگہ یہ ارشاد ہے: ''فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ

اَجۡمَعِیۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ'' (پس قسم ہے رب تیرے کی البتہ سوال کریں گے ہم ان سے سب سے اس چیز سے کہ تھے عمل کرتے)؟

جواب جہاں کلام کی نفی ہے وہاں لطف واکرام کے ساتھ کلام نہ کرنا مراد ہے اور جہاں کلام کا اثبات ہے وہاں اہانت اور توبیخ کے ساتھ کلام کرنا مراد ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی'' (فرض کیا جاتا ہے تم پر قصاص مقتولین کے بارے میں) حالانکہ قصاص (بہرحال) فرض نہیں ہے بلکہ مقتول کے اولیاء کو اس میں اختیار ہوتا ہے؟

جواب اس سے مراد یہ ہے کہ قاتل پر خود سپردگی فرض کی گئی ہے' یہ مراد نہیں ہے کہ مقتول کے ورثاء پر فرض ہے کہ وہ اپنا حق پورا پورا وصول کریں۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''اَلۡوَصِیَّۃُ لِلۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ'' (وصیت کرنا واسطے ماں باپ کے اور قرابت والوں) یعنی ''اَلۡاَقۡرَبِیۡنَ'' کا ''الۡوَالِدَیۡنِ'' پر عطف کیا گیا ہے' حالانکہ والدین تو قرابت داروں میں سب سے زیادہ قرابت والے ہیں یعنی اقرب الاقربین ہیں' عطف تو دونوں میں مغایرت کا مقتضی ہے؟

جواب والدین' اقربین میں سے نہیں ہیں' کیونکہ قریب اس کو کہتے ہیں جو دوسرے کی طرف بواسطہ منسوب ہو جیسے بھائی' چچا وغیرہ' جب کہ والدین' ایسے نہیں ہیں' اور اگر بالفرض والدین' اقربین میں شمار ہوں تو اس صورت میں والدین کا خصوصی ذکر ان کے شرف وعظمت کی بناء پر ہوگا' جیسے اس ارشادِ حق میں ہے: ''وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِیۡلَ وَمِیۡکٰلَ''۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ'' (فرض کیا گیا تم پر روزہ جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا) حالانکہ امتِ محمدیہ کا روزہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی امتوں کے روزوں کی طرح نہیں ہے؟

جواب اول یہاں تشبیہ اصلِ صوم میں ہے نہ کہ کیفیتِ صوم میں یا تشبیہ کیفیتِ افطار میں ہے۔ اس لئے کہ پہلے صرف غروبِ آفتاب سے لے کر رات سونے تک افطار مباح تھا پھر اس فرمانِ الٰہی سے یہ حکم منسوخ ہوا: ''وَکُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ'' (اور کھاؤ اور پیو اس وقت تک کہ تم کو ظاہر ہو)۔

جواب ثانی یہ تشبیہ صوم کے عدد میں بھی ہے' جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' وہ

فرماتے ہیں: نصاریٰ پر بھی رمضان کے روزے فرض تھے اور وہ دس روزے رمضان سے پہلے یا بعد میں رکھتے تا کہ وہ روزے گرمیوں میں نہ واقع ہوں اور پھر اس تقدیم وتاخیر کی تلافی مزید بیس روزوں سے کرتے چنانچہ ان کے پچاس روزے گرمی وسردی کے درمیان میں ہو جاتے ہیں۔

سوال ”هُدیً لِلنَّاسِ“ (لوگوں کے لئے ہدایت ہے) فرما دینے کے بعد مزید ”وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ“ (اور دلیلیں ہدایت کی سے اور معجزے) فرمانے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب پہلے یہ بات ذکر فرمائی کہ قرآن ذریعۂ ہدایت ہے، پھر یہ ذکر فرمایا کہ یہ منجملہ ان آسمانی کتابوں کے ہے جو بندوں کے لئے ذریعۂ ہدایت بھی ہیں اور حق و باطل میں فرق کرنے والی اور فیصلہ کرنے والی بھی ہیں دونوں میں کوئی تکرار نہیں۔

سوال ”فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ“ (پس جو کوئی حاضر ہو تم میں سے اس مہینے میں پس چاہئے کہ روزہ رکھے اس کو اور جو کوئی بیمار ہو یا او پر سفر کے پس گنتی ہے دِنوں اور سے) اس آیت میں مریض اور مسافر کو دوبارہ ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اصل میں سابقہ آیت میں تندرست آدمی، مریض اور مسافر کو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار دیا گیا تھا اس آیت سے تدرست آدمی کا اختیار منسوخ ہوا جبکہ سابقہ آیت میں مریض اور مسافر کے اختیار کا بھی ذکر تھا جس سے یہ وہم ہوتا تھا کہ شاید ان کے اختیار کا حکم بھی منسوخ ہو گیا اور اب مریض اور مسافر کو بھی اختیار نہیں رہا اس لئے اس وہم کے ازالہ کے لئے ان (مریض اور مسافر) کا ذکر دوبارہ کیا گیا۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ“ (پس تحقیق میں نزدیک ہوں جواب دیتا ہوں پکارنے کا پکارنے والے کو جب پکارتا ہے مجھ کو) اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دُعا کرنے والے کی دُعا کو قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے دُعا کرنے والوں کی دُعا قبول نہیں ہوتی؟۔

جواب نبی کریم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: ”جو مسلمان بھی اللہ تعالیٰ سے ایسی دُعا کرے جس میں کوئی قطع رحمی نہ ہو اور گناہ کی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو اس دعا کی وجہ سے تین امور میں سے ایک امر ضرور عطا کرتے ہیں، یا تو اس کی دُعا قبول کر لیتے ہیں یا اس دُعا کو اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ کر لیتے ہیں یا اس شخص سے اس کے مثل کوئی تکالیف و برائی دور کر دیتے ہیں“۔ نیز قبولیتِ دعا کے لئے اطاعتِ خداوندی، حلال کھانا اور دُعا کے وقت حضورِ قلبی شرط ہے، جب یہ

شرائط موجود ہوں گی تو وہ دعا ضرور قبول ہوگی' نیز دُعا کرنے والا شخص بسا اوقات دعا کی قبولیت میں اپنی مصلحت (بہتری) خیال کررہا ہوتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے مانگا ہے وہ چیز تاخیر سے دینے میں اس کا بھلا اور فائدہ ہے نہ کہ فوراً دینے میں۔ یا اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ چیز اس کو نہ دینے میں ہی قابلِ مصلحت ہوتی ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اس کا مقصودِ اصلی یعنی مصلحت و بہتری مطلوب ہوتی ہے جو کہ وہ منظور فرماتا ہے لیکن بندہ سمجھتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی اور مجھے مانگی ہوئی چیز عطا نہیں ہوئی۔

سوال "تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ" (یہ دس ہوئے پورے) اس فرمانِ باری تعالیٰ کا کیا فائدہ ہے؟ سب جانتے ہیں کہ تین اور سات دس ہوتے ہیں۔ نیز "كَامِلَةٌ" کہنے میں کیا نکتہ ہے؟ کیونکہ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ دس پورے ہی ہوتے ہیں' تمام اسمائے عدد نہ مذکور سے کم پر صادق آتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ پر صادق آتے ہیں؟۔

جواب "تِلْكَ عَشَرَةٌ" کہنے میں فائدہ یہ ہے کہ کہیں کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ مذکور آیت میں واو بمعنی او ہے جیسا کہ اس ارشادِ الٰہی مین واو بمعنی او ہے: "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ" (پس نکاح کرو جو خوش لگے تم کو سوائے ان کے عورتوں سے دو دو اور تین تین اور چار چار) یعنی پورے دس دن کے روزے رکھے' چنانچہ "تِلْكَ عَشَرَةٌ" سے دو عددوں میں سے ایک عدد کے واجب ہونے کا یہ خیال منتفی ہوگیا کہ یا تو تین روزے ایام حج میں رکھے یا حج سے واپس آنے کے وقت سات روزے رکھے۔ اس کی "عَشَرَةٌ" سے نفی ہوگئی اور معلوم ہوگیا کہ دونوں عدد واجب ہیں' ایام حج میں تین روزے اور حج سے لوٹتے وقت سات روزے۔ اور کلمہ "كَامِلَةٌ" تاکید کے لئے ہے' جیسے اس فرمان میں "حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ" (پورے دو سال) "كَامِلَيْنِ" تاکید کے لئے ہے۔ یا "كَامِلَةٌ" کا معنی ہے کہ یہ روزے اس ہدی کا بدل ہونے کے علاوہ اجر و ثواب میں کامل ہیں۔ یا "كَامِلَةٌ" کا مطلب یہ ہے کہ یہ روزے باوجود اس کے کہ بعض مسلسل ہیں اور بعض متفرق اس کا بدل واقع ہونے میں کامل ہیں۔ یا "كَامِلَةٌ" کا معنی یہ ہے کہ بعض روزے مکہ میں اور بعض غیر مکہ میں پیش آنے کے باوجود کامل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کمال وصف کے اعتبار سے ہے نہ کہ ذات کے لحاظ سے۔

سوال "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ" (پس جب پھر وتم عرفات سے پس یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر حرام کے اور یاد کرو اس کو جیسا ہدایت کیا تم کو) اس آیت میں ذکر اللہ کا حکم متکرر ہے اس میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اول ذکر اللہ کا حکم مکرر اس لئے ہے تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ مقصود اللہ تعالیٰ کا ذکر تکرار کے ساتھ ہے نہ کہ ایک مرتبہ ذکر کرنا' یعنی منظورِ خدا یہ ہے کہ اس کا ذکر بار بار کیا جائے۔ اسی لئے دوسری بار اس کا حکم دینے میں ایک اور فائدہ کا اضافہ کیا یعنی ''کَمَا هَدٰكُمْ'' مطلب یہ ہوا کہ تم اس کو اس کی وحدانیت کے ساتھ یاد کرو جیسے اس نے تم کو ہدایت دے کر یاد کیا۔

جواب ثانی پہلے ذکر سے مراد ہے مزدلفہ میں دو نمازوں کو جمع کرنا اور دوسرے ذکر سے مراد فجر کے بعد دُعا ہے۔لہٰذا یہاں تکرار نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔

سوال ''فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ۔۔۔ ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ'' (پس جب پھرو تم عرفات سے پھر پھرو جہاں سے پھرتے ہیں لوگ) مفسرین کا اتفاق ہے کہ ''ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ'' سے عرفات کی واپسی مراد ہے' اس تفسیر کے مطابق ''فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ'' کا کیا معنی ہوگا؟ یعنی مزدلفہ واپس آنے کے بعد اور اس میں دو مرتبہ ذکر کرنے کے بعد اب پھر وہ کیسے عرفات سے واپس لوٹیں گے؟۔

جواب یہاں اصل میں تقدیم وتاخیر ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: ''مِنۡ رَّبِّكُمۡ ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ 'فَاِذَاۤ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ'' (اس میں کوئی گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پھر تم سب کو ضرور ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آ جاؤ جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں' پس جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو۔۔)

سوال ''فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ'' (پس جو کوئی جلدی کرے بیچ دو دن کے پس نہیں گناہ اوپر اس کے' اور جو کوئی تاخیر کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں) اس فرمانِ الٰہی کے بیان میں کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ جب بعض رمی جمار کو ترک کر کے جلدی کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے تو اس شخص پر بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا جو تاخیر کرتا ہے اور مکمل رمی کا امر بجالاتا ہے؟

جواب اول اصل میں اہلِ جاہلیت میں دو فریق تھے' ایک فریق تعجیل کرنے والے کو گنہگار قرار دیتا تھا اور دوسرا فریق تاخیر کرنے والے کو گنہگار قرار دیتا تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں سے گناہ کی نفی کا ذکر کیا کہ دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔

جواب ثانی اصل میں دو چیزیں ہیں' ایک ہے رخصت اور دوسری چیز ہے عزیمت' یہ جو فرمایا کہ تاخیر کرنے والے پر بھی کچھ گناہ نہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ اس نے جو رخصت پر عمل نہیں کیا اور عزیمت کو اختیار کیا ہے اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں' اگر چہ اللہ تعالیٰ کو رخصت اور عزیمت دونوں

عمل پسند ہیں' خواہ رخصت کو بجالایا جائے اور خواہ عزیمت کو اختیار کیا جائے۔

جواب ثالث تعجیل اور تاخیر کرنے والوں کا گنہگار نہ ہونا دراصل تقویٰ پر موقوف ہے' محض رمیِ جمار کے بارے میں عزیمت یا رخصت پر موقوف نہیں ہے' پھر بعض کہتے ہیں کہ تقوی سے مراد حج کے دوران گناہوں سے بچنا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس تقوی سے میدانِ عرفات اور دوسرے مواقفِ حج میں جو اس نے اللہ سے وعدے کئے ہیں اور توبہ واستغفار وغیرہ کیا ہے حج کے بعد اپنی بقیہ زندگی میں ان پر قائم رہنا اور معاصی سے اجتناب کرنا مراد ہے۔ یہاں ایک مشکل یہ ہے کہ جس تعجیل کی رخصت دی گئی ہے وہ صرف ایام تشریق کے دوسرے دن میں ہے۔ یعنی صرف ایک دن کی ہے نہ کہ دودنوں کی' لہٰذا "یَوْمَیْنِ" کا لفظ ذکر فرما کر اس سے ایام تشریق کا صرف دوسرا دن کیسے مراد لیا؟

سوال "وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" (اور سارے مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جائینگے)۔ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ امور پہلے غیر اللہ کی طرف راجع تھے۔ جیسے اہلِ عرب کا قول ہے: رجع الی فلان عبده و منصبه یعنی فلاں کی طرف اس کا غلام اور اس کا منصب لوٹا دیا گیا۔؟

جواب اس آیت میں خطاب ان لوگوں کو ہے جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے افعال کو غیر کی طرف منسوب کرتے ہیں' ان کو اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت۔ کہ رر حقیقتِ حال کا انکشاف ہوگا تو وہ اپنے کفر اور ظلم کے سبب غیر اللہ کی طرف منسوب افعال کو رد کردیں گے' نیز "اور کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے' جیسے کہا جاتا ہے: "یعنی فلاں کی طرف سے مجھے ناگوار امر پیش آیا۔ ایک شاعر کہتا ہے:

وَمَا المرءُ اِلَّا کالشهاب وضوئِهٖ ☆ یحور رمادا بعد اذھو ساطع

یعنی انسان ایک شعلہ کی روشنی کی طرح ہے کہ جب وہ شعلہ بلند ہوتا ہے تو راکھ بن جاتا ہے۔ اور نیز یہ کہ تمام امور بندوں کی تخلیق سے قبل اللہ تعالیٰ ہی کی طرف راجع تھے' پھر جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو بعض امور کا بطورِ نیابت وخلافت کے مالک بنادیا پھر ان کی وفات کے بعد سارے امور آخر کار اسی ذات کی طرف راجع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ان فرامین کا تعلق اسی بات سے ہے' فرمایا: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" (آج کے دن کس کی بادشاہت ہے؟) اور فرمایا: "اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ" (اس روز حقیقی حکومت رحمٰن (ہی) کی ہوگی)۔

نیز یہاں یوں فرمایا: "وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" صرف "وَاِلَيْهِ" نہیں فرمایا' اگرچہ

سابق میں اس کا ذکر ہو چکا تھا تو اس کی وجہ تعمیم اور تعظیم کا قصد ہے' حالانکہ یہ ایجاز اور اختصار کے منافی ہے۔

سوال ''وَيَسْئَلُونَكَ مَا ذَا يُنفِقُونَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ'' (لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں۔ آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا)۔

یہاں جواب' سوال کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے سوال یہ کیا تھا کہ وہ کیا چیز خرچ کریں؟ مگر انہیں جواب میں مال کا مصرف بتایا گیا؟

جواب اللہ تعالیٰ اس ارشاد میں ''قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ'' (آپ فرما دیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو) ان کے سوال کا جواب موجود ہے اور وہ ہے: کل خیر یعنی جو مال بھی خرچ کرنا چاہو خرچ کر سکتے ہو پھر مزید مال کا مصرف بھی بیان فرما دیا۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى قَالَ هِيَ عَصَايَ'' الآیۃ (اے موسیٰ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے'' انہوں نے فرمایا یہ میری لاٹھی ہے۔۔) اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا یہ فرمان بھی اس کی نظیر ہے جب آپؐ سے ماءِ بحر سے وضو کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''هو الطهور ماؤه والحل ميتته'' یعنی بحر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

سوال اس میں کیا نکتہ پنہاں ہے کہ تین مرتبہ ''يَسْئَلُوْنَكَ'' واؤ کے بغیر آیا ہے (يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنفِقُوْنَ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ) اور تین ہی مرتبہ ''يَسْئَلُوْنَكَ'' واؤ کے ساتھ آیا ہے (وَيَسْئَلُوْنَكَ مَا ذَا يُنفِقُوْنَ ۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ)؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے پہلے امور سے متعلق سوالات متفرق طور پر ہوئے تھے اور دوسرے امور سے متعلق سوالات ایک ہی وقت میں کیے گئے تھے اس لئے حرف جمع کے ساتھ ان کو لایا گیا تاکہ اس پر دلالت کرے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' (اور اگر قصد کریں طلاق کا پس تحقیق اللہ سننے والا جاننے والا ہے) حالانکہ ان کے طلاق دینے کا قصد اور ارادہ علم سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ سماعت سے' تو کیسے فرمایا کہ وہ ذات ان کے عزمِ طلاق کو سننے والی ہے؟۔

جواب عموماً عزمِ طلاق اور عدمِ رجوع باہمی بحث و تکرار خالی نہیں ہوا کرتا اور اگر خالی بھی ہو تو عزمِ طلاق کے متعلق وہ اپنے دل میں اسے ضرور بیان کیا کرتا ہے اور یہ کلام ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی

سن سکتے ہیں' جیسے وہ شیطان کے وسوسہ تک کو سن لیتا ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ'' (اور ان عورتوں کے شوہران کے پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندر) حالانکہ عورتوں کے لئے رجعت میں کوئی حق نہیں ہے۔ اور افعل التفضیل کا صیغہ (اَحق) اشتراک کا مقتضی ہے کہ دونوں حق رکھتے ہیں؟۔

جواب اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر جب رجوع کرنا چاہتا ہو اور عورت نہ مانتی ہو تو اس صورت میں شوہر کے قول کی اس عورت کے قول کو ترجیح دینا ضروری ہے' کیونکہ رجعت میں اس عورت کا حق ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا'' (اور ان عورتوں کے شوہران کے پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں اس عدت کے اندر بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں) یہاں اصلاح کے قصد کی شرط کیسے لگائی' حالانکہ شوہر بہر حال رجعت کا حقدار ہے خواہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھتا ہو یا عدّت کو طول دے کر اس کے ساتھ اضرار (تکلیف دینے) کا قصد رکھتا ہو اس آیت کا مطلب کیا ہے؟۔

جواب مراد یہ ہے کہ اگر وہ شوہر اصلاح چاہتا ہو تو رجوع کرنا زیادہ درست اور قرینِ انصاف ہوگا اور اگر وہ اسے تکلیف پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر زیادہ صحیح اور درست یہ ہوگا کہ وہ رجوع نہ کرے۔

سوال دو آیتیں ہیں ان میں تطبیق کیسے ہوگی' ایک آیت یہ ہے: ''فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ'' (سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مرجاؤ (سب مرگئے) پھر ان کو جلا دیا) اور دوسری آیت یہ ہے: ''لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى'' (وہاں بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہیں چکھیں گے)؟

جواب پہلی آیت سے ان کی اجل کو باقی رکھتے ہوئے عقوبت کی موت دینا مراد ہے اور دوسری آیت سے ان کی اجل کو ختم کرتے ہوئے موت دینا مراد ہے۔ اس کی نظیر موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ'' (پھر ہم نے تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مرجانے کے بعد) اب اس آیت میں عقوبت کی موت دینا مراد ہے یا پھر ان کا دوبارہ زندہ ہونا ان کے پیغمبر کے معجزہ کے طور پر تھا' جیسا کہ حضرت عزیرؑ کے دوبارہ زندہ کرنے کا واقعہ قرآنِ کریم میں بیان ہوا ہے' انبیاء کرامؑ کے معجزات اصل میں نوادر اور مستثنیات میں سے ہوتے ہیں' لہٰذا دوسری آیتِ کریمہ سے مراد وہ موت ہے جو کسی نبی کے معجزہ کے سبب

نہ ہو۔ یا قوم موسیٰ کا زندہ کرتا ان کے نبی کا معجزہ بھی تھا' یہ عام جواب ہے۔ علاوہ ازیں خود یہ سوال بھی قابلِ اشکال ہے۔ اس لئے کہ "لَا یَذُوقُونَ" میں جو ضمیر ہے وہ متقین کی طرف راجع ہے اور "فِیهَا" کی ضمیر جنّت کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ سورۃ الدخان میں اس کی مزید وضاحت آ رہی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بناء بریں تو اصل سوال ہی مندفع ہو جاتا ہے۔

سوال یہ کیسے ارشاد فرمایا: "وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْکَهٗ مَنْ یَّشَآءُ" (اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک جس کو چاہیں دیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اپنا ملک نہیں دیتے؟

جواب یہاں ملک سے مراد وہ ریاست اور سلطنت ہے جس کے وہ لوگ طالوت کو دینے کے منکر تھے' اس سے یہ مراد بالکل نہیں کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں اپنا ملک دے دیتے ہیں آیت کا سیاق اس سے مانع ہے۔

سوال پانی کے متعلق کیسے فرمایا: "وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ" (اور جو کوئی نہ چکھے گا اس کو) "وَمَنْ لَّمْ یَشْرَبْهُ" (اور جو اس پانی کو نہ پیئے گا) کا لفظ نہیں فرمایا' حالانکہ پانی پی جانے والی چیز ہے نہ کہ کھائے جانے والی چیز؟

جواب اصل میں لفظ "طعم" عام ہے' کھانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور چکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے' یہاں مراد چکھنا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں "تِلْکَ الرُّسُلُ" الآیۃ' میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو خصوصی طور پر ذکر فرمانے کی کیا وجہ ہے' آخر اور بھی بہت سارے انبیاء موجود تھے؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دو پیغمبروں کو دو عظیم اور مشہور کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سے روشن اور ممتاز معجزات عطا کئے گئے ہیں۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ" (قبل اس کہ وہ دن (قیامت) آجائے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی ہوگی اور نہ کوئی سفارش ہوگی) حالانکہ قیامت کے روز انبیاء وغیرہ کی سفارش ثابت ہے' دلیل اس کی یہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" (کون ہے وہ جو سفارش کرے نزدیک اس کے مگر ساتھ حکم اس کے کے) اور یہ فرمان بھی اس کی دلیل ہے: "وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی" (اور وہ سفارش نہیں کر سکتے مگر اس کے لئے جو وہ پسند کرے)۔

نیز یہ فرمانِ الٰہی بھی ثبوتِ سفارش پر دلیل ہے: "وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ" "اور نہیں نفع دیتی سفارش اس کے نزدیک مگر جس کے لئے وہ اجازت دے"

بہر حال ان آیات سے سفارش کا ہونا ثابت ہوتا ہے' جبکہ "وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ" سے اس کی نفی ثابت ہوتی ہے؟۔

جواب یہ آیات قیامت کے روز شفاعت کے ثبوت پر دال نہیں ہیں' بلکہ ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی شفاعت اور سفارش فائدہ نہیں دے گی اور نہ ہی کسی کے لئے پائی جائے گی۔ اور یہ چیز وجودِ شفاعت کی نفی کے منافی نہیں ہے' منافی تو اس کے وجود کی خبر دینا ہے نہ کہ امکانِ وجود کی خبر دینا اس کے منافی ہے۔

جواب ثانی اگر یہ بات مان لی جائے کہ مذکورہ آیات قیامت کے دن سفارش کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں تو پھر اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس سے مراد ان کواکب (ستاروں) اور اصنام (بتوں) کی شفاعت کی نفی ہے جن کا وہ اعتقاد رکھتے تھے' اسی لئے اس کے بعد یہ فرمایا: "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں)۔

جواب ثالث بعض کہتے ہیں کہ "وَلَا شَفَاعَةٌ" سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں شفاعت صرف فضل و ثواب کی زیادتی کے لئے ہوگی' ترکِ واجب کے گناہ کے سلسلہ میں کوئی شفاعت نہیں ہوگی۔ اور یہاں مخاطب مومنین ہیں جن کو واجب نفقہ یعنی زکوٰۃ کے متعلق خطاب کیا گیا ہے۔

سوال "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (کافر لوگ ہی ظلم کرتے ہیں) بطورِ حصر کیوں فرمایا' جب کہ غیرِ کافر بھی ظلم کرتے ہیں؟

جواب کافروں کا ظلم چونکہ زیادہ شدید ہے اس لئے گویا وہی ظالم ہیں اور کوئی نہیں۔ اس کی نظیر یہ فرمان ہے: "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" (خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں)۔

سوال "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ" (اللہ تعالیٰ دوست دار ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے' نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے طرف روشنی کے)' اس آیتِ کریمہ میں "يُخْرِجُهُمْ" (نکالتا ہے) لفظِ مضارع کے ساتھ کیوں فرمایا ہے' "اَخْرَجَهُمْ" (ان کو نکالا) ماضی کا لفظ کیوں نہیں استعمال کیا' حالانکہ ایمان کے پائے جانے کی وجہ سے اندھیروں سے روشنی کی طرف اخراج (نکالنا) پایا گیا ہے' اس لئے بظاہر ماضی کا لفظ لانا مناسب تھا؟

جواب اصل میں مضارع کا لفظ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے: معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کے حق میں یہ اخراج (اندھیروں سے روشنی کی طرف) زمانۂ مستقبل میں دوام

واستمرار کے ساتھ ہوگا کہ ان کو مزید ہدایت دیتے رہیں گے اور ان کے شبہات دور کرتے رہیں گے اور جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے اور اللہ کے علم میں ہے کہ وہ آئندہ ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں گے ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اخراج ہدایت کی ابتداء اور اس کی زیادتی کے ذریعہ دوام واستمرار کے طور پر ہوگا' جب کہ ماضی کا لفظ استمرار کے معنی پر دلالت نہیں کرتا۔

سوال مومنین کفر کے اندھیروں میں اور کافرین' ایمان کے نور میں کب تھے کہ پھر ان کو اس سے نکالا گیا؟۔

جواب اخراج (نکالنا) کا لفظ داخل نہ ہونے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے' جیسے اس شخص کے لئے خَرَجَ اور اَخرَجَ (نکلا اور خود کو اس سے نکالا) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو کسی کام میں پڑنے سے آپنے آپ کو بچاتا ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا مومنین کو کفر وضلالت کے اندھیروں میں داخل ہونے سے بچانا ان کا اس سے اخراج (نکالنا) ہے اور کافروں کا ان کے لئے باطل کو مزین (آراستہ) کرنا' جس کے ذریعہ وہ ان کو راہِ حق سے باز رکھتے ہیں' ان کو نورِ ہدایت سے نکالنا ہے۔

نیز اہلِ کتاب کے رؤسا کا ظہورِ نبوت سے پہلے حضور ﷺ پر ایمان ان کے لئے نور تھا اور ظہورِ نبوت کے بعد ان کا کفر اس نور سے کفر کے ظلمات کی طرف خروج تھا' اس لئے کہ ظہورِ معجزات کے وقت حضور ﷺ کا متبع' جہالت کی ظلمتوں سے نکل کر علم کے نور کی طرف آیا اور آپ کا مخالف نورِ علم سے نکل کر جہالت کی ظلمتوں کی طرف آنے والا ہے۔

سوال حضرت ابراہیمؑ کی دلیل کے مقابلہ میں نمرود نے ایک مجوسی کو قتل کرواکے اور دوسرے کو رہا کر کے دکھایا کہ میں بھی زندہ کرسکتا ہوں اور مار سکتا ہوں ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی اور اسکی حجت توڑی نہیں گئی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے فوراً دوسری حجت اور دلیل بیان کردی کہ میرا رب سورج کو مشرق سے لاتا ہے تو اس کو مغرب سے لا کر دکھادے' آخر ابراہیمؑ کی زندہ کرنے اور مارنے سے کیا مراد تھی۔ اور آپ نے پہلی بات کو چھوڑ کر فوراً دوسری دلیل کیوں بیان کرنا شروع کردی۔

جواب اول حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ میرا مدّ مقابل احیاء اور اماتت کا وہ معنی سمجھنے سے قاصر ہے جس کی نسبت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف کی تھی' اس لئے تو نمرود نے عجیب طرح اس کی مخالفت کی' اور دو معنوں کا مختلف ہونا اس سے مخفی رہا۔

جواب ثانی پہلی حجت سے عدول کی وجہ یہ تھی کہ ابراہیمؑ کو چونکہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نمرود نے میری حجت سمجھ لی ہے لیکن وہ اپنے پیروکاروں اور حاشیہ نشینوں کے سامنے اس حجت کو ملتبس کرنا چاہتا ہے اور حقائق کی پردہ پوشی کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے انہوں نے ایک ایسی ظاہر اور واضح چیز کی طرف عدول کیا جسے ہر شخص سمجھ سکتا تھا اور جس کے سمجھنے میں کسی کو التباس یا اشتباہ نہیں ہو سکتا تھا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے نمرود کے دل پر کیسے مہر لگا دی کہ وہ پھر سورج کو مغرب سے طلوع کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کا معارضہ نہ کر سکا؟

جواب اول اگر وہ اس کا معارضہ کرتا بھی تو اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے طلوع نہ فرماتے' اس لئے کہ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا علاماتِ قیامت میں سے ہے جو علامت قیامت کے بالکل قریب ظاہر ہو گی۔

جواب ثانی نمرود اور اس کے متبعین بھی اس بات کو جانتے تھے کہ سورج کا مشرق سے طلوع ہونا خود اس کی پیدائش پر مقدم ہے اگر وہ بالفرض اس کا دعویٰ کرتا تو وہ سب اس کی تکذیب کر دیتے۔

سوال حضرت عزیرؑ نے نبی ہونے کے باوجود احیاء بعد الموت کو بعید خیال کرتے ہوئے کیسے فرمایا: "أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" (اللہ تعالیٰ اس بستی کے مُردوں کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کریں گے)۔ ایک پیغمبر پر تو ویران بستی کو اور اس کے رہنے والوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرتِ خداوندی مخفی نہیں ہوا کرتی؟

جواب اول حضرت عزیرؑ نے یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا انکار یا اس کے استبعاد کے طور پر نہیں فرمائی بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت سے متعجب ہو کر یا کیفیت احیاء کی رؤیت کے طالب اور خواہشمند ہو کر فرمائی۔ اس لئے کہ "أَنَّى" کیف' معنی میں بھی آتا ہے' امام مجاہدؒ سے منقول ہے کہ اس بستی کے پاس سے گزرنے والا کوئی کافر شخص تھا جسے بعث بعد الموت میں شک تھا' اگرچہ قولِ اول ہی زیادہ مشہور ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے یہ کیسے فرمایا: "أَوَ لَمْ تُؤْمِنْ" (کیا تم ایمان نہیں لائے؟) حالانکہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم تھی کہ ابراہیمؑ ایمان اور یقین کے لحاظ سے تمام لوگوں سے زیادہ مضبوط ہیں؟۔

جواب مقصد یہ تھا کہ ابراہیمؑ وہ جواب دیں جس سے سامعین کو مُردوں کے زندہ کرنے کی درخواست سے ایک عظیم فائدہ حاصل ہو۔

سوال یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کا دل اللہ تعالیٰ کی قدرت علی الاحیاء پر مطمئن نہ ہوحتی کہ

ابراہیمؑ نے جواب میں کہا: ''وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ '' (تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے) ابراہیمؑ کا دل تو اللہ تعالیٰ کی قدرت علی الاحیاء پر مطمئن تھا؟

جواب اول مطلب یہ تھا کہ جیسے برہان اور دلیل سے انہیں اطمینان حاصل ہے اسی طرح آنکھوں سے مشاہدہ کر کے بھی دلی اطمینان حاصل ہو جائے۔

جواب ثانی مطلب یہ ہے کہ تاکہ مجھے اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ آپ نے مجھے اپنا خلیل بنالیا ہے۔

جواب ثالث یعنی مجھے اپنے مستجاب الدعوات ہونے کا اطمینان حاصل ہو جائے۔ پہلی وجہ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ آنکھوں سے مشاہدہ کر کے یقین میں کیسے اضافہ ہو جاتا جبکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ حجاب کو ہٹا دیں تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا''۔ ابراہیمؑ کا مقام تو ان سے عظیم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی اس سے مراد مشاہدہ سے قبل اپنے یقین کی قوت ہے، حتیٰ کہ جو زیادتی (اضافہ) معاینہ سے انہیں حاصل ہوتی وہ بالکل معمولی اور غیر معتد بہ ہوتی۔

سوال ''فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ'' (تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو) یہاں لفظ ''فَخُذْ'' (چار پرندے لے لو) کافی تھا، مزید ''فَصُرْهُنَّ'' کہنے میں کیا نکتہ ہے؟

جواب اس لفظ ''فَصُرْهُنَّ'' کے ذکر کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ وہ ان پرندوں کو اور ان کی شکلوں اور صفتوں کو اچھی طرح دیکھ لیں تاکہ احیاء کے بعد کہیں ان کو یہ وہم نہ ہو کہ یہ کوئی اور پرندے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا'' (پھر خرچ کرنے کے بعد احسان نہیں جتلاتے) اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے احسان نہ جتانے پر متقین کی مدح فرمائی ہے، اور احسان سے منع بھی فرمایا ہے حالانکہ خود ذاتِ باری نے خود کو ''اَمَنَّان'' کے وصف کے ساتھ موصوف کیا ہے، ارشاد فرمایا: ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' (اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ہے)؟

جواب ''مَنَّ'' ''اَعْطٰى'' (دینا اور عطا کرنا) کے معنی میں ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات میں جو ''مَنَّان'' کا ذکر آتا ہے اس کا یہی معنی ہے یعنی عطا کرنے والا، اور ''فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ'' اور ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ'' میں ''مَنّ'' انعام کے معنی میں ہے یعنی اللہ نے مومنوں پر انعام کیا

ہے" اور "فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ" کا مطلب ہے بغیر کسی عوض کے انعام کے طور پر رہا کرنا۔ اور ایک "مَنّ" کا معنی ہوتا ہے کوئی نعمت کسی کو دے کر اس کو شمار کرنا' اس کا ذکر کرنا اور اس کو عظیم خیال کرنا' یہ مذموم ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: "بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ" (بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی) بظاہر اس "مَنّ" کا تعلق دوسری قسم سے ہے جو مذموم ہے؟۔

جواب اس سے مراد نعمتِ ایمان کو شمار کرنا اور اس کو ذکر کرنا ہے' یہ مذموم یا قبیح نہیں ہے' بخلاف نعمتِ مال کے' اس کو شمار کرنا قبیح ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ایسی ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کے حق میں تو قابلِ مدح ہیں مگر بندے کے حق میں باعثِ مذمّت ہیں جیسے جبّار' متکبّر اور منتقم وغیرہ۔

سوال اللہ تعالیٰ نے پہلے تو فرمایا: "اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ" (بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا) پھر فرمایا: "لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ" (اس شخص کے لئے اس باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں)۔

یعنی پہلے فرمایا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو پھر فرمایا اس میں ہر قسم کے میوے و پھل ہوں' دونوں کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟۔

جواب چونکہ کھجور کا درخت اور انگور کا درخت تمام درختوں میں زیادہ فضیلت رکھتے ہیں اور ان کے منافع بھی دوسرے درختوں کی بہ نسبت زیادہ ہیں اس لئے ان دونوں کو خاص طور پر ذکر کیا اور فرمایا کہ کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' اگرچہ اس باغ میں ان کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ بھی دوسری قسم کے پھل اور میوے موجود ہیں مگر کھجوروں اور انگوروں کے درخت کو تغلیباً اور تفضیلاً ذکر فرما دیا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ ذی شان سے "لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" (وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے) بظاہر یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ لپٹ کر لوگوں سے تو نہیں مانگتے تھے البتہ رفق اور نرمی سے مانگتے ہوں گے تو پھر ان کے حق میں یہ کیسے فرمایا: "يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ" (ناواقف ان کو دولتمند خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے)؟

جواب یہاں سوال (مانگنا) اور الحاف (لپٹ کر مانگنا) دونوں کی نفی مقصود ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ مبارک ہے: "لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ" (وہ نہ ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی

جائے)

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰو" (جولوگ سود کھاتے ہیں) کیا وجہ ہے کہ یہاں سود پر وعید اور عذاب کو صرف سود کھانے کے ساتھ خاص کیا گیا ہے حالانکہ سودی لباس پہنے والا، سود کو ذخیرہ کرنے والا اور سودی مال کا ہبہ کرنے والا سب اس گناہ میں برابر ہیں؟

جواب چونکہ مالی انتفاع سے مقصود زیادہ تر اس کا کھانا ہی ہوتا ہے جس سے کوئی استغناء نہیں ہوسکتا اس لئے انتفاع کی اقسام کو کھانے سے تعبیر فرمایا، جیسے کہا جاتا ہے: "اكل فلان ماله كله" جب وہ اپنے مال کو کھانے کے مصالح میں صرف کرے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ سود کھانے والے کے لئے وعید کو خاص کیا گیا ہے، حالانکہ سود کھانے والا اور کھلانے والا دونوں گنہگار ہیں؟

جواب اس لئے کہ سود کھانے والا کا ربا سے انتفاع سود کھلانے والے کے انتفاع سے زیادہ ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی کا کیا مطلب ہے: "اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰو" (بیع بھی تو مثل سود کے ہے) یہاں کلام تو ربا کے بارے میں ہے، اور ان مشرکین کا مقصود تو ربا کو بیع کے ساتھ تشبیہ دینا ہے، اس لحاظ سے ہونا یوں چاہئے "انما الربا مثل البيع" یعنی جیسے بیع حلال ہے اسی طرح ربا بھی حلال ہے؟

جواب یہ تشبیہ اور تمثیل بطورِ مبالغہ کے ہے۔ کیونکہ مشرکین کے اعتقاد میں ربا حلال تھا اور وہ ربا کو حلت میں اصل اور بیع کو فرع قرار دیتے تھے۔ جیسے کہا جاتا ہے: القمر كوجه زيد یعنی چاند زید کے چہرہ کی مانند ہے" "والبحر ككفه"۔ اور دریا اس کی ہتھیلی کی طرح ہے، یہ اس وقت کہتے ہیں جب کسی چیز کو مبالغہ کے طور پر بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

سوال ارشادِ باری ہے: "وَمَنْ عَادَ فَأُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" (اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے) اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سود کھانے والے لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، پھر آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب مخلدا فی النار (ہمیشہ دوزخ میں) نہ ہوگا؟

جواب اول "خلود" کا لفظ طولِ بقاء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اگر چہ وہ طولِ بقاء تابید کی صفت کے ساتھ نہ ہو۔ جیسے جب امیر کسی کو طویل مدت تک محبوس رکھے تو کہتے ہیں: "خلد الأمير فلانا في الحبس۔

جواب ثانی "فَأُولٰٓئِكَ" سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آیتِ تحریم کے نازل ہونے کے بعد بھی جو شخص

کہے: "اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰو" یعنی بیع سود کے مثل ہے اور ربا کو حلال سمجھے تو وہ کافر ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ کافر مخلّد فی النار ہوگا۔

سوال تنگ دست کو مہلت دینا فرض ہے جس کا ثبوت نص سے ہے اور اس پر صدقہ وخیرات کرنا تطوع (نفل) ہے لہٰذا یہ کیسے فرمایا "وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ" (اور یہ کہ خیرات کرو تو بہتر ہے تمہارے لئے)؟

جواب ہر وہ تطوع جس میں وصفِ زیادت کے ساتھ اصل فرض بھی حاصل ہو وہ فرض سے افضل ہے جیسے حرام سے اجتناب فرض ہے اور حلال سے بے رغبتی تطوع ہے' اسی طرح یہاں پر بھی ہے۔

سوال "اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ" (جب تم معاملہ کرو ادھار کا) یہاں "بِدَيْنٍ" کے لفظ کا کیا فائدہ ہے' حالانکہ "تَدَايَنْتُمْ" کے لفظ کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی؟

جواب اوّل اس کا فائدہ یہ ہے کہ "فَاكْتُبُوْهُ" کی ضمیر (ہُ) اس "بِدَيْنٍ" کی طرف راجع ہو جائے۔ اس لئے کہ اگر "بِدَيْنٍ" کا لفظ ذکر نہ فرماتے تو یوں کہنا پڑتا: "فاکتبوا الدین" جب کہ پہلی صورت نظم کے لحاظ سے احسن ہے۔

جواب ثانی اصل میں "تَدَايَن" کا لفظ مشترک ہے' ادھار' بیع اور جزا سب اس کے معانی آتے ہیں۔ "دَيْن" دال کے فتح کے ساتھ بمعنی قرض اور دال کے کسرہ کے ساتھ بمعنی جزا ہے' اس لئے "بِدَيْنٍ" کا لفظ لائے تاکہ امتیاز ہو جائے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" یعنی جزا کے دن کا مالک۔ چنانچہ "بِدَيْنٍ" سے مرادی معنی متعین ہو گیا۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ" (اگر تم کہیں سفر میں ہو) رہن کیلئے سفر کی شرط کیسے لگائی' جبکہ رہن کا جواز سفر کے ساتھ خاص نہیں ہے؟

جواب سفر کا ذکر تخصیصِ حکم کے لئے نہیں ہے' بلکہ سفر کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ سفر میں چونکہ قابلِ اعتماد قسم کے کاتب اور شاہد کا دستیاب ہونا یقینی نہیں ہوتا اس لئے علی سبیل الارشاد مسافروں کے مال کی حفاظت کے لئے رہن رکھنے کا امر فرمایا گیا۔

سوال "فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ" (پس اس کا قلب گنہگار ہوگا) میں قلب کو ذکر کرنے میں کیا نکتہ ہے' حالانکہ صرف قلب ہی نہیں بلکہ پورا جملہ گناہ کے ساتھ موصوف ہے؟

جواب کتمانِ شہادت کہتے ہیں گواہی کو ضمیر میں رکھنا (چھپانا) اور اسے زبان پر نہ لانا' اب چونکہ یہ ایسا گناہ ہے جو قلب کے ساتھ مقترن ہے اور قلب سے متعلق ہے اس لئے گناہ کی نسبت

قلب کی طرف کردی گئی۔ کیونکہ جس عضو کا عمل میں اصل تعلق ہو اس کی طرف کسی فعل کی اسناد زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: "هذا ما ابصرته عيني وسمعته اذني و وعاه قلبي"

سوال "وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ" (اور جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم ظاہر کرو گے یا پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے)۔ اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں جو خیالات آتے ہیں اس پر بھی اس کا مؤاخذہ اور محاسبہ ہوگا۔ حالانکہ جب تک انسان اپنے عمل کے ذریعہ اس کا ارتکاب نہ کرلے گنہگار نہیں ہوتا یا تو اس وجہ سے کہ وساوس سے بچنا اس کی وسعت و طاقت سے باہر ہے یا اس حدیثِ مشہور کی وجہ سے جو اس بارے میں وارد ہے۔؟

جوابِ اول بعض علماء کہتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ سے عموم ہی مراد ہے، مگر پھر یہ حکم اس فرمانِ باری سے منسوخ ہوگیا: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو)۔

جوابِ ثانی بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ منسوخ نہیں ہوا، اس لئے کہ یہ چیز ہے نہ کہ امرونہی۔ البتہ عموم مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ چیز ہے جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن ہو اور وہ ہے اعتقادِ جازم اور عزمِ قاطع، محض حدیث النفس اور وسوسہ مراد نہیں ہے، (کیونکہ اس سے بچنا ناممکن ہے)، پھر یہ بات بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محاسبہ کا ذکر فرمایا ہے، معاقبہ کا ذکر نہیں فرمایا، تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنا علمی احاطہ بتانے کے لئے بندوں کو ان کی وہ تمام باتیں جو انہوں نے ظاہر کی تھیں یا پوشیدہ رکھی تھیں بتلادیں گے، پھر جس کی چاہیں گے فضل فرماتے ہوئے مغفرت فرمائیں گے۔ اور جس کو چاہیں گے عدل کرتے ہوئے عذاب دیں گے۔ جیسا کہ اگلی آیاتِ مبارکہ میں اس کی خبر دی گئی ہے۔

سوال فرمانِ باری تعالیٰ: "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" (ایمان رکھتے ہیں رسولؐ) رسولِ پاک ﷺ کی مدح ایمان کے ساتھ بیان فرمائی گئی، حالانکہ آپؐ تو رسالت کے مقام و مرتبہ پر فائز ہیں، اس رسالت کا درجہ ایمان کے مرتبہ سے اعلیٰ ہے، اس ارشادِ عالی "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" میں کیا فائدہ اور نکتہ ہے؟

جواب مقصد مومنین کو یہ بتانا ہے کہ ایمان کا شرف و رتبہ بہت زیادہ ہے، یعنی ایمان کا مقام بہت اعلیٰ ہے، اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خواص اور انبیاء و رسل کی مدح ایمان کے وصف کے ساتھ فرمائی ہے۔ جیسے سورۃ الصّٰفّٰت میں ہر نبی کا تذکرہ فرمانے کے بعد آخر میں فرمایا گیا: "اِنَّهٗ

مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ'' (بے شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے)۔

سوال ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کو یوں پڑھا: ''وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ'' (اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتاب کے ساتھ) یعنی ''کتاب'' مفرد پڑھا۔ جمع کے ساتھ ''کُتُب'' نہیں پڑھا' اور پھر جب اس کی وجہ ان سے پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: کتاب' کتب سے اکثر ہے' اس کی کیا وجہ ہے۔؟

جواب ان کی مراد کتاب سے جنسِ کتاب تھی' اور کتب جمع ہے' اور جنس' جمع سے اکثر ہوتی ہے' کیونکہ وہ حقیقت میں کل کے معنی میں ہوتی ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جمع مضاف اور مفرد مضاف میں کلام عرفاً اور شرعاً استغراق کے لئے ہوتا ہے' جیسے کسی کا اپنے غلام کے لئے کہنا: ''اکرم أصدقائي' وأهن أعدائي'' یا یہ کہنا: ''زوجاتي طوالق یا عبیدی أحرار۔''۔ بخلاف اس قول کے: ''صدیقي وعدوی وعبدی وامرأتي'' اس سے معلوم ہوا کہ جمع مضاف' مفرد مضاف سے اکثر ہوتا ہے۔

سوال ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهٖ'' (ہم اس کے سب پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے)۔ یہاں پر ''بَيْنَ'' کا لفظ ''اَحَدٌ'' کی جانب مضاف کر کے استعمال کیا گیا' حالانکہ ''بَيْنَ'' کا لفظ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کی طرف ہی مضاف ہوتا ہے' پھر یہاں کیسے فرمایا گیا: ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهٖ''۔

جواب اول یہاں احد جمع کے معنی میں یعنی اَحاد جیسے فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ' میں ''اَحَد'' بمعنی جمع ہے' جس کی دلیل لفظ ''حَاجِزِيْنَ'' ہے' گویا یوں فرمایا: ''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَادٍ مِنْ رُسُلِهٖ''۔ جیسے کہتے ہیں: ''المال بين اَحاد النّاس''۔

جواب ثانی لفظ ''اَحَد' مفرد مذکر' مفرد مؤنث' تثنیہ مذکر و تثنیہ مؤنث اور جمع مذکر اور جمع مؤنث سب کی صلاحیت رکھتا ہے' خواہ کلام منفی ہو یا مثبت۔

جیسے: ''ما رأیت أحدا الا بني فلان یا الابنات فلان'' یہ دونوں برابر ہیں۔

نیز جیسے: ''ان جاء ك احد بكتابي فاعطه وديعتي'' اب اس میں سارے برابر ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آیتِ ہذا کا معنی یہ ہے کہ ہم پیغمبروں میں تفریق نہیں کرتے خواہ وہ دو ہوں یا جماعت ہو اور ''لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ'' کے فرمان میں بھی ''اَحَد'' کا اسی سے تعلق ہے۔

سوال ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ'' (اس کو ثواب بھی اسی کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے) اس فرمان میں اس بات پر کیا دلیل ہے

کہ اوّل: "لَهَا مَا كَسَبَتْ" کا تعلق خیر سے ہے اور ثانی "عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" کا شر سے ہے؟

جواب اوّل بعض کہتے ہیں کہ "مَنْ كَسَبَتْ" وَاكْتَسَبَتْ" کے معنی میں ہے اوّل خیر کے لئے اور ثانی شر کے لئے ہے۔ مگر غور کیا جائے تو یہ اس کے لئے دلیل نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں بھی "کسب" کا لفظ اس کے خلاف استعمال ہوا ہے: "وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً اَوْ اِثْمًا" نیز ارشاد ہے: "كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ" نیز فرمایا: "اَوْيُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا" نیز فرمایا: "وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً" یہاں اکتساب اور اقتراف کا ایک ہی معنی ہے (اس لئے یہ جواب ناقص ہے)۔

جواب ثانی یہاں پر خیر اور شر پر دلیل لام اور علیٰ کا کلمہ ہے' مگر دیکھا جائے تو یہ بھی دلیل نہیں ہے کیوں کہ ان آیاتِ قرآنیہ میں لام اور علیٰ کا لفظ اس کے خلاف استعمال ہوا ہے: "اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ" نیز "اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا" نیز فرمایا: "اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ"۔

جواب ثالث لام اور علیٰ کا کلمہ اطلاق کی صورت میں معنی خیر و شر کا مقتضی ہوتا ہے اور لام کا کلمہ خیر کے لئے اور علیٰ کا کلمہ شر کے لئے اس وقت استعمال ہوتا ہے جب وہ دونوں متقارب ہوں جیسے اس آیتِ مذکورہ میں متقارب ہیں "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" اس کی دلیل یہ فرمانِ باری ہے "وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا"۔ یہاں اس کو مطلق رکھا اور اس سے مراد شر ہے اور مابعد جملہ اس کی دلیل ہے۔ جیسے کہتے ہیں: "الدهر يومان' يوم لك ويوم عليك" یعنی زمانہ دو دن کا ہے' ایک دن تیرے حق میں اور ایک دن تیرے خلاف میں' نیز جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں: "فلان يشهد لك وفلان يشهد عليك" یعنی فلاں شخص تیرے حق میں اور فلاں تیرے خلاف گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی اپنے صاحب سے کہتا ہے: "هذا الكلام حجة عليك لا لك۔" یعنی یہ کلام تیرے خلاف حجت ہے نہ کہ تیرے حق میں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

عَلٰى اَنَّنِيْ رَاضٍ بِاَنْ اَحْمَلَ الْهَوٰى ☆ وَاَخْلُصَ مِنْهُ لَا عَلَيَّ وَلَا لِيَا

یعنی میں اس شرط پر عشق برداشت کرنے یا اس سے چھٹکارا پانے پر راضی ہوں کہ نہ وہ میرے لئے سودمند ہو اور نہ میرے نقصان دہ۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: "مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا" اگرچہ مقید ہے لیکن یہاں لام اور علیٰ کی وجہ سے اس پر دلالت موجود ہے اس لئے کہ یہاں قید ظرفیت کو شامل ہے۔

سورۃ آل عمران

سوال قرآنِ مجید کے بارے میں فرمایا: "نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ" (اتاری اوپر تیرے کتاب حق کے ساتھ) اور تورات وانجیل کے بارے میں یوں فرمایا: "وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ" (اور تورات وانجیل اتاری) یعنی قرآن کے متعلق لفظ "نَزَّلَ" اور تورات وانجیل کے لئے "اَنْزَلَ" کا لفظ ذکر کیا' اس کی کیا وجہ ہے؟۔

جواب اول امام زمخشریؒ وغیرہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا اور تورات وانجیل ایک ہی دفعہ نازل ہوئیں' اس لئے قرآن کے لئے "نَزَّلَ" کا لفظ اور دوسری کتابوں کے لئے "اَنْزَلَ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جو فرمانِ باری آتا ہے: "وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ" اس سے اس جواب پر اعتراض ہوتا ہے تو اس کے جواب میں امام زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے جنسِ کتب سماویہ مراد ہے' مذکورہ کتب ثلاثہ خصوصی طور پر مراد نہیں ہیں' یا اس کتاب سے زبور مراد ہے یا اس سے مراد قرآن ہے' اور پھر اس کا مکرّر ذکر تعظیم کے لئے ہے' مگر اس کے بعد والی آیت سے اس پر اعتراض ہوسکتا ہے یعنی "هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ" نیز ان آیاتِ کریمہ سے بھی اعتراض ہوسکتا ہے' فرمایا: "وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" نیز ارشادِ باری ہے: "وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً"

جواب ثانی "نَزَّلَ" میں تضعیف اور "اَنْزَلَ" میں ہمزہ دونوں تعدیہ کے لئے ہیں' اس لئے کہ نزل فعل لازم بنفسہ ہے' اور جب یہ دونوں تعدیہ کے لئے ہوں تو کسی اور معنی کے لئے نہیں ہوں گے جیسے تکثیر وغیرہ' کیونکہ اس کی کوئی نظیر نہیں ہے' دونوں کولائے ہیں' معنی ایک ہی ہے یعنی تعدیہ۔ جیسا کہ اہلِ عرب کی عادت ہے کہ وہ کلام کو مختلف طریقوں سے لایا کرتے ہیں۔ اس جواب کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی سے ہوتی ہے' ارشاد ہے: "لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" اور ایک اور جگہ ارشاد ہے: "لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ"

سوال یہاں "مِنْ" تبعیضیہ کے ساتھ فرمایا: "مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمٰتٌ" (اس کی بعض آیتیں محکم ہیں) اور دوسری جگہ فرمایا: "كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ" (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں محکم ہے) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات محکم ہیں۔؟

جواب اول یہاں "مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ" میں "مُحْكَمٰتٌ" سے مراد "نَاسِخَاتٌ" (منسوخ

کرنے والی) ہے اور ''مُتَشَابِهٰتٌ'' سے مراد ''مَنْسُوخَاتٌ'' (منسوخ شدہ آیتیں) ہے۔

''مُحْكَمٰتٌ'' سے مراد عقلیات ہے اور ''مُتَشَابِهَاتٌ'' سے مراد شرعیات ہے۔

جواب ثالث ''مُحْكَمٰتٌ'' سے مراد ہے جن آیتوں کا معنی واضح ہو اور ''مُتَشَابِهٰتٌ'' سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کا معنی غیر واضح اور دقیق ہو اور ''كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ'' سے مراد یہ ہے کہ سارا قرآن پاک صحیح اور ثابت (مضبوط) ہے اور ہر طرح کے خلل اور زلل سے مصون و محفوظ ہے۔ لہٰذا ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔

سوال یہاں ارشاد فرمایا: ''وَاُخَرُ مُتَشَابِهٰتٌ'' (اور بعض آیتیں مشتبہ المراد ہیں) اور دوسری جگہ میں فرمایا: ''كِتَابًا مُّتَشَابِهًا'' (متشابہ کتاب) پہلی آیت میں کتاب کے بعض حصہ کو متشابہ قرار دیا اور دوسری آیت میں سارے قرآن کو متشابہ فرمایا جا رہا ہے' وجہ تطبیق کیا ہوگی؟۔

جواب دونوں آیتوں میں کوئی منافات نہیں ہے' اس لئے کہ ''وَاُخَرُ مُتَشَابِهٰتٌ'' سے مراد وہی ہے جس کا ابھی اوپر ذکر گزرا' اور ''كِتَابًا مُّتَشَابِهًا'' سے مراد یہ کہ کتاب حکیم کا بعض حصہ صحت اور عدمِ تناقض میں اس کے بعض حصّہ کے مشابہ ہے اور ایک حصہ اس کے دوسرے حصہ کی تائید کرتا ہے۔

سوال پھر ''مُتَشَابِهٰتٌ'' (غیر واضح المراد آیتیں) کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ حالانکہ نزولِ قرآن سے مقصود بیان و ہدایت ہے' معانی کا غیر واضح ہونا اس مقصود کے منافی ہے یا اس کو بعید کر دیتا ہے؟

جواب اصل میں کلامِ عرب دو طرح کا ہوتا ہے کلام کی ایک قسم ایسی ہے جس کا معنی جلدی سمجھ میں آ جاتا ہے اور وہ ظاہری معنی کے علاوہ کسی اور کا محتمل بھی نہیں ہوتا اور دوسری قسم وہ ہے جو کنایہ' مجاز' تلویح اور اشارہ پر مشتمل ہوتی ہے' اور اس کے معانی متعارض اور متزاحم ہوتے ہیں۔ کلامِ عرب میں یہ قسمِ ثانی زیادہ مستحسن اور مستبدع (عمدہ) شمار ہوتی ہے' قرآنِ حکیم بھی معنی اعجاز کے ثبوت کے لئے ان دونوں قسموں میں نازل ہوا' گویا یوں فرمایا گیا کہ آؤ اس قرآن کا معارضہ کرو جس نوع سے بھی معارضہ کرنا چاہو معارضہ کرو کیونکہ یہ دونوں انواع کو جامع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو محکم اور متشابہ دونوں طرح نازل کیا تاکہ دیکھا جائے اور آزمایا جائے کہ کون سارے قرآن پر ایمان لاتا ہے اور مشتبہ المراد آیتوں کو سپردِ علمِ خداوندی کرتا ہے کہ پھر وہ ذات اس کو اس پر اجر و ثواب عطا کرے اور کون اس میں ریب و شک کر کے منافقت کا کردار ادا کرتا ہے کہ پھر اس کو سزا دی جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی نہرِ طالوت وغیرہ کے ذریعہ آزمائش کی تھی۔

جواب ثانی متشابہات کے نزول سے مقصد یہ ہے کہ علماء بحث واستدلال اور نظر واجتہاد کر کے اس متشابہ کو محکم کی طرف لوٹائیں تاکہ اس عبادت پر انہیں جزا دی جائے اور اجر وثواب سے نوازا جائے۔ اگر سارا قرآن ظاہر المراد اور واضح المعانی ہوتا تو پھر اس میں عالم اور جاہل سارے برابر ہو جاتے۔ اور بحث واستنباط نہ ہونے کی وجہ سے افکار معدوم ہو جائیں' کیونکہ نظر وفکر سے ہی مشکل امور حل ہوتے ہیں۔ اسی لئے کسی حکیم ودانا شخص کا قول ہے: مالداری کا عیب یہ ہے کہ وہ کند ذہنی کو پیدا کرتی ہے اور فکر کو معدوم کرتی ہے اور ناداری کی خوبی یہ ہے کہ وہ ذہن وفکر کو استعمال میں لانے اور کسب ومعاش میں تدبیروں کے اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک کا کیا مطلب ہے: ''وَاُخْرٰی كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ '' (اور یہ کافر اپنے کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصہ (زیادہ) ہیں کھلی آنکھوں دیکھنا) اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کافر گروہ مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھتے تھے یا اختلاف قولین کی بناء پر مسلمان ان کافروں کو اپنے سے دگنا دیکھتا تھے' بہرکیف! یہ آیتِ مبارکہ سورۃ الانفال کی اس آیت کے منافی ہے: ''وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ '' (اور جس وقت اللہ تعالیٰ تم کو جبکہ تم مقابل ہوئے وہ لوگ تمہاری نظر میں کم کر کے دکھا رہے تھے اور ان کی نگاہ میں تم کو کم کر کے دکھلا رہے تھے) اس لئے کہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو کم خیال کرنے میں مساوی تھے' یعنی ہر گروہ دوسرے کو کم ہی دیکھتا تھا؟

جواب اول اصل میں تقلیل اور تکثیر (کم اور زیادہ دیکھنا) کا تعلق دو مختلف حالتوں سے ہے' اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نظر میں مشرکین کی تعداد کو کم کر کے دکھایا اور اسی طرح مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں کی تعداد کو قلیل کر کے دکھایا حتیٰ کہ جب دونوں گروہ لڑائی پر جری ہوئے اور دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو پھر اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ کر کے دکھلائی حتیٰ کہ وہ بزدل اور پست ہمت ہونے لگے اور مغلوب ہوئے اور مسلمانوں کی آنکھوں میں مشرکین کی تعداد کو بھی زیادہ یا اپنے برابر کر کے دکھایا۔ مشرکین فی الحقیقت مسلمانوں سے زیادہ تھے' اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی سچائی معلوم ہو جائے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ '' الآیۃ (سو اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہونگے تو دو سو پر غالب آ جائیں گے)' چنانچہ مسلمان اس غزوہ بدر میں مشرکین پر غالب آئے حالانکہ مشرکین کی تعداد مسلمانوں سے کئی

گنا تھی۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کی تعداد مسلمانوں کی تعداد کے برابر کر کے دکھائی' حالانکہ مشرکین ان سے تین گنا زیادہ تھے' لیکن اللہ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں ان کو قلیل تعداد میں دکھایا اور مشرکین کو مسلمانوں کی تعداد اتنی دکھائی جتنی تعداد پر غالب آنے کا وعدہ پہلے فرمایا تھا کہ اگر تم میں سے سو آدمی بھی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو ان کے دوسو آدمیوں پر غالب آئیں گے۔

سوال "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لا وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" (گواہی دی اللہ نے اس کی کہ بجز اس ذات کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں) اور فرشتوں نے بھی اور اہلِ علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اس آیت میں "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" کو مکرر کیوں ذکر کیا گیا' اس میں کیا فائدہ ہے؟

جواب اول پہلا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" اللہ عزّ وجل کا قول ہے اور دوسرا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" فرشتوں اور اہلِ علم کے قول کو بیان کیا گیا ہے۔

جواب ثانی حضرت جعفر الصادقؒ فرماتے ہیں کہ پہلے کلمہ وصف ہے اور دوسرا تعلیم کے لئے ہے یعنی تم بھی اسی طرح کہو اور گواہی دو جیسے انہوں نے گواہی دی ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ مبارک میں: "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ" (اے محمدؐ) کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا اور اُسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے اُن کو بلایا بھی جاتا ہے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رخی کرتے ہیں)' وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ" (اور وہ بے رخی کرتے ہیں) کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ حالانکہ تولّی اور اعراض کا ایک ہی معنی ہے جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے' آخر ان دونوں لفظوں کو لانے کی کیا وجہ ہے؟

جواب اول "يَتَوَلّٰى" کا معنی ہے دعوت دینے والے سے انحراف کرتے ہیں اور "مُّعْرِضُوْنَ" کا معنی ہے کہ وہ داعی جس چیز کی طرف ان کو دعوت دیتا ہے وہ اس سے بے رخی کرتے ہیں۔ یعنی کتاب اللہ سے۔

جواب ثانی "يَتَوَلّٰى" کا مطلب ہے کہ ان کے ابدان ان سے انحراف کرتے ہیں اور "مُّعْرِضُوْنَ"

' کا معنی ہے کہ ان کے قلوب حق بات سے اعراض کرتے ہیں۔

جواب ثالث ''یَتَوَلّٰی '' سے مراد ان کے علماء کا انحراف (عن الحق) ہے اور ''مُعْرِضُوْنَ '' سے ان کے متبعین کا اعراض مراد ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی میں'' بِیَدِكَ الْخَیْرُ'' (آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی) خیر کی تخصیص کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ خیر و شر اور نفع و نقصان سب اللہ تعالیٰ کے اختیار اور قبضہ میں ہیں؟

جواب اوّل یہ کلام اصل میں مشرکین کی تردید میں لایا گیا ہے کیونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کے منکر تھے جو اس نے بزبانِ جبریلؑ اپنے نبی علیہ السلام سے روم و فارس کی فتح کے بارے میں کیا تھا' اللہ تعالیٰ نے اس فتح کا وعدہ آپؐ کے صحابہؓ سے بھی کیا تھا۔ چونکہ اصل کلام خیر سے متعلق تھا اس لئے حال کے اعتبار سے خیر کی تخصیص کی گئی۔

جواب ثانی یہاں مراد تو خیر اور شر دونوں ہیں مگر ایک چیز کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا کیونکہ وہ دوسرے امر پر دال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ'' خیر کے ذکر کی وجہ یہی ہے کہ انسان اسی میں رغبت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندوں کا مطلوب بھی یہی ہے۔

سوال ارشادِ باری ہے:'' تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ '' (آپ رات کو دن میں داخل کر دیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں) یہاں کیسے فرمایا کہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے۔ کسی شے کا کسی شے میں ''ایلاج '' (داخل کرنا) اجتماع حقیقت کا مقتضی ہے جیسے دھاگہ کا سوئی میں ڈالنا اور انگوٹھی کا انگلی میں داخل کرنا' یعنی اس سے تو دن اور رات کی حقیقت کا متحد ہونا لازم آتا ہے' حالانکہ دن اور رات کی حقیقت مختلف ہے؟

جواب اوّل ''ایلاج '' کا ایک معنی تو وہی ہے جو مذکور ہوا' لیکن کبھی ''ایلاج '' کا معنی ہوتا ہے کہ ایک چیز کی صفت کا اس طرح تبدیل ہونا کہ دوسری چیز کی صفت کا اس پر غلبہ ہو اور اصل ذات باقی رہے' جیسے کثیر دودھ میں تھوڑی سی روٹی کا ڈالنا' یا تھوڑے سے دودھ میں کثیر روٹی ڈالنا۔ کیونکہ دونوں کی حقیقت ذات کے اعتبار سے ایک ہے لیکن ایک کی صفت دوسرے پر غالب ہے۔

لیل و نہار بھی اسی طرح ہیں' جب رات معتدل زمانہ کی نسبت سے چودہ گھنٹہ کی ہو تو دن کی بہ نسبت اس میں دو گھنٹے یقیناً غالب ہونگے' اسی طرح برعکس صورت میں ہے۔

جواب ثانی مطلب یہ ہے کہ رات کے زمانہ کو دن کے زمانہ میں داخل کر دیتا ہے اور دن کے زمانہ کو رات کے زمانہ میں داخل کر دیتا ہے۔

جوابِ ثالث رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا اس اعتبار سے ہے کہ ایک قوم کی رات (وہی) دوسروں کے لئے دن ہے اور ایک قوم کا دن دوسروں کے لئے رات ہے۔

سوال '' وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى '' کا کیا معنی ہے؟ یہ بات تو واضح ہے کہ مذکر مؤنث کی طرح نہیں ہے؟

جواب اس جملہ کا مقصد امراَۃ عمران کا اپنی بات پر اعتذار ہے' اس لئے کہ انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ ان کے شکم میں لڑکا ہے اسی لئے انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ اس کو بیت المقدس کا خادم بنائے گی' ان کی شریعت میں صرف مذکر کے لئے اس طرح کی نذر ماننا درست تھا۔ لیکن جب ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی نذر قبول نہیں ہوئی اس لئے اعتذار کرتے ہوئے کہا: '' وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى '' (اور لڑکا لڑکی کے برابر نہیں)۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی تو لڑکے کی طرح مسجد کی خدمت وغیرہ کرنے کی صلاحیت و قابلیت نہیں رکھتی' اس سے ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ لڑکی صورت یا طاقت وغیرہ میں لڑکے کی طرح نہیں ہے (کیونکہ یہ بات تو سب جانتے ہیں)۔

چنانچہ جب امراَۃِ عمران نے مریم کو نذر کی قبولیت میں خاص کرنے پر تعجب کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: '' فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ '' (پس ان کو ان کے رب نے بوجہ احسن قبول فرمالیا)۔

سوال کلامِ عرب میں جب ایک چیز کو دوسرے کے مثل قرار دیتے ہیں تو حرفِ نفی کو امرِ قاصر پر اور حرفِ تشبیہ کو امرِ کامل پر داخل کرتے ہیں۔ یہ ان کا تمثیل میں طریقۂ استعمال ہے' لہٰذا اس بناء پر یوں کہنا چاہیے؟ '' وَلَيْسَ الْأُنْثَى كَالذَّكَرِ ''؟

جوابِ اول جیسے اثبات کی صورت میں تشبیہ کے اندر اصل کو فرع اور فرع کو اصل قرار دینے میں مبالغہ فی المشابہت ثابت ہوتا ہے جیسے القمر کوجه زيدٍ البحر ككفه' اسی طرح نفی کی صورت میں اصل کو فرع اور فرع کو اصل قرار دینے میں مبالغہ فی المشابہت کی نفی ثابت ہوتی ہے نہ کہ مشابہت کی نفی میں مبالغہ ثابت ہوتا ہے' اور یہی یہاں مقصود ہے۔ اس لئے کہ یہاں مذکر اور مؤنث کے مابین مشابہت' عمومی اور اغلبی اوصاف میں واقع ہے۔

حضرت اُمِّ مریمؑ کی مراد ان دونوں کے درمیان نذر کے صحیح ہونے اور بیت المقدس کے خادم بننے میں مشابہت کی نفی تھی' اسی لئے انہوں نے دوسرے کا عکس کیا' یعنی مذکر مؤنث کی طرح نہیں ہے۔

جواب ثانی یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے' معنی یہ ہوگا کہ وہ لڑکا جس کی حضرت امِ مریم نے خواہش کی تھی کہ وہ بیت المقدس کا خادم بنے اس لڑکی کے برابر نہیں ہے جو ان کو اس لئے عطا فرمائی کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ (لڑکی) اور اس کا بیٹا سارے جہان والوں کے لئے ایک نشانی بنیں گے' اور یہ قول: اس مجمل آیت کی تفسیر ہے: "وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ " (حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں اس کو جو انہوں نے جنی) یعنی وہ اس کے شرف کی مقدار کو نہیں جانتیں' اور "الذکر" اور "الانثی" میں لام عہدی ہے۔

یہ ساری بات امام زمخشریؒ نے بیان کی ہے' مکمل بحث "کشاف" میں ہے۔

فقیہ ابواللیثؒ فرماتے ہیں: بعض کہتے ہیں کہ "وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى " اللہ تعالیٰ کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرمانا ہے کہ اے محمدؐ! لڑکا لڑکی کے مانند نہیں ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ امِ مریم کا کلام ہے؟

سوال فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ " (پس پکار کے کہا ان سے فرشتوں نے اور وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں)۔ فرشتوں نے زکریا علیہ السلام کو نماز کی حالت میں ان کو کیسے پکارا اور پھر انہوں نے نماز کی حالت ہی میں ان فرشتوں کو کیسے جواب دیا' یہ تو درست نہیں ہے؟۔

جواب " يُصَلِّيْ " سے مراد ہے " يَدْعُوْا " (دعا کر رہے تھے) جیسے ایک مقام پر صلوۃ سے دعا مراد لی گئی ہے' فرمایا: " وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا " (اور اپنی نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھیے اور نہ بالکل چپکے چپکے ہی پڑھیے) یہاں صلوٰۃ سے مراد دعا ہے۔

سوال " اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ " (تحقیق اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحییٰؑ کی کہ وہ کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہونگے) اس آیت میں یحییٰ علیہ السلام کی تخصیص کی کیا وجہ ہے' ہر مومن اللہ تعالیٰ کے تمام کلمات کی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے؟

جواب مطلب یہ ہے کہ وہ (یحییٰؑ) عیسیٰؑ کی تصدیق کرنے والے ہونگے جن کا وجود اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کُنْ" سے وابستہ ہوگا یعنی جن کا وجود باپ کے واسطہ کے بغیر کلمۂ کُنْ کے ذریعہ ہوگا' ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی وجود یا رتبہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنا بڑھ کر ہے۔

سوال حضرت زکریا علیہ السلام نے پروردگارِ عالم سے " هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً " (عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد) اولاد کی درخواست کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بزبانِ ملائکہ یحییٰ علیہ السلام کی بشارت بھی دے دی اس کے باوجود انہوں نے اولاد عطا

کرنے پر قدرتِ خداوندی کا انکار کرتے ہوئے یہ کیسے کہا: ''رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ'' (میرے پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آ پہنچا اور میری بی بی بھی بانجھ ہے)؟

جواب اول زکریا علیہ السلام نے یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت سے تعجب اور استفہام کے طور پر فرمائی' انکار اور استبعاد کے طور پر نہیں فرمائی۔

جواب ثانی زکریا علیہ السلام کو اشتباہ ہوا تھا کہ میرے بوڑھے ہونے اور بیوی کے بھی بانجھ ہونے کے باوجود اولاد کیسے عطا ہوگی۔ انکار کے طور پر بالکل نہیں فرمایا۔

جواب ثالث ان کی مُراد یہ تھی کہ یہ حالتیں (میرے بڑھاپے کو پہنچنے اور بیوی کے بانجھ ہونے) ان دونوں سے کیسے زائل ہوں گی؟ لیکن اس جواب پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ آیت کا دوسرا حصہ اس جواب کے مطابق اور مناسب نہیں ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں ''اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ'' (بلاشک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب فرمایا ہے اور پاک بنایا ہے اور تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے) ''اصطفاء'' (منتخب فرمانا) کا ذکر مکرر کیوں ہے؟۔

جواب اول پہلے ''اصطفاء'' سے مراد بیت المقدس کی خدمت کی عبادت اور مؤنث ہونے کے باوجود نذر کی قبولیت کے لئے ان کو مخصوص ومنتخب فرمانا ہے اور دوسرے ''اصطفاء'' سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے لئے انہیں منتخب فرمانا ہے۔

جواب ثانی ''اصطفاء'' کا دوبارہ ذکر اس فائدے کی خاطر ہے کہ مریم علیہا السلام کو جہاں بھر کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا گیا ہے نہ کہ مردوں کے مقابلہ میں' جیسا کہ ''عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ'' کا قول اس کی طرف مشیر ہے۔

سوال ''وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ'' (اور آپ ان لوگوں کے پاس اس وقت نہ تھے جب وہ اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے) اس فرمان کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کے اس زمانہ میں موجود نہ ہونے کا ذکر کیوں فرمایا؟ یہ بات تو سب جانتے تھے کہ حضور مریم علیہا السلام کے زمانہ میں نہیں تھے' حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ اس بات کی نفی کی جاتی کہ یہ انباءِ غیب' حضور ﷺ کسی اور سے سن کر نہیں بتادیتے بلکہ وحی الٰہی سے بتاتے ہیں' مشرکین کو اسی بات کا تو وہم تھا کہ یہ کسی یادرکھنے والے سے سن کر ہمیں بتادیتے ہیں' خدا کی طرف سے وحی نہیں ہے؟

جواب مشرکین' حضورِ اکرم ﷺ کے اُمّی ہونے کو قطعی طور پر جانتے تھے اور وہ وحی کے منکر تھے

اور اب حضور اور مشاہدہ کے سوا اور کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی' اور یہ صورت انتہائی محال اور ناممکن ہے' اس لئے آپ کے حضور اور مشاہد کی نفی ان منکرینِ وحی کا مذاق اڑانے کے طور پر کی گئی جبکہ وہ حضور کے امّی ہونے کو بھی جانتے تھے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ عالی ہے: "وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ" (اور آپ (طور کی) مغربی جانب میں موجود نہ تھے) نیز "وَمَا كُنتَ بِجَانِبِ الطُّورِ" (اور آپ طور کی جانب میں موجود نہ تھے)۔

سوال " اِسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ " (اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا) کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے' مریم علیہا السلام کے علم میں تھا کہ جس ولد کی انہیں خوشخبری دی گئی ہے وہ ان کا بیٹا ہی ہوگا؟۔

جواب اصل میں اولاد اپنے باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے نہ کہ ماں کی طرف' اس لئے " عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ " بتانے پر مریم علیہا السلام کو معلوم ہو گیا کہ یہ ولد بغیر باپ کے پیدا ہوگا اور اپنی ماں کی طرف ہی منسوب ہوگا۔

سوال " وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا " (اور آدمیوں سے کلام کرینگے گہوارہ میں اور بڑی عمر میں) عیسیٰ علیہ السلام کا ادھیڑ عمر میں لوگوں سے باتیں کرنا ان کی وجہ خصوصیت اور صورتِ معجزہ کیسے ہے؟

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ان دو حالتوں میں نبیوں والا کلام کریں گے اور ان کی حالتِ طفولیت اور حالتِ کہولیت میں کوئی تفاوت نہیں ہوگا جس میں عقل پختہ ہو جاتی ہے اور نبیوں کو نبوت عطا ہوتی ہے۔ گویا کہ یوں فرمایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام لوگوں سے بچپن میں ایسے ہی کلام کرینگے جیسے وہ لوگوں سے ادھیڑ عمر میں کلام کریں گے' امام زجاجؒ کہتے ہیں: اس سے علیہ السلام یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زمانۂ کہولت تک زندہ رہیں گے۔ لہٰذا یہ مریم علیہا السلام کے لئے عیسیٰ علیہ السلام کی طولِ عمر کی مزید بشارت ہے۔

جواب ثانی ان حالتوں کو ذکر کرنے سے مقصود ان کے اِلٰہ (خدا) ہونے کی نفی کرنا ہے' وہ اس طرح سے کہ اگر وہ خدا ہوتے تو ان پر حالات کا تغیر کبھی نہ آتا اور زمانہ کبھی ان پر اثر انداز نہ ہوسکتا۔ چنانچہ ان پر حالات (کبھی حالتِ طفولیت اور کبھی حالتِ کہولیت) کا تغیر ان کے خدا نہ ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

سوال "اِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ " (پس تم کو وفات دینے والا ہوں اور (فی الحال) میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں) یہ کیسے ارشاد فرمایا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھایا

ہے'ان کو وفات تو نہیں دی؟۔

جواب اول جب یہودیوں نے ان کو قتل کی دھمکی دی تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس بات کی بشارت دی کہ ان کی روح (طبعی) وفات کے ذریعہ قبض ہوگی نہ کہ قتل کے ذریعہ' عربی میں واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی۔لہٰذا اس آیت سے رفعِ آسمانی سے پہلے ہی وفات کا ہونا لازم نہیں آتا۔

جواب ثانی عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے' یعنی یوں تھا: '' اِنِّیْ رَافِعُكَ وَمُتَوَفِّيْكَ '' (میں تمہیں اٹھاؤں گا اور تمہیں وفات دوں گا)۔

جواب ثالث '' مُتَوَفِّيْكَ '' کا معنی ہے میں تمہیں تمہارے اعضاء اور جسم کے ساتھ زمین سے پورا پورا وصول کروں گا کہ یہ یہودی لوگ تجھے کبھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔اس لئے کہ ''توفی'' کا لفظ اہلِ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے ''توفيت حقي على فلان '' یعنی میں نے فلاں سے اپنا حق پورا پورا وصول کرلیا۔

جواب رابع ''مُتَوَفِّيْكَ '' کا معنی ہے' میں تمہیں تیرے نفس میں نوم کے ساتھ وفات دوں گا' جیسے اس فرمانِ الٰہی میں ''توفی'' کا ذکر ہے: ''اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا'' (اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت) اور '' رَافِعُكَ '' کا معنی ہے اور میں تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا جبکہ تو سورہا ہوگا۔تاکہ تمہیں کوئی خوف اور ڈر لاحق نہ ہو اور اس وقت بیدار ہوگا جب تو آسمان میں ہوگا۔

سوال یہ کیسے فرمایا ہے: '' اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ '' (بے شک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدمؑ کی مثال کی طرح ہے) عیسیٰ وآدم علیہما السلام میں مماثلت کیسے ہے؟ آدمؑ کی تخلیق مٹی سے اور عیسیٰؑ کی تخلیق پھونک سے ہوئی اور آدمؑ ماں باپ کے بغیر اور عیسیٰؑ صرف ماں سے پیدا کئے گئے؟

جواب اس سے مقصود صرف باپ کے واسطہ کے بغیر پیدا ہونے میں تشبیہ دینا ہے۔اور تشبیہ من جمیع الوجوہ مماثلت کا تقاضا نہیں کرتی بلکہ من بعض الوجوہ مماثلت کافی ہوتی ہے۔

سوال ''وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ '' (اور اہلِ کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ (اے مخاطب) اگر تم اس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھو گے تو وہ (مانگنے کے ساتھ ہی) اس کو تمہارے پاس

لا رکھے اور ان ہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کرے) اہلِ کتاب کی تخصیص کی وجہ کیا ہے کہ ان میں سے بعضے امین اور بعضے خائن ہیں، مسلمانوں اور دیگر اہلِ مذاہب میں بھی بعض امانتدار اور بعض خیانت گر ہوتے ہیں؟

جواب اول اہلِ کتاب کو واقعۂ حال کی بناء پر خاص طور سے ذکر فرمایا۔ اس لئے کہ آیتِ ہذا کے نزول کا سبب یہ ہے کہ عبداللہ بن سلامؓ کے پاس بارہ سو اوقیہ سونا امانت رکھا گیا تو انہوں نے مانگنے کے ساتھ ہی اس امانت کو ادا کر دیا اور فنحاص بن عازوراء کے پاس صرف ایک دینار امانۃً رکھا گیا تو اس نے اس میں خیانت کر دی۔

جواب ثانی اہلِ کتاب کا مسلمانوں سے خیانت کرنا استحلال (حلال سمجھنے) کے طور پر ہوتا تھا جس کی دلیل آیت کا دوسرا حصہ ہے: "قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ" (وہ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہلِ کتاب کے (مال کے) بارے میں کسی طرح کا الزام نہیں) جبکہ مسلمان کا دوسرے مسلمان سے خیانت کرنا اس کو حلال سمجھنے کے خیال سے نہیں ہوتا۔

سوال یہ کیسے فرمایا ہے: "وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا" (حالانکہ حق تعالیٰ کے سامنے سب سرافگندہ ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور بے اختیاری سے) سب تو اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار نہیں ہیں؟ اکثر انسان و جنات تو منکر ہیں؟

جواب اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے جیسے موت و حیات، صحت و مرض اور سعادت و شقاوت وغیرہ۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ" (بے شک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں ان کی توبہ ہرگز مقبول نہ ہوگی) حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ مرتد کا ارتداد خواہ کفر میں کتنا ہی بڑھ جائے اور وہ پھر توبہ کرلے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی؟

جواب اول ابن عباسؓ فرماتے ہیں: یہ آیتِ کریمہ ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مرتد ہوگئے تھے اور اپنا حال مخفی رکھنے کے لئے اور اپنے دلوں میں کفر کو چھپاتے ہوئے زبان سے توبہ کا اظہار کیا تھا۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے شرک کے سوا باقی تمام گناہوں سے توبہ کی تھی۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ موت آجانے کے وقت ان کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: "اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ" (یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے واسطے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے) حالانکہ آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر ابراہیم علیہ السلام کے دور تک بہت سے گھر خانہ کعبہ سے پہلے بنائے گئے ہیں؟

جواب اول اس آیت کا معنی یہ ہے کہ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے قبلہ کے طور پر اور مقام عبادت کے لحاظ سے بنایا گیا وہ خانہ کعبہ ہے۔

جواب ثانی مراد یہ ہے کہ سب سے پہلا مکان جو لوگوں کیلئے مبارک بنایا گیا وہ بیت اللہ ہے۔

جواب ثالث ابن عباسؓ فرماتے ہیں: سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کیا اس لئے کہ جب آدم علیہ السلام کا آسمان سے ہبوط (نزول) ہوا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم میرے لئے زمین میں ایک گھر بناؤ اور اس کے اردگرد ویسا عمل کرو جیسا تم نے فرشتوں کو میرے عرش کے اردگرد کرتے دیکھا ہے چنانچہ انہوں نے گھر بنایا اور اس کے اردگرد طواف کرنے لگے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے یوں کیوں فرمایا: "کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ" (تم بہترین امت تھے) ایسا کیوں نہیں فرمایا "اَنۡتُمۡ خَیۡرُ اُمَّۃٍ" یعنی تم بہترین امت ہو؟

جواب اول "کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ" کا مطلب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق میں بہترین امت تھے یا تم اس دن بہترین امت تھے جب اولادِ آدم سے عہد لیا گیا تھا۔ اور اس سے مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ خیریت ان کی صفتِ اصلی ہے نہ کہ صفتِ عارضی۔

جواب ثانی یہاں "کَانَ" تامہ ہے اور "خَیۡرَ اُمَّۃٍ" بنا بر حال کے منصوب ہے معنی یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو "کَانَ" کے متعلق مکمل بحث "اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّ مَقۡتًا" میں ذکر کی جائے گی (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

سوال اس ارشادِ الٰہی کا کیا معنی ہے: "وَلَوۡ اٰمَنَ اَھۡلُ الۡکِتٰبِ لَکَانَ خَیۡرًا لَّھُمۡ" (اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا) کسی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اس سے زیادہ بہتر ہے اسی وقت درست ہوتا ہے جبکہ ان دونوں چیزوں میں خیر (بہتری) ہو۔ حالانکہ ایمان میں تو خیر ہے مگر غیرِ ایمان میں تو کوئی خیر نہیں ورنہ یہ لازم آئے گا کہ غیرِ ایمان میں بھی خیر ہے لیکن ایمان میں زیادہ خیر ہے؟

جواب اس آیتِ مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ اہلِ کتاب کا موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان

لانے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد ﷺ پر بھی ایمان لانا صرف موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے سے زیادہ اچھا اور بہتر ہے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ کا مطلب کیا ہے: "مَثَلُ مَایُنْفِقُوْنَ فِیْ ھٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْھَا صِرٌّ" (وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگانی میں اس کی حالت اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو) اس آیت مبارکہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کے وہ اموال جن کو وہ جاہ وشہرت اور مفاخرت کے حصول کے لئے خرچ کرتے ہیں یا کفر کے باوجود نیک کاموں میں صرف کرتے ہیں یا رسولِ کریم ﷺ کی عداوت میں ان کو خرچ کرتے ہیں ان (اموال) کو ایسی کھیتی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کو تیز ہوا لگ جائے اور وہ اس کھیتی کو برباد کر کے رکھ دے، جس کے سبب وہ کھیتی ناقابلِ انتفاع ہو جائے یہاں درحقیقت تشبیہ کا تعلق کھیتی کے ساتھ ہے نہ کہ ہوا کے ساتھ، لیکن آیت میں "ریح" کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے؟

جواب اول اصل میں یہاں لفظ مقدر ہے، اصل میں ہے: "اِھْلَاكُ مَا یُنْفِقُوْنَ کَمَثَلِ اِھْلَاكِ رِیْحٍ فِیْھَا صِرٌّ" یعنی جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسے ہی برباد جاتا ہے جیسے تیز ہوا کھیتی کو برباد کر دیتی ہے، یا ان کفّار کے خرچ کرنے کی مثال اس ہوا سے تباہ شدہ جگہ (یعنی کھیتی) کی طرح ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانِ عالی ہے: " مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ " (جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت) نیز یہ فرمانِ باری بھی اس کی نظیر ہے: "وَمَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ" (اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس (جانور کی) کیفیت کے مثل ہے کہ ایک شخص ہے وہ جانور کے پیچھے چلا رہا ہے)۔

جواب ثانی امام ثعلبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے، تقدیری عبارت اس طرح ہے: "کَمَثَلِ حَرْثِ قَوْمٍ ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ اَصَابَتْهُ رِیْحٌ فِیْھَا صِرٌّ فَاَھْلَکَتْهُ" یعنی کفار کی مثال اس قوم کی کھیتی کے مثل ہے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو پھر تند وتیز ہوا اس کھیتی کو لگ جائے اور اس کو برباد کر کے رکھ دے۔

سوال "اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِھَا" (اگر لگے تم کو بھلائی ناخوش کرتی ہے ان کو اور اگر پہنچے تم کو برائی خوش ہوتے ہیں ساتھ اس کے) اس آیت میں کیا وجہ ہے کہ حسنةٌ کو مَسّ کے ساتھ اور سیئةٌ کو اِصابہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے؟

جواب مَسّ کا لفظ عبارت میں توسّع کے لئے اِصابہ کے معنی میں مستعار ہے۔ وگرنہ دونوں کا

معنی ایک ہی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: "مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ" نیز "اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا"

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ "وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ" (اور جلدی کرو طرف بخشش کے) جبکہ حضور نبی کریم علیہ افضل التحیۃ تو فرماتے ہیں: "العجلة من الشیطان والتأنی من الرحمٰن" یعنی جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اور آہستہ روی اختیار کرنا رحمٰن کی طرف سے ہے؟

جواب نبی کریم ﷺ نے پانچ موقعوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے' آپؐ نے فرمایا: "مگر گناہ سے توبہ کرنے' قرض ادا کرنے' بالغہ کنواری کی شادی کرنے' میت کو دفن کرنے اور مہمان کا اکرام کرنے میں جلدی کرو"۔ آیتِ بالا میں جس مسارعت (جلدی) کا حکم دیا گیا ہے اس سے توبہ کرنے میں جلدی کرنا مراد ہے' اسی طرح اسبابِ مغفرت بھی توبہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

سوال "وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ" (اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اُٹھاتے ہیں) اس آیت مبارکہ میں ظَلَمُوْٓا کا کلمہ اَوْ کے ذریعہ ماقبل پر عطف کیا گیا ہے' حالانکہ فاحشہ (بُرائی) کا فعل' ظلمِ نفس میں داخل ہے بلکہ فاحشہ' ظلمِ نفس کی ابلغ نوع ہے؟ اس لئے بظاہر تو "ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ" کہنا کافی تھا؟۔

جواب یہاں 'فاحشة' سے مراد ظلمِ نفس کی ایک نوع ہے یعنی زنا یا ہر کبیرہ گناہ مراد ہے' پس اس لفظ "فاحشه" کو زیادتِ قباحت کے لئے ذکر کیا گیا اور ظلمِ نفس سے مراد اس کے ماسوا گناہ ہیں۔

سوال یہاں تو فرمایا: "وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ" (اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہے) لیکن ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: "وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ" (اور جس وقت کہ غصے ہوتے ہیں وہی بخش دیتے ہیں) نیز فرمایا: "قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا" (آپ فرمادیجئے ایمان والوں کو کہ وہ بخش دیا کریں) ان آیات میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے پہلی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں بخشتا اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے' کہ اللہ کے سوا بھی اور لوگ بخشتے ہیں' اس آیت کا مطلب کیا ہے؟۔

جواب "وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ" کا معنی ہے کہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو من کل الوجوہ

گناہوں پر پردہ ڈال دے' ظاہر ہے ایسا غفران (معاف فرمانا اور بخشنا) اللہ کے سوا اور کسی میں پایا جا سکتا۔

سوال ''اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ'' (سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہی ہو جائیں) اس آیتِ کریمہ میں ''اَوْ قُتِلَ'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟ صرف ''اَفَائِنْ مَّاتَ'' کہہ دینا کافی تھا اس لئے کہ قتل بھی ایک موت ہے جو اس میں داخل ہے؟۔

جواب قتل' اگرچہ موت ہے لیکن جب عرفِ عام میں میّت کا لفظ بولا جائے تو اس سے مقتول مفہوم نہیں ہوتا چنانچہ اسی لئے ایک کا دوسرے پر عطف کیا گیا۔

سوال اس مقام پر تو فرمایا ہے: ''وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' (جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا) لیکن ایک دوسری جگہ پر ارشاد فرمایا: ''وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ'' (الانعام:۹۴) (اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آ گئے جس طرح ہم نے اول بار تم کو پیدا کیا تھا)۔

دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض ہے' کیونکہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری مخلوق تنہا تنہا حاضر ہوگی؟

جواب پہلی آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا گناہ اس کے دفترِ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ یا مطلب یہ ہے کہ اپنے گناہ کا بار اٹھائے ہوئے آئے گا۔ اور دوسری آیت میں ''فُرَادٰى'' کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے اہل و اموال سے علیحدہ اور تنہا ہو کر آئیں گے۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا باطل معبودوں سے الگ ہو کر آئیں گے' یا اپنے شرکاء سے جدا ہو کر حاضر ہوں گے۔ آیت کا مکمل حصہ ان توجیہات کے صحیح ہونے پر شاہد ہے۔

سوال صحیحین میں نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث منقول ہے' آپؐ نے فرمایا: ''خیانت کرنے والا شخص قیامت کے دن بعینہ اسی چیز کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے آئے گا جس میں اس نے خیانت کی ہوگی خواہ وہ چیز بولنے والی ہو (جانور وغیرہ) یا خاموش رہنے والی (مال و دولت)''۔

یہ حدیثِ رسولؐ کا مفہوم ہے۔ اس سے مذکورہ جواب مندفع ہو جاتا ہے؟

جواب بناء بریں دوسری آیت سے مراد یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے اہل و مال کی حمایت و مدد سے الگ اور جدا ہوں گے' مکمل آیت اس جواب کے صحیح ہونے پر شاہد ہے۔

سوال اس ارشادِ باری کا کیا مطلب ہے: ''وَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ'' (یہ لوگ درجات (پر)

ہیں اللہ کے نزدیک) لوگوں کو نفسِ درجات کہنا کیسے صحیح ہے؟

جوابِ اوّل لفظ مقدر ہے۔ اصل میں ہے: "هُمْ ذُوْ دَرَجٰتٍ" یعنی وہ درجات والے ہیں۔ یا "هُمْ اَهْلُ دَرَجَاتٍ" یہاں اصل مراد کو عدمِ التباس کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔

جوابِ ثانی "دَرَجٰتٌ" سے مراد طبقات ہے، اس صورت میں کوئی لفظ مقدر ماننے کی ضرورت نہیں، معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگ اللہ ہاں درجات میں مختلف ہونے کی وجہ سے طبقات میں متفاوت ہوں گے۔

سوال دونوں فریقوں (ایک وہ جو رضائے حق کا تابع ہو اور دوسرا وہ غضبِ الٰہی کا مستحق ہو) کے لئے درجات کا لفظ کیسے فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک فریق درجات کا اور دوسرا درکات کا مستحق ہے؟

جوابِ اوّل "دَرَجٰتٌ" کا لفظ دونوں فریقوں کے لئے مستعمل ہے، اس کی دلیل سورۃ الاحقاف میں فرمانِ خداوندی ہے، دونوں فریقوں کا پہلے ذکر فرمایا، اس کے بعد فرمایا: "وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا" (اور ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے میں ملیں گے) اس کی تحقیق یہ ہے کہ بعض جہنمی خفیف عذاب میں مبتلا ہوں گے اس اعتبار سے وہ مقام کے اعتبار سے اعلیٰ ہوں گے اور بعض جہنمی جہنم میں شدید عذاب سے دوچار ہوں گے اس لحاظ سے وہ مقام کے اعتبار سے ان سے اسفل ہوں گے۔

جوابِ ثانی اگر "دَرَجٰت" کا اہلِ درجات کے ساتھ اختصاص تسلیم کر لیا جائے تو "هُمْ دَرَجٰتٌ" کا قول صرف انہی کی طرف راجع ہوگا، اصل عبارت یوں ہوگی: "اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ وَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَهُمْ دَرَكَاتٌ" یعنی سوا ایسا شخص جو کہ رضائے حق کا تابع ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجات پر فائز ہو کیا وہ اس شخص کے مثل ہو جائے گا جو کہ غضبِ الٰہی کا مستحق ہو اور درکات کا اہل ہو"۔ بہرحال یہاں بعض حصہ کو اس لئے حذف کر دیا کہ مذکور حصہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

سوال "اَلَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ" (جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم دولتمند ہیں) جن لوگوں نے یہ بات کہی تھی وہ نبی کریم علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے اور انہوں نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنا: "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" (کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح قرض کے طور پر دے)۔ لہٰذا ان کے حق میں یہ کیسے فرمایا: "سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ" (ہم ان کے

کیے ہوئے کو لکھ رہے ہیں اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی)' انہوں نے تو کبھی بھی انبیاء کو قتل نہیں کیا؟

جواب چونکہ وہ اپنے اسلاف کے اس عمل (انبیاء کو قتل کرنا) پر راضی اور خوش تھے تو گویا انہوں نے خود یہ کام کیا ہے' اس لئے انبیاء کے قتل کی نسبت انکی طرف کر دی گئی۔ قرآنِ حکیم میں یہ صورت جابجا مذکور ہے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ'' (یہ امر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں)' یہاں ''ظلّام'' مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بہت زیادہ ظلم کرنے والا۔ ظلّام کی نفی سے ظالم کی نفی لازم نہیں آتی' ہاں البتہ ظالِم کی نفی سے ظلّام کی نفی لازم آتی ہے' اس لئے لَیۡسَ بِظَالِمٍ فرماتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ سے ابلغ طریقہ سے ظلم کی نفی ہو جاتی؟

جواب اوّل یہاں مبالغہ کا صیغہ کثرتِ عبید (بندوں کی کثرت) کی وجہ سے لایا گیا ہے نہ کہ کثرتِ ظلم کی وجہ سے۔ جیسے ارشاد ہے: ''وَلَا یَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا'' (آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا) اسی طرح فرمایا: ''عَالِمُ الۡغَیۡبِ'' اور ایک جگہ ''عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ'' مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ۔ جب معمول مفرد ہو تو مبالغہ کا صیغہ نہیں لایا جاتا۔ جیسے زید ظالم لعبدہ وعمرو ظلّام لعبیدہٖ' زید اور عمرو دونوں ظلم میں برابر ہیں۔ نیز جیسے ''مُحَلِّقِیۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِیۡنَ'' اس میں تشدید کے ساتھ محلّق اور مقصّر کو لایا گیا فاعلین کی کثرت کی بناء پر نہ کہ فعل کے مکرر ہونے کی وجہ سے۔

جواب ثانی یہاں صیغہ مبالغہ نسب کے لئے ہے یعنی اس ذاتِ مقدسہ کی طرف ظلم کو منسوب نہیں کیا جاتا۔ تو بناء بریں آیت کے معنی ہوں گے کہ وہ ظالم نہیں ہے۔

جواب ثالث یہاں ''ظَلَّام'' کا اطلاق قباحتِ فعل کی زیادتی کے اعتبار سے کیا گیا ہے نہ کہ کثرتِ فعل کے اعتبار سے' اس لئے کہ وہ ذات جو عظیم القدر بھی ہو اور کثیر العدل بھی اس کی طرف سے کسی جرم کے بغیر کسی کے لئے عذاب کا صادر ہونا اس شخص کے ظلم سے زیادہ قبیح اور شنیع ہے جو نہ عظیم المرتبت ہو اور نہ کثیر العدل ہو۔ حاصلِ جواب یہ ہے کہ مبالغہ کا صیغہ کبھی تو ذاتِ فعل کی زیادتی کے اعتبار سے مستعمل ہوتا ہے اور کبھی صفتِ فعل کی زیادتی کے لحاظ سے استعمال ہوتا ہے' پس ظلم اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدسہ کی طرف سے پایا جائے تو وہ زیادتِ قباحت کے اعتبار سے ان ہزارہا ظلموں سے کہیں بڑھ کر ہوگا جو بندوں کی طرف سے پائے جائیں۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا'' (اور انسان نے

اس کو اپنے ذمہ لے لیا وہ ظالم ہے جاہل ہے) اس میں "ظَلُوْم" اور "جَهُوْل" مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی میں: "فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ" (اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گزرے ہیں تکذیب کی جا چکی ہے) اس آیت میں جزا مقدم ہے، حالانکہ حق تو یہ ہے کہ جزا شرط کے بعد ہو؟

جواب جوابِ شرط محذوف ہے، اس لئے کہ "فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ" اس کی جزا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ شرط پر مقدم ہے، معنی یہ ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو آپؐ سابقہ پیغمبروں کی تکذیب سے خود کو تسلّی دیا کریں۔ یہاں سبب کو (جو کہ ان کی تکذیب ہے) مسبب کی جگہ پر (جو کہ تسلی دینا ہے) رکھا گیا ہے۔

سوال "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" (اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے یہ عہد لیا کہ اس کتاب کو عام لوگوں کے روبرو ظاہر کر دینا اور اس کو پوشیدہ مت کرنا) یہاں مزید "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کہنے میں کیا فائدہ ہے؟ آیت کا اوّل حصّہ اس کو مستغنی کر دیتا ہے؟ یعنی جب یہ کہہ دیا کہ "اس کتاب کو ظاہر کرنا" تو اس کی بظاہر ضرورت نہیں رہتی کہ "پوشیدہ مت کرنا"؟

جوابِ اوّل "لَتُبَيِّنُنَّهٗ" کا مطلب ہے کہ اس کتاب کو فی الحال ظاہر کرنا اور اس پر مداومت رکھنا اور "لَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کا معنی یہ ہے کہ آئندہ اس کو مت چھپانا۔

جوابِ ثانی پہلی ضمیر کتاب کی طرف اور دوسری ضمیر نبی ﷺ کے ذکر اور صفت کی طرف راجع ہے، اس لئے کہ کچھ پہلے حضور اکرم ﷺ کا ذکر گزرا ہے۔

سوال پھر بھی "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کہنا تکرار ہے، اس لئے کہ جب وہ کتاب کو بیان کریں گے اور اس کو ظاہر کریں گے تو اس سے لازماً نبی کریم ﷺ کی صفت اور آنحضرتؐ کا ذکر بھی واضح اور بیان ہوگا اس لئے کہ حضور ﷺ کا صفت بھی من جملہ کتاب میں سے ہے یعنی تورات و انجیل میں حضورؐ کی شان بھی مذکور ہے۔ لہٰذا اس کے بعد "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کہنا تکرار ہوگا؟

جواب بناء بریں "وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ" کا قول تاکید کے لئے ہوگا۔

سوال "رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ" (اے ہمارے پروردگار بے شبہ آپ جس کو دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کر دیا) اور دوسری جگہ فرمایا: "يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" (اس دن کہ نہ رسوا کرے گا اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو کہ ایمان لائے

ساتھ ان کے) ان آیات مبارکہ سے بظاہر معتزلہ اور خارجیہ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ مومنین جہنم میں داخل ہی نہیں ہوں گے' ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟۔

جواب اول "اَخْزَيْتَهٗ" کا معنی ہے ذلیل وخوار کرنا' یہ "خِزْیٌ" سے ماخوذ ہے' اور "يَوْمَ لَا يُخْزِیْ" میں "يُخْزِیْ" خِزَايَةٌ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے نکال وفضیحت۔ چنانچہ جو شخص بھی دوزخ میں داخل ہوگا وہ ذلیل وخوار ضرور ہوگا لیکن یہ ضروری نہیں کہ دوزخ میں جانے والا ہر شخص فضیحت کا بھی شکار ہو۔

جواب ثانی آیتِ اولیٰ سے اقامت اور خلود کا ادخال مراد ہے' اس سے تحلّتِ قسم (قسم پوری کرنے) کے لئے ادخالِ جہنم مراد نہیں ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے: "وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا" (مریم:۷۱) یعنی اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو"۔

جواب ثالث اس سے مراد تطہیر والا ادخال ہے جو بعض مومنین کے لئے ان کے گناہوں کے بقدر ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قولِ مبارک: "يَوْمَ لَا يُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" مستقل کلام ہے' یعنی یہاں سے ایک نیا کلام شروع ہو رہا ہے' اس کا ماقبل پر عطف نہیں ہے۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: "سَمِعْنَا مُنَادِيًا" (یعنی ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا)۔ حالانکہ امرِ مسموع منادی کی ندا ہوتی ہے نہ کہ نفسِ منادی؟۔

جواب اصل عبارت تھی: "نِدَاءَ مُنَادٍ" کیونکہ پورا قولِ باری اس طرح ہے "سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِیْ" (ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ پکارتا ہے)۔ جیسے کہتے ہیں: سمعت زيدا يقول كذا (میں نے زید کو سنا کہ وہ اس طرح کہتا ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "سَمِعْتُ قَوْلَ زَيْد" (میں نے زید کی بات سنی)۔ بہر حال آیتِ مذکورہ میں "مُنَادِيًا" سَمِعَ کا مفعول ہے اور "يُنَادِیْ" حال ہے جو مفعول کے مضاف کے محذوف ہونے پر دال ہے۔

سوال "رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا" (اے پروردگار ہمارے پھر ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرمادیجئے اور ہماری بدیوں کو بھی ہم سے زائل کردیجئے) یہاں بظاہر تکرار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تکفیرِ سیئات (بدیوں کو زائل کرنا) غفرانِ ذنوب (گناہوں کو معاف کرنا) میں داخل ہے؟ دونوں لفظ لانے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب دونوں کا معنی مختلف ہے' اس لئے کہ "غفران" محض فضل کرنے کو کہتے ہیں' اور "تکفیر" کہتے ہیں سیئات کو حسنات سے مٹانا اور زائل کرنا۔

سوال ''وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ'' (اور ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ موت دیجئے) اس کا معنی کیا ہے؟ کیونکہ نیک لوگوں کے ساتھ وفات پانا تو ان کے لئے نافع نہیں ہے بلکہ خود ان کا نیک ہونا ان کے لئے نفع بخش ہے' خواہ پھر ان کے ساتھ وفات پائیں یا ان سے پہلے وفات پائیں یا ان کے بعد؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ ہمیں اس حال میں موت دینا کہ ہم نیک لوگوں کی صحبت سے وابستہ ہوں اور پھر بالآخر ان میں ہمارا شمار ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے امیر نے مجھے بھی عطا کیا انعام والوں کے ساتھ۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے مجھے بھی ان کی جماعت میں سے قرار دیا اور شامل کیا۔ اگرچہ ان سے پہلے دیا ہو یا بعد میں۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ'' (اور ہم کو وہ چیز بھی دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے)' یہاں انہوں نے پیغمبروں کی معرفت اللہ تعالیٰ سے وعدہ پورا کرنے کی دعا کی ہے حالانکہ ان کے علم میں بھی ہے بلکہ خود ان کا یہ قول ہے: ''اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ'' (یقیناً وہ وعدہ خلافی نہیں کرتے)؟

جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کی زبانی مومنین سے وعدہ عام ہے جس میں احتمال ہے کہ اس سے خصوص مراد ہو جیسا کہ قرآنِ کریم کی عام آیات میں ایسا اکثر ہوتا ہے' چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کو بھی ان لوگوں میں شامل اور شمار کیا جائے جو اس وعدہ کے حکم میں داخل ہیں۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس وعدہ کے جلد پورا کرنے کی درخواست کی جو وعدہ اس نے ان کے دشمنوں کے خلاف اپنی نصرت وامداد کے متعلق کیا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی انکے دشمنوں کے خلاف نصرت کرے گا لیکن اس وعدہ کو کسی وقت کے ساتھ مقیّد اور مخصوص نہیں کیا تھا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی کا کیا مطلب ہے: ''لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ'' (تجھ کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا فریب میں نہ ڈالے)' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسولِ پاک ﷺ ان نعمتوں کی وجہ سے فریب یا دھوکہ میں آ جائیں جو ان کافروں کو دی گئیں ہیں حتیٰ کہ حضور ﷺ کو ان کے دھوکہ میں آنے سے منع کیا جائے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ اے مومنو! ان کافروں کی چہل پہل کہیں تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ طریقہ یہ ہے کہ قوم کے رئیس اور مقتداء کو کسی بات کا مخاطب بنایا جاتا ہے مگر اس سے مراد اس کے متبعین اور اس کی جماعت کے افراد ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

کافروں کی خوشحالی سے فریب خوردہ نہیں تھے' یہاں فریب میں نہ آنے کا حکم محض تاکید کے لئے اور اس پر مداومت اور ثابت قدم رہنے کے لئے ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری جگہ پر حضور کو فرمایا گیا: '' فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ '' (آپؐ کافروں کے پشت پناہ نہ ہوں) یا فرمایا: '' وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ '' (آپؐ مشرکوں میں سے نہ ہوں) یا ایک جگہ آپؐ سے فرمایا گیا: '' فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ '' (آپ ان تکذیب کرنے والوں کا کہنا کبھی نہ ماننا)۔

سوال '' تَقَلُّبُ '' (چلنا پھرنا) سے کس طرح منع کیا گیا ہے حالانکہ یہ ممنوع چیز نہیں ہے؟

جواب اس کا معنی ہے ان کے شہروں میں چلنے پھرنے کی وجہ سے آپؐ فریب میں نہ آئیں کہ کہیں ان کا چلنا پھرنا آپؐ کو دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ یعنی یہ کلام تنزيل السبب منزلة المسبب کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ کافروں کے تَقَلُّب (چلنا پھرنا) نے اگر (بالفرض) ان کو فریب و دھوکہ میں ڈالا تو وہ اس کی وجہ سے دھوکہ میں آجائیں گے' اس لئے اصل سبب سے ہی منع کر دیا گیا اور وہ ہے ان کے تَقَلُّب کا ان کو دھوکہ میں ڈالنا۔ تاکہ مسبب سے باز رہیں اور وہ ہے ان کا کافروں کے تَقَلُّب سے دھوکہ اور فریب میں آنا۔

سوال اچھا! اس کی کیا وجہ ہے کہ یوں فرمایا گیا ہے: '' لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ '' (کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں فریب میں نہ ڈالے) اس طرح کیوں نہیں فرمادیا: '' لَا يَغُرَّنَّكَ نِعَمُهُمْ وَاَمْوَالُهُمْ '' (کافروں کی نعمتیں اور ان کے مال تمہیں فریب میں نہ ڈالیں) کیونکہ فریب خوردگی کا احتمال کافروں کے اموال اور ان کی نعمتوں میں ہے' ان کے شہروں میں چلنے پھرنے میں تو فریب خوردگی کا احتمال نہیں ہے؟

جواب کافروں کے چلنے پھرنے سے مراد نعمتوں اور تجارتوں میں ان کا تصرّف اور اموال کے ذریعہ تلذّذ اور تلّطف (مزے لینا) ہے' ایک نادار اور تہی دست آدمی جب کسی مالدار شخص کو مختلف نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھتا ہے تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے اور اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں '' تَقَلُّب '' (چلنا پھرنا) کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کافروں کا گناہوں اور نافرمانیوں میں ملوّث ہونا تمہیں فریب میں نہ ڈال دے کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے پکڑے نہیں جارہے ہیں۔

سوال '' اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ '' (ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس' بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب کر دینگے) اس آیت کا معنی کیا ہوگا؟ کیونکہ یہاں: '' لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ '' کا قول اجر و ثواب کی بشارت

کے موقع پر لایا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرعتِ حساب کا قول ''اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ'' بھی ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ قول اس وقت ذکر کرتے ہیں جب کسی کو ڈرانا' دھمکانا یا کسی عذاب کی وعید سنانی ہو؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات کو حساب کے خوف سے نہیں بیچتے کیونکہ وہ ذات سریع الحساب ہے' اس کا تعلق ماقبل سے ہے۔

سورۃ النساء

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا'' (اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا) جب حواء کی تخلیق حضرت آدمؑ سے ہوئی ہے اور ہم بھی حضرت آدمؑ ہی سے تخلیق شدہ ہیں یعنی ان کی اولاد ہیں تو حواء کی نسبت آدمؑ کی طرف اولاد کی ہوگی اور حواء اس لحاظ سے ہماری بہن ہوگی نہ کی ماں؟

جواب اول بعض مفسرین کہتے ہیں: یہاں ''مِنْ'' بیانِ جنس کے لئے ہے' تبعیض کے لئے نہیں ہے' معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس جاندار کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا فرمایا۔ جیسے یہ آیتِ مبارکہ ہے: ''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ'' میں ''مِنْ'' بیانِ جنس کے لئے ہے۔

جواب ثانی جمہور مفسرین کہتے ہیں: یہاں ''مِنْ'' تبعیض ہی کے لئے ہے لیکن حواء کی آدم علیہ السلام سے تخلیق بطریقِ تولید نہیں تھی جیسے اولاد کی تخلیق ماں باپ سے ہوتی ہے' لہٰذا اس سے بنتیت (آدمؑ کی بیٹی ہونا) اور اخیتت (ہمارے لئے ان کا بہن ہونا) لازم نہیں آتی۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: ''وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ'' (اور دو یتیموں کو مال ان کے) اس آیتِ مبارکہ میں یتیموں کو ان کے مال ادا کرنے کا حکم ہے۔ حالانکہ یتیم کو اس کا مال اس وقت تک دینا بالاتفاق جائز نہیں جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے؟

جواب یہاں یہی مراد ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کا مال ان کو دے دو' اور یہاں ان کو مَاكَانَ کے اعتبار سے زمانۂ بلوغ کے قریب ہونے کی بناء پر یتیم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جیسے اونٹنی کو وضعِ حمل کے بعد بھی عُشَرَاء (دس ماہ کی حاملہ اونٹنی) کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح کبھی بالغ کو بھی مَاكَانَ کے اعتبار سے یتیم کہہ دیتے ہیں' جیسے مَايَكُوْنَ کے اعتبار سے حی (زندہ) کو میّت (مردہ) اور انگور کو شراب کہہ دیتے ہیں۔ فرامینِ باری تعالیٰ ہیں: ''اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ'' اور فرمایا: ''اِنِّيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا'' اسی طرح لوگوں کا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لئے نبوت

ملنے کے بعد یتیم ابی طالب کہنا' اسی قبیل سے ہے۔

سوال "وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰی اَمْوَالِكُمْ" (اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ) یہاں فرمایا گیا ہے کہ یتیموں کا مال اپنے مالوں کے ساتھ مت کھاؤ' حالانکہ صرف یتیم کا مال کھانا بھی حرام ہے' کیا وجہ ہے کہ یہاں یتیم کے مال کے کھانے کی ممانعت کو اوصیاء (وصی کے جمع) کے مال کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے؟۔

جواب تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود یتیم کا مال کھانا زیادہ قبیح اور شنیع ہے' چونکہ وہ لوگ عدمِ ضرورت کے باوجود یتیموں کا مال کھایا کرتے تھے اس لئے ممانعت اس کے مطابق آئی۔

سوال جب یہ فرمادیا: "مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ" (اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں) تو اس میں قلیل اور کثیر بھی آ گیا لہٰذا اس کے بعد پھر یہ کہنا "مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ" (خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر) بظاہر بے فائدہ ہے؟

جواب "مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ" کہنا تاکید کے طور پر اور یہ بتانے کے لئے ہے کہ سارا کا سارا ترکہ واجب القسمت ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ' کہیں ایسا نہ ہو کہ ترکہ کے کسی قلیل حصہ کو معمولی امر سمجھ کر چھوڑ دیا جائے اور اسے تقسیم نہ کیا جائے' اور کوئی وارث اس کا تنہا مالک بن جائے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ" (اور ماں باپ کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ ہے' اگر میت کے کچھ اولاد ہو) حالانکہ اگر اولاد میں میت کی بیٹی ہو تو باپ کے لئے ثلث ہوتا ہے' سدس نہیں ہوتا؟

جواب آیتِ مبارکہ میں فرض کا بیان کیا گیا ہے۔ تعصیب (عصبہ) کا بیان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ فرض ہونے کے طور پر باپ کو بیٹی کے ساتھ سدس ہی ملتا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے: "وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا" (اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جائے گا اس کو آگ میں داخل کریں گے اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا)۔ یہاں عاصی کے لئے خلود فی النار (جہنم میں ہمیشہ رہنا) کا قطعی حکم کیسے لگایا گیا؟۔

جواب اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کی نافرمانی اس کے احکام کو رد کر کے اور انکار کی صورت میں کرتا ہے' ظاہر ہے کہ احکامِ خداوندی کا انکار کفر ہے اور کفر کی سزا خلود فی النار ہی تو ہے۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: "حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ" (یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ

کردے) یہاں "توفّی" اور "موت" دونوں کا معنی ایک ہی ہے' گویا کہ یوں فرمایا' حَتّٰی یُمِیْتَهُنَّ الْمَوْتُ " معنی یہ ہوگا کہ یہاں تک کہ موت ان کو موت دے دے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ یہاں تک کہ موت کے فرشتے ان کو پکڑ کر ان کی روح قبض کرلیں۔

جواب ثانی معنی یہ ہے کہ یہاں تک کہ موت کے فرشتے ان کو فوت کردیں۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: "اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ " (توبہ اللہ کے ذمہ ہے) توبہ تو بندہ کے ذمہ ہے۔اس لئے' اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى الْعَبْدِ " کہنا چاہیے؟

جواب اول یہاں مضاف محذوف ہے' اصل میں ہے: "اِنَّمَا قُبُوْلُ التَّوْبَةِ عَلَى اللّٰهِ "یعنی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔

جواب ثانی توبة الله کا معنی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا مغفرت اور رحمت کے ساتھ اپنے بندوں پر رجوع کرنا' اس لئے کہ توبہ کا لغوی معنی رجوع ہے۔

سوال یہاں "بِجَهَالَةٍ " (نادانی میں) فرمانے کا کیا مطلب ہے؟ اگر کوئی شخص جانتے ہوئے گناہ کا ارتکاب کرے' پھر توبہ کرے تو کیا اس کی توبہ ہوگی؟۔

جواب "بِجَهَالَةٍ " کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس گناہ کی مقدارِ قباحت اور اس کے برے انجام سے ناواقف ہوکر ایسا کرے' کیونکہ ہر گنہگار گناہ کرتے وقت اس سے جاہل اور نادان ہوتا ہے' "جہالت" سے مراد اس کے فعلِ معصیت اور گناہ ہونے کی نادانی نہیں ہے کہ وہ اس فعل کے معصیت ہونے کو نہیں جانتا۔لہٰذا اس کا معنی یہ ہوا کہ نفسانی خواہشات کے غلبہ' تلبیسِ ابلیس اور تزیینِ شیطان کے سبب اس شخص سے اس کا کمالِ علم سلب کرلیا گیا ہو۔

سوال اس سے کیا مراد ہے:' ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ " (پھر قریب ہی وقت میں توبہ کرلیتے ہیں) حالانکہ اگر کوئی گنہگار آدمی فوراً توبہ نہ کرے بلکہ ایک عرصہ دراز کے بعد بھی توبہ کرلے تو بھی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے؟

جواب یہاں "قَرِیْبٍ " کا لفظ بعید کے مقابل نہیں لایا گیا ہے' کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ پھر وہ سلطانِ موت کو دیکھنے سے پہلے پہلے توبہ کرلیتے ہیں۔ کذا قاله ابن عباس رضی اللہ عنہ۔اس پر قرینہ (آگے جاکر) یہ قولِ باری ہے: "حَتّٰی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ " (یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں)۔

سوال اس کا کیا مطلب ہے: "وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا " (اور تم اس ایک کو انبار کا انبار مال

دے چکے ہو) حالانکہ اس سے لینے کی حرمت مطلقاً ثابت ہے خواہ اس کو مہر نہ دیا ہو بلکہ وہ اس کے ذمہ ہو؟

جواب یہاں ''اِیتَاءٌ'' سے مراد ضمان اور التزام ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ضمان والتزام مراد ہے: ''اِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اٰتَیْتُمْ'' (جب کہ ان کے حوالہ کردو جو کچھ ان کو دینا کیا ہے)۔

سوال اس آیت میں ''بہتان'' سے مراد کیا ہے: ''اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا'' (کیا تم اس کو لیتے ہو بہتان رکھ کر) حالانکہ مہر کا لینا ظلم ہے بہتان نہیں ہے کیونکہ بہتان تو جھوٹ کو کہتے ہیں؟

جواب حضرت ابن عباسؓ اور ابن قتیبہؒ فرماتے ہیں: ''بہتان'' سے مراد ظلم ہے اور امام زجاجؒ فرماتے ہیں اس سے مراد باطل ہے۔ لغت کی کتابوں میں یہ امر مشہور ہے کہ بہتان یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے متعلق وہ بات کہے جو اس نے نہ کی ہو لہٰذا اس آیت کی مراد یہ ہے کہ شوہر بسا اوقات اپنی بیوی پر اس لئے تہمت لگاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس کا مہر اس سے لے سکے اور اس سے جدائی اختیار کر سکے اور بعض کہتے ہیں کہ اس بہتان سے مراد شوہر کا اس بات سے انکار کرنا ہے کہ اس کے ذمہ اس عورت کا کوئی مہر ہے۔

سوال اس جگہ ''وَلَا تَنْكِحُوْا'' (تم نکاح مت کرو) فعلِ مستقبل سے نہی ہے اور ''اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ'' (مگر جو بات گزر گئی گزر گئی) ماضی ہے تو ماضی کا مستقبل سے استثناء کیسے درست ہے؟

جوابِ اول یہاں ''اِلَّا'' بَعْدُ کے معنی میں ہے جیسے اس قولِ باری میں ''اِلَّا'' بَعْدُ کے معنی میں مستعمل ہے ''لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی''۔

جوابِ ثانی یہاں عبارت میں تقدیم و تاخیر ہے اصل عبارت اس طرح ہے: ''اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ'' (تحقیق یہ ہے بے حیائی مگر جو بات گذر گئی گزر گئی)۔

سوال اس جگہ: ''اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً'' بلفظِ ماضی کیوں فرمایا حالانکہ باپ کی منکوحہ سے نکاح فی الحال بھی اور فی المآل بھی تا قیامت فاحشہ ہے؟

جواب ''كَانَ'' کبھی ماضی منقطع (یعنی انقطاعِ زمانہ ماضی) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ''كَانَ زَیْدٌ غَنِیًّا'' زید مالدار تھا اور کبھی ''كَانَ'' تسلسل زمانہ کے لئے آتا ہے جو زمانۂ حال سے متصل ہو۔ جیسے ابو جندب الہذلی کا شعر ہے

وَكُنْتُ اذا جاری دعا لمضوفۃ

اُشَمِّرُ حتی یَنصِفَ الساق مِئْزَرِی

نیز جیسے قرآنِ پاک میں ہے: ''وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا'' یعنی اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے ہر

چیز کا علم ہے۔ نیز: "وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا" یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز پر قادر ہے' بہر کیف! ہماری بحث اس قسم سے ہے۔ "کان" کے متعلق مزید کلام ان شاء اللہ تعالیٰ اس فرمانِ الٰہی: "اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" کے تحت آرہا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی میں: "وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ" (اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں) ربیبہ کی حرمت کو زیرِ پرورش ہونے کے ساتھ مقیّد کیا گیا ہے' حالانکہ یہ حرمت مطلقاً ثابت ہے' اگر چہ وہ اس کی زیر پرورش نہ ہو؟

جواب "فِيْ حُجُوْرِكُمْ" (زیر پرورش) کی قید اغلب اور عادۃً لگائی گئی ہے' یہ قید احترازی یا شرط کے طور پر نہیں ہے۔ (یعنی یہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں ہے) یہی وجہ ہے کہ حلّت کے موقع پر صرف نفیِ دخول (صحبت نہ کرنا) پر اکتفاء کیا گیا ہے (وہاں پرورش کے تحت ہونے نہ ہونے کی کوئی قید نہیں) فرمایا: "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" (اگر تم نے ان بیبیوں سے صحبت نہ کی ہو تو تم کو کوئی گناہ نہیں) فتأمل۔

سوال یہاں "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" کہنے کا کیا فائدہ ہے؟ بظاہر یہ کہنے کی ضرورت نہیں' کیونکہ "مِنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" اور "اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ" دونوں کے مجموعے سے یہ بات معلوم ہو ہی جاتی ہے کہ ربیبہ کی حرمت عدمِ دخول کے ساتھ مقید ہے؟

جواب "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" کا فائدہ یہ ہے کہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ جس طرح "فِيْ حُجُوْرِكُمْ" کی قید محض عادت اور اغلب کے اعتبار سے ہے اسی طرح "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ" کی قید بھی عادۃً اور اغلب کے اعتبار سے ہے (یعنی اتفاقی ہے احترازی نہیں ہے' یہ وہم نہ ہو) چنانچہ اس وہم کے ازالہ کے لئے فرمایا: "فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" (اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم کو کوئی گناہ نہیں)۔

سوال باندیوں کے نکاح کے سلسلہ میں فرمایا: "فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ" (سو ان سے نکاح کرلیا کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور ان کو ان کے مہر دے دیا کرو) حالانکہ باندی کے مہر کا مالک اس کا آقا ہوتا ہے' اس بناء پر ان باندیوں کا مہر ان کے آقا کو دینا ضروری ہے' نہ کہ ان باندیوں کو دینا چاہئے' لہٰذا یہ کیسے فرمایا کہ ان باندیوں کو ان کے مہر دے دیا کرو؟۔

جواب اول چونکہ خود باندی بھی اور اس کی تمام چیزیں اس کے آقا کی مِلک ہوتی ہیں اس لئے باندی کو مہر دینا ایسا ہی ہے جیسے اس کے آقا کو دے دینا۔

جواب ثانی یہاں مضاف محذوف ہے، اور وہ ہے "مَوَالِيهِنَّ" چنانچہ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ان باندیوں کا مہر ان کے آقاؤں کو دے دیا کرو۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: "ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ" (یہ اس شخص کے لئے ہے جو تم میں زنا کا اندیشہ رکھتا ہو) حالانکہ باندی سے نکاح کا جواز بعض علماء کے نزدیک خوفِ عَنَت (زنا کا اندیشہ) کے بغیر بھی ثابت ہے؟

جواب یہاں عبارت مقدر ہے اصل میں تھا: "ذٰلِكَ اَصْوَبُ وَاَصْلَحُ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ" یعنی جو تم میں زنا کا اندیشہ رکھتا ہو اس کے لئے باندی سے نکاح کر لینا زیادہ درست اور مناسب ہے، لہٰذا خوفِ عَنَت (زنا کا اندیشہ) کی یہ شرط، اصلح اور ارشد کے لئے ہوگی۔ (جوازِ نکاح کے لئے نہ ہوگی) جیسے اس فرمانِ خداوندی میں "خیرًا" کی شرط اسی کے لئے ہے فرمایا: "فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا" (النور:۳۳) (اگر ان میں (بہتری کے آثار) پاؤ تو ان کو مکاتب بنا دیا کرو)۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ" (اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ تم سے بیان کردے) حالانکہ "ارادہ" تو اَنْ کے ساتھ متصل ہوتا ہے، یوں کہتے ہیں: یرید ان یفعل، جیسے اس فرمانِ مبارک میں "يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ" (ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ یہ کہ تخفیف کرے تم سے)۔ ارادہ کا لفظ اَنْ کے ساتھ مقترن ہے۔؟

جواب کتابِ عزیز میں "لام" بمعنی اَنْ بہت جگہ آیا ہے جیسے ارشاد ہے: "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ" نیز جیسے فرمایا: "وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" اور ایک اور جگہ فرمایا: "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا" وغیرہ۔

سوال اس آیتِ مبارکہ میں تجارت کو خصوصی طور پر کیوں ذکر کیا گیا ہے: "اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ" (لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضا مندی سے ہو) حالانکہ تجارت کی طرح، ہبہ، وصیت، صدقہ اور ضیافت وغیرہ بھی حلت کا تقاضا کرتے ہیں)۔

جواب اول تجارت کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ لوگوں کا اپنے اموال کے متعلق اکثر تصرف تجارت ہی میں ہوتا ہے۔

جواب ثانی اسبابِ رزق کا زیادہ تر تعلق تجارت سے ہے اس لئے تجارت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ" (کاش کہ برابر کی جائے ساتھ ان کے زمین)۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ قیامت کے روز تمنا کریں گے کہ کاش وہ

مٹی بن جائیں۔ جیسے سورۃ النباء کے آخر میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ الفاظ کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ کفار آرزو کریں گے کہ ہم (اللہ تعالیٰ) زمین کو ان کے مثل انسان بنا دیں۔ جیسے کہتے ہیں سوّیت زیدًا بعمرو' اس کا معنی ہوتا ہے کہ میں نے زید کو عمرو کے برابر کر دیا' زید مسوّیٰ اور عمرو مسوّی بہ ہے؟

جواب ''سَوَّيْتُ هٰذَا بِهٰذَا'' کے دو معنی ہیں (۱) دوسرے کے حکم کو پہلے پر جاری کرنا جیسے سَوَّيْتُ زَيْدًا بِعَمْرٍو یعنی میں نے زید کو عمرو کے برابر کر دیا' یہ سَاوَيْتُ کی طرح ہے۔

(۲) مسوّٰی مفعول ہو اور مسوّٰی بہ اس کا آلہ ہو۔ جیسے ''سَوَّيْتُ الْقَلَمَ بِسِكِّيْنٍ'' یعنی میں نے قلم کو چھری کے ساتھ برابر کیا۔ قلم مسوّٰی اور مفعول ہے اور سکّینٌ (چھری) مسوّٰی بہ اور آلہ ہے۔ یا جیسے ''سَوَّيْتُ الثَّوْبَ بِالْمِقْرَاضِ'' یعنی میں نے کپڑے کو برابر قینچی سے' یعنی ٹھیک کیا' الثوب (کپڑا) مسوّی اور مفعول ہے اور مقراض (قینچی) مسوّی بہ اور آلہ ہے۔ اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں بھی ''تُسَوّٰی'' کے معنی میں دو احتمال ہیں (۱) یہ بمعنی ''سَاوَيْتُ'' ہو' آیت کا مطلب یہ بنے گا کہ وہ کفار قیامت کے دن آرزو کریں گے کہ کاش وہ مٹی بنا کر زمین کے برابر کر دیئے جائیں۔ جیسے قولِ باری تعالیٰ ہے ''لَتَنُوْءُ'' اور وَامْسَحُوْا بِرُءُ وسِكُمْ' ان لوگوں کے قول کے مطابق جو یہاں باء کو زائدہ قرار نہیں دیتے' نیز جیسے عام محاورہ میں کہتے ہیں: ''ادخلت الخاتم فی اصبعی'' یعنی میں نے انگوٹھی داخل کی اپنی انگلی میں)۔

(۲) یہ ''تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ'' بمعنی آلہ ہو' اس صورت میں آیتِ مبارکہ کا معنی ہوگا کہ وہ آرزو کریں گے کہ کاش زمین ان کو خوب کوٹ کر برابر کر دے اور وہ مٹی بن جائیں اور پھر زیرِ زمین منتشر ہو جائیں اور زمین بالکل سیدھی اور ہموار ہو جائے کہ کہیں بھی اونچ نیچ نہ ہو۔ جیسے ایک جگہ فرمایا: ''لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَا اَمْتًا'' (طٰہٰ:۱۰۷) ''(اے مخاطب) نہیں دیکھے گا تو بیچ اس کے کجی اور نہ اونچان یعنی ٹیلہ)۔ جب بعث بعد الموت ہوگا اور قبریں اور گڑھے مردوں سے خالی ہو جائیں گی تو زمین کی سطح متفاوت ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کو ہموار اور مساوی السطح کر دیں گے' بہر حال! ہو سکتا ہے کہ کافروں کی یہ تمنا اور آرزو زمین کو مساوی سطح بنانے سے قبل ہو۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ ''لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ'' (تو یہ بات ان کے لئے بہتر ہوتی اور موقع کی بات تھی) ''خَيْرٌ'' اسم تفضیل کا صیغہ ہے' جب کہا جاتا ہے کہ ''هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ ذٰلِكَ'' یعنی یہ اس سے بہتر ہے تو اس کا مطلب اور تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بہتری ان دونوں باتوں میں سے ہر بات کے اندر ہے لیکن اس بات کو دوسری بات سے فضیلت ہے' یعنی

اس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ جو کلمات یہودی لوگ کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں مگر سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کے کلمات اس سے زیادہ بہتر ہیں؟۔

جواب یہاں "خَیْر" سے مراد وہ خیر ہے جو شر کے مقابل استعمال ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ خیر نہیں ہے جو صیغہ افعل التفضیل کا ہے۔ جیسے کہتے ہیں فلَانٍ خَیْرٌ فلاں میں خیر ہے یعنی شر نہیں ہے۔

سوال اس آیت میں "مَفْعُوْل" سے کیا مراد ہے؟ " وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا " (اور ہے کام اللہ کا کیا گیا) "مفعول" تو مخلوق ہے حالانکہ اللہ کا امر مخلوق نہیں ہے؟

جواب یہاں "اَمر" سے مراد وہ امر نہیں ہے جو نہی کی ضد ہے۔ بلکہ اس سے مراد کوئی حادثہ یا کام یا بات ہے وغیرہ کیونکہ اس کو "امر" کہتے ہیں جیسے اس فرمانِ الٰہی میں "اَمر" کا معنی کوئی کام یا بات وغیرہ ہے: " لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا " (الطلاق:۱) "شاید کہ اللہ پیدا کردے پیچھے اس کے کچھ بات" نیز فرمایا: " اَتٰهَا اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا " (یونس:۲۴) "دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا"۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: " اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ " (بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے" حالانکہ بھول کر شرک کرنے والا کرھا اور جبراً شرک کرنے والا اور شرک سے توبہ تائب ہونے والا قابلِ بخشش ہے؟

جوابِ اول اس سے مراد ان لوگوں کے شرک کے ماسوا دوسروں کا شرک ہے' یہ مذکورہ لوگ خارجی دلائل کی بناء پر آیت کے عموم سے مخصوص اور مستثنیٰ ہیں۔

جوابِ ثانی مشیت کی قید کا تعلق منفی اور مثبت دونوں فعلوں سے ہے۔ گویا یوں فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے گا شرک معاف نہیں کرے گا اور جس کیلئے چاہے گا اس کے ماسوا معاف کردے گا۔

سوال اس آیتِ مذکورہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شرک کے علاوہ جو گناہ ہیں ان کی بخشش قطعی نہیں ہے بلکہ ان کی بخشش متوقع ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی: " اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا " (النساء:۱۶۹) سے پتہ چلتا ہے کفر اور ظلم جو غیر شرک ہیں ان کی قطعی مغفرت نہیں ہوگی' ان آیات میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟۔

جوابِ اول یہاں "ظلم" سے مراد شرک ہے' حضرت مقاتلؒ فرماتے ہیں: شرک کا نام ظلم بھی رکھا

جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ "(شرک بڑا ظلم ہے)۔ لہٰذا یہ ایسا ہی ہے جیسے فرمایا ہو:" اِنَّ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا "

جواب ثانی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:" وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ "شرک کے ماسوا گناہ کی مغفرت پر قطعی نہیں ہے بلکہ اس کی مغفرت مشیتِ الٰہیہ کے ساتھ معلّق ہے' پھر دوسری آیت کے ذریعہ توضیح فرمائی کہ کافران لوگوں میں داخل نہیں ہے جن کی مغفرت' مشیت خداوندی سے معلّق ہے۔ لہٰذا یہ امر متعین ہو گیا کہ کافران لوگوں میں داخل ہے جن کی مغفرت نہیں ہوگی' اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔

جواب ثالث یہ آیت عام ہے لیکن دوسری آیت سے مخصوص ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ قول " اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا "پہلی آیت سے مخصوص ہے' اجماعِ امت اس کا مؤید ہے' کیوں کہ اس بات پر اجماعِ امت ہے کہ کافر اور مشرک دونوں ناقابلِ مغفرت ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے" اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا "یعنی بیشک وہ لوگ جو کافر ہوئے اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں ہوں گے"۔

سوال اللہ تعالیٰ تو مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:" اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاءُ "(کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کو مقدس بتلاتے ہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بنادیں) نیز فرمایا:" فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى "(النجم:۳۲) (تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو (بس) تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے) ان آیات سے تو معلوم ہوا کہ اپنے کو مقدس اور متقی نہیں کہنا چاہئے' لیکن ایک حدیثِ مبارک میں حضورِ اقدس ﷺ نے خود کو مزکّی اور مقدس فرمایا ہے' حضورؐ نے فرمایا:"میں خدا کی قسم آسمان میں بھی امین ہوں اور زمین میں بھی امین ہوں" اسی طرح یوسف علیہ السلام نے بھی فرمایا:" اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ "(یوسف:۵۵) (ملکی خزانوں پر مجھ کو پر مامور کردو' تحقیق میں نگہبانی کرنے والا خوب جاننے والا ہوں")؟

جواب حضورِ اکرم ﷺ نے مذکورہ فرمان اس وقت فرمایا تھا جب منافقین نے حضورؐ پر الزام لگایا تھا کہ آپؐ نے عدل اور امانت کے ساتھ مال تقسیم نہیں کیا' آپ کو چاہئے کہ اس تقسیم میں عدل و انصاف سے کام لیں تو آپؐ نے ان کی تردید اور تکذیب کے لئے مذکورہ فرمان ارشاد فرمایا۔ اور یوسف علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی وجہ صرف احکامِ الٰہی کا نفاذ اور حق وعدل کا قیام تھا جو

کہ انبیاء کے فرائضِ منصبی میں سے ہوا کرتا ہے۔ نیز یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اس وقت ان کے علاوہ اور کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اس اہم کام کو سرانجام دے سکے لٰہذا یوسف علیہ السلام ہی چونکہ اس کے لئے متعین تھے اس لئے انہوں نے اس منصب کا مطالبہ کیا اور خود اپنی تعریف بیان کی' اس کے باوجود نبی کریم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف علیہ السلام پر رحم فرمائے اگر وہ یہ نہ کہتے کہ مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو' تو اللہ اس کو اسی وقت حاکم بنادیتے لیکن ان کے کہنے کی وجہ سے ایک سال کی تاخیر ہوئی''۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ........ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ'' (کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا ہے (پھر باوجود اس کے) وہ بُت اور شیطان کو مانتے ہیں..... یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ملعون بنادیا ہے) یہاں کلام حصر کے لئے ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی لعنت ان میں منحصر ہے' حالانکہ اللہ کی لعنت ان میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام کفار کو شامل ہے؟۔

جواب ''اُولٰٓئِكَ'' کے لفظ سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ کفار مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ راہِ راست پر ہیں' ظاہر ہے یہ بات تمام کفار کی طرف سے پائی جاتی ہے لٰہذا لعنت ان تمام کو شامل ہوگی۔

سوال '' كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ'' (جب ایک دفعہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کردیں گے تاکہ عذاب ہی بھگتتے رہیں) اس سے بظاہر یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ گناہ والی کھالوں کی جگہ اور اس کے بدلہ ان کھالوں کو عذاب دیں گے جن کھالوں نے گناہ نہیں کئے' حالانکہ بے قصور کو عذاب دینا ظلم ہے؟۔

جواب اول جب ان کی نئی کھالوں کو عذاب دیا جائے گا تو اس عذاب کا درد ان کے دلوں کو ہوگا اور ظاہر ہے کہ وہ دل تو نئے نہ ہوں گے بلکہ اصل میں وہ دل ہی شرک وغیرہ کی وجہ سے عاصی ہوں گے۔

جواب ثانی تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ ان کی کھالیں تو وہی رہیں گی البتہ کھالوں کو جلانا اور گلانا بار بار ہوگا' یعنی یہاں ایک کھال کی جگہ دوسری کھال کی تبدیلی کا ذکر صفات کے اعتبار سے ہے' نہ کہ ذات کے اعتبار سے۔ صفات کی تبدیلی مراد ہے' ذات کی تبدیلی مراد نہیں ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا

فرمان ہے: ''یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ'' (ابراہیم:۴۸) (جس روز دوسری زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی)۔ نیز جیسے ایک شاعر کا شعر ہے:

وما النّاس بالنّاس الذین عہدتہم ☆ وَماالدارُ بالدار التی کنتُ اعہد

(یہ لوگ وہ لوگ نہیں ہیں جن سے میں نے عہد کیا تھا اور نہ یہ گھر وہ گھر ہے جہاں میں رہتا تھا)۔

سوال یہ کیسے فرمایا: '' وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا '' (اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ میں داخل کریں گے)۔

جنت میں تو دھوپ نہیں ہوگی کہ اس کی گرمی سے بچنے کے لئے سایہ کی ضرورت پیش آئے؟

جواب یہاں مجازاً خوشگوار اور پر آسائش مقام مراد ہے جیسا کہ عرف عام میں ایسا کہتے ہیں۔ کیونکہ حجاز کے علاقے شدید گرم ہوتے تھے اس لئے سایہ کی جگہ ان کے لئے بڑی عمدہ تھی' لہٰذا ان سے ان کے فہم اور سمجھ کے مطابق خطاب کیا گیا' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا '' (مریم:۶۲) (اور ان کو ان کا کھانا صبح وشام ملا کرے گا) حالانکہ جنت میں نہ طلوع آفتاب ہوگا اور نہ غروب آفتاب کہ اس میں صبح وشام کا وقت آئے' لیکن چونکہ جنت میں کھانے پینے کی تمام نعمتیں دن کے دونوں حصوں میں ان کے لئے موجود ہوں گی اس لئے یہ تعبیر اختیار کی کہ ان کے لئے صبح وشام رزق موجود ہوگا۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ '' (تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء)۔ اس آیتِ مبارکہ میں ان لوگوں کی مدح بیان ہوئی ہے جو اللہ ورسولؐ کے مطیع وفرماں بردار ہیں۔ اہلِ عرب کی عادت تو یہ ہے کہ جب کسی کی مدح بیان کرتے ہیں تو پہلے ادنیٰ کا ذکر کرتے ہیں پھر اعلیٰ کو بیان کرتے ہیں جسے ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ کہتے ہیں' لیکن یہاں تو اس کا عکس ہے' یعنی اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول ہے؟۔

جواب یہاں کلام سے مراد مذکورہ امر نہیں ہے بلکہ یہاں کلام سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ جو لوگ اللہ ورسولؐ کے فرماں بردار ہیں وہ قیامت کے روز معزّزین اور خواص کے ساتھ ہوں گے۔ پھر گویا کسی سائل نے ان اشراف اور خواص کے متعلق سوال کیا کہ وہ کون ہیں؟ تو مزید افادہ کی خاطر معنیٰ مقصود مکمل ہونے کے بعد تفصیل بیان کی گئی کہ '' فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ '' الآیۃ اور اس تفصیل کے بیان کرنے میں اخص فالاخص اور اشرف فالاشرف کا لحاظ فرمایا

گیا' اشراف اور خواص کو ذکر کرنے کی غالب وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے: "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ" نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ" خلاصہ یہ ہوا کہ آیتِ ہذا سے مقصود اجمالی طور پر خبر دینا ہے نہ کہ تفصیلی طور پر' جس کی دلیل یہ ہے کہ جب بندوں کو تعلیم دی کہ وہ اللہ سے اس چیز کو مانگیں تو ان لوگوں کی اس قول سے اجمالاً رہنمائی فرمائی: "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ"۔

سوال یہاں ارشاد فرمایا: "اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا" (تحقیق شیطان کی تدبیر کمزور ہوتی ہے) اور عورتوں کی تدبیر کے بارے میں فرمایا: "اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ" (تحقیق تمہاری تدبیر عظیم ہوتی ہے) ان دو آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا مکر شیطان کے مکر سے زیادہ بڑا ہوتا ہے حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ شیطانی تدبیر' نسوانی مکر سے عظیم تر ہوتی ہے؟

جواب پہلی آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے مخلص اور نیک بندوں کے خلاف شیطان کی تدبیر حفاظتِ خداوندی کی وجہ سے کمزور اور لچر ہوتی ہے' جیسے ارشاد ہے: "اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ" یعنی میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا اور طرح ابلیسِ لعین کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا: "اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ" (صٓ:۸۳) (بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں)۔ اور دوسری آیت سے مراد یہ ہے کہ عورتوں کے مکر اور ان کی چالاکیاں مردوں کے بہ نسبت عظیم ہیں۔ دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ: "اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ" عزیزِ مصر کا قول ہے' اس کے قائل اللہ تعالیٰ نہیں ہیں۔ لہٰذا ان آیات میں کوئی تناقض یا تعارض نہیں ہے۔

سوال "وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ" (اور اگر ان کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ (اتفاقاً) ہو گئی اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ آپ کے سبب سے ہے) اس آیت سے منافقین اور مشرکین کی عیب چینی اور ان کی مذمت کی گئی ہے پھر اس قول سے اس کا رد کیا گیا: "قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" (آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے) پھر اس کے بعد فرمایا: "مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ" (تجھ کو جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ کی جانب سے ہے اور جو کوئی بدحالی پیش آئے وہ تیرے ہی سبب سے ہے) اب اس آیت میں منافقین کے بعینہ سی قول کی خبر دی گئی ہے جس کا

پہلے رد کیا گیا تھا؟

جوابِ اوّل بعض علماء کہتے ہیں کہ دوسرا جملہ بھی منافقین کے قول کی حکایت ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: '' فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا '' یعنی ان لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے کہ یہ یوں کہتے ہیں: '' مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ '' الآیۃ۔

جوابِ ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اے انسان! تجھے جو کوئی خوشحالی اور آسودگی حاصل ہوتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے ہوتی ہے اور جو کوئی بدحالی اور قحط زدگی پیش آتی ہے وہ تیرے ہی گناہوں اور شامتِ اعمال کے سبب آتی ہے' نہ کہ محمد ﷺ کے سبب' جیسا کہ مشرکین خیال کرتے ہیں۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی سے ہوتی ہے: '' وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ '' (الشوریٰ: ۳۰) (اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سی تو درگزر ہی کر دیتا ہے)۔

سوال یہ کیسے کہا گیا ہے کہ شر اور معصیت' اللہ کے ارادہ سے ہوتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: '' وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ '' (اور تجھے جو کوئی بدحالی پیش آئے تو وہ تیرے ہی سبب سے ہے)؟

جواب ان آیات میں ''حسنة'' سے مراد طاعت اور ''سيئة'' سے مراد معصیت نہیں ہے۔ بلکہ ان سے مراد خوش حالی و بدحالی اور نصرت و ہزیمت ہے' جیسا کہ علماء کے اس میں اختلافی اقوال ہیں' غور کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے '' مَآ اَصَابَكَ '' (جو کچھ تجھے پیش آئے) فرمایا ہے: ''مَا عَمِلْتَ مِنْ سَيِّئَةٍ'' (جو برائی تو نے کی) نہیں فرمایا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا'' (تو کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے)' یہاں دو طرح کے سوالات ہیں' پہلا سوال یہ ہے کہ اس آیت کا مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن میں اختلاف کم ہے' ورنہ وصفِ کثرت کے ساتھ اس اختلاف کو مقید کرنے کا کوئی فائدہ نہیں' حالانکہ قرآن میں نہ زیادہ اختلاف ہے اور نہ کم' یعنی بالکل اختلاف ہی نہیں ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں اختلاف کثیر کا نہ ہونا اس بات پر دال ہے کہ غیر اللہ کی جانب سے آنے والی ہر کتاب میں اختلاف کثیر پایا جاتا ہے' حالانکہ یہ خلافِ واقع ہے' اس لئے کہ یہاں اختلاف سے مراد یا تو اس کے الفاظ میں

کذب اور تناقض ہے یا اس کے معانی میں تباین اور تعارض ہے یا پھر بلاغت اور حکمت وغیرہ میں بعض کا بعض کے درمیان تفاوت ہے؟

جواب از سوالِ اوّل: وصفِ کثرت کے ساتھ اختلاف کو مقید کرنا مبالغہ فی الاثبات کے لیے ہے گویا یوں فرمایا: "اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں اختلاف قلیل تو کیا' بکثرت تفاوت پاتے' لیکن یہ قرآن چونکہ اللہ کی جانب سے ہے اس لئے اس میں نہ کثیر اختلاف ہے اور نہ قلیل' لہٰذا یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ یہاں اختلاف کو وصفِ کثرت کے ساتھ مقید کرنے سے مقصود یہی ہے' اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ قرآن کریم قلیل اختلاف پر مشتمل ہے' کثیر پر نہیں ہے۔

جواب از سوالِ ثانی: علم وفن کی کوئی بھی کتاب جو غیر اللہ کی طرف سے ہو اس میں مذکورہ تفاسیر میں سے کسی نہ کسی تفسیر کے مطابق فی الجملہ اختلاف ضرور موجود ہوتا ہے جس کی معرفت استقراء اور تتبع سے ممکن ہے۔ اور قرآن مختلف علوم وفنون کا جامع ہے' لہٰذا اگر قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ہر فن کی نسبت سے کچھ نہ کچھ اختلاف اور تفاوت ضرور ہوتا' جس کی وجہ سے مجموعہ اختلاف' اختلافِ کثیر بن جاتا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: "وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا" (اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے) فضل و رحمت نہ ہونے کی صورت میں قلیل لوگوں کا استثناء کیا گیا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلا استثناء سب لوگ شیطان کے پیروکار ہو جاتے' یہاں کیا وجہ ہے کہ قلیل لوگوں کا استثناء کیا گیا ہے؟۔

جوابِ اوّل یہ استثناء ماقبل کی طرف راجع ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: "اَذَاعُوْا بِهٖ اِلَّا قَلِيْلًا"

جوابِ ثانی بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے" لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا"

جوابِ ثالث بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے:" ولولا فضل اللّٰه عليكم بارسال الرسل لاتبعتم الشيطٰن فى الكفر والضلال الا قليلا منكم كانوا يهتدون بعقولهم الى معرفة اللّٰه تعالى و توحيده "یعنی اگر رسولوں کو مبعوث کر کے اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تم سب کفر وضلالت میں شیطان کے پیروکار بن جاتے سوائے چند لوگوں کے کہ وہ اپنی عقلوں کے ذریعہ خدا کی توحید اور معرفت کو حاصل کر لیتے۔ جیسے بعثتِ نبویؐ سے قبل قس بن ساعدہ اور ورقہ بن نوفل وغیرہ حضرات

سے نے اپنی عقل کے ذریعہ توحید باری تعالیٰ اور معرفتِ خداوندی کو سمجھا۔

سوال اس آیتِ کریمہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت کا وجود اکثر لوگوں کے لئے شیطان کی اتباع سے مانع ہے' حالانکہ حقیقتِ حال اس کے خلاف ہے کیونکہ اکثر لوگ کافر ہیں' اس کی تائید فرمانِ نبویؐ سے بھی ہوتی ہے' آپؐ نے فرمایا: ''اسلام' کفر کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے سیاہ رنگ کے بیل میں ایک سفید بال ہو''؟

جواب یہاں خطاب صرف مومنین کو ہے' تمام لوگوں کو نہیں ہے۔

سوال اگر آیتِ مذکورہ میں خطاب صرف مومنین کو ہے تو پھر استثناء کا کیا معنی ہے؟ اگر اس سے مراد شیطان کی ان معاصی میں اتباع ہے جن کیطرف وہ دعوت دیتا ہے یا جن کا دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے تو بایں مراد اکثر مومنین اس میں اس کے پیروکار ہیں اگرچہ عمر بھر میں کسی کبیرہ گناہ میں ایک بار ہی کیوں نہ ہو' اور اگر اس سے مراد دعوت الی الکفر میں اتباعِ شیطان ہے تو کسی بھی مومن نے کفر کے اندر اس کی پیروی نہیں کی ہے؟

جواب اس آیتِ مبارکہ کا معنی یہ ہے کہ اے مومنو! اگر رسولؐ کے ذریعہ ہدایت دے کر اللہ تعالیٰ کا تم پر فضل نہ ہوتا تو تم کفر اور بُت پرستی وغیرہ امور میں شیطان کی پیروی کرتے مگر بعض تم میں سے ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ارسالِ رسولؐ کے علاوہ بھی زیادتیِ ہدایت اور نورِ بصیرت سے نوازا ہے کہ وہ اس کی بدولت کبھی بھی اس کی رحمت و کرم سے شیطان کے پیچھے نہ لگتے' جیسے قس بن ساعدہ اور ورقہ بن نوفل وغیرہ۔

سوال ''وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا'' (اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی) جس طرح قول اور علم کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ ھذا القول اقول یاھذالعلم اعلم۔ اسی طرح ھذالصدق اصدق بھی نہیں کہا جاتا' کیوں کہ صدق نام ہے خبر کا واقع کے مطابق ہونا' لہٰذا جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ خبر نفس الامر اور واقع کے مطابق ہے تو اس میں کمی وزیادتی کا احتمال نہیں ہوتا؟

جواب یہاں پر ''اَصْدَقُ'' قائل کی صفت ہے' قول کی صفت نہیں ہے' ظاہر نفس الامر اور واقع کے لحاظ سے دو قائل صدق میں متفاوت ہو سکتے ہیں' اگرچہ وہ دونوں قصۂ واحدہ کی خبر دینے میں مساوی ہوں گے اور ہر ایک اس میں صادق ہوگا' لہٰذا یہ صدق میں ایک قائل کو دوسرے قائل پر ترجیح دینا ہے' نہ کہ ایک صدق کو دوسرے صدق پر ترجیح دینا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی بھی بات میں زیادہ صادق نہیں ہے' اس لئے کہ غیر اللہ کے لئے غیرِ صدق

عقلاً ممکن ہے' بلکہ واقع بھی ہے' ولو نادرًا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ دونوں چیزوں سے منزہ اور پاک ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی ہے: "كُلَّمَا رُدُّوٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا" (جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں جا گرتے ہیں) "رکس" کا معنی بھی "رد" کے آتے ہیں' اس لحاظ سے معنی یوں ہو جائیں گے "كُلَّمَا رُدُّوا الى الفتنة ردو فيها" اور یہ تکرار ہے؟

جواب فاعل مختلف ہونے کی وجہ سے تکرار نہیں ہے' معنی یہ ہو جائیں گے "جب کبھی ان کو ان کی قوم شرک کی طرف بلاتی ہے تو اللہ ان کو اس کی طرف لوٹا دیتے ہیں اور ان کے نفاق کی نحوست کو انہی پر پلٹ دیتے ہیں"۔ لہٰذا پہلا "رد" دعا (بلانا) کے معنی میں ہے اور "رکس" رد اور نکس کے معنی میں ہے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ کا کیا مطلب ہے: "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً" (اور کسی مومن کی شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے لیکن غلطی سے)۔ جب کہ کسی مومن کو غلطی سے قتل کرنا بھی جائز نہیں ہے؟

جواب اول یہاں "اِلَّا" "وَلَا" کے معنی میں ہے' یعنی "اور نہ ہی غلطی سے"۔ جیسے ان آیات میں "اِلَّا" "وَلَا" کے معنی میں ہے۔ ارشاد ہے: "اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ" نیز فرمانِ الٰہی ہے: "لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ"

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ مومن کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو اس وقت قتل کرے جب کہ اسے اس کے ایماندار ہونے کا یقین ہو' ہاں البتہ جب اس کو غالب گمان ہو کہ یہ مومن نہیں ہے اور وہ مشرکین کی صف میں موجود ہو تو پھر اس کو قتل کرنا جائز ہے اگرچہ وہ نفس الامر میں مومن ہو۔

سوال یہ بات کیسے کہی جاتی ہے کہ جو مسلمان کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوں گے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے' حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا" (اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہنا ہوگا اور اس پر اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے اور اس کو اپنی رحمت سے دور کر دیں گے اور اس کے لئے بڑی سزا کا سامان کرینگے)' اس آیت میں تو اس کی سزا خلود فی النار بتائی گئی ہے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے ایمان دار ہونے کے سبب اس کو قصداً قتل کر دے' ظاہر ہے جو کسی مومن کو اس لئے قتل کر ڈالے کہ یہ صاحب ایمان ہے تو وہ کافر ہو جائے گا' اور کافر کی سزا

خلود فی النار ہی ہے۔

جواب ثانی خلود سے مراد طولِ مکث (طویل عرصہ رہنا) ہے' اس لئے کہ خلود سے جب ابدیت مراد نہ ہو تو اس سے طولِ مکث مراد ہوتا ہے' جیسے کہتے ہیں: خلّد السلطان فلانا فی الحبس' مطلب یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اس کو طویل مدت تک قید میں رکھا۔

سوال پہلے فرمایا: "فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً" (بزرگی دی اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو ساتھ مالوں اپنے کے اور جانوں اپنی کے اوپر بیٹھ رہنے والوں کے درجہ میں) اس کے بعد فرمایا: "وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا لا دَرَجٰتٍ مِّنْهُ" (اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اجرِ عظیم دیا ہے یعنی بہت سے درجے)۔ ان آیات میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی' پہلی آیت سے ایک درجہ کے اعتبار سے مجاہدین کی فضیلت کو بیان فرمایا اور دوسری آیت میں بہت سے درجات کے اعتبار سے ان کی فضیلت کو ذکر کیا گیا؟

جواب پہلی آیت میں مجاہدین کی ان لوگوں کے مقابلہ میں فضیلت بیان کی گئی ہے جو کسی عذر کی بناء پر گھر بیٹھے رہے کہ ان مجاہدین کو ایسے قاعدین کے مقابلہ میں ایک درجہ میں فضیلت ہے کیونکہ وہ لوگ بھی جہاد کا عزم وقصد رکھتے تھے مگر کسی عذر کی وجہ سے مجاہدین کے ساتھ شامل نہ ہو سکے اس لئے فرمایا: "وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" (اللہ تعالیٰ نے سب سے اچھے گھر کا وعدہ کر رکھا ہے) یعنی جنت کا وعدہ ہے مجاہدین سے بھی اور کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں نہ جا سکنے والوں سے بھی۔ اور دوسری آیت میں مجاہدین کی ان لوگوں پر تفضیل بیان کی گئی ہے جو بلا عذر جہاد کرنے والوں کے ہمراہ نہ گئے۔ ایسے قاعدین کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہے' بلکہ وہ کوتاہی کرنے والے اور گنہگار ہیں' لہٰذا ایسے قاعدین کے مقابلہ میں ان مجاہدین کی بہت سے درجات کے ساتھ فضیلت معلوم ہوئی' کیونکہ ان قاعدین کے لئے کوئی فضیلت ہی نہیں ہے۔

سوال اس ارشادِ باری تعالیٰ میں: "قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ" (وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم کس کام میں تھے' وہ کہتے ہیں کہ ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے)۔ جواب' سوال کے مطابق نظر نہیں آتا' جو جواب ان فرشتوں کے قول کے مطابق ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس کام میں تھے یا ہم کسی کام میں نہیں تھے؟

جواب "فِيْمَ كُنْتُمْ" کا معنی توبیخ ہے یعنی فرشتوں نے ان کو زجر اور توبیخ کی ہے کہ وہ دین سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتے کیونکہ انہوں نے ہجرت نہیں کی' لہٰذا "فِيْمَ كُنْتُمْ" کا قول مجازًا "لَمْ

تَرَکْتُمْ'' کے معنی میں ہے'یعنی تم نے ہجرت کیوں ترک کی ہے؟

چنانچہ انہوں نے اس کی علت بیان کرتے ہوئے اور فرشتوں کی توبیخ پر اعتذار کرتے ہوئے کہا: ''کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ '' (ہم سرزمین میں محض مغلوب تھے)' فرشتوں نے ان کے اس اعتذار کو اس طرح رد کیا: ''اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا'' (کیا خدا تعالٰی کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترکِ وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہیئے تھا)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم دور ہونے کی وجہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے تو مکہ سے کسی قریبی علاقہ کی طرف چلے جاتے جہاں تم اپنے دینِ اسلام کے اظہار پر قدرت رکھ سکتے۔

سوال اللہ تعالٰی کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ ''فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ '' (پس تحقیق ثابت ہو گیا ثواب اس کا اللہ تعالٰی کے ذمہ) یعنی واجب ہو گیا۔ غلام تو اپنے آقا پر کسی اجر کا مستحق نہیں ہوتا' اس لئے کہ وہ اجیر نہیں ہے بلکہ وہ خالص غلام ہے' لہٰذا یہ کیسے فرمایا کہ اس کا اجر' اللہ کے ذمہ واجب ہو گیا؟۔

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ اجر اس جہت سے واجب اور ثابت ہو گیا کہ اس نے اپنے بندوں سے اس کا وعدہ فرمایا ہے کہ وہ کسی کا نیک عمل کبھی ضائع نہیں کرے گا' اور اللہ تعالٰی کا وعدہ کے خلاف کرنا محال ہے۔ لہٰذا اجر کا یہ وجوب اس جہت سے ہے' اور یہ وعدہ بھی ابتداءً اس کا فضل ہے۔

سوال اس ارشادِ خداوندی میں مسافر کے لئے قصر کے جواز کے لئے دشمن کے خوف کی شرط کیوں لگائی گئی ہے' حالانکہ قصر' امن کی صورت میں بھی جائز ہے فرمایا: ''وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ '' الآیۃ (اور جب تم زمین میں سفر کرو.......)

جواب اوّل دشمن کے خوف کا ذکر شرط کے طور پر نہیں ہے بلکہ غالب اور عادت (اکثر) کے اعتبار سے ہے۔ رسولِ کریم ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ کے اکثر اسفار دشمن کے خوف سے خالی نہیں ہوتے تھے' اس کی نظیر اللہ تعالٰی کا یہ فرمان ہے: ''فَکَاتِبُوْھُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِیْھِمْ خَیْرًا''

جواب ثانی اصل میں کلام , اللہ تعالٰی کے اس فرمانِ مبارک پر پورا ہو جاتا ہے: ''اِنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ'' اور آگے یہ فرمانِ خداوندی: ''اِنْ خِفْتُمْ'' الآیۃ مستقل کلام ہے یعنی جملہ مستانفہ ہے (نئی بات شروع ہو رہی ہے) اور اس کا جواب محذوف ہے' اور وہ ہے: ''فَاحْتَاطُوْا اَوْتَاھَبُوْا'' یعنی پھر تم احتیاط سے کام لو یا پھر تم تیاری کرو۔

جواب ثالث یہاں قصر سے مراد وہ قصر ہے جس کے شرائط وارکان میں سے شدّتِ خوف کی حالت ہے جیسے خوف اس قدر شدید ہو کہ رکوع اور سجدہ کے ساتھ نماز نہ پڑھی جا سکتی ہو یا قبلہ رخ ہو کر نماز

ادا نہ کی جا سکتی ہو یا سواری سے اتر کر نماز کا فریضہ ادا نہ ہو سکتا ہو۔ اس سے مراد رکعات کی تعداد میں قصر نہیں ہے اور مذکورہ قصر خوف دشمن کے ساتھ مشروط ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے: "اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" (یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے) لفظ "کَانَتْ" ماضی پر دال ہے حالانکہ نماز فی الحال اور تا قیامت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے؟

جواب لفظِ "کَانَ" قرآنِ عزیز میں پانچ معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (۱) "کَانَ" ازل اور ابد کے معنی میں جیسے: "وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا" (۲) "کَانَ" ماضی کے معنی میں انقطاع کے ساتھ۔ جیسے: "وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ" اور "کَانَ" کے معانی میں اصل یہی ہے۔ جیسے "كَانَ زَيْدٌ صَالِحًا" اَوْ فقيرًا اَوْ مريضًا (۳) "کَانَ" بمعنی حال جیسے "اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" (۴) "کَانَ" بمعنی استقبال جیسے: "وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ" یعنی صار (ہو گیا)۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا يَرْجُوْنَ" (اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ امید نہیں رکھتے)۔ جس طرح مسلمان اجر و ثواب کی امید رکھتے ہیں اسی طرح کفار بھی مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کرنے میں ثواب کی امید رکھتے ہیں کیونکہ کفار بھی مسلمانوں کی طرح اپنے دین کو حق خیال کرتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دینِ الٰہی کی نصرت کر رہے ہیں اور اس کا دفاع کر رہے ہیں اور اس کے دشمنان کے خلاف جنگ کر رہے ہیں پس ثابت ہوا کہ یہ "رجا" (امید) دونوں میں مشترک ہے؟ جب مشترک ہے تو یہ کیوں فرمایا گیا کہ تم اللہ سے امید رکھتے ہو اور وہ امید نہیں رکھتے ہیں؟

جواب اول بعض کہتے ہیں کہ یہاں "رجا" خوف کے معنی میں ہے جیسے اس ارشادِ باری تعالیٰ میں ہے: "مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا" نیز جیسے اس میں ہے: "قُلْ لِّلَّذِيْنَ يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ" جیسے شاعر کا قول ہے:

اذا لسعه النحل لم يَرْجُ لَسْعَهَا

یعنی جب اسے شہد کی مکھی ڈنک مارتی ہے

تو وہ اس کے ڈسنے کا خوف نہیں کھاتا۔

جواب ثانی اگر "رجا" اصل (امید) ہی کے معنی میں ہو تو پھر اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مسلمانوں کو بشارت دی ہے اور ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کا دین تمام ادیانِ عالم

پر غالب ہوگا' ظاہر ہے کہ اس طرح کی بشارت اور وعدہ قرآن کے علاوہ باقی تمام کتب میں موجود نہیں ہے' لہٰذا دونوں باتیں الگ الگ ہوگئیں' ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے مسلمان ہی اس بشارت اور وعدہ کے ایفاء کی امید کر سکتے ہیں۔ کفار نہیں کر سکتے۔

جواب ثالث مسلمانوں کے لئے "رجا" ہے اور کافروں کے لئے "طمع" ہے" رجا" اس چیز کی ہوتی ہے جس کا سبب بھی صحیح ہو اور جس کے مقدمات بھی درست ہوں' اور "طمع" اس کے برخلاف ہے' اس اعتبار سے کافروں کے لئے "طمع" تو ہے' مگر "رجا" نہیں ہے' "رجا" صرف مسلمانوں کے لئے ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک سے کیا مراد ہے اور اس کے ذکر کرنے میں کیا نکتہ ہے: "اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ" (یا اپنی جان کا ضرر کرے) 'صرف اس قول پر اقتصار کیوں نہیں کیا: "وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا" (اور جو شخص برائی کرے)۔ کیونکہ ظلمِ نفس بھی عملِ سوء میں داخل ہے' صرف عملِ سوء کا ذکر کر دیتے؟

جواب اول یہاں "اَوْ" واؤ کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ "اور وہ شخص اس برائی کی وجہ سے اپنی جان کا ضرر کرے جس نے معصیت پر اسے دھنسایا"۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ "عملِ سوء" سے مراد شرک کے ماسوا دیگر برائیوں میں ملوّث ہونا ہے اور "ظلمِ نفس" سے مراد شرک ہے۔

جواب ثالث "عملِ سوء" سے مراد ہے وہ گناہ جس کا ضرر دوسرے تک متعدی ہو' اور "ظلمِ نفس" سے مراد ہے وہ گناہ جس کا ضرر اس کے فاعل تک محدود ہو۔

سوال اللہ تعالیٰ کا فرمانِ مبارک ہے: "وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ" (اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا ارادہ کرا یا تھا) اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے فضل کی وجہ سے ان لوگوں کی طرف سے آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ نہیں پایا گیا۔

حالانکہ تفاسیر میں یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے آپ کو بہکانے کا ارادہ کیا تھا۔ بلکہ "ھمّ" (قصد وارادہ) سے بڑھ کر ان کی طرف سے "قول مضل" (بہکانے والی باتیں) بھی پایا گیا' یہ بات اس قصہ کے ابتدائی حصہ سے معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے: "اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ"؟

جواب ''لَهَمَّتْ'' ''لَوْلَا'' کا جواب نہیں ہے' بلکہ ''لَوْلَا'' سے مقدم ہے۔ ''لَوْلَا'' کا جواب محذوف ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: ''لَقَدْ هَمَّتْ طائفة منهم اَنْ يَضلوك ولولا فضل الله عليك ورحمته لا ضلوك '' (یعنی ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کرلیا تھا اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو یہ لوگ آپ کو بہکا دیتے)۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں: ''لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ '' (عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی ہاں مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ خیرات کی ترغیب دیتے ہیں۔۔۔۔) فعل سے اسم کا استثناء کیسے درست ہے' کیوں کہ ''نَجْوٰى '' فعل ہے اور ''مَنْ '' اسم ہے؟

جواب یہاں الفاظ مقدر ہیں' عبارت اس طرح ہے: ''اِلَّا نَجْوٰى مَنْ اَمَرَبِصَدَقَةٍ'' لہٰذا یہاں فعل کا استثناء فعل سے ہی ہو رہا ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ '' اصل میں ہے: ''بِرّ من اٰمَنَ بِاللّٰهِ ''

سوال پہلے امر بالخیر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اِلَّا مَنْ اَمَرَ '' پھر فعل بالخیر کا ذکر فرمایا: ''وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ '' الآیۃ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب پہلے آمر بالخیر کا ذکر اس لئے کیا تاکہ فاعل بالخیر کی خیریت بطریق اولیٰ معلوم ہو جائے' پھر فاعل کا ذکر کیا اور اس کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا تاکہ حکم بجالانے والے فاعل بالخیر کی آمر بالخیر پر فضیلت کا اظہار ہو' جب آمر بالخیر سے اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے تو فاعل بالخیر سے بطریق اولیٰ اجرِ عظیم کا وعدہ ہوگا۔

سوال پہلے تو فرمایا: ''اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ''یعنی یہ لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر صرف لات و منات وغیرہ کی عبادت کرتے ہیں جو مؤنث ہیں' لیکن پھر فرمایا: ''وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ''(یعنی وہ لوگ صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو سرکش ہے؟''

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کی بت پرستی درحقیقت شیطان پرستی ہے۔ یا تو اس لئے کہ شیطان نے بت پرستی کے اچھے ہونے کا جوان کو دھوکہ دیا اور اس کو اچھی شکل میں ان کے سامنے پیش کرکے ان کو گمراہ کیا اور بہکایا اس میں ان لوگوں نے شیطان کی فرماں برداری اختیار کی' یا پھر اس لئے کہ شیطان بتوں پر مقرر ہے' کفّار کو بتوں کی پوجا کی طرف دعوت دیتا ہے اور عبادت خانوں کے خادم کا روپ اختیار کرکے ان سے گمراہانہ باتیں کرتا ہے۔

سوال یہ بات کیونکر صحیح ہے کہ بندہ کے لئے جنّتی ہونے کا حکم صرف ایمان کی وجہ سے لگایا

جائے گا' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں بظاہر عملِ صالح کی بھی شرط لگائی ہے: "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" (اور جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے کام کیے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی) اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں بھی عمل صالح کی شرط کا ذکر ہے: "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ" الآیۃ ورنہ اس تقیید کا کوئی فائدہ نہیں رہ جاتا؟۔

جوابِ اوّل عملِ صالح سے مراد اخلاص فی الایمان ہے۔

جوابِ ثانی عملِ صالح سے مراد تا زیست ایمان پر ثابت قدم رہنا ہے' ظاہر ہے یہ دونوں چیزیں ایمان کے دخول جنّت کے لئے سبب ہونے میں شرط ہیں۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے؟: "مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ" (جو شخص کوئی بُرا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا)۔ جبکہ توبہ کرنے والا جب توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے' اس کو اس کی برائی کی سزا نہیں دی جاتی' اسی طرح جو شخص کوئی برائی کرے پھر اس کے بعد کوئی نیکی کرلے تو وہ نیکی اس برائی کو مٹا دیتی ہے اور ختم کر دیتی ہے اور یہ بات نصِ قرآنی سے ثابت ہے؟

جوابِ اوّل اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ برا کام کرتا ہے اور موت تک اس پر مصر رہتا ہے تو اس کو سزا دی جائے گی' لیکن اگر وہ اس سے توبہ کرلیتا ہے تو پھر وہ اس کے عوض میں سزا نہیں دیا جائے گا۔

جوابِ ثانی مراد یہ ہے کہ مومن کو دنیا ہی میں اس کے گناہوں کا بدلہ مختلف قسم کے مصائب اور امراض وغیرہ کی صورت میں دیا جاتا ہے مگر کافر کو آخرت میں ہی اپنے کئے کا بدلہ ملے گا' جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

سوال اس ارشادِ الٰہی میں: "وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ" (الآیۃ) (نیک کام کرنے والے مومنوں کی تخصیص کی گئی کہ ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

حالانکہ ان کے علاوہ جو لوگ ہوں گے ان پر بھی ظلم نہ ہوگا؟

جوابِ اوّل "وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا" کا قول دونوں فریقوں کی طرف راجع ہے برائی کرنے والا فریق اور نیکی کرنے والا فریق' کیونکہ فریقین کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔

جوابِ ثانی ایجاز اور اختصار کی بناء پر ایک فریق کو ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا' کیونکہ یہ دوسرے فریق کے یہاں مضمر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ مومنوں پر ان کے اعمال کم

کر کے ظلم نہیں ہوگا اور کافروں پر ان کے گناہوں کی سزا کو بڑھا کر ظلم نہیں ہوگا۔

جواب ثالث یہاں "ظلم" سے طاعات کے ثواب میں کمی نہ کرنا مراد ہے اور یہ مومنوں کے ساتھ خاص ہے اس لئے کہ کافروں کے اعمال پر اجر و ثواب ہی نہیں ہوتا کہ جو کم کیا جائے۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" (اے ایمان والو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ) مومنوں سے ایمان کی طلب تو تحصیلِ حاصل ہے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ اے وہ لوگوں جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر بھی ایمان لاؤ۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اے وہ لوگو جو میثاق کے دن ایمان لائے ہو اب بھی ایمان لاؤ۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ اے وہ لوگو جو علانیہ طور پر ایمان لائے ہو پوشیدہ طور پر بھی ایمان لاؤ۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے: "اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ" الآیة (وہ ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر رہتے ہیں پھر اگر تمہاری فتح منجانب اللہ ہوگئی تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل گیا......) کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی کو "فتح" سے اور کافروں کی کامیابی کو "نصیب" سے تعبیر فرمایا ہے؟

جواب اس کی وجہ مسلمانوں کی عظمتِ شان اور کافروں کی حقارتِ شان کو بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی کامیابی ایک عظیم امر ہے' کیونکہ مسلمانوں کی کامیابی دینِ الٰہی کی نصرت اور اہلِ دین کی عزت سے عبارت ہے' آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں' حتیٰ کہ اللہ کے اولیاء پر نزول ہوتا ہے۔ جبکہ کافروں کی کامیابی دنیا کے معمولی مال و متاع کے حصول کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور وہ مذکورہ امور میں سے کسی امر کو متضمن نہیں ہوتی۔ اس لئے مسلمانوں کی کامیابی کو "فتح" سے اور کافروں کی کامیابی کو "نصیب" سے تعبیر کیا گیا۔

سوال اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے؟ "وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا" (اور اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہرگز غالب نہ فرمائیں گے)' حالانکہ غزوۂ احد وغیرہ سے لے کر آج تک کفار بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب آئے ہیں؟۔

جواب اس سے مراد دلیل و برہان میں غالب آنا ہے۔ ظاہر ہے مسلمان ہی ہمیشہ دلیل و برہان میں غالب رہے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' (بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں جائیں گے)۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ منافق کو کافر سے زیادہ سخت عذاب ہوگا حالانکہ منافق کا حال کافر سے بہتر ہے' کیونکہ منافق معصوم الدم ہوتا ہے اور کافر پر کفر کا حکم لگایا جاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے حق میں فرماتے ہیں: ''مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰی هٰۤؤُلَاۤءِ ؕ'' (یہ معلق ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان میں' نہ اِدھر نہ اُدھر)۔ پس اللہ نے ان کو نہ مومن قرار دیا اور نہ ہی کافر؟

جواب منافق کا حال اگرچہ ظاہری طور پر کافر سے بہتر ہے اور اچھا ہے مگر اس کا حال آخرت میں اللہ کے نزدیک کافر سے بھی بدتر ہے' اس لئے کہ منافق کافر کے ساتھ کفر میں شریک ہونے کے علاوہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ استہزاء اور اللہ اور مسلمانوں کے ساتھ فریب کاری میں بھی شریک ہے۔ اس لئے وہ زیادہ سخت عذاب میں گرفتار ہوگا۔

سوال ''لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ'' (اللہ تعالیٰ بُری بات کو پکار کر کہنے کو پسند نہیں کرتے مگر جو کوئی ظلم کیا جائے) اس آیت کا کیا معنی ہے؟ اللہ تعالیٰ تو بُری بات کو بالکل ہی پسند نہیں کرتے' وہ تو عفو و درگزر کو پسند فرماتے ہیں' مگر ''اِلَّا مَنْ ظُلِمَ'' سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم کی بُری بات کو پسند کرتے ہیں؟۔

جواب اس کا معنی ہے ''وَلَا جَهْرَ مَنْ ظُلِمَ'' (اور نہ ہی مظلوم کے بُری بات کو زبان پر لانے کو پسند کرتے ہیں) یعنی یہاں ''اِلَّا'' بمعنی ''وَلَا'' ہے۔ اسکی نظیر گزر چکی ہے ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا''۔

سوال ''وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ'' میں لفظ ''بَیْنَ'' کو ''اَحَد'' پر کیسے داخل کیا گیا؟' کلمہ ''بَیْنَ'' تو دو یا دو سے زیادہ امور کا تقاضا کرتا ہے' فرّقت بین زید و عمرو' یا فرقت بین القوم تو کہا جانا صحیح ہے مگر فرقت بین زید کہنا صحیح نہیں ہے؟

جواب یہ سوال و جواب سورۃ البقرۃ کے آخر میں بھی ''عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِكَ'' کے تحت گزر چکا ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ جب ''فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ'' الآیۃ (ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور ان کے کفر کی وجہ سے احکامِ الٰہیہ کے ساتھ ــــــ) میں ایک مرتبہ کفر کا ذکر ہو گیا تھا تو دوبارہ دوسری آیت میں ''وَبِكُفْرِهِمْ'' کفر کا اعادہ کیوں کیا گیا ہے؟

جواب اس لئے کہ ان کی طرف سے کفر بھی متکرر رہا تھا' کیونکہ انہوں نے پہلے موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ کفر کیا پھر محمد ﷺ کے ساتھ بھی کفر کیا' چنانچہ بعض کفر کا بعض پر عطف کیا گیا۔

سوال یہود تو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے منکر تھے' وہ عیسیٰؑ کو ساحر بن ساحرہ اور فاعل ابن فاعلہ کہتے تھے' لہٰذا وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیغمبرِ خدا ہونے کا اقرار کیسے کر سکتے ہیں جس کو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے: ''وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ'' (اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کر دیا)؟

جواب یہود نے ان کو اللہ کا رسولؑ بطورِ استہزاء کے کہا' جیسے فرعون نے کہا: ''اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ'' (بلاشبہ تمہارا وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے البتہ دیوانہ ہے)۔

سوال اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی ہے: ''وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ط مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ج'' (اور جو لوگ ان کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں ہیں اس سے' ان کے پاس اس پر کوئی علم نہیں' مگر پیروی کرنا گمان کا)' اس آیتِ مبارکہ میں اولاً ان کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ شک میں ہیں پھر بتایا گیا کہ وہ ظن کا ہی اتباع کرتے ہیں۔ حالانکہ شک میں دونوں جانبین مساوی ہوتی ہیں اور ظن دو جانبوں میں سے ایک جانب کے راجح اور غالب ہونے کا نام ہے' یعنی ظن اور شک معنی کے اعتبار سے مختلف ہیں' لہٰذا وہ لوگ شک کرنے والے بھی ہوں اور ظن کرنے والے بھی ہوں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور پھر ظن کا استثناء علم سے کیا گیا' حالانکہ ظن' علم کے افراد میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا قسیم ہے؟

جواب اول یہاں ظن' شک کے معنی میں مجازاً استعمال کیا گیا ہے' کیونکہ ان دونوں کی عدمِ جزم میں مشابہت ہے' اور اس آیت میں ظن کا علم سے استثناء منقطع ہے' چنانچہ یہاں ''اِلَّا'' ''لٰكِنَّ'' کے معنی میں ہے' اس کی نظیر یہ فرمانِ خداوندی ہے: ''لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا'' (وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ کوئی بیہودہ بات پس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آئے گی)۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے: ''لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ'' (تاکہ نہ ہو واسطے لوگوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کے الزام بعد پیغمبروں کے)' اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ ارسالِ رُسُل کی علت یہ بیان کرنا کہ ان لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے بظاہر صحیح نہیں ہے' کیونکہ ارسالِ رُسُل سے قبل بھی لوگوں کو ایسے عقلی دلائل عطا کیے گئے ہیں جو اس کی معرفت تک پہنچانے والے ہیں' لہٰذا ارسالِ رُسُل کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہنے کا کیا مطلب ہوگا؟۔

جواب اصل میں اللہ تعالیٰ کے رُسُل اور اس کی کتب، غفلت سے بیدار کرنے والی اور عقلی دلائل میں غور کرنے پر ابھارنے والی ہیں اور دنیا کی حقیقت کو اور تکلیف (مکلّف ہونے) کے ان احوال کا انکشاف اور ان کی تفصیل بیان کرنے والی ہیں جن کی معرفت عقلِ انسانی سے پوری طرح حاصل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبروں کو بھیجنا لوگوں کی علت کے ازالہ کے لئے اور ان پر لزومِ حجت کی تکمیل کے لئے ہے۔ تاکہ کل کو وہ یہ نہ کہہ دیں: ''لَوْ لَا اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا'' یعنی آپ نے ہماری طرف پیغمبر کیوں نہیں بھیج دیا جو ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کرتا اور واجب الانتباہ امر پر متنبّہ کرتا۔

سوال ''اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ '' (اتارا اس کو اپنے علمی کمال کے ساتھ) فرمایا ہے ''انزله بقدرته'' یا ''انزله بعلمه وقدرته'' نہیں فرمایا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فعل، علم و قدرت کے بغیر نہیں ہوتا؟

جواب اوّل اس کا معنی ہے: ''انزله متلبسًا بعلمه'' یا اس کا معنی ہے: وفيه علمه۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے اس کتاب کو آپؐ پر یہ جانتے ہوئے اتارا کہ ساری مخلوق میں سے آپ ہی پر اس کا نزول اولیٰ ہے۔

سوال ''رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ '' (اللہ کے رسول ہیں اور اس کے ایک کلمہ ہیں) جب کہ کلام اللہ صفتِ قدیمہ ہے اور قائم بذاتہٖ ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ مخلوق ہیں اور حادث ہیں؟ لہٰذا ان'' پر کلمۃ اللہ'' کا اطلاق کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟۔

جواب اوّل اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا شکمِ مادر میں آنا اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کن'' سے بغیر باپ کے واسطہ کے ہوا، جبکہ حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ دوسرے انسانوں کا معاملہ حضرت آدمؑ کے سوا اس سے مختلف ہے۔

جواب ثانی ''کلمہ'' سے مراد حجت ہے۔

سوال اگر پہلے جواب کے مطابق حضرت عیسیٰؑ پر کلمہ کا اطلاق درست ہے تو حضرت آدمؑ پر بھی اس کا اطلاق درست ہونا چاہیے، بلکہ بطریقِ اولیٰ درست ہونا چاہیے کیونکہ حضرت آدمؑ میں یہ معنی بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ حضرت آدمؑ اس کلمہ ''کُنْ'' کے ذریعہ ماں اور باپ دونوں کے واسطوں کے بغیر پیدا ہوئے؟

جواب ہم بایں معنی حضرت آدمؑ پر بھی کلمہ کے اطلاق کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

سوال اگر حضرت آدمؑ پر بھی کلمہ کا اطلاق صحیح ہے تو قرآنِ کریم میں ضرور اس کا ذکر ہوتا جیسے حضرت عیسیٰؑ کے حق میں آیا ہے؟

جواب عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس کی تخصیص کی گئی ہے کیونکہ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ (مریمؑ) پر بہتان لگاتے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کی باپ کی طرف نسبت کرتے تھے ان کی تردید کے لئے ان کے حق میں "کلمۃ اللہ" لایا گیا ہے۔

جبکہ یہ معنی اور صورت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں نہیں پائی جاتی' کیونکہ سب لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آدم علیہ السلام نہ کسی باپ کی طرف منسوب ہیں اور نہ ہی کسی ماں کی طرف منسوب ہیں۔

سورۃ المائدۃ

سوال "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (اے ایمان والو عہدوں کو پورا کرو) اور "اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ" (تمہارے لئے تمام چوپائے جو مشابہ انعام (یعنی اونٹ' بکری' گائے) کے ہوں حلال کئے گئے ہیں) کے مابین کیا مناسبت اور ربط ہے؟۔

جواب "عُقُوْدٌ" سے مراد وہ عہود ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حلال کی تحلیل اور حرام کی تحریم کے سلسلہ میں ان سے لیے۔

چنانچہ پہلے اجمالاً اس کا ذکر فرمایا پھر اس کے بعد "اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ" اور "حُرِمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ" الآیۃ میں اسی کی تفصیل بیان کر دی گئی۔

سوال "مَا اَکَلَ السَّبُعُ" (اور جو کھا گیا ہو درندہ) کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ جو درندہ کھا گیا ہو وہ تو معدوم ہو گا اس کا کھانا تو ناممکن ہے' لہٰذا اس کی تحریم چہ معنی دارد؟

جواب اس کا معنی ہے درندے کے کھانے کے بعد جو حصہ باقی بچا ہے اس کا کھانا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی: "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا) کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بطورِ دین پسند نہیں کیا تھا' حالانکہ اسلام بعثتِ نبویؐ سے ہی حضور انور ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے لئے اللہ کے نزدیک پسندیدہ رہا ہے؟۔

جواب "اَلْیَوْمَ" اصل میں پہلے دو جملوں کے لئے ظرف ہے' تیسرے جملہ کے لئے ظرف نہیں ہے' اس لئے کہ پہلا واؤ عطف کے لئے اور دوسرا ابتداء کے لئے ہے' لہٰذا تیسرا جملہ مطلق ہے' موقت نہیں ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ'' (لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا جانور ان کے لئے حلال کئے گئے ہیں آپ فرمادیں کہ حلال کی گئی ہیں تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں) جواب' سوال کے مناسب نہیں ہے' طیبات نہ معلوم ومتعین ہیں اور نہ ہی متفق علیہ کیونکہ طبیعتوں اور جگہوں کے اختلاف کے سبب وہ مختلف ہیں؟۔

جواب یہاں پر''طَیِّبٰتُ'' سے مراد ذبیحے ہیں' اہلِ عرب ذبیحہ کو طیّب بھی کہتے ہیں' نیز میتہ کو خبیث کا نام بھی دیتے ہیں۔ لہٰذا اصل مراد متعین ہوگئی' البتہ دیگر عمومات کی طرح یہ بھی عام مخصوص البعض ہے۔

سوال ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ'' (جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو) کہہ دینے کے بعد ''مُکَلِّبِیْنَ'' (تم سدھاتے ہو) میں کیا فائدہ ہے' کیونکہ ''مُکَلِّب'' کا معنی بھی ہے شکاری کتے کو تعلیم دینے والا؟

جواب ''مُکَلِّبٌ'' کا ایک معنی ہوتا ہے شکاری جانور کو شکار کے پیچھے لگانے والا اور اس پر آمادہ کرنے والا' اس معنی کے اعتبار سے یہاں کوئی تکرار نہیں ہے اور پہلے معنی کے اعتبار سے کہا جائے گا کہ پہلے تعیم تھی پھر تخصیص کردی' اس لئے کہ ان لوگوں کا عام طور پر شکار کا ذریعہ یہ کتے ہی تھے۔ گویا اغلب اور اکثر کے اعتبار سے اس کا ذکر کیا گیا۔

سوال ''وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ'' کا بظاہر تقاضا یہ ہے کہ خود یہ سدھائے ہوئے شکاری جانور حلال ہوں' حالانکہ وہ خود تو حرام ہیں؟

جواب یہاں عبارت مقدر ہے اصل میں ہے: ''مَصِیْدُ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ'' یعنی ان شکاری جانوروں کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے' اس کی تائید ''فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ'' (تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو کھاؤ) سے ہوتی ہے۔

سوال ''وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ'' (اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا) سے کیا مراد ہے۔ حالانکہ مومن بہ جیسے اللہ تعالیٰ ہیں اسی طرح مکفور بہ اللہ تعالیٰ ہیں جیسے: ''قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' اور ''کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ'' سے معلوم ہوتا ہے' لہٰذا جیسے یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ایمان کے ساتھ ایمان لایا اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس نے ایمان کے ساتھ کفر کیا؟

جواب اول ''وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ'' سے مراد ہے ''جو شخص ایمان سے پھر جائے'' جیسے کہتے ہیں کَفَرَ فُلَانٌ بِالْاِسْلَامِ یعنی فلاں شخص اسلام سے مرتد ہوگیا۔ کفر' ارتداد کے معنی میں ہے' کیونکہ

ارتداد بھی کفر کی ایک نوع ہے' اور یہاں "بِالْاِیْمَانِ" میں باء عَنْ کے معنی میں ہے' جیسے "سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ" اور "فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا" وغیرہ میں باء عَنْ کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی یہاں "ایمان" سے مراد مومن بہ ہے' یعنی مصدر بمعنی مفعول ہے۔ جیسے "صَیْدُ الْبَحْرِ" میں صَیْدُ' مصید کے معنی میں ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ" (اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور ثواب عظیم ہے) جبکہ "وَعَمِلُوا السَّیِّئَاتِ" (اور گناہ کئے) کہنا چاہئے تھا' کیونکہ مغفرت اس کے لئے ہوتی ہے جو برائیوں کا مرتکب ہو' نہ کہ اس شخص کے لئے جو نیک کام کرنے والا ہو؟

جواب کوئی بھی شخص چھوٹے بڑے گناہ سے خالی نہیں۔ اگرچہ وہ نیک کام کرنے والا ہو' آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے اس سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کے سیئات کو معاف کردے گا' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: "اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ" یعنی نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

سوال "وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ" الایۃ کے آخر میں فرمایا: "فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلَ" (اور جو شخص اس کے بعد کفر کرے گا وہ بے شک راہِ راست سے دور جا پڑا) حالانکہ جس نے اس سے قبل بھی کفر کیا تھا وہ بھی راہِ راست سے دور جا پڑا؟۔

جواب یہ بالکل صحیح ہے کہ جس نے اس سے پہلے کفر کیا وہ بھی راہِ راست پر نہیں ہے' لیکن انعامات کے ذکر کرنے کے بعد کی ضلالت زیادہ قبیح ہے' اس لئے کہ کفر کی قباحت' انکار کردہ نعمتوں کے بڑے ہونے کے بقدر ہوتی ہے' اسی لئے اس کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ "وَمِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓی" (اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں) کا انداز اختیار فرمایا ہے' یوں نہیں فرمایا: "وَمِنَ النَّصٰرٰی" (اور نصاریٰ میں سے)؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں کہ ہم نصاریٰ ہیں جھوٹے ہیں' انہوں نے اپنا نام نصاریٰ' اللہ کی نصرت کے دعویٰ پر رکھا تھا' انہی لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کہ ہم اللہ کے انصار ہیں' بعد ازاں وہ نسطوریہ' یعقوبیہ اور ملکانیہ کے ناموں سے انصارِ شیطان بنتے ہوئے الگ

الگ ہو گئے اس لئے ان کو زجر اور توبیخ کرنے کے لئے یہ اندازِ کلام اختیار فرمایا۔

سوال "یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ" (اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارے یہ رسول آئے ہیں کتاب میں سے جن امور کا تم اخفا کرتے ہو ان میں سے بہت سی باتوں کو تمہارے سامنے صاف صاف کھول دیتے ہیں اور بہت سے امور کو واگذاشت کر دیتے ہیں) سے کیا مراد ہے؟ نبی کریم ﷺ کے لئے یہ کیسے جائز ہے کہ وہ بعض ان امور کو ظاہر نہ کریں جن کو اہلِ کتاب چھپاتے تھے؟۔

جواب اوّل حضور علیہ السلام نے ان کے بعض مخفی امور کو اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ آپ حکمِ خداوندی کا اتباع فرماتے تھے دینی امور میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتے تھے آپؐ ایسے کاموں میں وحی الٰہی کا ہی اتباع فرمایا کرتے تھے لہٰذا جن امور کے بیان و اظہار کا آپ کو حکم دیا گیا آپؐ نے ان کو واضح کیا اور جن امور کے بیان اور اظہار کا حکم نہیں ملا اس کے متعلق تا حکمِ اظہار خاموشی اختیار فرمائی۔

اس جواب کے مطابق یہاں "عفو" مجازاً ترک کے معنی میں ہوگا' ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ان امور سے حضورؐ کو مطلع فرما دیا ہو مگر اہلِ کتاب کے سامنے ان کے اظہار کا حکم نہ دیا ہو۔

جواب ثانی جن امور کے بیان کرنے سے کسی شرعی حکم کا اظہار ہوتا اس کو آپؐ بیان فرما دیتے جیسے آنحضرت ﷺ کی صفات اور بشارت اور آیتِ رجم وغیرہ' اور جن امور کے بیان کرنے میں محض ان کی فضاحت اور آبرو ریزی ہوتی اور ان کا تعلق کسی شرعی حکم سے نہ ہوتا ان سے آپؐ درگزر فرماتے۔

جواب ثالث جن امور کے اظہار میں آپؐ کے کسی معجزہ کا اثبات یا جن صفات کے بیان سے آپؐ کی نبوت کی تصدیق ہوتی اس کو حضور ﷺ بیان فرماتے یا جن امور میں اہلِ کتاب باہم اختلاف کرتے اور آپ کو ان میں حکم (ثالث) بناتے تو آپؐ ان کی وضاحت فرما دیتے تھے۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: "قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۔ یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ" (تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح (یعنی قرآن مجید) کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں راہیں بتلاتے ہیں) حالانکہ بندوں کو جب تک پہلے ہدایت نہ دی جائے وہ رضائے حق کی اتباع نہیں کر سکتے پس یہاں دور لازم آتا ہے؟

جواب یہاں عبارت مقدر ہے: "یَھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنْ عَلِمَ اَنَّہٗ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَّبِعَ رِضْوَانَہٗ" یعنی

15619

جس کے بارے میں اللہ کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ رضائے حق کی اتباع کا ارادہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت بخشتے ہیں' جیسے اس آیت میں عبارت مقدر ہے: "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کی راہوں کے طالب ہیں ہم ان کو اپنے مجاہدہ کی راہیں ضرور دکھائیں گے۔

سوال یہ بات کہیں بھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی کہ یہودیوں یا نصرانیوں نے کہا ہو کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں لہٰذا "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ" (ہم اللہ کے بیٹے ہیں) سے کیا مراد ہے؟

جواب اول اللہ کے بیٹوں سے مراد اللہ کے خواص ہیں' جیسے کہا جاتا ہے 'ابناء الدنیا' یا ابناء الآخرة

جواب ثانی یہاں عبارت مقدر ہے' اصل میں ہے "ابناء انبياء الله" یعنی اللہ کے نبیوں کے بیٹے۔

سوال "قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ" (آپ یہ پوچھیئے کہ اچھا تو پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض عذاب کیوں دیں گے) کا کیا مطلب ہے؟ وہ لوگ تو اس بات کے منکر تھے کہ ان کو ان کے گناہوں کے عوض عذاب ہوگا۔ ان کا دعوی تو یہ تھا کہ جو گناہ وہ دن کو کرتے ہیں وہ رات کو معاف ہو جاتے ہیں اور جو رات کو کرتے ہیں وہ دن کو معاف ہو جاتے ہیں؟

جواب اول وہ اس بات کے معترف تھے کہ ان کو چالیس دنوں کے عوض عذاب ہوگا جن چالیس دنوں میں انہوں نے حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی میں گوسالہ کی پوجا کی تھی جب موسیٰ علیہ السلام' پروردگار کی ملاقات کے لئے گئے ہوئے تھے۔ جیسے ان کا قول ایک دوسری جگہ پر نقل کیا گیا ہے: "قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً"

جواب ثانی اس سے مراد وہ عذاب ہے جو اللہ نے بعضوں پر دنیا میں نازل کیا' جیسے اصحاب سبت کی شکلیں مسخ کر دی گئیں اور ان کو بندر بنا دیا گیا' قارون کو خسف (زمین میں دھنسانے) کا عذاب ہوا' اس توجیہ کے مطابق فعلِ مضارع (يُعَذِّبُكُمْ) بمعنی ماضی ہوگا' اور ان کی طرف عذاب کی نسبت اصل میں ان کے آباء کی طرف ہے۔ گویا کہ فرمایا کہ پھر اس نے تمہارے آباء واجداد کو کیوں عذاب دیا تھا۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے؟: "بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ط يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ" (بلکہ تم بھی منجملہ اور مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے بخشیں گے اور جس کو چاہیں گے سزا دینگے) اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اے یہودیو اور عیسائیو! وہ تم میں سے جس کو چاہیں گے بخشیں گے اور جس کو چاہیں گے سزا دیں گے تو اس سے ان کی مغفرت کا جواز

ثابت ہوتا ہے جو کہ اس آیت کی وجہ سے صحیح نہیں ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ" اور اگر اس سے مراد مومنین ہیں کہ مومنین میں سے جس کو چاہیں گے بخشیں گے اور جس کو چاہیں گے سزا دینگے تو یہ ان کے قول کا جواب نہیں بن سکتا؟۔

جواب اوّل اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کفر (وغیرہ) سے توبہ کر لیں تو جس کو چاہیں گے بخشیں گے۔

جواب ثانی مراد یہ ہے کہ مخلوقات میں سے جس کو چاہیں گے بخشیں گے یعنی مومنوں کو اور جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے یعنی مشرکوں کو۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے؟ "يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا" (اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب ملک بنایا) حالانکہ قوم موسیٰ صاحب ملک نہیں تھی؟

جواب اوّل اس سے مراد بنی اسرائیل کے صاحبِ ملک لوگ ہیں وہ بارہ قبیلوں کے بارہ صاحبِ ملک تھے، ہر قبیلہ کا ایک صاحبِ ملک۔

جواب ثانی اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحت و کفایت، خادم و زوجہ موافقہ اور گھروں سے نوازا، چنانچہ ان کو صاحبِ ملک فرمایا۔

جواب ثالث اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے وسیع محلات عطا فرمائے جن میں نہریں بہتی تھیں۔

سوال ان دو شخصوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ وہی غالب آئیں گے حتی کہ انہوں نے یہ کہا: "فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ" (جس وقت تم دروازہ میں قدم رکھو گے اسی وقت غالب آ جاؤ گے) آخر ان کو اپنے غالب آنے کا علم کس طریقہ سے ہوا؟

جواب اوّل کیونکہ انہیں حضرت موسیٰ کی اس خبر پر کامل یقین تھا کہ: "اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" (اس متبرک ملک میں داخل ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے)

جواب ثانی ان کو اپنے غالب ہونے کا علم غالب گمان کے طور پر ہوا تھا، انہیں وہ زمانہ یاد تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان کے دشمنوں کے خلاف نصرت و امداد فرمائی تھی۔

سوال "وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (اور اللہ پر توکل رکھو اگر تم ایمان رکھتے ہو) یہاں تعلیق اس امر کا فائدہ دیتی ہے کہ جو شخص اللہ پر توکل نہیں رکھتا وہ مومن نہیں ہے، ورنہ یہ

تعلیق بیکار ہے حالانکہ حقیقتِ امر یہ نہیں ہے؟

جواب یہاں پر ''اِنْ'' ''اِذَا'' کے معنی میں ہے' لہٰذا یہ تعلیل کے معنی میں ہوگا' جیسے اس آیتِ کریمہ میں ''وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ''

سوال دو آیتیں ہیں' ایک ہے: ''اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ'' (اس متبرک ملک میں داخل ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے) اور دوسری آیت ہے: ''فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ'' (پس تحقیق وہ زمین حرام کی گئی ہے ان پر) ان دو آیتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ یہ زمین تمہارے حصہ میں اللہ نے لکھ دی ہے بشرطیکہ تم اس کے باشندوں سے جہاد کرو' لیکن جب انہوں نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا تو کہہ دیا گیا کہ یہ زمین ان پر حرام کر دی گئی ہے یعنی ان کے ہاتھ نہ لگے گی۔

جواب ثانی کتابت اور تحریم دونوں عام ہیں لیکن ان سے خاص مراد لیا گیا ہے' چنانچہ کتابت (زمین کا تمہارے حصہ میں لکھ دینا) بعضوں کے لئے ہے اور اس سے مراد اطاعت گزار ہیں۔ اور تحریم بعضوں کے لئے ہے یعنی نافرمانوں پر حرام ہے۔

جواب ثالث تحریم' چالیس برس کے ساتھ موقت ہے اور کتابت غیر موقت ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوں گے کہ چالیس برس گزرنے کے بعد ان کے حصہ میں آئے گی۔ مگر یہ جواب ان حضرات کے قول کے مطابق تام ہوگا جو ''اَرْبَعِیْنَ'' کو ''مُحَرَّمَةٌ'' کی وجہ سے منصوب قرار دیتے ہیں اور اس کو ظرف بناتے ہیں لیکن جو لوگ ''اَرْبَعِیْنَ'' کو ''یَتِیْهُوْنَ'' کا ظرف بناتے ہیں ان کے قول کے مطابق تحریم ابدی طور پر ہوگی' اور یہ جواب تام نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تقدیری عبارت اس طرح ہوگی: ''فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَبَدًا یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً'' یعنی وہ زمین ہمیشہ کے لئے ان پر حرام کر دی گئی ہے اور وہ چالیس برس تک اس زمین میں سرگرداں پھریں گے۔

یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ امام فراء ان لوگوں میں سے ہیں جو ''اَرْبَعِیْنَ'' کے نصب کو محرّمة اور یتیھون کی بناء پر جائز قرار دیتے ہیں اور امام زُجاج ان لوگوں میں سے ہیں جو محرّمة کی وجہ سے اس کے نصب کے جواز کو منع کرتے ہیں۔ بعض نقل کرتے ہیں کہ تحریم ابدی طور پر تھی اور وہ چالیس برس کے بعد بھی داخل نہیں ہوئے' اور بعض سے یہ منقول ہے کہ جو لوگ ان میں سے باقی رہے اور جو مر گئے ان کی اولاد

چالیس سال کے بعد اس سرزمین میں داخل ہوئی۔

پہلی توجیہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ کلامِ عرب میں فعل کا ظرف پر تقدم غالب الاستعمال ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: سافر زید اربعین یوما' وغیرہ۔ جبکہ اس کا عکس بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ: "اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا" (جس وقت دونوں نے ایک نیاز پیش کی) فرمایا ہے۔ "قُرْبَانَیْن" (دو نیازیں) نہیں فرمایا' حالانکہ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک نیاز پیش کی تھی؟۔

جوابِ اول اس سے مراد جنس ہے جسے مفرد لفظ سے تعبیر کیا گیا' جیسے اس آیت میں: "وَالْمَلَكُ عَلٰى اَرْجَآئِهَا"

جوابِ ثانی عرب کے لوگ کبھی واحد بول کر تثنیہ مراد لیتے ہیں' جیسے اس آیت میں: "عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ" نیز ایک شاعر کہتا ہے:

فانی وقیار بھا لغریب یعنی اصل میں تھا "فانی بھا لغریب وقیار کذلک" اسی طرح اس آیتِ مبارکہ میں: "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصَّابِئِيْنَ" الآیۃ۔

جوابِ ثالث "قُرْبَانًا" واحد اس لئے لائے کہ فُعلان وزن میں واحد' تثنیہ اور جمع سب برابر ہیں۔

سوال "اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ" (خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں) "لَاَقْتُلَنَّكَ" (میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا) کا جواب کیسے بن سکتا ہے؟

جواب چونکہ قابیل کا اپنے بھائی سے حسد اس کی نیاز کے قبول ہونے کی وجہ سے تھا اسی چیز نے اس کو آمادہ کیا کہ وہ اس کو قتل کی دھمکی دے' اس لئے اس نے یہ بات تعریضاً اور حقیقتِ جواب سے کنایہ کے طور پر کہی۔

لہٰذا معنی یہ ہوا کہ جب تو نے اپنی نیاز تقویٰ سے خالی پیش کی تو مجھے کیوں کر قتل کرتے ہو' میں نے تو اپنی نیاز تقویٰ سے پیش کی۔

سوال ہابیل نے قابیل سے یہ کیسے کہا: "اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ" (میں یوں چاہتا ہوں کہ تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ لے) حالانکہ ایک اجنبی کے لیے جب بُرائی کا ارادہ اور اسے گناہ میں مبتلا کرنا حرام ہے تو بھائی کے لیے کیسے روا ہوگا؟۔

جوابِ اول یہاں حرفِ نفی مضمر ہے' اصل عبارت اس طرح ہے: "انی ارید ان لا تبوٓا باثمی واثمك" یعنی میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گناہ اور اپنے گناہ کے ساتھ نہ پھرو' جیسے اس آیت میں

حرف نفی مقدر ہے: "وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ "یعنی" ان لا تمید بکم "نیز جیسے اس آیت میں مقدر ہے" تَاللَّهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ "اور امری القیس کے اس قول میں بھی حرف نفی محذوف ہے:

فقلتُ یمینِ اللّٰهِ ابرح قاعداً یعنی لا ابرح قاعداً۔

جواب ثانی یہاں مضاف محذوف ہے' اصل میں یوں ہے:"اِنّی ارید انتفاء ان تبوأ باثمی واثمك "یعنی میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گناہ اور اپنے گناہ کو اپنے سر نہ رکھو۔ جیسے اس آیت میں مضاف محذوف ہے:" وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ " یعنی حبّ العجل۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ میں یہ امر چاہتا ہوں بشرطیکہ تم مجھے قتل کرو' مطلقاً نہیں۔

جواب رابع قابیل ظالم تھا' اور ظالم کی جزا کا ارادہ جب اللہ کی طرف سے اچھا ہے تو بندہ کی جانب سے بھی اچھا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا فرمان:" فَأَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِينَ "(پس ہو گیا پشیمانوں میں سے) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قابیل تائب ہو گیا تھا' کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ "ندامت ہی حقیقت میں توبہ ہے" لہٰذا قابیل مستحق دوزخ نہیں ہوگا؟

جواب اوّل قابیل کو شرمندگی اپنے بھائی کے قتل پر نہیں ہوئی تھی بلکہ سال بھر اپنی گردن پر اسے اٹھائے پھرنے پر ہوئی تھی یا اسے اس بات پر شرمندگی ہوئی کہ اسے اپنے بھائی کو دفن کرنے کی نہیں سوجھ رہی تھی بالآخر ایک کوے نے اس کو دفن کرنے کا طریقہ سکھایا۔ یا اسے اپنے بھائی کی گمشدگی پر پشیمانی ہوئی نہ کہ اپنے گناہ پر۔

جواب ثانی اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ قابیل کو شرمندگی اپنے بھائی کے قتل کرنے پر ہوئی تھی تو ممکن ہے کہ ندامت ان کی شریعت میں توبہ شمار نہ ہوتی ہو' صرف ہماری شریعت میں اس کا توبہ ہونا معتبر ہو۔

جواب ثالث توبہ' حقوق اللہ میں مؤثر ہوتی ہے' حقوق العباد میں مؤثر نہیں ہوتی۔ خون کرنا' حقوق العباد میں سے ہے' لہٰذا اس میں توبہ مؤثر نہیں ہوگی۔

سوال ایک کا قتل کل کے قتل کی طرح اور ایک کا احیاء کل کے احیاء کی طرح کیسے ہو سکتا ہے' جب کہ دلیل بدو وجہ اس کا انکار کرتی ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ جرم جنایت جب بھی متعدد اور بہ کثرت ہوں گے تو وہ اور زیادہ قبیح ہوں گے لہٰذا اس پر گناہ اور سزا کی زیادتی بھی مناسب ہوگی یہی بات عقل و حکمت کے مطابق ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس تشبیہ سے یا تو گناہ اور سزا میں

ایک فرد اور کُل افراد کے قتل کا مساوی ہونا مراد ہے یا متقارب ہونا مراد ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جب وہ دوسرے شخص کو یا تیسرے شخص کو (ھلم جرا) قتل کرے گا تو اس پر ایک اور گناہ نہیں ہوگا اور وہ ایک اور سزا کا سزاوار نہیں ہوگا' کیونکہ وہ کل افراد کے قتل کے گناہ کا ایک گناہ ہے' اور صرف اوّل یا اوّل اور ثانی کے قتل پر کُل کے قتل کی سزا کا مستحق ہوگا' اس لئے کہ جب ایک کا قتل کُل کے قتل کے مساوی یا مقارب ہے تو دو آدمیوں کا قتل' اس پر کُل انسانوں کے قتل کے گناہ اور کل انسانوں کے قتل کی سزا لازم کرے گا' لہٰذا اس کے بعد تیسرے اور چوتھے الیٰ آخرہ کے قتل سے کیا زیادتی ہوگی' اور یہ جائز نہیں کہ وہ ایک شخص یا دو شخصوں کے قتل سے بھی کُل انسانوں کے قتل کے گناہ کا مستحق ہو اور کل انسانوں کے قتل سے بھی کل انسانوں کے قتل کے گناہ کا مستوجب ہو؟۔

جواب اوّل راجح قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے ایک جان بھی ناحق قتل کر دی تو اگر اس کا ولی نہ ہو تو تمام لوگ دنیا میں اس کے خصم ہیں اور آخرت میں مطلقاً ہیں۔ کیونکہ سب لوگ ایک باپ اور ایک ماں سے پیدا ہوئے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے کسی ایسی جان کو جو نبی ہے یا امام عادل ہے قتل کر دیا تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام لوگوں کی منفعت کو ضائع کرنے کے اعتبار سے ساری انسانیت ہی کو قتل کر ڈالا۔

اس لئے کہ ایک نبی یا امامِ عادل کا نفع سب کو شامل ہوتا ہے۔

جواب ثالث '' مَنْ قَتَلَ '' سے مراد قابیل ہے۔ قابیل پر گناہ ایسا ہوگا جیسا سب لوگوں کے قتل کا گناہ۔ کیونکہ قابیل پہلا شخص تھا جس نے قتل کا طریقہ رائج کیا' لہٰذا اس کے بعد جو قتل بھی ہوگا اس کا گناہ قابیل کو سبب بننے کی بناء پر ملتا رہے گا۔

جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: '' مَنْ سنّ سنّة حسنة '' الحدیث۔ یہ معنی (بظاہر) احسن ہے البتہ آیت کے یہ الفاظ اس کے مؤید نہیں ہیں: '' مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ '' اس لئے کہ یہ معنی اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب اس سے مراد قابیل ہو اور رس کی کتابت بنی اسرائیل کے ساتھ خاص نہ ہو۔

سوال اس ارشادِ خداوندی کا کیا مطلب ہے: '' اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ '' الآیۃ (جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں ان کی یہی سزا ہے۔۔۔) بندہ اور رب کے درمیان لڑائی ممتنع (ناممکن) ہے؟

جواب اوّل یہاں عبارت مقدر ہے' اصل میں ہے '' یحاربون اولیاءَ اللّٰہِ '' یعنی اللہ کے اولیاء سے

لڑتے ہیں۔

جواب ثانی یہاں محاربت سے مراد مخالفت ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے: ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ'' (یقیناً جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس تمام دنیا بھر کی چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تاکہ وہ اس کو دے کر چھوٹ جائیں۔۔۔) یہاں پر ''بہ'' فرمایا ہے حالانکہ جب دو چیزیں پہلے مذکور ہیں تو ضمیر بھی ''بھما'' ہونی چاہئے؟

جواب اس قسم کا جواب پہلے بھی: ''اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا'' کے تحت گزر چکا ہے۔

یہاں ایک اور جواب بھی ہے وہ یہ ہے کہ اسمِ اشارہ کی جگہ پر اسمِ ضمیر کو رکھ دیا گیا ہے گویا کہ فرمایا: ''لیفتدوا بذلك'' اور ''ذلك'' کے ذریعہ واحد تثنیہ اور جمع سب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ ''فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ'' (اگر یہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو خواہ آپ ان میں فیصلہ کر دیجئے یا ان کو ٹال دیجئے) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اہلِ کتاب کے ساتھ معاملہ ان دو صورتوں سے خالی نہیں تھا' یا تو آپؐ ان میں فیصلہ فرما دیتے یا ان سے اعراض فرماتے' پھر اس کے ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب اول اس کا فائدہ یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کو ان کے مابین فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ اہلِ کتاب کے مابین فیصلہ کرنا آپؐ پر واجب نہیں ہے جیسے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرنا آپؐ پر واجب ہے جب وہ اپنا کوئی معاملہ لے کر آئیں۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ یہ تخییر اس آیت کریمہ سے منسوخ ہے: ''فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' اس سے مراد قرآنِ مجید ہے' اس کی دلیل یہ ہے: ''وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ'' یعنی آپ تورات کے ذریعہ فیصلہ کر کے ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں۔

سوال جب اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو نازل فرمایا تو انجیل منسوخ ہوگئی لہٰذا یہ کیسے فرمایا: ''وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ'' (اور انجیل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں)؟

جواب یہ عام مخصوص ہے' یعنی اللہ تعالیٰ نے انجیل میں حضور کی نبوت کی صداقت پر جو علامات نازل فرمائیں اور بیان فرمائیں ہیں اس کے مطابق اہلِ انجیل حکم کیا کریں' اور یہ منسوخ نہیں ہے۔

سوال اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: ''فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ

بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ" (پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو یہ یقین کر لیجئے کہ بس خدا ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعضے جرموں پر ان کو سزا دیں)، حالانکہ کفار تو اپنے تمام گناہوں اور جرموں پر سزا پائیں گے؟

جواب اول اس سے مراد دُنیوی سزا ہے، یعنی بنی النضیر یا بنی قریظہ کی جلاوطنی، اور یہ ان کے بعضے جرموں کی سزا ہے، کیونکہ یہ دائمی سزا نہیں ہے، باقی رہی ان کی وہ سزا جو ان کو شرک کی بناء پر ملے گی وہ دائمی ہوگی، دنیا میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ اس "بعض" سے مراد ان کا قرآنی حکم کو تسلیم نہ کرنے اور اس سے اعراض کرنے کا گناہ ہے، اس کو مبہم اس لئے رکھا تاکہ اس کی شان ظاہر ہو۔

سوال خدائی فیصلہ کا صحیح اور اچھا ہونا بالعموم ثابت شدہ امر ہے، خواہ یقین رکھنے والی قوم ہو یا نہ ہو۔

تو پھر یہ کیسے فرمایا: "وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" (اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا ہوگا یقین رکھنے والوں کے نزدیک)؟

جواب چونکہ یقین رکھنے والے لوگ دوسروں کی بہ نسبت اس سے زیادہ نفع اٹھاتے ہیں اس لئے حقیقت میں وہی منتفع ہونے والے ہیں، دوسرے نہیں ہیں، اس لئے ان کو خاص کر لیا گیا، اور اس کی نسبت انہی کی طرف کر دی گئی، اس کی نظیر یہ ہے: "اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا"۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: "وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ" (اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بیشک وہ انہی میں سے ہوگا) اس آیت کا بظاہر تقاضا یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے دوستی کرنے والا کافر ہو جائے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ فرمانِ الٰہی ہے: "لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ" الآیۃ؟

جواب "وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ" سے مراد منافقین ہیں، اس لئے کہ یہ آیت ان کے متعلق نازل ہوئی۔ کیونکہ منافقین ضمیر اور اعتقاد کے اعتبار سے کفار میں سے ہیں۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ ایسا شخص جزا کے لحاظ سے آخرت میں ان میں سے ہوگا اور اس کو سخت سزا ہوگی۔

سوال اس آیتِ کریمہ کا کیا معنی ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" (یقیناً اللہ تعالیٰ سمجھ نہیں دیتے ان لوگوں کو جو ظلم کر رہے ہیں)، حالانکہ کتنے ہی ایسے ظالم دیکھے گئے ہیں کہ انہوں نے توبہ کی تو اللہ نے ان کو ہدایت عطا کر دی؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے ظلم پر قائم رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دیں گے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے علمِ سابق میں جس کا گمراہی پر مرنا لکھا ہے اس کو ہدایت نہیں دیں گے۔

جواب ثالث آیت کا معنی یہ ہے کہ ظالم لوگوں کو قیامت کے دن جنت کا راستہ نہیں دکھائیں گے' مراد مشرکین ہیں۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ:'' اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ '' (نرمی کرنے والے ہیں مسلمانوں پر) فرمایا ہے۔ یوں نہیں فرمایا گیا:'' اَذِلَّةٍ لِلْمُؤْمِنِيْنَ '' جب کہ اہلِ عرب ذَلّ لہ کہتے ہیں ذل علیہ نہیں کہتے؟

جواب چونکہ '' ذل'' کا لفظ مہربانی اور نرمی کے معنی کو متضمن ہے اس لئے اس کو علیٰ سے متعدی کیا' گویا کہ یوں فرمایا'' حانين على المؤمنين عاطفين عليهم ''یعنی وہ مسلمانوں پر مہربان اور ان کے لئے شفیق ہوں گے۔

سوال اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے:'' وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ '' (اور جو شخص اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایماندار لوگوں سے سو اللہ کا گروہ بلا شک غالب ہے)' حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ مبارک سے آج تک کتنی بار اللہ کا گروہ غالب رہا؟ کیا مراد ہے اس غلبہ سے؟

جواب اس سے مراد حجت و برہان کا غلبہ ہے' نہ کہ دولت و حکومت کا غلبہ' ظاہر ہے کہ حزب اللہ سے مراد مومنین ہیں جو حجت و برہان کے لحاظ سے ہمیشہ غالب رہیں گے۔

سوال ''مَثوبة'' کا لفظ تو اچھائی کے ساتھ خاص ہے' لہٰذا یہ کیسے فرمایا:'' قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ '' الآیۃ (آپ کہیے کہ کیا میں تم کو ایسا طریقہ بتلاؤں جو اس سے بھی خدا کے یہاں پاداش ملنے میں زیادہ بُرا ہوا)؟۔

جواب ہمیں یہ بات تسلیم نہیں ہے کہ ثواب اور مثوبة کے الفاظ اچھائی کے ساتھ خاص ہیں' بلکہ اس کا معنی مطلقاً جزا (بدلہ) ہے' اس کی دلیل یہ ارشادِ خداوندی ہے:'' هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ''یعنی کیا بدلہ دیئے گئے کافر اس چیز کا کہ تھے کرتے۔ نیز ارشاد ہے:'' فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ '' مراد بدلہ دینا ہے' ثواب کا لفظ بشارت کی طرح ہے جو لغت کے اعتبار سے اچھی خبر کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ بری خبر کو بھی شامل ہے' جیسے فرمانِ الٰہی ہے:'' فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ''یعنی ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

سوال ایسے بہت سے لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجنے اور کتابیں نازل کرنے کا کیا فائدہ جن کے

بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّكُفْرًا" (اور ضرور جو مضمون آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب بن جاتا ہے)؟

جواب اس کا ایک فائدہ ان پر الزامِ حجت ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب پیغمبر تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہوگا تو اس میں اس رسول کی اور کتاب کی تعظیم ہوگی۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ" الآیۃ (اور اگر یہ لوگ توریت کی اور انجیل کی پوری پابندی کرتے ــــ) اس آیت میں آسودہ حالی اور رزق کی کشادگی کو کتاب پر ایمان اور اس پر عمل کرنے کے ساتھ مُعلّق (مشروط) کیا گیا ہے' حالانکہ حقیقتِ حال ایسی نہیں ہے' کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے وہ لوگ جو چاروں کتابوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور ان پر عمل پیرا بھی ہیں (جبکہ وہ منسوخ نہ ہوئے ہوں) ان کی زندگی مکدر اور رزق تنگ ہوتا ہے؟

جواب یہ تعلیق اہلِ کتاب کے ساتھ خاص ہے' اس لئے کہ انہوں نے رزق کی تنگی کی اس طرح شکایت کی تھی: "یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ" تو اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ ان کی یہ تنگی ان کے کفر اور معاصی کی نحوست کے سبب بطورِ سزا کے ہے۔ اللہ تعالیٰ رزق کی تنگی کو بعض بندوں کے لئے نعمت اور بعضوں کے لئے نقمت (عذاب) کے طور پر کرتے ہیں۔ یہی حال رزق کی کشادگی کا ہے۔ یعنی کبھی رزق کی کشادگی اور تنگی دونوں کسی گناہ پر سزا کے طور پر ہوتی ہے اور کبھی ان دونوں سے کسی نیکی پر جزا دی جاتی ہے' اور یہ امر اشخاص کے احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا رزق کی وسعت سے کسی کی عزت افزائی اور رزق کی تنگی سے کسی کی تذلیل لازم نہیں آتی۔ اور نہ ہی اس کا عکس لازم آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں اس کا رد فرمایا ہے: "فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ" سے لے کر "كَلَّا" تک۔ یعنی حقیقتِ حال ایسی نہیں ہے جیسے انسان خیال کرتا ہے' انسان سمجھتا ہے کہ رزق کی وسعت اکرام کی اور اس کی تنگی اہانت کی دلیل ہے' بلکہ کسی کو نیک کاموں کی توفیق حاصل ہونا اور ہدایت کا ملنا درحقیقت کسی کے اکرام کی دلیل ہے اور نیک کاموں کی توفیق سے محروم ہونا اور راہِ ہدایت حاصل نہ ہونا اہانت کی دلیل ہے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے: "یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" (اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجئے۔ اور اگر آپ ایسا نہ کرینگے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا ایک

پیغام بھی نہیں پہنچایا)۔

یہ بات تو سب جانتے ہی ہیں کہ اگر رسول' نازل شدہ احکام کو نہیں پہنچائیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچانے والے نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اس کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اوّل اس سے مراد یہود کے ان عیوب اور قبائح کو لوگوں تک پہنچانے اور اسکی تبلیغ پر برانگیختگی ہے جو آپؐ پر نازل کیے گئے' خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ تمام نازل کردہ باتوں کو پہنچا دیجئے۔ اگر آپ (بالفرض) اس کا ایک حرف بھی چھپائیں گے تو وہ گناہ اور مخالفت میں ایسے ہے جیسے کوئی ایک بات بھی نہ پہنچائے۔ تو یہاں بعض کے کتمان کو کل کا کتمان قرار دیا گیا۔

جواب ثانی اصل میں آنحضرت ﷺ کو تبلیغ کے سلسلہ میں تعجیل (جلدی کرنے) کا حکم دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے جمیع احکامات کی تبلیغ پر آمادہ اور اس کے میں پرعزم تھے لیکن بعض باتوں کو اپنی جان کے خوف کے سبب مؤخر فرمایا اگرچہ دوسرے وقت میں ان کی تبلیغ پر بھی آپؐ پُرعزم تھے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں آپؐ کو تبلیغ کے سلسلہ میں تعجیل کا حکم دیا گیا۔ اس قول کی تائید اس فرمانِ خداوندی سے ہوتی ہے: ''وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ '' یعنی ''اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا''۔

سوال اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں ''وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ '' (اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا) اپنے پیغمبرؐ کی حفاظت کی ذمہ داری کیسے لی' احد کی لڑائی میں تو آپؐ کا چہرۂ مبارک زخمی ہوا اور آپؐ کے دانت مبارک بھی شہید ہوئے؟

جواب اوّل اس آیتِ مبارکہ میں ''عصمت'' سے مراد قتل سے حفاظت ہے' نہ کہ تمام تکالیف سے حفاظت مراد ہے' کیونکہ تمام تکالیف اور آلام سے مکمل طور پر محفوظ ہونا انبیائے کرام علیہم السلام کے اخلاق کے مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام تمام مکارمِ اخلاق کے جامع ہوتے ہیں اور سب سے اشرف اور اکرام خُلق' تکالیف کو برداشت کرنا ہے۔

جواب ثانی یہ آیتِ مبارکہ غزوۂ احد کے بعد نازل ہوئی ہے' اس لئے کہ سورۃ المائدہ قرآنِ کریم کی ان سورتوں میں سے ہے جو آخر میں نازل ہوئیں۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ ''وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ '' (اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا) جب کہ بعض ظالمین یعنی گنہگار مسلمانوں کی قیامت کے روز حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم شفاعت فرمائیں گے' معلوم ہوا کہ آپؐ ان کی مدد کریں گے؟

جواب یہاں پر ''ظالمین'' سے مراد مشرکین ہے۔ جیسا کہ آیتِ ہذا کے اوّل اور درمیان

والے حصہ سے معلوم ہوتا ہے۔

سوال "قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ" (تحقیق گمراہ ہوئے اس سے پہلے) کے بعد پھر "وَضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ" (اور بہک گئے سیدھی راہ سے) کہنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب پہلے ضلال سے مراد ان کا انجیل سے بھٹکنا ہے اور دوسرے ضلال سے ان کا قرآن سے دور ہونا مراد ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ" (جو برا کام انہوں نے کر رکھا تھا اس سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے) اس آیت سے کیا مراد ہے' کیونکہ خود برا کام کر گزرنے کے بعد اس برے کام سے منع کرنا بے معنی ہے؟

جواب اول یہاں مضاف محذوف ہے' اصل عبارت یہ ہے: "كانوا لا يتناهون عن معاودة منكر فعلوه" یعنی وہ لوگ اس برے کام کی عادت سے ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے جو انہوں نے کر رکھا تھا۔ یا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اس برائی سے منع نہیں کرتے تھے جس کے کرنے کا وہ ارادہ کرتے۔

جواب ثانی یہ بھی ممکن ہے کہ "لَا يَتَنَاهَوْنَ" سے مراد لا يمتنعون ہو۔ یعنی وہ لوگ اس برے کام سے خود باز نہیں آتے تھے۔ جو انہوں نے کر رکھا تھا' بلکہ اس پر مُصر تھے۔ جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں "تناهى عن الامر اور انتهى عنه" دونوں کا معنی ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی اس کام سے باز آیا۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: "وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ" (لیکن ان میں زیادہ لوگ فاسق ہیں) یہاں "مِنْهُمْ" سے مراد علی اختلاف القولین یہود ہیں یا نصاریٰ' وہ تو سارے ہی فاسق ہیں؟

جواب یہاں مطلق فسق مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ فسق ہے جو مشرکین کے ساتھ دوستی اور ان تک خبریں پہنچانے سے لازم آتا ہے' ظاہر ہے کہ فسق کی یہ خاص صورت ان میں سے زیادہ لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا آیت کے شروع میں یعنی "تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ" الآیۃ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان سب کو شامل نہیں ہے۔

سوال اس ارشادِ مبارک کا کیا مطلب ہے: "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" (شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں) یہ تمام چیزیں تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں تو ان کے ایجاد میں شیطان کے عمل کو کیسے دخل ہوا؟۔

جواب یہاں عبارت مقدر ہے: "اِنّما تعاطی الخمر والمیسر الخ" یا اس طرح ہے "انما مباشرۃ الخمر والمیسر" یعنی شراب' جوا' بُت وغیرہ اور قرعہ کے تیر کے کام کرنا اصل میں شیطانی کام ہیں۔

سوال لیکن اس کے باوجود ان کو شیطانی عمل کیسے قرار دیا گیا؟ شراب اور جوئے وغیرہ کے کام تو فی الحقیقت انسانی عمل ہے؟

جواب شیطان کی طرف ان کی نسبت مجازًا ہے۔ کیونکہ شیطان ہی فاسقوں کے لئے تزیین ووسوسہ کے واسطہ سے اس فعل کے وجود کا سبب ہے' جیسے ایک آدمی دوسرے کو کسی کے مارنے پر اکسائے اور وہ اس کو مارے تو اکسانے والے کے متعلق یہ کہنا جائز ہے کہ یہ تیرا عمل ہے۔

سوال پہلی آیت میں شراب' جوئے' بت وغیرہ اور قرعہ کے تیروں کو جمع کیا (سب کا ذکر کیا) اور دوسری آیت میں صرف شراب اور جوئے کو خاص طور پر ذکر کیا' اس کی کیا وجہ ہے؟

جوابِ اوّل اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں بغض وعداوت زیادہ تر شراب اور جوئے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں کہ لوگ ان کی وجہ سے طاعات سے غافل ہوتے ہیں' جبکہ بُت وغیرہ اور قرعہ کے تیروں میں یہ خرابیاں نہیں پائی جاتیں' اگرچہ ان میں بھی دیگر مفاسد موجود ہیں۔

جوابِ ثانی بعض کہتے ہیں کہ دوسری آیت میں صرف شراب اور جوئے کا مکرر ذکر اس لئے کیا گیا کہ خطاب مسلمانوں کو ہے' جس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" اور وہ صرف شراب اور جوئے کا عمل کرتے تھے۔ اور پہلی آیت میں ان چاروں کاموں کو اس لئے جمع کیا تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ چاروں کام زمانۂ جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں' نیز یہ کہ بت پرستی اور غیب دانی کا دعویٰ کر کے اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کرنا اور شراب نوشی یا جوا بازی کو حلال خیال کرتے ہوئے کرنا ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ کا کیا معنی ہے: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّکُمُ اللّٰہُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُہٗٓ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّخَافُہٗ بِالْغَیْبِ" (اے ایمان والو اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان کرے گا جن تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے تاکہ اللہ تعالیٰ معلوم کرے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی کام اس لئے کریں تاکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو معلومات حاصل ہوں؟

جوابِ اوّل اس کا معنی یہ ہے کہ تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے ڈرنے والوں اور نہ ڈرنے والوں کو

ممتاز اور جدا جدا کردے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ تا کہ اللہ کے بندے جان لیں کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔ یہ جواب بھی پہلے کے قریب ہے۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ تا کہ خوف کو وقوع کی حالت میں جان لے جیسے اس کو انتظار کی حالت میں جانا۔

سوال فرمانِ خداوندی ہے: ''وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ'' (اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر پاداش واجب ہوگی جو کہ مساوی ہوگی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے) اس آیتِ مبارکہ کا مطلب کیا ہے؟ وجوبِ جزا کے لئے وصفِ عمدیت تو شرط نہیں ہے' کیونکہ اگر وہ اس کو بھول کر یا غلطی سے بھی قتل کرے گا تب بھی جزا واجب ہوگی؟

جواب حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کے نزدیک وجوبِ جزا کے لئے وصفِ عمدیت شرط ہے لہٰذا اس صورت میں تو یہ سوال وارد نہیں ہوگا۔ البتہ جمہور کے قول کے مطابق وصفِ عمدیت کے ساتھ جزاء مقید ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ جو واقعہ اس آیتِ مبارکہ کے نزول کا سبب بنا اس میں قتل عمداً ہوا تھا' بعض صحابہؓ حالتِ احرام میں مقام حدیبیہ میں تھے کہ ان کے سامنے ایک گورخر آ گیا' ابوالیسرؓ نے اس کو نیزہ مارا اور اس کو کاٹا' پھر یہ آیت نازل ہوئی' لہٰذا عمدیت کا وصف واقعہ کے اعتبار سے ہوا نہ کہ شرط کے اعتبار سے' امام زہریؒ کہتے ہیں: کتاب اللہ میں حکم عمد پر نازل ہوا اور سنّت میں خطا کی صورت میں بھی وجوب وارد ہے۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: ''هَدْيًاۢ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ'' (قربانی پہنچنے والی کعبہ کی) حالانکہ قربانی صرف حرم تک پہنچنا شرط ہے؟

جواب اول ہدی کے جانور کا حرم تک پہنچنے سے مقصود کعبہ کی تعظیم ہے اس لئے کعبہ کا ذکر فرمایا ہے۔

جواب ثانی اس کا معنی ہے ''بالغ حرم الکعبۃ'' یعنی کعبہ کے حرم تک پہنچنے والی۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ'' (خدا تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا اور عزت والے مہینہ کو بھی اور حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور ان

جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے ہوں یہ اس لئے تا کہ تم اس بات کا یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں) ان مذکورہ امور سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو خوب جانتے ہیں؟

جواب اول ''ذٰلِكَ'' سے ان تمام غیوب کی طرف اشارہ ہے جن کا اس سورت میں پہلے ذکر کیا گیا ہے جیسے انبیائے کرام اور منافقوں اور یہودیوں کے احوال وغیرہ۔ اس سے ان امور کی طرف اشارہ نہیں ہے جن کا اس آیتِ مذکورہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

جواب ثانی عرب کے لوگ خونریزیاں کرتے اور لوگوں کے مال لوٹتے لیکن جب حرمت والا مہینہ آجاتا یا وہ خود حرمت والے شہر میں داخل ہوتے تو ان کاموں سے باز آجاتے۔ پس یہ بات علمِ الٰہی میں آئی کہ اگر ان کے لئے کوئی ایسا مکان یا زمان مقرر نہ کیا جائے جو ان کو قتل وغارت اور لوٹ مار سے روکنے کا سبب بنے تو لوگ ہلاک وتباہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا مناسبت واضح ہوگئی۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: ''مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ'' (اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو) اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ ''جَعَلَ'' کا معنی تو پیدا کرنا ہوتا ہے جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے'' وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا'' نیز'' وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ'' حالانکہ ان اشیاء کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں مگر اس آیت میں اس کی نفی کی گئی ہے؟

جواب اول یہاں ''جَعَلَ'' سے مراد ایجاب اور امر ہے' مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو واجب نہیں کیا اور نہ ہی ان کا حکم دیا ہے۔

جواب ثانی یہاں ''جَعَلَ'' سے مراد تحریم ہے۔

سوال اس آیتِ کریمہ کا کیا معنی ہوگا'' يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ''(اے ایمان والو اپنی فکر کرو) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بس اپنی فکر کرنی چاہئے' حالانکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی واجب ہے' اس آیت سے تو اس کا عدمِ وجوب معلوم ہو رہا ہے؟

جواب اول '' اَنْفُسَكُمْ '' کا معنی ہے:'' اَهْلَ دِيْنِكُمْ '' یعنی اپنے اہلِ دین کی فکر کرو' جیسے:'' وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ '' کا معنی ہے'' اپنے اہلِ دین کو قتل نہ کرو۔

جواب ثانی اس سے مراد آخر زمانہ ہے جب فتنہ وفساد بڑھ جائے گا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا دشوار ہو جائے گا' جیسا کہ آج کا زمانہ ہے۔

سوال جب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے" مَا ذَآ اُجِبْتُمْ " (تم کو کیا جواب ملا تھا) تو پیغمبر کیسے عرض کرینگے کہ" لَا عِلْمَ لَنَا " (ہم کو کچھ خبر نہیں) حالانکہ وہ جانتے ہوں گے کہ ان کو انکی امتوں کی طرف سے کیا جواب ملا تھا؟

جواب اول اس وقت دوزخ کی آگ بھڑک رہی ہوگی اور موقع دہشت زدگی و سرگردانی کا ہوگا اور انسانی عقلیں چکرا رہی ہوں گی اس لئے اس طرح کے موقعوں پر کوئی بات نفی یا اثبات میں کسی طرح نہیں سوجھتی ہے۔

جواب ثانی پیغمبروں کا" لَا عِلْمَ لَنَا " کہنا اپنی امتوں سے شکایت کے طور پر تعریض اور ان سے انتقام کے بارے اللہ تعالیٰ سے اظہارِ التجاء کے طور پر ہوگا۔ گویا وہ کہیں گے: الٰہی! آپ جانتے ہی ہیں کہ ان کی طرف سے ہمیں کیا جواب ملا انہوں نے نہ ہماری تصدیق کی یا تکذیب۔

جواب ثالث اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے جو بھی جواب ملا ہم اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں' اس لئے کہ ہم تو اس کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آپ کی ذاتِ عالی اس کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ بعد والی آیات اس کی مؤید ہے۔

سوال حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ادھیڑ عمر میں لوگوں سے باتیں کرنا آپ کا معجزہ کیسے شمار ہو سکتا ہے؟

جواب اس اشکال کا جواب سورۃ آل عمران میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

سوال حواریوں نے یہ بات کیسے کہدی" هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ " (کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا نازل فرمائیں) انہوں نے تو بعض ممکن چیزوں کے بارے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کیا' یہ تو کفر ہے؟

نیز انہوں نے اللہ کی ذات کو استطاعت کے ساتھ موصوف کیا' یہ تو تشبیہ ہے' اس لئے کہ استطاعت کا تعلق تو جوارح و اعضاء کے ساتھ ہوتا ہے' جبکہ حواری' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص پیروکار تھے' اور ان پر ایمان رکھنے والے تھے' کہ جیسا کہ اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے:" قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ "؟

جواب اول ان کا یہ استفہام فعل سے تھا نہ کہ قدرت سے۔ جیسے ایک فقیر' مالدار صاحبِ قدرت شخص سے کہتا ہے: کیا آپ مجھے کچھ عطا کرنے پر قادر ہیں؟۔

اور اس کا نام استطاعۃ المطاوعۃ ہے' اس کو استطاعت القدرۃ نہیں کہتے۔

جواب ثانی مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کے لئے یہ بات آسان ہے کہ آپ اپنے رب سے مانگیں؟

جیسے کسی سے کہا جائے: کیا تم میرے ساتھ کھڑے ہونے کی استطاعت رکھتے ہو؟ جب کہنے والا جانتا ہو کہ وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے۔

سوال اگر یہی معنی مراد ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں ان کو نکیر کیوں فرمائی: "اِتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (خدا سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو)؟

جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ناگواری کا اظہار اس لئے فرمایا کہ انہوں نے ایسا محتمل المعنی لفظ استعمال کیا جو ایک مخلص مومن کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا' اگرچہ انہوں نے یہ لفظ قصدًا استعمال نہیں کیا تھا۔

سوال حضرت عیسیٰؑ نے کیسے فرمایا: "وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ" (اور نہیں جانتا میں جو کچھ آپ کے جی میں ہے) ہر نفس والا ذی جسم ہوتا ہے' اس لئے کہ "نفس" اس جوہر سے عبارت ہے جو قائم بذاتہ اور متعلق بالجسم ہو' اللہ تعالیٰ تو جسم سے منزّہ ہیں؟

جواب "نفس" کے دو معانی ہیں: ایک تو یہی جو اوپر ذکر ہوئے' نفس کا دوسرا معنی ہے شے کی حقیقت اور اس کی ذات۔ جیسے کہتے ہیں: نفس الذهب والفضة محبوبة مراد ہوتی ہے سونے چاندی کی ذات۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ دوسرا معنی مراد ہے۔

سوال حضرت عیسیٰؑ نے یہ کیسے فرمایا: "مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ" (نہیں کہا میں نے واسطے ان کے مگر جو کچھ حکم کیا تھا تو نے مجھ کو ساتھ اس کے کہ تم اللہ کی عبادت کرو۔۔۔) حالانکہ لوگوں کو توحیدِ خداوندی کی تبلیغ کے علاوہ بھی آپ نے بہت سا مباح کلام فرمایا ہے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے ان سے الٰہ سے متعلق وہی بات کہی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا۔

سوال جب عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں میں زندہ ہیں' ان کی وفات نہیں ہوئی تو پھر انہوں نے یہ کیسے فرمایا: "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" (پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا)؟ اس سے کیا مراد ہے؟

جواب "توفی" سے مراد ہے زمین پر ان کی مدّتِ اقامت مکمل کرنا۔ جس کا ذکر اس آیت میں گزر چکا ہے: "اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ" الآیۃ۔ اور یہ سوال ان لوگوں کے قول پر ہوسکتا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ سوال وجواب اس روز ہوئے جب آپ کو آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا۔ لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ سوال وغیرہ قیامت کے روز ہوں گے' اس صورت میں آپ کا جواب' سوال کے بالکل مطابق ہے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں۔

سوال اگر حضرت عیسیٰؑ یوں فرماتے: "اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ " (اگر آپ ان کو عذاب دیں گے تو آپ زبردست ہیں حکمت والے ہیں اور اگر آپ ان کو بخش دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں) تو آپس کی مناسبت زیادہ ظاہر ہوتی؟

جواب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر آپ ان کو سزا دیں گے تو یہ آپ کے بندے ہیں' یعنی مالکِ حقیقی و مطلق کا اپنے غلاموں میں تصرف مباح ہے' جو چاہے تصرف کرے' اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو آپ عزیز ہیں یعنی نافرمانوں سے انتقام نہ لینے اور ان کو سزا نہ دینے سے جس کی عزت میں کوئی کمی نہیں آتی اور حکیم بھی ہیں یعنی خواہ عذاب دیں یا معاف فرمائیں اپنے ہر کام میں حکمت والے ہیں۔

سوال اس سے کیا مراد ہے: "يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ" (یہ دن ہے کہ فائدہ دے گا سچوں کو ان کا سچ) ظاہر ہے اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ جبکہ صدق (سچ) دنیا اور آخرت دونوں میں فائدہ دیتا ہے' آیت کے الفاظ حصر کو ظاہر کر رہے ہیں؟

جواب آخرت میں صدق کا فائدہ چونکہ جنت کے حصول اور جہنم سے نجات کی صورت میں ظاہر ہوگا جو کہ دنیا میں نہیں ہے' اس لئے اُخروی نفع کی نسبت سے دنیوی نفع کالمعدوم ہے' چنانچہ اس کے مقابلہ میں اس کو مقید نہیں کیا۔

سوال اگر اس آیتِ کریمہ: "هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ" سے مراد ان کا آخرت میں سچا ہونا ہے تو آخرت تو دارالعمل نہیں ہے اور اگر اس سے مراد ان کا دنیا میں سچا ہونا ہے تو اس مضمون کے مطابق نہیں ہے' جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ کے سچے ہونے کی گواہی؟

جواب اس سے مراد وہ صدق ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں قائم رہا' حضرت قتادہؒ سے مروی ہے کہ قیامت کے روز دو متکلم سچ بولیں گے مگر ایک کو تو ان کا سچ بولنا فائدہ دے گا مگر دوسرے کو فائدہ نہیں دے گا' ایک ابلیس ہوگا وہ کہے گا: "اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ" یعنی بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا' اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا مگر میں نے خلاف وعدہ کیا۔ چنانچہ اس دن اس کا سچ بولنا اس کو کچھ نفع نہ دے گا۔ کیونکہ وہ اس سے قبل کاذب تھا' اور دوسرے حضرت عیسیٰؑ ہوں گے جو دنیا و آخرت دونوں میں صادق تھے چنانچہ ان کا سچ ان کے کام آئے گا۔

سوال آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ عقلاء اور غیر عقلاء ہیں' ایسا کیوں نہیں کیا کہ عقلاء کو

تغلیباً ذکر کرتے ہوئے: ''لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ'' فرمادیتے؟ یعنی ''ما'' کی بجائے ''مَن'' لے آتے؟

جواب اس لئے کہ کلمہ ''ما'' اصل وضع کے اعتبار سے تمام اجناس کو بالعموم شامل ہے۔ جب کہ ''مَنْ'' اصل وضع کے اعتبار سے تمام غیر عقلاء کو شامل نہیں ہے۔ لہٰذا کلمہ ''ما'' کا اس جگہ پر استعمال زیادہ جامع ہے۔

سورۃ الانعام

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ ''وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ'' (اور تاریکیوں کو اور نور کو بنایا) میں ''ظلمات'' کو جمع اور ''نور'' کو واحد لائے؟

جواب اوّل اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس سے قبل ظلمات کو جمع لائے ہیں اس لئے نور کو جمع لانے کی ضرورت نہیں' کیونکہ یہ اس پر دال ہے۔ جیسے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ'' میں سماوات کو جمع لانے کے بعد ''ارض'' کو پھر جمع لانے کی حاجت نہیں رہی۔

جواب ثانی دراصل ظلمۃ اسم ہے اور نور مصدر ہے' مفضل نے اس کو نقل کیا ہے' اور مصادر کی جمع نہیں لائی جاتی۔

سوال جب یہ فرمادیا: ''يَعْلَمُ سِرَّكُمْ'' (وہ تمہارے پوشیدہ احوال کو بھی جانتا ہے) تو پھر اس کے بعد ''وَجَهْرَكُمْ'' (اور تمہارے ظاہر احوال کو بھی) کہنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب صرف اس کے مقابلہ کے لئے ذکر فرمایا۔ جیسے اس آیتِ متبرکہ میں: ''فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ''۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ'' (اور واسطے اس کے ہے جو کچھ بستا ہے بیچ رات کے اور دن کے) جو حضرات سکون کی تفسیر حرکت کے مقابلہ میں کرتے ہیں ان کے قول کے مطابق اس آیتِ کریمہ میں حرکت کو چھوڑ کر صرف سکون کو خاص طور پر کیوں ذکر فرمایا؟۔

جواب اوّل اس لئے کہ ان میں سکون اغلب حالت ہے جو کہ حیوانات اور جمادات میں سے ہر مخلوق پر طاری ہوتی ہے' کیونکہ ساکن مخلوقات' تعداد کے لحاظ سے متحرک مخلوقات سے زیادہ ہیں' یا اس لئے کہ ہر متحرک تو سکون کی طرف لوٹتا ہے مگر ہر ساکن حرکت کی طرف نہیں لوٹتا۔ یا اس لئے کہ سکون اصل ہے' اور حرکت ایک حادثاتی اور وقتی ہے۔

جوابِ ثانی یہاں عبارت مقدر ہے اصل میں تھا: " مَا سَكَنَ وَتَحَرَّكَ " مگر اختصار کی خاطر صرف ایک کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا' کیونکہ وہ اپنے مقابل پر دال ہے۔ جیسے اس آیتِ کریمہ میں: " سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ " یعنی وَالْبَرْدَ۔

سوال اس میں کیا نکتہ ہے کہ یوں فرمایا گیا: " وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ " (اور وہی کھلاتا ہے اور وہ نہیں کھلایا جاتا) یوں نہیں فرمایا: " وَهُوَ يُنْعِمُ وَلَا يُنْعَمُ عَلَيْهِ " یعنی وہی انعام کرتا ہے' اس پر انعام نہیں کیا جاتا۔ بظاہر یہ صورت زیادہ عام ہے' کیونکہ یہ اطعام اور اس کے علاوہ چیزوں کو بھی شامل ہے؟۔

جوابِ اوّل چونکہ رزق کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا گیا۔

جوابِ ثانی مطعم کا آکل ومتغوط (کھانے والا اور پاخانہ کرنے والا) ہونا اس کے منعم علیہ ہونے سے زیادہ قبیح ہے اس لئے اس کا ذکر کیا۔

سوال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ مبارک: " قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ " (آپ کہئے کہ سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے۔ آپ کہئے کہ اللہ) اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی شے کے ساتھ موسوم ہوسکتے ہیں' اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر شے کے ساتھ اس ذات کو پکارنا بھی اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وغیرہ کی طرح درست ہو؟

جواب اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی صحت انہی الفاظ کے ساتھ مخصوص ہے جو الفاظ اس کی مدح وتعریف اور صفاتِ کمالیہ پر دلالت کرتے ہوں جیسے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وغیرہ۔ ایسا نہیں ہے کہ جس لفظ کا بھی اس ذاتِ عالی پر اطلاق صحیح ہو اس کے ذریعہ اس کو پکارنا بھی درست ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر موجو اور ثابت امر کا اطلاق اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر درست ہے لیکن ہر ایک کے ذریعہ اس کو پکارنا درست نہیں ہے کذا ذکروا۔

سوال شرعاً کسی مدّعی کا اللہ تعالیٰ کو اپنے دعویٰ کی صحت اور ثبوت کے لئے گواہ بنانا کافی نہیں ہے' حتی کہ اگر کوئی مدّعی کہے کہ اللہ تعالیٰ میرے گواہ ہیں تو یہ ناکافی ہے' لہٰذا اس کی کیا وجہ ہے کہ خود نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا: " قُلِ اللّٰهُ شَهِيدٌ م بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ " (آپ کہئے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ گواہ ہے)؟

جواب اصل میں نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لئے یہ صحیح نہیں ہے' کیوں کہ کوئی دوسرا شخص اس پر دلیل قائم نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے حق میں گواہ ہیں' جبکہ نبی کریم علیہ السلام نے ان الفاظ میں دلیل قائم فرمائی: " وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ " اس لئے کہ یہ معجزہ ہے:

سوال ارشادِ خداوندی ہے: " ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ " (پھر نہیں ہوگا بہانہ ان کا مگر یہ کہ کہیں گے قسم ہے اللہ پروردگار ہمارے کی نہ تھے ہم مشرک) یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت کے دن تمام امور کے حقائق کا معائنہ ہو جانے کے بعد بھی وہ تکذیب کر دیں' حالانکہ اس دن حال یہ ہوگا کہ "بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ " (قبروں کے تمام مردے زندہ کئے جائینگے) اور "حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ " (آشکارا ہو جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے)؟

جواب قیامت کے دن کی ہولناکی اور دہشناکی ایسی ہوگی کہ مصائب میں گرفتار شخص بدحواسی اور نفع ونقصان میں تمیز نہ کرنے کے سبب اس طرح کہے گا' جیسے دنیا میں عذاب میں مبتلا شخص کا حال ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی اور دوسرے کی بھی تکذیب کر دیتا ہے اور ایسی بات کہہ دیتا ہے جس سے اس کو نفع کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ جیسا کہ اہلِ دوزخ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے یہ کہیں گے: " رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا " یعنی اے ہمارے رب ہمیں اس دوزخ کے عذاب سے باہر نکال دیجئے۔ نیز خلودِ جہنم کا یقین ہونے کے باوجود کہیں گے " یَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ " یعنی اے مالک تمہارا پروردگار (ہمیں موت دے کر) ہمارا کام ہی تمام کردے' حالانکہ وہ جانتے ہوں گے کہ: " لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا "

سوال یہاں دو آیتیں ہیں' ایک تو یہی ہے اور دوسری آیتِ کریمہ یہ ہے: " وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا " (اور وہ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا اخفاء نہ کرسکیں گے) ان آیتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟

جوابِ اول قیامت کے دن مواقع مختلف ہوں گے' بعض مواقع پر وہ اخفاء کرسکیں گے اور بعض میں جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔ جیسے ارشادِ ربانی ہے: " فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ " نیز فرمایا: " فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ "

جوابِ ثانی اصل میں ان کا جھوٹی قسمیں کھانا ان کے اعضاء وجوارح کی ان کے خلاف شہادت دینے سے قبل ہوگا' اور " لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا " کا معاملہ جوارح کی ان کے خلاف گواہی دینے کے بعد ہوگا۔

سوال ارشادِ ربانی ہے: " وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ " (اور البتہ آخرت کا گھر متقیوں کے لئے بہتر ہے) کیا وجہ ہے کہ متقین کو خاص طور پر ذکر کیا گیا' حالانکہ دارِ آخرت غیرِ متقین جیسے مجانین واطفال' ان کے لئے بھی بہتر ہے؟

جواب متقین کو خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا گیا کہ وہ اس حیثیت سے اصل ہیں کہ ان کا درجہ

اعلیٰ ہے اور غیر متقین ان کے تابع ہیں۔

سوال اس میں کیا حکمت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے لئے اندازِ تخاطب اس طرح استعمال کیا "فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" (سو آپ نادانوں میں سے نہ ہو جایئے) اور حضرت نوح علیہ السلام سے یوں فرمایا: "اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" (بے شک میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم (آئندہ) نادان نہ بن جاؤ) یعنی حضرت نوحؑ سے تو نرم انداز میں خطاب فرمایا اور حضورِ اکرم ﷺ سے ذرا سخت انداز میں خطاب فرمایا' حالانکہ مرتبہ اور درجہ کے اعتبار سے حضورِ اکرم ﷺ ان سے اعلیٰ واشرف ہیں؟۔

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنے مطلوب سے ناواقف ہونے کی بناء پر معذور تھے' اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ان کے اہل کو نجات حاصل ہوگی' نوح علیہ السلام نے گمان کیا کہ ان کا بیٹا ان کے اہل میں سے ہے۔ اس لئے انہوں نے اللہ کے وعدہ کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کی نجات کے لئے دعا فرمائی تھی' جب کہ حضور نبی کریم ﷺ اس طرح کے معذور نہ تھے' حضورؐ یہ جاننے کے باوجود کہ ایمان وکفر کا تعلق مشیتِ خداوندی سے ہے اور یہ لوگ اللہ کی ہدایت سے ہی ہدایت حاصل کر سکتے ہیں آپؐ پر کفّار کا کفر گراں بار ہوتا تھا۔

سوال اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے: "وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ" (اور مُردوں کو اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھائیں گے پھر سب اللہ ہی کی طرف لائے جائینگے) یہ بات تو واضح ہے کہ جب مُردوں کو اللہ تعالیٰ ان کی قبروں سے اٹھائیں گے تو وہ لامحالہ زندہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لائے جائینگے' پھر اس کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب اس سے مراد لوگوں کو اللہ کے سامنے حساب وجزا کے لئے لا کھڑا کرنا ہے اور یہ بات "بَعْث" کے علاوہ ہے جو حیات بعد الممات کا نام ہے لہٰذا اس میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: "وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً" (اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قدرت ہے اس پر کہ وہ معجزہ نازل فرمائیں) اگر یہ جواب نبی کریم ﷺ کی طرف سے صحیح ہو تو پھر ہر مدعیِ نبوت کا معجزہ کے مطالبہ کے وقت یہ کہہ دینا بھی درست ہو کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ وہ کوئی معجزہ نازل فرمائیں؟۔

جواب جب کسی کی نبوّت معجزۂ خداوندی سے ثابت ہو تو اس کے لئے ایسا کہنا صحیح ہے لیکن جب اس کی نبوت ہی ثابت نہ ہو تو پھر اس کے لئے ایسا کہنا صحیح نہیں ہے' حضور نبی کریم ﷺ کی

نبوت قرآن پاک اور انشقاقِ قمر وغیرہ سے ثابت ہو چکی ہے اس لئے آپ کا اس طرح فرمانا تو درست ہوگا لیکن کسی اور کے لئے درست نہ ہوگا جس کی نبوت ہی ثابت نہ ہو۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک: " وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ " (اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوں سے اُڑتے ہیں) کا کیا فائدہ ہے؟ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ " دابّة " وہی جانور ہوتا ہے جو زمین پر چلتا ہے اس لئے کہ لغت میں " دابّة " اس جانور کا نام ہے جو سطحِ زمین پر چلتا ہو اور " طیر " کے بازو اور پر ہوتے ہی ہیں' یہ سب کچھ بتانے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس میں چند فائدے ہیں' پہلا فائدہ یہ ہے کہ یہ تاکید کے لئے ہے جیسے کہتے ہیں " هٰذِهٖ نَعْجَةٌ اُنْثٰى " (یہ مادہ دنبی ہے) اور كَلَمْتُهٗ بِلِسَانِيْ " (میں نے اس سے زبان سے بات کی) اور کہتے ہیں: " مَشَيْتُ اِلَيْهِ بِرِجْلِيْ " (میں اس کی طرف اپنے ٹانگوں سے چل کر گیا) نیز جیسے ارشاد ہے: " لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ " نیز جیسے فرمایا: " يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ "

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مجاز ہونے کا وہم دور کرنا' کیوں کہ عرب کے ہاں کہا جاتا ہے: " طار فلان فی امر کذا " جب وہ اس کام کی طرف جلدی کرے۔ نیز وہ کہتے ہیں: " طار الفرس " جب گھوڑا تیز دوڑے۔

تیسرا فائدہ تعمیم اور احاطہ کی زیادتی ہے۔ گویا کہ فرمایا کہ تمام قسم کے دواب' جو زمین پر چلتے ہیں اور تمام قسم کے طیور' جو اڑتے ہیں۔

سوال " قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ...... فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ " (آپ کہیے کہ اپنا حال تو بتلاؤ کہ اگر تم پر خدا کا کوئی عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ہی آپہنچے تو کیا خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم سچے ہو بلکہ اسی کو پکارنے لگو پھر جس کے لئے تم پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے) اس آیتِ کریمہ میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے ایک قیامت کا عذاب بھی ہے حالانکہ وہ تو مشرکین پر منکشف نہیں کیا گیا؟

جواب مطلقاً کشف کی خبر نہیں دی بلکہ مشروط طور پر فرمایا ہے کہ اگر وہ چاہے تو مشرکین سے اس کو کھول دے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں: " قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ " (آپ کہہ دیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ

میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیبوں کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں) پہلے اور تیسرے جملہ میں تو قول کا ذکر کیا ہے لیکن دوسرے جملہ میں اس کا ذکر نہیں کیا؟

جواب چونکہ اخبار بالغیب ایسی چیز ہے کہ بہت سے لوگ اس کا دعویٰ کیا کرتے ہیں جیسے نجومی' کاہن وغیرہ۔ پھر اکثر جہال بھی ان نجومیوں کی باتوں کو درست خیال بھی کرتے ہیں اور ان کے بتانے کے مطابق عمل کرتے ہیں اس لئے حضور ﷺ نے اپنی ذاتِ مبارکہ سے اس کی حقیقت سے مبالغہ کے طور پر نفی فرمائی کہ میں غیبوں کو نہیں جانتا' جبکہ ملکیت اور الٰہیت دو ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا حضور کی ذات سے اور دوسرے انسانوں سے انتفاء بالکل ظاہر ہے اس لئے ان دونوں کی نفی میں صرف فی قول پر اکتفاء فرمایا' کیونکہ ان دونوں میں کوئی اور دعوی نہ نفس الامر میں متصور ہے' اور نہ لوگوں کے خیال وگمان میں متصور ہے۔ لہٰذا دونوں چیزوں میں امتیاز ہو گیا' اللہ تعالیٰ کے ارشادِ عالی: '' قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِندِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ '' سے مراد یہ ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں: '' کذا قاله بعض المفسرین ''

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: '' وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ '' (اور اسی طرح ہم آیات کی تفصیل کرتے رہتے ہیں اور تا کہ مجرمین کا طریقہ ظاہر ہو جائے) مجرمین کے طریقہ کا ذکر تو فرمایا لیکن مومنین کے طریقہ کا ذکر نہیں فرمایا' حالانکہ دونوں طریقوں کے ظاہر کرنے کی ضرورت ہے؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مجرمین کا طریقہ ظاہر ہو جائے گا تو لامحالہ مومنین کا طریقہ بھی آشکارا ہو جائے گا' کیونکہ یہی دو طریقے ہیں اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ تو ہے ہی نہیں۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ فرمایا: '' وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ '' (اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو وہ اس کو جانتا ہے) حالانکہ لوگ جو کچھ دن میں اور رات کو کرتے ہیں وہ ان سب کو جانتا ہے؟ صرف دن کا ذکر کیوں فرمایا؟۔

جواب اس لئے کہ اکثر و بیشتر کام دن ہی کو ہوتے ہیں' کیونکہ دن انسان کی حرکت کا زمانہ ہے جبکہ رات اس کے سکون کا زمانہ ہے' اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: '' وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ '' اور یہ بات اس آیت کے بعد بیان فرمائی: '' مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ''۔

سوال یہاں فرمایا ہے: '' ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ '' (پھر سب اپنے مالکِ حقیقی کے

پاس لائے جائینگے) اور دوسرے مقام پر فرمایا: "وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ" (کافروں کا کوئی مولی و مالک نہیں ہوگا؟

جواب پہلے مولیٰ سے مراد مالک یا خالق یا معبود ہے اور دوسرے مولیٰ سے مراد ناصر و مددگار ہے لہٰذا دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ" (بات اسی کی سچ ہے اور واسطے اسی کے ہے بادشاہی جس دن پھونکا جائیگا صور میں) اس کی کیا وجہ ہے کہ "حق" اور "ملک" کو قیامت کے دن کے ساتھ خاص فرمایا گیا' حالانکہ اللہ تعالیٰ کی بات ہر وقت سچ ہے اور ہر زمان میں اس کی بادشاہی ہے؟۔

جواب وجہ یہ ہے کہ وہ دن ایسا ہوگا کہ غیر اللہ کے لئے کسی صورت میں بادشاہی نہیں ہوگی' دنیا میں غیر اللہ کے لئے حکومت' خلافت یا ہبہ وانعام کے طور پر تو ہے' جس کی دلیل یہ آیتِ مبارکہ ہے جو حضرت داؤدؑ کے بارے میں ہے: "وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ" نیز یہ ارشاد بھی دلیل ہے: "وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ" اور اللہ تعالیٰ کی بات اس دن سچ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس روز اللہ تعالیٰ کی بات بااثر ہوگی کہ کوئی بندہ اس کو رد نہیں کر سکے گا اور نہ ہی کوئی ضدی اس میں کسی قسم کا شک کرے گا' کیونکہ سب لوگوں سے پردے ہٹا دیئے جائیں گے اور سب کے دعاوی اور خصومات کا قلع قمع ہو چکا ہوگا۔ جیسے فرمانِ خداوندی ہے: "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" یعنی اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ آج کس کی بادشاہت ہے؟۔

سوال اس کی کیا وجہ وحکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احسان جتانے کے ضمن میں فرمایا: "وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ" (اور ہم نے ان کو اسحاقؑ دیا اور یعقوبؑ) حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام نہیں لیا حالانکہ وہ ان کے بڑے صاحبزادہ تھے؟۔

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام ایک حرہ (آزاد عورت) کے بطن سے ان کو عطا ہوئے اور اسماعیل علیہ السلام ایک امہ (باندی) سے نوازے گئے' نیز اسحاق علیہ السلام ان کو ایک بوڑھی بانجھ عورت کے بطن سے عطا ہوئے' لہٰذا ان میں احسانِ خداوندی کا ظہور زیادہ ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآنِ پاک کے بارے میں فرمایا: "وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ" (اور جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں) حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے بہت سے لوگ جو آخرت کا یقین تو رکھتے ہیں لیکن قرآنِ حکیم پر ایمان نہیں لاتے؟۔

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر کار آمد اور مقبول انداز میں ایمان لاتے ہیں وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر اس کی دو صورتیں ہیں یا تو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بشارت کی وجہ سے اس کے نزول سے قبل اس کی تصدیق کرتے ہیں یا نزول کے بعد اس کی اتباع کرتے ہیں' اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ کیوں کہ جو شخص حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی بشارتِ محمدیؐ اور بشارتِ قرآن کی تصدیق نہیں کرتا یا بعثتِ نبویؐ کے بعد ان پر ایمان نہیں لاتا تو اس کا ایمان بالآخرت غیر معتبر ہے۔

سوال جب یہ فرمایا کہ: "وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا" (اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے) تو پھر اس کے بعد مستقل طور پر یہ فرمانے کی کیا ضرورت ہے کہ: "اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ" (یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے) یہ بھی تو افترا علی اللہ ہی ہے؟

جواب الزامی: پہلا عام اور دوسرا خاص ہے' اور مقصود دونوں کا انکار ہے' اور عام کے وجود سے خاص کا وجود لازم نہیں آتا البتہ عام کی مذمت اور اس کے انکار سے خاص کی مذمت اور اس کا انکار لامحالہ لازم آتا ہے' اور ہماری بحث اسی قسم سے ہے۔

جواب تحقیقی: چونکہ یہ خاص افتراء کی انواع میں سے زیادہ قبیح کی نوع کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے اس کو خاص طور سے ذکر فرمایا تاکہ گناہ اور سزا کی زیادتی پر تنبیہ ہو۔

سوال "بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ......خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ ......خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" اس کی کیا وجہ ہے کہ "خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ" کے بعد دوبارہ "خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" فرمایا' دوبارہ ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس کو پہلے نفی ولد پر استدلال کرنے کے لئے ذکر فرمایا' پھر اس کو دوبارہ اس قول: "فَاعْبُدُوْہُ" کی تمہید کے لئے ذکر فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا "خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" ہونا اس کے مستحقِ عبادت و طاعت کو مقتضی ہے' لہٰذا یہ ایک نیا فائدہ ہوا۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ" (اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے) اس کی کیا وجہ ہے کہ ابصار کو ادراک کے ساتھ خاص کیا گیا' یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ ہر شے کا ادراک کر لیتا ہے حالانکہ یہ صورت ایسی ہے کہ اس سے تعریف میں زیادہ مبالغہ ہوتا ہے؟

جواب اس کی دو وجہیں ہیں: ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں لفظ مقابلہ کی رعایت رکھی گئی ہے' یہ

بلاغت کی ایک نوع ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ صفت' اس ذات کے اور ابصار کے درمیان خاص ہے کہ وہ ابصار کا ادراک یعنی احاطہ کر سکتا ہے لیکن ابصار اس کو محیط نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس کے علاوہ جو چیزیں ابصار کا ادراک کر سکتی ہیں وہ ابصار بھی ان کا ادراک کر سکتی ہے' اسی لئے ابصار کا خاص طور سے ذکر فرمایا۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا: "وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا" (اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک کتاب کامل تمہارے پاس بھیجدی ہے اس کی حالت یہ ہے کہ اس کے مضامین خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ" یعنی ہم آپ کے پاس کتاب بھیجی۔؟ یہاں یوں نہیں فرمایا: "وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيَّ" (اور وہ ایسا ہے جس نے میرے پاس کتاب بھیجی ہے؟"۔

جواب چونکہ نبی کریم ﷺ پر کتاب کے نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپؐ اس کو مخلوق تک پہنچائیں اور اس کے ذریعہ ان کو ہدایت دیں اس لئے حقیقت میں یہ کتاب لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہے لیکن حضور ﷺ کے واسطہ سے ہے اس لئے اس انزال کی نسبت حضور کی طرف بھی صحیح ہے اور لوگوں کی طرف بھی درست ہے۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: "فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ" (جس جانور پر اللہ کا نام لیا جائے اس میں سے کھاؤ اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو) اس کی کیا وجہ ہے کہ مومن ہونے کو ایسے جانور کے کھانے کے ساتھ معلّق کیا گیا جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ اگر کوئی شخص جانور بالکل بھی نہ کھائے تب بھی وہ مومن رہے گا؟۔

جواب اس سے مراد ایسے جانور کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھنا ہے نہ کہ اس کا محض کھانا۔ کیونکہ عرب میں بعض ایسے بھی لوگ تھے جو میتہ کے حلال ہونے کے معتقد تھے لیکن ذبیحہ کی حرمت کے قائل تھے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں تزیین کے فاعل کو مبہم رکھا: "كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ" (اسی طرح کافروں کو مستحسن معلوم ہوا کرتے ہیں) جب کہ ایک آیت میں فرمایا: "زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ" یعنی ہم نے ان کے اعمال ان کے سامنے مزین کئے' اور ایک دوسری آیت میں فرمایا: "وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ" یعنی شیطان ان کے سامنے ان کے اعمال مزیّن کر کے پیش کرتا ہے' آخر کفار کے اعمال کا حقیقی مزیّن کون ہے؟۔

جواب شیطان کی تزیین اغواء' ضلالت' وسوسہ اور ایرادِ شبہ کی صورت میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی

تزیین ان تمام امور کی تخلیق کی صورت میں ہے لہٰذا دونوں نسبتیں درست ہوئیں۔

سوال اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: " یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ " (اے جماعتِ جنات کی اور انسان کی کیا تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے تھے) حالانکہ پیغمبر صرف انسانوں میں سے ہوئے ہیں؟

جواب اول رُسُلُ الْجِنِّ سے مراد وہ حضرات ہیں جو نبی کریم ﷺ سے قرآنِ کریم سن کر اپنی قوم کی طرف انذار و تبلیغ کے لئے گئے تھے۔ جیسے اس آیت میں فرمایا ہے: " وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ " الآیۃ۔

جواب ثانی یہ آیتِ مبارکہ اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: " یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ " حالانکہ مراد صرف ایک دریا سے نکلنا ہے کیونکہ یہ کھارے سے ہی نکلتے ہیں۔

جواب ثالث جنات کی طرف بھی پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں: " قاله الضحاك ومقاتل "

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس مذکورہ آیت: " یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ " الآیۃ میں ان کا اپنی جانوں پر گواہی دینے کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ دونوں جملوں میں معنی ایک ہی ہے؟

جواب شہادت کے اعتبار سے ایک ہے مگر مشہود بہ کے اعتبار سے متعدد ہے۔ پہلے جملہ میں تو یہ ذکر ہے کہ وہ اس بات کے مقر ہوں گے کہ پیغمبروں نے تبلیغ و انذار کا فریضہ انجام دیا تھا اور دوسرے میں یہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں کفر کا اقرار کریں گے۔ چنانچہ دونوں جملوں میں فرق ہوگیا۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیت میں تو ذکر ہے کہ وہ اپنے کفر کا اقرار کریں گے لیکن: " وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ " میں مذکور ہے کہ وہ اس سے انکار کریں گے؟

جواب اول قیامت کے دن مواقع اور مواقف مختلف ہوں گے۔ بعض میں اقرار کریں گے اور بعض میں انکار۔

جواب ثانی یہاں پر مراد یہ ہے کہ جب ان کے مُنہ پر مُہر لگ جائیگی تو ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے جیسے ایک اور جگہ پر ارشاد ہے: " اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ " الآیۃ۔

سوال " قَدْ ضَلُّوْا " (تحقیق یہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے) فرما دینے کے بعد: " وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ " (اور نہ ہوئے راہ پانے والے) کہنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب اس کا فائدہ اس بات کی خبر دینا ہے کہ وہ ایک بار گمراہ ہو جانے کے بعد اب دوبارہ

راہ یاب نہیں ہوں گے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو گمراہ ہوتے ہیں مگر پھر راہِ ہدایت پا لیتے ہیں۔

سوال "سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ" (بے وقوفی بغیر علم کے) کا کیا معنی ہے؟ ظاہر ہے کہ بے وقوفی جہالت سے ہی ہوتی ہے؟

جواب اول "بِغَيْرِ عِلْمٍ" کا معنی ہے بِغَيْرِ حُجَّةٍ یعنی بغیر حجت کے۔

جواب ثانی یعنی مقدارِ قباحت اور مقدارِ عقوبت کے علم کے بغیر۔ ان دونوں جوابات کی صورت میں دوسری بات پہلے سے مستفاد نہ ہوگی۔

سوال "كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖ" (اس کے پھل میں سے کھاؤ) کے بعد: "اِذَا أَثْمَرَ" (جبکہ پھل لائے) کہنے میں کیا نکتہ ہے؟ حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ پھل تبھی کھایا جا سکتا ہے جب وہ پھل لائے؟

جواب اس کا فائدہ اور نکتہ یہ ہے کہ اس وہم کا ازالہ ہو کہ پھل کی اباحت اس کے پکنے پر موقوف ہے اس لئے فرمایا "اِذَا أَثْمَرَ" یعنی جب وہ پھل نکل آئے اسی وقت اس کا کھانا مباح ہے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ کا کیا مطلب ہے: "قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا" الآیۃ۔ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو کوئی حرام غذا پاتا نہیں)۔ حالانکہ قرآنِ پاک ہی میں سود کھانے، یتیم کا مال اڑانے اور کسی کا مال باطل طریقہ سے کھانے وغیرہ، کی حرمت کا ذکر بھی موجود ہے؟

جواب اول "مُحَرَّمًا" کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ لوگ زمانہ جاہلیت میں حرام سمجھتے تھے ان کو میں حرام نہیں پاتا.........

جواب ثانی یعنی جن چیزوں کو وہ حلال سمجھتے ہیں میں وحی کے ذریعہ ان کو حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ وہ مردار ہو الخ۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ" (پھر یہ اگر آپ کو کاذب کہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے)۔

حالانکہ موقع تو عذاب کا ہے لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ یوں کہا جاتا کہ تمہارا رب بڑا سخت عذاب والا ہے یا اس جیسا کوئی لفظ ہوتا؟

جواب اول ایسا اس لئے فرمایا تا کہ وہ جو خدا کی نافرمانی کی جرأت و جسارت کے معاملہ میں اللہ کی وسعتِ رحمت پر خود فریبی میں مبتلا ہیں اس کی نفی کی جائے، اور یہ طریقہ تہدید و انذار میں بلیغ تر ہے

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ تم اللہ کی وسعتِ رحمت سے دھوکہ نہ کھاؤ کیونکہ وہ وسعتِ رحمت کے باوجود تم سے اپنا عذاب نہیں ہٹائے گا۔

جواب ثالث اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا رب فرمانبرداروں کے حق میں وسیع الرحمت ہے اور وہ اپنا عذاب نافرمانوں سے نہیں ہٹائے گا۔

سوال فرمانِ خداوندی ہے: "قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" (آپ کہیئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے) پھر اس کی تفسیر دس احکامات کے ساتھ فرمائی، جن میں سے پانچ احکام تو واجب العمل ہیں۔ لیکن یہاں تلاوت کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ تلاوت لفظ کی صفت ہے نہ کہ معنی کی۔ تا کہ اس سے ان کے اضداد کا حرام ہونا لازم نہ آئے؟۔

جواب اول "اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" کا قول تلاوتِ غیر کی نفی نہیں کرتا، آپ ﷺ نے یقیناً ما حرّم کی بھی تلاوت کی ہے اور اس کے علاوہ کی بھی تلاوت کی ہے۔

جواب ثانی عبارت مقدر ہے: "اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ وَ اَوْجَبَ" یعنی میں نے تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تم پر تمہارے رب نے حرام فرمایا ہے اور واجب کیا ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ کہ صرف مالِ یتیم کے قریب جانے کی ممانعت فرمائی ہے جبکہ مالِ بالغ کا بھی یہی حکم ہے؟

جواب اول صرف مالِ یتیم سے منع فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ یتیم بیچارہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے جس کی وجہ سے طامعین کی طمع اس کے مال میں زیادہ ہوتی ہے، نیز اس کے مال کی حفاظت اور مدد کرنے والے بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ جبکہ بالغ کے مال کا یہ حال نہیں ہے۔

جواب ثانی یہ تخصیص دونوں حکموں کی بناء پر ہے، یعنی غیر مستحسن طریقہ سے مالِ یتیم کے قریب جانے سے ممانعت اور مستحسن طریقہ سے اس کے قریب جانے کا وجوب یا اس کے مالک کی اجازت کے بغیر مستحسن طور پر اس کے مال کے قریب جانے کا جواز۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں حکموں کا مجموعہ مالِ یتیم کے ساتھ ہی خاص ہے۔

جواب ثالث غایت محذوف ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: حتی یبلغ فسلموه الیه، یعنی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے پھر اس کا مال اس کے حوالہ کر دو۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ عدل کو قول کے ساتھ خاص کرتے ہوئے فرمایا: "وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا" (اور جب تم بات کہو تو انصاف کرو) ایسا کیوں نہیں فرمایا: "وَاِذَا فَعَلْتُمْ فَاعْدِلُوْا

''یعنی جب تم کوئی کام کرو تو انصاف کرو حالانکہ افعال میں عدل کی حاجت زیادہ ہوتی ہے۔اس لئے کہ فعلی جور وظلم سے پیدا ہونے والا ضرر اس ضرر سے زیادہ قوی ہوتا ہے جو قولی جور وظلم سے پیدا ہو؟

جواب عدل کو قول کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معلوم ہو جائے کہ فعل میں عدل بطریقِ اولیٰ واجب ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے'' وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ '' یہاں یوں نہیں فرمایا:''وَلا تشتمهما ولا تضربهما '' کیوں کہ جب قول کا ذکر فرما دیا تو فعل میں تو بطریق اولیٰ ضروری ہوگا۔

سوال ان دو آیتوں میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ پہلی آیت ہے:'' وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی '' (اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا) اور دوسری آیت یہ ہیں:'' وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَ اَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ '' (یہ لوگ اپنے گناہ اپنے اوپر لادے ہونگے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور) اور:''لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ '' (نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے تھے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑے گا) نیز ایک مشہور حدیثِ مبارک بھی ہے کہ جو شخص کوئی برائی کرے تو اس بُرائی کا گناہ بھی اس پر ہوگا اور قیامت کے دن تک جو لوگ اس برائی پر عمل کریں گے ان کے گناہ بھی اس پر ہوں گے؟

جواب پہلی آیت سے مراد ایسا گناہ ہے جس کی طرف وہ شخص بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی طرح بھی منسوب نہ ہو بلکہ مکمل طور پر اس کی نسبت کسی اور کی طرف ثابت ہو ایسے گناہ کا وہ بوجھ نہیں اٹھائے گا لیکن جو برائی اس طرح کی نہ ہو یعنی کسی طرح اس کی جانب منسوب ہو تو وہ اس وجہ سے اس کا بوجھ اٹھائے گا۔

جواب ثانی اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اس بوجھ کو طوعًا (خوشی سے) نہیں اٹھائے گا جیسے مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ آپ کو آپکے دین کے معاملہ میں جو مشقت وغیرہ پہنچے گی ہم اس کے ذمہ دار ہیں' نیز کفار نے ایمان والوں سے کہا تھا'' اِتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ''یعنی تم ہماری راہ کو اپنا لو ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ اور دوسری آیات کا معنی یہ ہے کہ ہم ان بوجھوں کو کرھًا (ناخوشی سے) اٹھائیں گے۔لہٰذا ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔

سورة الاعراف

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ" (پس نہ ہو بیچ سینے تیرے کے تنگی اس سے) اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشاد میں نہی حرج کی طرف متوجہ ہے؟

جواب یہ ایسا ہی ہے جیسے کہتے ہیں: "لَا اَرَیْنَكَ هُنَا" یعنی میں تمہیں یہاں نہ دیکھوں، مراد یہ ہوتا ہے کہ تم یہاں نہ ٹھہرو کیونکہ اگر تم یہاں ٹھہرو گے تو میں تمہیں دیکھوں گا، اسی طرح آیت کا معنی ہے کہ آپؐ اس پر یقین کرلیں، کوئی شک نہ کریں۔ اس لئے کہ حرج سے مراد شک ہے۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: "اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَ هَا بَأْسُنَا" (ہلاک کیا ہم نے پس آیا ان کے پاس عذاب ہمارا) حالانکہ ہلاکت تو عذاب آنے کے بعد ہوتی ہے۔

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔ جیسے یہ ارشادِ الٰہی ہے: "اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ" نیز جیسے "فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" مراد ہوتا ہے ان کاموں کا ارادہ کرنا۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ ــــ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ" (پس جس شخص کا پلّہ بھاری ہوگا...... اور جس کا پلّہ ہلکا ہوگا) حالانکہ قیامت کا میزان (تول) ایک ہے، متعدد تو نہیں ہیں پھر "موازین" فرما کر اس کو جمع کیوں لائے؟

جواب اول اس کو جمع اس لئے لائے کہ میزان سے مراد اعمال کے موزونات ہیں۔

جواب ثانی جمع اس لئے لائے کہ قیامت کا ایک میزان بھی کئی میزانوں کے قائم مقام ہوگا اور بہت سے میزانوں کا فائدہ دے گا، کیونکہ اس ایک میزان میں چھوٹے چھوٹے اعمال بھی تولے جائیں گے اور پہاڑوں جیسے بڑے بڑے اعمال بھی تولے جائیں گے۔

سوال اعمال کا وزن کیسے ہوگا، اعمال تو اعراض ہیں، نہ ان کا جسم ہے اور نہ ہی ثقل (بوجھ)، وزن تو اجسام کا خاصہ ہے؟

جواب اول اعمال کے صحیفے (رجسٹر) وزن کئے جائیںگے۔

جواب ثانی یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اعمال کو جواہر اور اجسام کی صورت دے دیں گے۔ نیک لوگوں کے اعمال اچھی صورت میں اور برے لوگوں کے اعمال بُری صورت میں متصور ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کا وزن کریں گے۔ "وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ"۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: "وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ

اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ'' (اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے ہی تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو) کلمۂ ثُمَّ ترتیب کے لئے ہوتا ہے۔ جبکہ فرشتوں کو سجدۂ آدمؑ کا حکم ہماری تخلیق اور تصویر سے قبل ہوا تھا؟

جواب اوّل آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہارے باپ (آدمؑ) کو پیدا کیا پھر ان کی صورت بنائی' یہاں اصل میں مضاف (اب) محذوف ہے۔

جواب ثانی مراد یہ ہے کہ ہم نے تمہارے باپ (آدمؑ) کو پیدا کیا پھر ان کی پشت میں تمہاری صورت بنائی۔ لیکن پہلا جواب زیادہ واضح ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے کیسے فرمایا: '' فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا'' (تو آسمان سے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے آسمان میں رہ کر) حالانکہ نہ ابلیس کو کوئی حق حاصل ہے اور نہ ہی کسی اور کو کہ وہ زمین میں بھی تکبر کرے؟ پھر آسمان کو کیوں خاص کیا گیا؟

جواب چونکہ آسمان' ان فرمانبردار فرشتوں کا مستقر ہے جو معصیت کا بالکل بھی ارتکاب نہیں کرتے' اس لئے ان کی طرف سے کسی معصیت کا پایا جانا زیادہ قبیح ہے' اس لئے ان کے مستقر اور مقام (آسمان) کو خاص طور پر ذکر فرمایا۔

سوال ابلیس کی مہلت کی درخواست کیسے قبول کر لی گئی حالانکہ اس کا اس درخواست سے مقصد اللہ کے بندوں کو گمراہ کرنا اور ورغلانا ہی تھا؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دراصل بندوں کی آزمائش ہے نیز ابلیس کی مخالفت میں عظیم ثواب بھی ہے۔ اس کی نظیر دنیا کی وہ دلفریب چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے' نفس کی خواہشات بھی اس کی نظیر ہیں جن کے ذریعہ بندوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا'' (پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کا پردہ کا بدن جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کردے) شیطان کا اصل مقصد تو ان کو جنّت سے نکالنا تھا نہ کہ ان کو بے پردہ کرنا' جس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: '' فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ''۔

جواب '' لِيُبْدِيَ '' میں لام' لامِ عاقبت وصیرورت ہے نہ کہ لامِ کَی۔ جیسے اس فرمانِ الٰہی میں: ''فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا''

نیز جیسے کسی شاعر کا قول ہے:

لِدُوا للموت وابنوا للخراب ☆ فکلکم یصیر الی التراب۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: "ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ" (یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے) لباس اور پوشاک میں اللہ تعالیٰ کی کونسی نشانی ہے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ لباس اور پوشاک' انسان کی ایک ایسی خاص علامت ہے جو اس بات پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام حیوانات پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ لباس وغیرہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے حق میں یہ کیسے فرمایا: "يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا" (وہ ان سے ان کا لباس اتار لیتا تھا) حالانکہ حقیقت میں ان کے لباس کو اتارنے والے اللہ تعالیٰ تھے؟۔

جواب چونکہ ابلیس اپنے وسوسہ اور اغواء کی وجہ سے اس نزع لباس کا سبب بنا تھا اس لئے لباس اتارنے کی اس کی طرف نسبت کر دی گئی' جیسے کہتے ہیں: کھانے نے مجھے سیر کر دیا' مشروب نے مجھے سیراب کر دیا' حالانکہ سیراب کرنے والے اور سیر کرنے والے در حقیقت اللہ تعالیٰ ہیں اور طعام و مشروب اس کا سبب ہیں۔

سوال اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: "كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ" (تم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح پھر تم دوبارہ پیدا ہو گے) حالانکہ اللہ نے ہم کو اولاً نطفہ سے پھر خونِ بستہ سے پھر لوتھڑے سے اور پھر گوشت ہڈیاں بنا کر پیدا کیا تھا اب ہم دوبارہ اس ترتیب پر نہ موت کے وقت اور نہ بعث بعد الموت کے وقت پیدا ہوں گے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو شروع میں مٹی سے پیدا کیا تھا اسی طرح پھر تم دوبارہ مٹی سے پیدا ہو گے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے تم کو عدم کے بعد وجود دیا اسی طرح دوبارہ عدم کے بعد وجود دیں گے۔ چنانچہ تشبیہ نفسِ احیاء و خلق میں ہے نہ کہ کیفیت و ترتیب میں۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو شروع میں سعید اور شقی دو صورتوں میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے کہ کوئی تم میں سے سعید ہو گا اور کوئی شقی۔ آیتِ ہذا بھی اس کی تائید کرتی ہے:

جواب رابع اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم کو شروع میں اس حال میں پیدا کیا کہ تم کسی چیز کے مالک نہ تھے اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے۔ جیسے ارشادِ خداوندی ہے: "وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا

فُرَادٰی" الآیۃ۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے: " قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (یہ اشیاء دنیوی زندگی میں خاص اہلِ ایمان ہی کے لئے ہیں) حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ یہ اشیاء (زینت وطیبات) ان لوگوں کے لئے جو ایمان نہیں لائے زیادہ دائمی اور اکثر ہیں؟

جواب عبارت مقدر ہے " قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا غَيْرُ خَالِصَةٍ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" یعنی یہ اشیاء دنیوی زندگی میں اہلِ ایمان کے لئے خالص نہیں ہیں، اس لئے کہ مشرکین بھی اس میں شریک ہیں لیکن آخرت کی زندگی میں یہ اہلِ ایمان کے لئے خاص ہیں۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: " وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" (اور ان سے پکار کر کہا جائیگا کہ یہ جنت ہے تم اسکے وارث کئے گئے ہو.......) میراث تو اس مال وغیرہ کا نام ہے جو کسی میت کی طرف سے کسی کو منتقل ہو یہ معنی یہاں مفقود ہے؟۔

جواب اول یہ کلام اصل میں اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کو وارث اور موروث عنہ کے ساتھ تشبیہ دینے کے طور پر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں ایمان لانے کی شرط پر کفار کے لئے منزلیں پیدا کی ہیں پس جو ان میں سے ایمان نہیں لاتا اس کی منزل اہلِ جنت کو دے دیتے ہیں۔

جواب ثانی نفسِ دخولِ جنت بلاعوض محض اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے ہوگا پس یہ میراث کے مشابہ ہوگیا۔ اگرچہ جنت میں درجات اعمال کے اعتبار سے ہوں گے۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: " اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" (خبردار ہو واسطے اس کے ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا) "خلق" بمعنی ایجاد واحداث ہے، ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے لیکن "امر" تو غیر اللہ کے لئے بھی ثابت ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے: " يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ" نیز: " وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ" نیز یہ آیت بھی دلیل ہے: " وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ"؟

جواب اول یہاں "امر" سے مراد لفظ "کن" ہے جو اللہ تعالیٰ اشیاء کو خلق کرتے وقت فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے "امر" کا یہ معنی "خلق" کی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

جواب ثانی خلق اور امر سے مراد وہ ہے جس کا ذکر سابقہ آیت میں گزرا ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین کو خلق کرنا اور سورج، چاند اور ستاروں کی تسخیر کا امر۔ کما ذکرٗ ظاہر ہے یہ خلق وامر اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

سوال نوح علیہ السلام نے تاء کے ساتھ "ضَلٰلَةٌ" کیوں فرمایا؟ یوں نہیں فرمایا: لَيْسَ بِيْ

ضَلٰلٌ ''جیسے اپنی قوم کو ''ضلال'' کے ساتھ موصوف کیا ہے' تاکہ خوف مناسبت بھی ہو جاتی کہ جس چیز کو قوم نے ثابت کیا حضرت نوحؑ اس کی نفی کرنے والے ہوتے؟۔

جواب ضلالۃ کا درجہ ضلال سے کم ہے' لہٰذا اپنی ذات سے ضلالۃ کی نفی کرنے میں زیادہ مبالغہ ہے' گویا کہ فرمایا: مجھ میں تو ذرا بھی گمراہی نہیں۔ جیسے کوئی پوچھے: کیا آپ کے پاس پھل ہے؟ آپ اس کے جواب میں کہیں کہ میرے پاس تو کوئی بھی پھل نہیں' تو یہ نفی میں زیادہ بلیغ ہوگا۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ قصہ ہودؑ میں تو مَلأ (سردار) کو ''اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' (جو لوگ کافر ہوئے) کے ساتھ بیان کیا ہے' مگر قصہ نوحؑ میں مَلأ کو ''اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' کے ساتھ موصوف نہیں کیا وہاں صرف ''مَلَاُ مِّنْ قَوْمِہٖ'' فرمایا؟

جواب جب قومِ ہودؑ کے اشراف نے ہود علیہ السلام سے یہ کہا تھا: ''اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ سَفَاھَۃٍ'' (ہم تم کو کم عقلی میں دیکھتے ہیں) اس وقت ان اشراف میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو ہود علیہ السلام پر ایمان لائے تھے' چنانچہ تمام اشراف ان کی قوم میں سے نہیں تھے بخلاف قومِ نوحؑ کے کہ جب انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا تھا: ''اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ'' (ہم تم کو صریح غلطی میں مبتلا دیکھتے ہیں) اس وقت ان میں ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو حضرت نوحؑ پر ایمان لایا ہو۔ چنانچہ یہاں تمام اشراف یہ بات کہنے والے تھے۔ بعض علماء نے یہی جواب دیا ہے۔ لیکن یہ جواب سورۃ ہود میں قصہ نوحؑ کے بیان میں اس آیتِ کریمہ سے مخدوش ہو جاتا ہے: ''فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' سورۃ المؤمنون میں بھی اسی طرح ہے۔ مگر اس کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ قول دو مرتبہ واقع ہوا ہے' دوسری مرتبہ کا قول بعضوں کے ایمان لانے کے بعد سے متعلق ہے۔

سوال جب قومِ صالحؑ زلزلہ کے عذاب میں گرفتار ہو کر موت کا شکار ہو گئی تو ان کے مر چکنے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کیسے فرمایا: ''یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ'' (اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچایا تھا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم لوگ خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے)

بظاہر ایک زندہ شخص کا میت کو مخاطب کرنا تو ایک بے فائدہ چیز ہے؟

جواب یہ صورت عرف میں مستعمل ہے' کیونکہ جو شخص کسی شخص کو نصیحت کرے اور وہ اس نصیحت کو قبول نہ کرے حتی کہ وہ پھر قتل ہو جائے یا تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے پھر وہی خیر خواہ اس کے پاس

سے گزرے اور اسے یوں مخاطب کرتے ہوئے کہے۔

اے میرے بھائی! میں نے کتنی بار تمہیں سمجھایا بجھایا پر تم نے میری ایک نہ مانی حتی کہ تم اس انجام سے دوچار ہوئے۔ نیز اس قول وکلام کا فائدہ دیگر سامعین کو قبولیتِ نصیحت کی ترغیب دینا ہے تاکہ دوسرے سامعین کا اس شخص کی طرح انجام نہ ہو جس کو اس نے نصیحت کی تھی مگر اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہلاکت سے دوچار ہوا۔

سوال شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کیوں فرمایا: "وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" (اور روئے زمین میں اس کی درستی کے بعد فساد مت پھیلاؤ) حالانکہ قومِ شعیبؑ تو کبھی بھی مصلح نہیں رہی وہ تو ہمیشہ کافر اور مفسد رہی تھی؟

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زمین میں فساد مت پھیلاؤ بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کی امر بالعدل اور ارسالِ رُسُل کے ذریعہ اصلاح فرمائی۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ تم فساد مت پھیلاؤ بعد اس کے کہ صالحین نے اس میں اصلاح فرمائی جیسے انبیاء کرامؑ اور ان کی شریعتوں کے متبعین۔ چنانچہ یہ اضافت ایسی ہے جیسے اس ارشادِ خداوندی میں اضافت ہے: "بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ" یعنی بَلْ مَكْرُهُمْ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔

سوال قومِ شعیبؑ نے اس آیت میں حضرت شعیبؑ کو دوبارہ کفر میں واپس آجانے کا کیسے کہا: "لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا" (اے شعیبؑ ہم آپ کو اور جو آپ کے ہمراہ ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آجاؤ) جب کہ شعیبؑ نے ان الفاظ میں ان کو جواب دیا تھا: "اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا" (اگر ہم تمہارے مذہب میں آجائیں بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو)۔ شعیب علیہ السلام تو کبھی بھی ان کے مذہب پر نہیں تھے کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کبائر خصوصاً کفر سے بری ہوتے ہیں؟

جواب اول اہلِ عرب "عاد" کو صار کے معنی میں بھی ابتداءً استعمال کرتے ہیں۔ جیسے یہ آیتِ کریمہ ہے: "حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ"۔

جواب ثانی اہلِ عرب یہ بات تغلیب الجماعۃ علی الواحد کے طور پر کہا کرتے ہیں، اصل میں مراد قومِ شعیبؑ کا عود فی الکفر ہے، انہوں نے ان لوگوں کو جو کفر کے بعد ایمان لے آئے تھے ان سب کو تغلیباً عود فی الکفر (کفر میں دوبارہ واپسی) کے لئے کہا۔

سوال فرعون نے: "اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ" (اگر آپ کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں) کے بعد

"فَأْتِ بِهَا" (تو اس کو اب پیش کیجئے) کیوں کہا' اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تو کوئی نشانی اللہ کی جانب سے لایا ہے تو اسے میرے سامنے لے آؤ۔

سوال یہاں تو فرمایا: "قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ" (قومِ فرعون میں جو سردار لوگ تھے انہوں نے کہا کہ واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے) جبکہ سورۃ الشعراء میں ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا کہ یہ شخص (موسیٰ) بڑا ماہر جادوگر ہے' ارشاد ہے: "قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهٗ إِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ" (فرعون نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص واقعی بڑا ماہر جادوگر ہے) دونوں میں تعارض ہے' پہلی آیت میں قومِ فرعون کے سرداروں کی طرف اس قول کو منسوب کیا گیا ہے اور سورۃ الشعراء کی آیتِ ہذا میں اس قول کو فرعون کی طرف منسوب کیا گیا؟۔

جواب فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں' دونوں نے یہ بات کہی تھی' سورۃ الشعراء میں پہلے صرف فرعون کا قول ذکر کیا گیا پھر یہاں پر قومِ فرعون کے سرداروں کے قول کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

سوال جادوگر تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے رونما ہونے پر اس کو قبول کرتے ہوئے اپنی خوشی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوئے تھے تو پھر یہ کیسے فرمایا: "وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ" (اور ڈالے گئے جادوگر سجدے میں)؟

جواب جب جادوگروں نے اللہ کے نبی کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کا معجزہ اپنی آنکھوں سے ظاہر ہوتے دیکھا اور ان کے تمام شکوک وشبہات دور ہو گئے تو اس چیز نے ان کو فوری طور پر سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ غایتِ مبادرت کی وجہ سے ان کا حال ایسا ہو گیا جیسے ان کو اللہ ورسول کی تصدیق کے لئے سجدہ میں ڈالا گیا ہو۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس جگہ تو ایمان لانے والے جادوگروں اور فرعون کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا: "قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ .... وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ" اور سورۃ طٰہٰ اور سورۃ الشعراء میں یہی واقعہ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ بیان کیا گیا' جب یہ واقعہ ایک بار ہی پیش آیا ہے تو اس واقعہ کے الفاظ مختلف کیوں ہیں؟۔

جواب اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے یہ کلام اپنی زبان میں کہا تھا نہ کہ عربی زبان میں' اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا کلام کئی بار عربی زبان میں کسی حکمت کی بناء پر نقل فرمایا جو (حکمت) تکرارِ واقعہ کا تقاضا کرتی تھی' جس کا ذکر ہم ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ الشعراء میں کریں گے۔ چنانچہ ایک بار تو ان کے کلام کو لفظ کی رعایت کرتے ہوئے ان کے الفاظ کے مطابق بیان فرمایا اور دوسری بار

صرف معنی ومفہوم کا خیال رکھتے ہوئے اس کو نقل فرما دیا۔ جیسا کہ اہلِ عرب کی عادت ہے کہ وہ اپنے کلام میں کبھی تفنن کا طرز اور اختلافِ اسلوب سے کام لیتے ہیں کیونکہ محض عبارت کا بار بار تکرار طبیعت کو بور کرتا ہے۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: "مَهْمَا تَأْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا" (کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ سے ہم پر جادو چلاؤ) پہلے تو اس کو "آیۃ" کہا پھر "لتسحر نا بها" بھی کہا؟

جواب انہوں نے اس چیز کو آیۃ اللہ سمجھتے ہوئے اور اس کا اعتقاد رکھتے ہوئے "آیۃ" نہیں کہا بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے جو اس کو آیۃ اللہ کہا اس کو انہوں نے استہزاء اور مذاق کے طور پر آیۃ کہا ہے۔

سوال ان آیاتِ قرآنیہ میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی' یہاں فرمایا: "وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ" (اور ہم نے فرعون کو اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا) اور دوسری جگہ یوں ارشاد ہے: "فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ" (غرض ہم نے ان کو باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مکانات سے نکال باہر کیا یوں کیا اور ان کے بعد بنی اسرائیل کو ان کا مالک بنایا)؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم' موسیٰ علیہ السلام کے خلاف جو مکر وفریب (چال بازیاں) کیا کرتے تھے اس کو اور اس کی اس بلند عمارت کو درہم برہم کر دیا جس کے بنانے کا فرعون نے ہامان کو اس لیے حکم دیا تھا تا کہ اس کو اس کے ذریعہ سے آسمان تک رسائی حاصل ہو سکے۔

جواب ثانی یہ اپنے ظاہر پر ہے۔ اس لئے کہ ایک مدّت تک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا مالک بنایا تھا لیکن پھر ان سب کو تہس نہس کر دیا۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: "وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ج يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ط وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ" (اور جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے بچا لیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو بکثرت مار ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور تمہارے رب کی طرف سے اس میں بڑی آزمائش تھی) اگر "وَفِيْ ذٰلِكُمْ" سے نجات کی طرف اشارہ ہے تو یہ تو کوئی آزمائش نہیں تھی

بلکہ یہ تو نعمت تھی اور اگر اس سے قتل اور قید کی طرف اشارہ ہے تو اس کی آلِ فرعون کی طرف اضافت کرنا زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر امتنان (احسان جتانا) مقصود ہے، اسی لئے آلِ فرعون کی طرف دو فعل "یقتلون اور یستحیون" منسوب کئے گئے؟۔

جواب "بلاء" کا لفظ نعمت اور محنت (آزمائش) میں مشترک ہے، اور یہ ابتلاء بمعنی آزمائش سے ماخوذ ہے۔ بلاہ وابتلاہ کا معنی ہوتا ہے اختبرہ یعنی اس کو آزمایا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے شکر کو نعمت سے اور ان کے صبر کو محنت (آزمائش) سے آزماتے ہیں۔ جس کی تائید اس آیتِ کریمہ سے بھی ہوتی ہے: "وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ" نیز اس ارشاد سے بھی تائید ہوتی ہے: "وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً"۔ چنانچہ آیت کا معنی یہ ہوا کہ اس نجات میں تمہارے رب کی طرف سے تم پر ایک عظیم نعمت ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ" (اور ہم نے موسیٰ سے تیس شب کا وعدہ کیا اور دس شب کو ان تیس راتوں کا تتمہ بنایا) جب راتیں روزے کا محل ہی نہیں ہے تو ان کو کیوں ذکر فرمایا، دنوں کا ذکر زیادہ اولیٰ تھا اس لئے کہ دن روزے کا محل ہے اور وہ وعدہ اسی سے متعلق ہے؟۔

جواب اول اہلِ عرب اپنی تواریخ میں اکثر راتوں کا ذکر کیا کرتے ہیں اگرچہ ان راتوں سے دن مراد ہوتے ہیں، اس لئے کہ رات ہی زمانہ کے اعتبار سے اصل ہے۔ اور دن تو عارض ہے۔ کیونکہ ظلمت وجود میں نور پر مقدم ہے۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے دین میں رات کا روزہ بھی جائز تھا۔

سوال جب "وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ" سے مجموعہ وقت معلوم ہو ہی گیا تھا تو پھر مزید "فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً" (سو ان کے پروردگار کا وقت پوری چالیس شب کا ہو گیا) فرمانے میں کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس میں چند فوائد ہیں: پہلا فائدہ تاکید ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ "عشر" (دس) سے راتیں مراد ہیں نہ کہ ساعات (گھنٹے)۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ کہیں یہ وہم نہ ہو کہ جس عشر پر اتمام ہوا وہ ان ثلاثین (تیس شب) میں داخل ہے۔ جیسے اس آیتِ مبارکہ میں ہے: "وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ" جیسا کہ ہم آگے چل کر سورۃ حم السجدہ میں اس کی وضاحت کریں گے۔

سوال موسیٰ علیہ السلام نے یہ کیسے فرمایا: ''وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' (اور سب سے پہلے میں ایمان لانے والا ہوں) حالانکہ ان سے قبل بھی بہت سے لوگ ایمان والے تھے' جیسے انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے لوگ؟

جواب اوّل اس کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ! سب سے پہلے میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ تیری ذات کا دیدار اس دارِ فانی میں اس جسد کے حاسۂ فانی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ میں اپنے زمانہ میں بنی اسرائیل کے اندر سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

جواب ثالث بعض کہتے ہیں کہ ''اوّل'' سے مراد ایمان میں اقویٰ اور اکمل ہے۔ یعنی اے اللہ! میری دیدارِ خداوندی کے لئے طلب اور خواہش اس وجہ سے نہیں ہے کہ مجھے آپ کے وجود کے بارے میں کوئی شک ہے یا میرے ایمان میں کوئی ضعف وغیرہ ہے بلکہ دیدار کی یہ طلب اس لئے ہے تاکہ مجھے مزید کرامات واعزازات سے نوازا جائے۔

سوال اس کا کیا معنی: ''وَاْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا'' (اور اپنی قوم کو حکم کرو کہ اس کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں) حالانکہ قومِ موسیٰ تو تورات کے تمام احکامات کو بجالانے پر مامور تھی؟

جواب اوّل اس کا معنی ہے ''بحسنها'' یعنی احکام پر عمل کریں اس کے اچھے ہونے کی وجہ سے' اور سارے احکام اچھے تھے۔

جواب ثانی قومِ موسیٰ کو اس میں خیر کا حکم اور شر سے منع کیا گیا تھا' پس فعلِ خیر' ترکِ شر سے زیادہ اچھا ہے۔

جواب ثالث تورات میں بعض احکام اچھے اور بعض بہت اچھے تھے جیسے قصاص لینا اور معاف کرنا۔ انتقام لینا اور صبر کرنا۔ اور بعض واجب اور مندوب ومباح تھے۔ چنانچہ ان کو عزائم وفضائل کا حکم دیا گیا یعنی جن کاموں کے کرنے پر زیادہ سے زیادہ اجر وثواب حاصل ہو۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: ''وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ'' (اور موسیٰؑ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں کا ایک بچھڑا بنالیا جو ایک قالب تھا جس میں ایک آواز تھی) حالانکہ موسیٰؑ کی قوم کا بچھڑے کو معبود بنانے کا واقعہ موسیٰؑ کے زمانہ میں پیش آیا تھا' آیت کا سیاق بھی اس پر دال ہے؟

جواب اوّل مِنْ بَعْدِهٖ کا معنی یہ ہے کہ موسیٰؑ کے پہاڑ کی طرف جانے کے بعد۔

جواب ثانی ''مِنْ بَعْدِهٖ'' کا معنی ہے کہ ان سے اس بات کا عہد وپیمان لینے کے بعد کہ وہ غیر اللہ کی

عبادت نہیں کریں گے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ میں: ''وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ اَيْدِيْهِمْ'' (اور جب پشیمان ہوئے اپنے ہاتھوں کے بیچ) ندامت کو سقوط فی الید سے کیسے تعبیر کیا' دونوں میں کیا مناسبت ہے؟۔

جواب مناسبت یہ ہے کہ جب کسی کو مافات پر بہت زیادہ حسرت اور ندامت ہونے تو لگتی ہے تو وہ اپنا ہاتھ غم کے مارے کاٹنے لگتا ہے پس اس کا ہاتھ اس میں مسقوط ہو جاتا ہے۔ یہ اصل میں کنائی الفاظ میں سے ہے۔ جیسے نائم کے لئے کہتے ہیں: ضرب علی اذنہ۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''غَضْبَانَ اَسِفًا'' (غصہ سے پچتا تا ہوا)؟ جب کہ یہ دونوں لفظ قریب المعنی ہیں؟۔

جواب اول ''آسف'' غمزدہ کو کہتے ہیں۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں ''آسف'' شدید غصہ والے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اس میں نیا فائدہ ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ: ''وَاَخَذَ الْاَلْوَاحَ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ'' (ان تختیوں کو اٹھالیا اور ان کے مضامین میں رحمت اور ہدایت تھی) فرمایا ہے: وَفِیْهَا' (اور اس تورات میں) نہیں فرمایا۔ نسخة کا معنی تو ہوتا ہے ایک چیز کو ایک مرتبہ لکھا جائے پھر اس کو نقل کیا جائے۔ پس پہلے مکتوب (لکھے ہوئے) کو نسخہ نہیں کہا جاتا' حالانکہ وہ الواح (تختیاں) کسی دوسرے مکتوب سے نقل کر کے لکھی ہوئی نہیں تھیں؟

جواب اول کیونکہ وہ الواح بھی رکھ دی گئی تھیں۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ دو تختیاں ٹوٹ گئی تھیں چنانچہ آپ نے ان میں موجود احکام کو سونے کی تختی میں نقل کیا' ان دو تختیوں میں ہدایت اور رحمت تھی اور بقایا تختیوں میں ہر چیز کی تفصیل تھی۔

جواب ثالث بعض کہتے ہیں کہ ''وفی نسختها'' اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پہلے تورات تلقین کی تھی پھر ان کو اس کی کتابت کا حکم بھی دیا تھا' چنانچہ موسی علیہ السلام نے اس کو اپنے سینہ سے تختیوں میں نقل کیا' اس لئے ان کا نام ''نسخة'' رکھا۔

سوال اس آیتِ کریمہ کا کیا مطلب ہے: ''وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ'' (اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ اتارا گیا ہے) ''نور'' سے قرآن مجید اور ''معه'' سے مع النبیؐ مراد ہے' جب کہ قرآنِ مجید' جبریلؑ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے جسے وہ لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس آئے' نبی ﷺ کے ساتھ تو نہیں اتارا گیا؟

جواب اول ''مَعَهٗ'' سے مراد حضورؐ کے زمانہ سے متصل ہے۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ "مَعَهٗ" کا معنیٰ "عَلَیْهِ" ہے۔

جواب ثالث بعض کہتے ہیں کہ "مَعَهٗ" کا معنیٰ "اِلَیْهِ" ہے۔

جواب رابع ممکن ہے کہ "مَعَهٗ" کا تعلق اتبعوا کے ساتھ ہو' انزل کے ساتھ نہ ہو۔ معنیٰ یہ ہو جائینگے کہ وہ قرآنِ منزّل کا اتباع کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ کی سنتوں پر بھی عمل اور ان کا اتباع کرتے ہیں یا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی پیروی کی جیسے خود اس کی اتباع حضورؐ نے فرمائی اس حال میں کہ وہ لوگ آپ کی اتباع میں آپ کی مصاحبت اختیار کرنے والے ہیں۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ" (پس بدل ڈالا جنہوں نے ظلم کیا تھا ان میں سے بات کو سوائے اس کے جو کہی گئی تھی واسطے ان کے) حالانکہ انہوں نے اس بات کو بدل دیا تھا جو ان سے کہی گئی تھی یعنی ان سے کہا گیا تھا کہ "حطّةٌ" کہو مگر انہوں نے اس کی بجائے "حنطةٌ" کہا؟

جواب سورۃ البقرۃ میں یہ سوال و جواب گزر چکا ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ" (تم ذلیل بندر بن جاؤ) حالانکہ انسانی صورت سے بندر کی صورت میں تبدیل ہونا ان کی طاقت میں تو نہیں تھا۔

جواب یہ سوال و جواب بھی سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے۔

سوال "حلم" اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے تو پھر یہ کیسے فرمایا: "اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ" (بلاشبہ آپ کا رب واقعی جلدی ہی سزا دیتا ہے) جلدی سزا دینا تو اس صفتِ حلم کے خلاف ہے' اس لئے کہ حلیم وہ ہے جو نافرمانوں کو جلدی سزا نہ دے؟

جواب اوّل سریع العقاب سے مراد شدید العقاب ہے۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سریع العقاب ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ جب اس کا سزا دینے کا وقت آ پہنچتا ہے تو کوئی پھر اس کو ٹال نہیں سکتا۔

سوال تمسّک بالکتاب کا لفظ تمام عبادات کو شامل ہے جن میں اقامتِ صلوٰۃ بھی ہے لہٰذا اس آیت میں اقامتِ صلوٰۃ کی تخصیص کی کیا وجہ ہے' فرمایا: "وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ" (اور جو لوگ محکم پکڑتے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو)؟

جواب اقامتِ صلوٰۃ کی تخصیص اس لئے فرمائی تا کہ اس کی فضیلت و مرتبہ کا اظہار ہو' کیوں کہ نماز دین کا ستون ہے (حدیث) اور نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکنے والی ہے۔

(آیتِ قرآنی)۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ'' (پس مثال اس کی مانند مثال کتے کی ہے اگر بوجھ رکھے تو اوپر اس کے زبان لٹکا دے) بلعم کی حالت کو مثال سے بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے بعد فرمایا: ''سَآءَ مَثَلًا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا'' (بری ہے مثال اس قوم کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو) حالانکہ مثال فردِ واحد کی بیان کی جاتی ہے نہ کہ قوم کی؟

جواب اول یہ مثال اگرچہ بظاہر بلعم کی بیان کی گئی ہے لیکن اس سے تمام کفارِ مکہ مراد ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے بھی حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے مکروفریب کے ذریعہ دنیا کی لذات وشہوات کی طرف مائل ہو کر وہی برتاؤ کیا جو بلعم نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا' دونوں کا فعل آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ تھا۔

جواب ثانی ''سَآءَ مَثَلًا ۨ الْقَوْمُ'' کا تعلق شروع آیت سے نہیں ہے بلکہ ''مَثَلُ الْقَوْمِ'' سے ہے۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: ''اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'' (نہیں میں مگر ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا واسطے اس قوم کے کہ ایمان لاتے ہیں)

حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کے لئے نذیر و بشیر تھے' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ''؟

جواب اول ''لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'' سے مراد ایسی قوم ہے جن کے متعلق ازل میں ہی یہ لکھا تھا کہ وہ ایمان لائے گی' اور ان کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ ایمان والے ہی حقیقت میں انذار اور بشارت سے نفع اٹھانے والے ہوتے ہیں۔ گویا حضورؐ صرف مومنوں کے لئے نذیر و بشیر ہیں۔ جیسے یہ ارشاد ہے: ''اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا''۔

جواب ثانی ممکن ہے کہ نذیر کا متعلق محذوف ہو' عبارت یہ ہو: ''ان انا الا نذیر للکافرین وبشیر لقوم یؤمنون'' یعنی میں کافروں کے لئے نذیر اور مومنوں کے لئے بشیر ہوں۔ چنانچہ ایک کے ذکر سے دوسری چیز کا ذکر ضروری نہ رہا' جیسا کہ اسی آیت میں تفصیل کی ضرورت نہ سمجھی گئی' کیوں کہ آیت کا معنی یہ ہے: اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر سب کے لئے' مومنوں کے لئے بشیر بنا کر اور کافروں کے لئے نذیر بنا کر۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: ''جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا'' (کیا واسطے اس کے شریک بیچ اس چیز کے کہ کر دیا تھا) اللہ تعالیٰ نے آدم و حواء علیہما السلام کے بارے میں یہ بات

بیان کی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ'' (سو اللہ پاک ہے ان کے شرک سے) انبیاءؑ تو مطلق کبائر سے معصوم ہوتے ہیں، شرک جو اکبر الکبائر ہے اس کے مرتکب کیسے ہو سکتے ہیں؟

جواب اوّل ''جَعَلَا لَهٗ'' سے مراد ہے جَعَلَ اَوْلَادُهُمَا، یعنی ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دینے لگی۔ یعنی یہاں مضاف محذوف ہے۔ اسی طرح: ''فِيْمَآ اٰتٰهُمَا'' میں ان کی اولاد مراد ہے۔ اس کی تائید اس قولِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے: ''فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ''

کیونکہ یہاں جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ ''يُشْرِكَانِ'' نہیں فرمایا ہے۔ اور آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد کا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز میں اللہ کے شریک کرنے کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کا نام عبد العزیٰ، عبد مناۃ، عبد شمس وغیرہ رکھا۔ حالانکہ ان کو چاہئے تھا کہ ان ناموں کی جگہ عبد اللہ، عبد الرحمٰن، عبد الرحیم وغیرہ رکھتے۔

جواب ثانی ''جَعَلَا'' میں ضمیر ولدِ صالح کی طرف راجع ہے بمعنی سلیم الخلق۔ اور ''جَعَلَا'' اس لئے فرمایا کہ حواء علیہا السلام کے ہاں ایک پیٹ سے مذکر اور مؤنث دونوں پیدا ہوتے تھے۔

جواب ثالث اس سے مراد ان کا اس کو عبد الحارث کے ساتھ نامزد کرنا ہے۔ حارث فرشتوں میں ابلیس کا نام تھا، اس نامزدگی کا سبب آیت کی تفسیر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اور ''شُرَكَآءَ'' محض واحد کو جمع کے قائم مقام کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ آدم و حوّا علیہما السلام کا یہ مقصد نہیں تھا کہ حارث ان کا رب ہے بلکہ مقصد یہ تھا کہ حارث نجات کا سبب تھا۔ اور جمہور مفسرین فرماتے ہیں کہ ''فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ'' کا ارشاد صرف مشرکینِ عرب کے متعلق ہے۔ قصۂ آدم و حوّا علیہما السلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

سورۃ الانفال

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ'' الآیۃ (سوائے اس کے نہیں کہ ایمان والے وہ لوگ ہیں کہ جب یاد کیا جائے اللہ ڈر جاتے ہیں دل ان کے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص ان مذکورہ صفات سے متصف نہ ہو وہ مومن نہیں ہے کیونکہ کلمۂ انما حصر کے لئے آتا ہے؟

جواب یہاں عبارت مقدر ہے: ''انما المؤمنون ایمانًا کاملًا'' (یعنی کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جن میں یہ صفات موجود ہوں۔ جیسے کہتے ہیں مرد تو وہ ہے جو مشکلات کے وقت صبر

سے کام لے۔ مراد ہوتا ہے کامل مرد۔

سوال مگر اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی: "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا" (سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں) مذکورہ مطلب کی نفی کرتا ہے؟

جواب اوّل معنی یہ ہے کہ سچے و کامل ایمان والے یہی لوگ ہیں۔

جواب ثانی اصل میں "حقًّا" کا تعلق مابعد سے ہے نہ کہ ماقبل سے۔ المؤمنون پر کلام تام ہوجاتا ہے۔

سوال یہ بات کیسے کہی جاتی ہے کہ ایمان کمی وبیشی کو قبول نہیں کرتا یعنی ایمان میں کمی وزیادتی نہیں ہوتی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا" (جب اللہ کی آیتیں انکو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ کردیتی ہیں)؟۔

جواب یہاں مراد ایمان کے آثار ہیں یعنی دلی اطمینان، یقین اور خشیتِ الٰہیہ وغیرہ۔ اس لئے کہ ایسے دلائل سے مراد ہوتا ہے عقائد میں رسوخ اور مضبوطی، یعنی اللہ کی آیات جب پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان وعقائد میں اور زیادہ رسوخ اور مضبوطی آجاتی ہے، کیونکہ ایمان کی حقیقت تو تصدیق بالقلب اور وحدانیتِ خداوندی کا اقرار ہے۔ جس طرح خدا تعالیٰ کی وحدانیت کمی و زیادتی کو قبول نہیں کرتی اسی طرح اس وحدانیت کا اقرار بھی اس کو قبول نہیں کرتا۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی: "كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ" (جس طرح سے نکالا تجھ کو رب تیرے نے گھر تیرے سے) تشبیہ پر مشتمل ہے مگر مشبّہ اور مشبّہ بہ کہاں ہے؟۔

جواب اوّل اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح آپ اپنے گھر سے لڑائی کے لئے حق کے ساتھ نکلے اور لوگ ناپسند کررہے تھے اسی طرح آپ مجاہدین میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں جو مناسب اور درست خیال فرمائیں کرگزریئے۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنی اصلاح کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگرچہ تمہیں ناگوار ہو جیسے آپ کو اپنے گھر سے نکالنا کسی مصلحت کے ساتھ تھا۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے؟ "لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ" (تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کرے) یہ بظاہر تحصیلِ حاصل ہے، یہ دونوں چیزیں دشوار ہیں؟۔

جواب یہاں "حق" سے مرد ایمان اور "باطل" سے مرد شرک ہے، لٰہذا سوال نہ رہا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: "وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ

دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ .... ’’(اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کردے اور ان کافروں کی بنیاد کو قطع کردے.........) اس تکرارِ عبارت کا کیا فائدہ ہے؟

جواب پہلے یہ بات بیان کی گئی کہ ان لوگوں کا ارادہ اس گروہ کو اختیار کرنے سے متعلق تھا جس میں غنیمت کا مال تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس گروہ کو اختیار کرنے سے متعلق تھا جس کے مغلوب ہونے میں دین کی نصرت تھی چنانچہ اس کو اولاً اس لئے ذکر فرمایا تا کہ ان دونوں ارادوں میں امتیاز ہو جائے' پھر اس کو ثانیاً یہ اس حکمت بیان کرنے کے لئے ذکر فرمایا کہ اس سے کافروں کی بنیاد اور قوت کا قلع قمع ہوگا۔

سوال کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى‘‘ (سو تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا' اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی لیکن اللہ تعالیٰ نے وہ پھینکی) حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں نے کافروں کو قتل کیا تھا اور خود نبی کریم ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں ان کفار پر پھینکی تھیں اور فرمایا تھا: شاهت الوجوه (چہرے بدشکل ہو جائیں) چنانچہ کوئی مشرک بھی ایسا نہ رہا جس کی آنکھوں میں کوئی نہ کوئی کنکری نہ لگی ہو' پھر وہ اپنی آنکھیں ملنے لگے اور شکست خوردہ ہوئے پھر مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کو قتل کیا اور قیدی بنایا؟

جواب اول چونکہ ان کافروں کے قتل ہونے کا قوی تر سبب فرشتوں کا مدد کرنا کافروں کے دلوں میں رعب کا ڈالے جانا اور مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا تھا اور یہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان افعال کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے ان مسلمانوں سے اس کی نفی فرمائی۔ یعنی بلاشبہ یہ کام ظاہری صورت کے لحاظ سے تم سے صادر ہوا لیکن فی الحقیقت مجھ سے ہوا' لہٰذا تمہارا کام یہ ہونا چاہئے کہ تم بجائے عجب (خود پسندی) اور اظہارِ فخر کے شکر کرو۔

یہی صورت کنکریاں مارنے کی ہے' اللہ تعالیٰ نے یہ کام' رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی ثابت کیا کیونکہ اس کی ظاہری صورت کا تحقق آنحضرتؐ کی طرف سے ہوا' اور حضورؐ سے اس کام کی نفی بھی فرمائی کیونکہ اس کا وہ اثر اور تاثیر جس کا صدور عامی بشر سے ممکن نہیں حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا فعل ہے' اس کی نظیر یہ ہے کہ جیسا کہ آپ اس شخص کو جس سے کوئی اچھا قول یا برا قول صادر ہو یہ کہتے ہیں کہ یہ تیرا قول یا تیرا فعل نہیں ہے' مقصد ہوتا ہے اس سے بلند مرتبہ والے آدمی کو غالب کرنا۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ: ’’وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ‘‘ کا معنی ہے کہ جب آپؐ نے ان کافروں

پر کنکریاں پھینکی تو اس وقت آپؐ نے ان کے دلوں میں رعب نہیں ڈالا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈالا۔ اس قسم کی آیاتِ قرآنی و احادیث نبویؐ کے سلسلہ میں اہلِ حقیقت کے بیان کردہ عمدہ مباحث بھی ہیں مگر ہماری یہ مختصر کتاب ان کی متحمل نہیں ہے۔ تصوف کی کتابوں میں ایسی مباحث مفصل طور پر موجود ہیں۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشادِ مبارک میں: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ" (اے ایمان والو اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا اور اس سے روگردانی مت کرو) امرِ اطاعت میں تو تثنیہ (دو) کا ذکر فرمایا ہے اور لیکن نہی کے سلسلہ میں مفرد ضمیر (عَنْہُ) لائے؟۔

جواب اول جس طرح لغتِ عرب میں مفرد اسم بول کر تثنیہ اور جمع مراد لیا جاتا ہے اسی طرح مفرد ضمیر ذکر کر کے اس سے تثنیہ کی ضمیر مراد لی جاتی ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ" یعنی "یرضوھما" اس آیتِ کریمہ میں بھی اسی طرح ہوا ہے' چنانچہ معنی یہ ہوگا کہ "وَلَا تَوَلَّوْا عَنْھُمَا" یعنی ان دونوں سے روگردانی نہ کرو۔

جواب ثانی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ضمیر لوٹانے کے اعتبار سے ضمیر کو مفرد لائے ہیں' کیونکہ اصل اللہ کی اطاعت ہے' اس لئے کہ اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جیسے فرمانِ خداوندی ہے: "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ" نیز فرمایا: "اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ" چنانچہ رسولؐ سے اعراض درحقیقت اللہ تعالیٰ سے اعراض اور روگردانی ہے۔ اس لئے صرف اس (اللہ) کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ اس حکم سے اور اس جیسے دوسرے حکموں سے روگردانی نہ کرو۔ لہٰذا "عَنْہُ" کی ضمیر حکم کی طرف راجع ہے نہ کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف۔

جواب ولا تولوا عنھما (تثنیہ کے ساتھ) اس لئے نہیں فرمایا تا کہ لفظ اللہ کو مقدم کئے بغیر اللہ ورسولؐ دونوں کو ایک ہی لفظ میں ذکر کرنے سے نبی کریم ﷺ کے ادب میں کوئی کوتاہی لازم نہ آئے۔ کیونکہ ایک حدیثِ مبارک میں اللہ و رسول دونوں کو تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ لانے سے منع فرمایا گیا ہے۔ جیسے مروی ہے کہ ایک خطیب نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے یوں کہا مَنْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ رَشَدَ' وَمَنْ عَصَاھُمَا فَقَدْ غَوٰی' تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو فرمایا کہ تم اپنی قوم کے بُرے خطیب ہو' تم نے یوں کیوں نہیں کہا' ومن عصی اللہ ورسولہ فقد غوی؟

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ عالی کا کیا مطلب ہے: "وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا

لَّاَسْمَعَهُمْ "الآیۃ۔ (اور اگر جانتا اللہ تعالیٰ ان کے بھلائی البتہ سنا تا ان کو)؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مستقبل میں ان میں ایمان اور تصدیق جانتے اور دیکھتے تو ان کو فہم وقبولیت والی سماعت کی توفیق دیتے۔ یا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے ان کی فرمائش کے مطابق مُردوں کو قوتِ گویائی عطا فرمادیتے جو پھر آپ کی نبوّت کی صداقت کی گواہی دیتے۔

جواب ثانی بعض کہتے ہیں کہ "لَّاَسْمَعَهُمْ" کا معنی ہے کہ ان کو پھر فہم وبصیرت عطا فرمادیتے۔ مگر وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے عناد اور ظہورِ حق کے بعد اس کا انکار کی بناء پر روگردانی اور بے رخی کریں گے۔

سوال "تولّی" اور "اعراض" دونوں کا ایک ہی معنی ہے لہٰذا: "لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُوْنَ" کا کیا معنی ہوگا؟

جواب اس کا معنی ہے: "لتولوا عن الایمان واعرضوا عن البرهان" یعنی وہ ایمان سے روگردانی اور برہان سے اعراض کریں گے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ" (پس برسا اوپر ہمارے پتھر آسمان سے) اس آیتِ مبارکہ میں آسمان کا ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ ظاہر ہے مطر (برسنا) آسمان سے ہی ہوتی ہے؟

جواب اول مطلق مطر (بارش) یقیناً آسمان سے ہی ہوتی ہے اور کہیں سے نہیں ہوتی، مگر یہاں پر مطر مضاف ہے یعنی مَطَرَ الْحِجَارَةِ (پتھروں کی بارش) یہ مطر کبھی پہاڑوں کے اوپر سے ہوتی ہے اور کبھی مکانات اور محلات کی دیواروں اور چھتوں سے بھی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ اس آیتِ کریمہ میں آسمان کا ذکر بافائدہ ہے، اس لئے کہ پتھر جب آسمان سے آئیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ تکلیف اور ضرر میں شدید اور زیادہ ہوں گے۔

جواب ثانی چونکہ حجارۃ (پتھر) سے عذاب کے لئے نشان زدہ متعین پتھر مراد ہیں یعنی کھنگر جن کے آسمان سے اترنے کا وقت متعین ہے، اس لئے آسمان کا ذکر کر کے ان مخصوص اور متعین پتھروں کی طرف اشارہ کر دیا۔ گویا یوں فرمایا: "فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ" یعنی تو ہم پر کھنگر کے پتھر برسائیے۔ چنانچہ "السماء" کو "سجیل" کے قائم مقام کر دیا گیا۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ" (اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرینگے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے انکو عذاب دیں) حالانکہ غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے ان کو حضورؐ کے ہوتے ہوئے قتل اور قید کا عذاب دیا؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دینگے جبکہ آپ مکہ میں مقیم ہیں۔ اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ جب تک مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے مشرکین کو عذاب نہیں دیا گیا۔ لیکن جب مشرکین نے آنحضرتؐ کو مکہ سے نکال دیا اور آپؐ سے لڑنے کے لئے میدان میں آئے تو عذاب میں گرفتار ہوئے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپؐ کے ہوتے ہوئے ایسا عذاب نہ دینگے کہ وہ جڑ سے ہی اکھاڑ دیئے جائیں۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپؐ کے ہوتے ہوئے وہ عذاب نہیں دیں گے جس کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے یعنی پتھروں کی بارش کا عذاب۔

سوال پہلے تو فرمایا: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ" الآیۃ (اللہ تعالیٰ آپ کے ان میں ہوتے ہوئے ان کو عذاب نہیں دیں گے) پھر فرمایا: "وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ" (ان کا کیا استحقاق ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے) بظاہر ان آیات میں تناقض اور تعارض ہے؟۔

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ ان کا کیا استحقاق ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آپؐ کے اور دیگر مومنین کے ان کے درمیان سے نکلنے کے بعد عذاب نہ دے۔

جواب ثانی پہلے عذاب سے مراد استیصالی عذاب (جڑ سے اکھاڑ دینے والا عذاب) ہے۔ اور دوسرے سے غیر استیصالی عذاب (جو ایسا نہ ہو) مراد ہے۔

جواب ثالث پہلے عذاب سے مرد دنیا کا عذاب ہے اور دوسرے سے آخرت کا عذاب ہے۔

سوال اس کا معنی کیا ہے: "وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً" (اور نہیں ہے نماز ان کی نزدیک کعبہ کے مگر سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا) حالانکہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا تو نماز نہیں کہلاتا؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے مُكَآءً (سیٹیاں بجانے) اور تَصْدِيَةً (تالیاں بجانے) کو نماز کے قائم مقام کر دیا' جیسے کوئی کہے: میں فلاں شخص سے ملا تو اس نے جفا (ظلم و زیادتی) کو میری صلہ رحمی بنایا' مطلب ہوتا ہے کہ اس نے جفا کو میرے صلہ کے قائم مقام کیا۔ فرزدق کا یہ شعر بھی اسی کی مثال ہے:

اخاف زیادًا ان یکون عطاؤہ اداھم سودًا او محدرجۃٌ سُمرًا

اس شعر میں "اداھم" سے بیڑیاں اور "محدرجۃ" سے کوڑے مراد ہیں' یہاں اس نے ان دونوں کو عطاء بخشش کی جگہ پر رکھ دیا۔

سوال اس آیت کا کیا مفہوم ہے: "قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ج وَاِنْ یَّعُوْدُوْا" (آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آجائیںگے تو ان کے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کردیئے جائیںگے اور اگر وہ عود کریں۔۔۔) وہ تو کفر سے باز نہیں آئے پھر کیسے فرمایا: "وَاِنْ یَّعُوْدُوْا" کہ اگر وہ عود کریں گے، حالانکہ کسی چیز کی طرف عود تو اس وقت ہوتا ہے جب اس چیز کو ترک کردیا جائے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ اگر یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی عداوت اور ان سے محاربت (لڑائی) سے باز آجائیںگے تو ان کے سابقہ گناہ معاف کردیئے جائیںگے، اور اگر وہ حضورؐ سے قتال اور عداوت میں عود (دوبارہ) کریں گے تو ان کو سنا دیجئے کہ کفار سابقین کے حق میں قانون نافذ ہو چکا ہے یعنی جن کفار کے بدر کی لڑائی میں بنائے ہوئے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور وہ شکست خوردہ ہوئے یا ان لوگوں کے حق میں قانون نافذ ہو چکا ہے جنہوں نے سابقہ امتوں میں اپنے نبیوں کو ناحق تکلیفیں پہنچائیں۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کفر سے باز آکر ایمان قبول کرلیں تو ان کے کفر اور دیگر تمام معاصی معاف کردیئے جائیں گے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم علیہم السلام نے ارشاد فرمایا: اسلام لانے سے ماقبل کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں" اور اگر ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر اختیار کرکے (نعوذ باللہ) مرتد ہو گئے تو یہ لوگ جان لیں گے کہ سابقین کفار کے حق میں خدا کا قانون نافذ ہو چکا ہے یعنی اللہ نے جیسے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اسی طرح ان لوگوں کو بھی تباہ و برباد کردیا جائے گا۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "وَیُقَلِّلُكُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ" (اور تم کو ان کی نگاہوں میں کم کرکے دکھا رہے تھے) مسلمانوں کی نظروں میں کافروں کو کم کرکے دکھانا تو واضح ہے کہ اس سے مسلمانوں کے دلوں سے ان کا خوف و رعب ختم ہوگا اور مسلمانوں کو ثابت قدمی حاصل ہوگی اور مسلمانوں کی کافروں کے ساتھ لڑنے کی جرأت بڑھ جائے گی لیکن کافروں کی نگاہوں میں مسلمانوں کی تعداد کم کرکے دکھانے میں کیا فائدہ ہے۔ حالانکہ اس سے تو کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب جاتا رہے گا اور ان کے قدم مضبوط ہونگے اور پھر ان کافروں کو مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کی ہمت اور جرأت مزید بڑھ جائیگی؟

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح سے کفار بھرپور تیاری نہ کرینگے وہ مسلمانوں کو قلیل تعداد میں خیال کرتے ہوئے ان کے ساتھ لڑنے کی جرأت کریں گے لیکن جب مسلمانوں کی کثرت

اچانک ان کے مقابلہ میں آئیگی تو وہ حیران وسرگردان رہ جائیں گے نیز یہ امر دینِ حق کی نصرت کا سبب بنے گا کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ مسلمان قلت کے باوجود ان پر غالب آئے ہیں تو یقیناً ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ دو جانبوں کی تقلیل میں ایک معارضہ ہے جو غور و فکر سے ہی معلوم ہوسکتا ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ" (اور نزاع مت کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال اور منازعہ (لڑنا جھگڑنا) حرام ہے تو پھر مناظرہ کیونکر جائز ہے۔ آخر وہ بھی جدال اور منازعہ ہے؟

جواب اس آیتِ مبارکہ میں منازعہ سے مراد جنگ کے معاملہ میں جھگڑنا ہے نہ کہ دلیل وبرہان کے ذریعہ حق کے اظہار میں منازعہ کرنا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مناظرہ کا تو حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" البتہ اس کے جواز کے لئے کچھ شرائط ضرور ہیں جو آج کل کے دور میں کمیاب ہیں: ایک شرط تو یہ ہے کہ مناظرہ سے مکمل طور پر مقصود اظہارِ حق ہو خواہ اس حق کا ظہور دو فریقوں میں سے کسی کی بھی زبان سے ہو جیسے اسلاف کا مناظرہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ شخص اپنی زبان سے حق کے اظہار پر اس قدر خوش نہ ہو جس قدر اپنے مدمقابل کی زبان سے حق کے اظہار پر خوش ہو۔

سوال ابلیس نے یہ کیسے کہا: "اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ" (میں تو خدا سے ڈرتا ہوں) حالانکہ وہ تو اللہ سے نہیں ڈرتا کیوں کہ اگر اس کے اندر خدا کا خوف ہوتا تو وہ حکمِ خداوندی کی کبھی بھی مخالفت نہ کرتا اور نہ ہی خدا کے بندوں کو گمراہ کرتا؟۔

جواب اول حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ اگر ابلیس نے اپنی اس بات میں: "اِنِّيْ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ" (میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں) سچ بولا ہے کہ اس نے بدر کے دن مسلمانوں کی نصرت کے لئے آسمان سے اترتے ہوئے جبریل علیہ السلام اور ان کے ہمراہ فرشتوں کو دیکھا ہے تو اس نے یہ جھوٹ بھی بولا ہے کہ: "اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ" (میں خدا سے ڈرتا ہوں) خدا کی قسم! اسے تو خدا کا کچھ بھی خوف نہیں اصل میں وہ جانتا تھا کہ اس کو مسلمانوں کے خلاف کچھ کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہے۔

جواب ثانی ابلیس نے جب فرشتوں کے نزول کو ایسی صورت میں دیکھا جس صورت میں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا تو اسے قیامت کے قائم ہو جانے کا خوف ہوا جو کہ اس کے لئے آخری مہلت ہے جس کے بعد وہ موعود عذاب میں گرفتار ہوگا (اس لئے اس نے کہدیا کہ میں خدا سے ڈرتا

ہوں)۔

جواب ثالث ''اَخَافُ اللّٰہَ'' کا معنی ہے میں جانتا ہوں کہ اللہ کا اپنے نبیؐ سے نصرت کا وعدہ سچا ہے' کیونکہ خوف' علم کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ''اِلَّآ اَنۡ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ''۔

جواب رابع میرے نزدیک اس بات کا احتمال ہے کہ وہ اس بات سے ڈرا ہو کہ

میں کہتا ہوں کہ ابلیس تو سب سے بڑا کافر فاسق ہے اس کے متعلق جھوٹ بولنے پر تعجب
کیسا؟ تعجب تو اس کے سچ بولنے پر ہے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ'' اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں)' اس آیت میں شرط اور جزا میں کیا مناسبت ہے؟

جواب جب مسلمانوں نے مشرکین کے خلاف لڑنے کے لئے اقدام کیا' حالانکہ مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ کے قریب تھی اور کفار کی ایک ہزار کے قریب تھی تو منافقین کہنے لگے: دیکھو! کیسے بے وقوف ہیں' ان کو انکے دین نے دھوکہ دیا ہے' اپنے سے تین گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ لشکر پر چڑھائی کرنے جا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں منافقین کی بات کی تردید کرتے ہوئے اور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی ثابت قدمی کے لئے فرمایا: ''وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ غالب ہیں کہ قلیل اور ضعیف کو کثیر اور طاقتور پر مسلط کر کے ان کے خلاف نصرت وغلبہ عطا فرماتے ہیں اور وہ اپنے تمام افعال میں حکمت والا ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس طرح فرمایا: ''وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ'' (اور یہ کہ اللہ نہیں ظلم کرنے والا واسطے بندوں کے) یوں کیوں نہیں فرمایا: ''لَیۡسَ بِظَالِمٍ'' حالانکہ یہ الفاظ ذاتِ مقدسہ سے ظلم کی نفی کرنے میں زیادہ بلیغ ہیں؟

جواب یہ سوال اور اس کا جواب سورۂ آلِ عمران میں گزر چکا ہے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ'' (یہ بسبب اس کے ہے کہ اللہ نہیں تھا بدلنے والا نعمت کو کہ انعام کی تھی وہ اوپر کسی قوم کے یہاں تک کہ بدل ڈالیں وہ اس چیز کو کہ جو کچھ ان کے جی کے بیچ ہے) اس ''ذٰلِکَ'' سے کفارِ مکہ اور آلِ فرعون کی ہلاکت کی طرف اشارہ ہے' حالانکہ ان کی کوئی ایسی اچھی حالت تو تھی ہی نہیں جس کو انہوں نے بدل ڈالا ہو؟

جواب جیسے اچھی حالت بُری حالت سے بدلا کرتی ہے اسی طرح بُری حالت بھی ایسی حالت سے بدلا کرتی ہے جو اس سے بھی زیادہ بُری اور قابلِ نفرت ہوتی ہے۔

یہ لوگ بھی آنحضرت ﷺ کی بعثت سے قبل بتوں کے پجاری تھے۔ پھر جب آنحضرت ﷺ ان کے پاس روشن دلائل لے کر مبعوث ہوئے تو انہوں نے آنحضرتؐ کی تکذیب کی اور آپؐ کے دشمن بن گئے حتی کہ حضورؐ کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی' لہٰذا جب انہوں نے اپنی سابقہ حالت کو بدترین حالت سے تبدیل کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی نعمتِ امہال (مہلت دینے کی نعمت) کو جو پہلے سے ان کو حاصل تھی تعجیلِ عذاب (جلدی عذاب دینے) سے تبدیل فرما دیا۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ: "اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا" (بلاشبہ بدترین خلائق اللہ کے نزدیک یہ کافر لوگ ہیں) فرمانے کے بعد یہ فرمایا ہے: "فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ" (تو یہ ایمان نہ لائیں گے)؟ اسکا فائدہ و مقصد کیا ہے؟

جواب اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ بدترین کافر وہ ہیں جو کفر اختیار کرنے کے بعد موت تک اپنے کفر پر اڑے رہیں۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں: "اِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ يَغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ .... وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ" (اگر ہو تم میں سے بیس صبر کرنے والے غالب آئینگے دو سو پر .... اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ تخفیف سے پہلے اور تخفیف کے بعد کثیر التعداد لشکر کے ساتھ مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں ایک ہی بات کو مکرر ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اصل حالت قلت و کثرت کے باوجود ایک ہے کوئی فرق نہیں ہوتا' کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ دس آدمیوں کو دو سو پر غالب کرتے ہیں اسی طرح سو آدمیوں کو ایک ہزار پر غالب و منصور کر دیتے ہیں' اسی طرح جیسے اللہ تعالیٰ سو آدمیوں کو دو سو آدمیوں پر غلبہ دیتے ہیں اسی طرح ایک ہزار کے لشکر کو دو ہزار کے لشکر پر غالب فرما دیا کرتے ہیں۔

سوال ہمارا مشاہدہ تو اس کے خلاف ہے' کیوں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کفار کے سو آدمی مسلمانوں کے سو آدمیوں پر غالب آجایا کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ تو دو سو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب رہتے ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس غلبہ کا ذکر میدانِ جنگ میں صبر اور ثابت قدمی کی شرط

کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ یا یہ موعود غلبہ اس صورت میں ہے جب مسلمانوں میں ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے موافقت ہو۔ چنانچہ جب شرط پائی جائیگی تو لامحالہ قلت کے باوجود غالب و منصور رہیں گے۔ نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ غلبہ اس گروہ کے ساتھ خاص ہے جس کے ایک فرد آنحضرت ﷺ تھے' آیت کا سیاق بھی اس پر دال ہے۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: ''وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْاٰخِرَةَ'' (اور اللہ ارادہ کرتا ہے آخرت کا) جب کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی ارادہ کیا ہے' کیونکہ اگر دنیا کا ارادہ نہ ہوتا تو اس کو بناتے ہی نہ' لہٰذا اس تخصیص میں کیا فائدہ ہے؟

جواب یہاں ارادہ سے مراد اختیار و محبت ہے۔ نہ کہ وجود کا ارادہ۔ مطلب یہ ہوگا کہ کیا تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو اور اس کو پسند کرتے ہو؟ جبکہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو پسند فرماتے ہیں جو کہ حصول جنت کا سبب ہے اور وہ ہے اسلام کی قوت افزائی کفار کی خونریزی کے ساتھ۔

سورۃ التوبۃ

سوال اس کا کیا سبب ہے کہ اس سورت کی ابتداء میں بسم اللہ نہیں ہے جبکہ باقی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ موجود ہے؟

جواب اول چونکہ سورۃ التوبۃ اور سورۃ الانفال ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور صحابہ کرامؓ کا بھی اس میں اختلاف رہا کہ یہ دونوں حقیقت میں ایک ہی سورت ہے یا دو سورتیں' اس لئے دونوں سورتوں کے درمیان جگہ چھوڑ دی گئی تاکہ ان حضرات کی بات پر عمل ہو سکے جو کہتے ہیں کہ یہ دو الگ الگ سورتیں ہیں اور ان دونوں کے درمیان بسم اللہ بھی چھوڑ دی تاکہ ان حضرات کی بات پر بھی عمل ہو جائے جو ان دونوں کے ایک (سورت) ہونے کے قائل ہیں۔ جیسا کہ حضرت قتادہؒ کا یہ قول ہے۔

جواب ثانی اللہ تعالیٰ کا ایک نام سلام و امان بھی ہے' اور سورتِ براءت (سورۃ التوبۃ) میں مشرکین کے ساتھ قتل و قتال کا ذکر ہے' اس لئے یہ مناسب نہ ہوا کہ اس کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک: ''وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ م بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ'' (اور اگر توڑ دیں قسمیں اپنی عہد کرنے کے بعد اور تمہارے دین (اسلام) پر طعن کریں پس لڑو تم کفر کے سرداروں سے) میں کفر کے سرداروں اور پیشواؤں

کے ساتھ قتال کو خاص کیا گیا ہے' جبکہ عہد شکنی اور طعنہ زنی کچھ ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام مشرکوں میں پائی جاتی ہے؟

جواب اول اَئِمَّةَ الْكُفْرِ " سے مراد مشرکین کے سردار اور ان کے قائدین ہیں۔

جواب ثانی "اَئِمَّةَ الْكُفْرِ " سے مراد کفارِ مکہ ہیں۔ اس لئے کہ وہی کفر میں تمام عرب کے لیڈر ہیں تو گویا عہد شکنی اور طعنہ زنی صرف انہی کی طرف سے پائی گئی کیونکہ وہ اس میں اصل کا درجہ رکھتے ہیں' اسی لئے ان کو خاص طور پر ذکر فرمایا:

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ " (اور کہا یہود نے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور کہا نصاریٰ نے مسیح اللہ کا بیٹا ہے) حالانکہ جب یہود و نصاریٰ سے اس کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو وہ اس کا صاف انکار کرتے ہیں کہ ہم تو ان کو اللہ کا بیٹا نہیں کہتے؟

جواب یہود و نصاریٰ کا ایک گروہ اس کا قائل ہے' سارے یہود و نصاریٰ اس کے قائل نہیں ہیں۔ الیھود اور النصریٰ پر الف ولام عہد کے لئے ہے نہ کہ جنس اور استغراق کے لئے۔ یا یہ کہا جائے کہ اطلاق تو کل پر کیا ہے مگر مراد بعض ہیں' جیسے اس ارشاد میں ہے: "وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ " حالانکہ مریم علیہا السلام سے صرف جبریل علیہ السلام نے کہا تھا۔

سوال اس کا معنی کیا ہے: "ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ " (یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا) جبکہ یہ بات واضح ہے کہ قول (بات) منہ سے ہی ہوتا ہے لہٰذا اس جملہ میں کیا فائدہ ہے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ یہ محض الفاظ ہیں ان کی کوئی اصل نہیں ہے' یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو دلیل و برہان کہا جا سکے۔

جواب ثانی اصل میں ان کے قول کی تردید اور انکار کو مبالغہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے' جیسے ایک آدمی دوسرے سے کہتا ہے: تو نے مجھ سے یہ بات اپنی زبان سے کہی ہے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "هُوَالَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ " (وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے) اس آیت میں "دِيْنِ الْحَقِّ " کو الھدیٰ پر معطوف کر کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ آخر دینِ حق بھی منجملہ ہدایت کے ہے؟

جواب اول یہاں ہدایت سے مراد قرآن مجید ہے اور دینِ حق سے مراد اسلام ہے' یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔

جواب ثانی دینِ حق اگرچہ "الھدیٰ " میں داخل ہے لیکن اس کو خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا

تا کہ اس کی شرافت اور فضیلت کا اظہار ہو۔ جیسے اس ارشادِ الٰہی میں: "حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" اور اس فرمانِ خدوندی میں: "وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ"

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ یوں ارشاد فرمایا: "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ." (تا کہ غالب کرے اس کو او پر دین سب کے) یوں کیوں نہیں فرمایا: "عَلَى الْاَدْيَانِ كُلِّهَا" (تمام ادیان پر) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دیا ہے؟

جواب یہاں "الدِّین" سے مراد اسمِ جنس ہے اور قاعدہ ہے کہ اسمِ جنس معرف باللّام جمع کے معنیٰ کا فائدہ دیتا ہے، جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں: "کثر الدرهم والدینار فی ایدی الناس"

سوال ارشادِ رب العالمین ہے: "وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (اور نہیں خرچ کرتے اس کو اللہ کی راہ میں) اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں پر ضمیر واحد کی لائے ہیں حالانکہ پیچھے سونے اور چاندی، دو چیزوں کا ذکر ہے؟

جوابِ اوّل ضمیر کا مرجع صرف چاندی ہے، اس لئے کہ یہاں چاندی کا ذکر سونے سے زیادہ قریب ہے یا اس لئے کہ چاندی لوگوں کے پاس زیادہ پائی جاتی ہے لہٰذا چاندی کا کنز ہونا زیادہ ہوگا۔ اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: "وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ"۔

جوابِ ثانی یہ ضمیر اصل میں معنیٰ کی طرف لوٹتی ہے، اس لئے کہ مکنوز چیز دراہم، دنانیر اور اموال ہیں، اس کی نظیر یہ ہے: "وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا" کیونکہ ہر گروہ کثیر تعداد پر مشتمل ہے۔ اسی طرح یہ فرمانِ الٰہی ہے: "هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ"۔ مراد مومنین اور کافرین ہیں۔

جوابِ ثالث اہلِ عرب جب کوئی ایسی دو چیزیں ذکر کرتے ہیں جو معنیٰ میں مشترک ہوں تو ان دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی طرف اعادۂ ضمیر کو کافی سمجھتے ہیں کیونکہ سامع کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں امر معنیٰ میں مشترک ہیں۔

حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر اسی سے متعلق ہے:

> اِنّ شرخ الشباب والشعر الاسود وَمَالَمْ يُعاص كان جنونا

یہاں اس شعر میں مالم یعاصیا نہیں کہا گیا، اسی طرح کسی شاعر کا یہ شعر ہے:

> فمن يلك امسٰی بالمدينة رحله فاني وقيارٌ بها لغريب

یہاں بھی لغریبان نہیں کہا گیا۔ اسی طرح ان آیات میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ۔ "وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ"

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْا اِلَيْهَا "وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْئًا" یہ تمام آیات بھی اسی قبیل سے ہیں جبکہ آخری دو آیتوں میں کلمہ او بمعنی واو ہو۔ نیز ان دو آیتوں میں ایک نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ کلام جبکہ دو امروں میں سے کسی ایک امر پر اعادۂ ضمیر کا تقاضا کرتا ہے تو اس ضمیر کو پہلی آیت میں "تجارت" کیطرف لوٹایا اگر چہ وہ ابعد بھی ہے اور مؤنث بھی ہے اس لئے کہ تجارت لہو ولعب کی بہ نسبت ایسی چیز ہے جو لوگوں کے دلوں کو اللہ کی اطاعت سے زیادہ کھینچتی ہے اس لئے کہ تجارت میں لگنے والے لوگ زیادہ ہوتے ہیں لہو ولعب میں لگنے والے لوگوں کی بہ نسبت۔ یا اس لئے کہ تجارت کا نفع لہو ولعب کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے یا اس لئے کہ تجارت اصلاً تھی اور لہو تبعاً تھی کیونکہ اس آیت کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی قافلہ کے آنے پر طبل بجایا گیا تھا اور دوسری آیت میں ضمیر کو "اثم" کی طرف لوٹایا تاکہ قرب اور تذکیر کی رعایت ہو جائے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا" (یقیناً شمار مہینوں کا کتابِ الٰہی میں اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں) اس ارشاد کا فائدہ کیا ہے ہر امت میں عام لوگوں کے نزدیک بھی مہینوں کا شمار اسی طرح ہے خواہ مہینہ قمری ہو یا شمسی؟۔

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ سب جان لیں کہ مہینوں کی یہ تقسیم اور تعداد ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کو لوگوں نے خود اپنی عقلوں سے ایجاد کیا ہے بلکہ یہ ایک ایسا امر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی زبانی اپنی کتابوں میں نازل کیا ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ" (پس مت ظلم کرو بیچ ان کے آپس میں) ظلمِ نفس کو حرمت کے چار مہینوں کے ساتھ خاص کیا گیا ہے حالانکہ ظلمِ نفس تو ہر زمانہ میں ممنوع ہے؟

جواب حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "فِيْهِنَّ" کی ضمیر "اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا" کی طرف راجع ہے نہ کہ صرف اربعة الحرم کی طرف یا تو اس لئے کہ یہ اقرب ہے یا اس کی وجہ وہ ہے جو امام فراءؒ نے ذکر فرمائی ہے۔

وہ فرماتے ہیں: بنا بریں اربعہ حرم کی وجہ تخصیص یا تو ان کی فضیلت وحرمت کی زیادتی کے لئے ہے کہ جب زمانہ جاہلیت میں یہ چار مہینے باحرمت شمار ہوتے تھے تو ان میں ظلم کرنا اور بھی زیادہ قبیح ہوگا اس کی نظیر یہ آیت ہے: "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" حالانکہ غیر حج میں بھی یہ کام ممنوع ہیں یا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں "ظلم" سے نسیء (مہینوں میں تاخیر وتقدیم کرنا) مراد ہے اور یہ عمل انہی چار مہینوں کے ساتھ خاص تھا یا مراد ہے ان مہینوں میں کفار سے ابتداءً قتال کرنا یا مراد یہ ہے کہ جب وہ لڑنے کی ابتداء کریں تو ان کے ساتھ قتال ترک کرنا ظاہر

ہے یہ سب باتیں اربعہ حُرم کے ساتھ مخصوص ہیں۔

سوال "شھر" کا لفظ مذکر ہے تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ "فیھا" ہو؟

جواب ھاء اور نون کے ساتھ ضمیر مؤنث کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اور اگر خاص بھی ہو تو کہا جائے گا کہ "فیھنّ" سے مراد ساعات الاشھر ہے اور یہ مؤنث ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ" (پس تم ان میں اپنے اوپر ظلم مت کرو) انسان اپنے اوپر تو ظلم نہیں کیا کرتا بلکہ وہ دوسرے پر ظلم کرتا ہے؟

جواب اول ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ انسان اپنے اوپر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْءً اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ" نیز فرمایا ہے: "وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ" (جو شخص کوئی برائی کرتا ہے یا اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ یقیناً اپنے اوپر ظلم کرتا ہے)۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ تم ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔ جیسے ارشادِ خداوندی ہے: "وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ" نیز فرمایا: "فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ" نیز فرمایا: "وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ"۔

جواب ثالث اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم اپنا آخرت کا حصہ نافرمانی کر کے کم نہ کرو۔ کیونکہ جو شخص نافرمانی کرتا ہے وہ بالیقین اپنے اجر و ثواب میں نقصان اور عذاب کو متوجہ کر کے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اس فرمانِ الٰہی میں: "وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ"۔

جواب رابع جو شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے تو وہ درحقیقت خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اس لئے کہ مظلوم کے حق میں اس کے ظلم کا ضرر عنقریب ختم ہو جائے گا کیونکہ وہ دنیا تک محدود ہے لیکن خود اپنی ذات کے حق میں اس کے ظلم کا ضرر ایسا ہے جس کو وہ آخرت میں بھی دیکھے گا جہاں ختم ہونے کا نام نہیں یا وہاں اس کا ضرر زیادہ شدید اور دائمی ہوگا۔

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِى الْكُفْرِ" (یہ آگے پیچھے کر لینا کفر میں زیادتی ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر زیادت و نقصان کو قبول کرتا ہے پس ایمان جو اس کی ضد ہے وہ بھی زیادت و نقصان کو قبول کرے گا لہٰذا یہ امام شافعیؒ کی دلیل ہوئی کہ ایمان زیادت و نقصان کو قبول کرتا ہے؟

جواب اس کا معنی ہے کہ یہ نسی (آگے پیچھے کرنا) کفر میں معصیت کی زیادتی کا سبب ہے۔

سوال ارشادِ باری ہے: ''لَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ'' (جولوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ سے رخصت نہ مانگیں گے) اگر یہ نہی ہے تو پھر جزم کہاں ہے؟ اور اگر نفی ہے تو امرِ منفی تو واقع ہوا ہے' اس لئے کہ بہت سے مخلص مومنوں نے آنحضرتؐ سے کسی عذر کی بناء پر جہاد پر نہ جاسکنے کی رخصت واجازت مانگی تھی' اس کی تائید اس ارشادِ خداوندی سے بھی ہوتی ہے: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ'' پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ امرِ طاعت ہے جس پر سب لوگ جمع ہوتے ہوں۔ جیسے جہاد' جمعہ اور عید وغیرہ؟

جواب اول یہ نہی بصیغۂ نفی ہے۔ جیسے یہ ارشاد ہے: ''فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ''۔

جواب ثانی حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اس آیت سے: ''لَمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ''۔

جواب ثالث ''یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ'' ''الخ' سے مراد ہے بلا عذر جہاد پر نہ جانے کی اجازت طلب کرنا اور مابعد والی آیت سے یہی مراد ہے' اور ''لَمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ'' میں کسی عذر کی وجہ سے کسی امرِ جامع پر نہ جاسکنے کی اجازت مانگنے کے جواز کا ذکر ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں پر عمل ممکن ہونے کی وجہ سے یہاں نسخ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر حکم کا محل مختلف ہے اور وہ ہے عذر کا پایا جانا اور عذر کا نہ پایا جانا۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَقِیْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِیْنَ'' (اور یوں کہہ دیا گیا کہ بیٹھ رہو ساتھ بیٹھ رہنے والوں کے) اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جہاد پر نہ جانے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جہاد پر نہ جانے اور نہ جانے کی اجازت مانگنے پر مذمت بیان فرمائی ہے؟

جواب اول آیتِ ہذا سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اللہ نے ان کو اس کا حکم دیا ہے کہ وہ جہاد پر نہ جائیں بلکہ بعض علماء کے قول کے مطابق اس کا آمر دراصل شیطان ہے جو وساوس اور تزئین کے ذریعہ ان کو جہاد پر نہ جانے کا امر کرتا ہے۔

جواب ثانی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اس کا حکم دیتے ہیں۔

جواب ثالث یہ بات درحقیقت نبی کریم ﷺ نے ان سے غصہ کی حالت میں فرمائی تھی۔

جواب رابع یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امرِ توبیخی وتہدیدی ہے۔ جیسے یہ ارشاد ہے: ''اِعْمَلُوْا مَا

شِئْتُمْ'' اس کی تائید اگلا جملہ ''مَعَ الْقٰعِدِيْنَ'' کر رہا ہے یعنی ان عورتوں' بچوں اور اپاہجوں کے ساتھ بیٹھ رہو جن کا کام ہی گھروں میں بیٹھے رہنا ہے۔

سوال جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ یہ منافق لوگ اگر مسلمانوں کے ہمراہ جہاد پر نکلیں گے تو فتنہ وفساد ہی برپا کریں گے تو پھر اللہ جل جلالہ نے ان کو مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے لئے نکلنے کا حکم کیسے دیا؟۔

جواب اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی خروجِ جہاد کا اس لئے حکم دیا تا کہ ان کا نفاق آشکارا ہو اور ان پر حجت لازم وقائم کر دی جائے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالی: ''قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ'' (آپ فرما دیجئے کہ تم خواہ خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے کسی طرح مقبول نہیں بلاشبہ تم فاسق قوم ہو) سے پتہ چلتا ہے کہ فسق وفجور طاعات کی قبولیت سے مانع ہے؟

جواب یہاں فسق سے مراد مطلق فسق نہیں ہے بلکہ کفر ونفاق کا فسق ہے۔ ظاہر ہے یہ فسق' طاعات کی قبولیت سے مانع ہے' اس کی تائید اس ارشادِ الٰہی سے ہوتی ہے: ''وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ'' الآیۃ۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ آیتِ صدقہ میں آخری چار مصارف میں بجائے کلمۂ لام کے ''فی'' کا کلیہ لائے ہیں؟۔

جواب یہ بتانے کے لئے کہ یہ آخری چار مصارف' سابق الذکر مصارف کی بہ نسبت استحقاقِ صدقہ میں زیادہ قوی ہیں' اس لئے کہ ''فی'' ظرفیت کے لئے آتا ہے' چنانچہ اس سے تنبیہ فرمائی کہ یہ لوگ اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ صدقات ان میں رکھے جائیں' کیونکہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی عبادت مذکورہ لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مشقت آمیز ہے' مسافر کو دیکھ لیا جائے کہ وہ اپنے اہل وعیال سے بھی دور ہے اور اس کے علاوہ فقر کا بھی شکار ہے' اسی طرح اگر کوئی غلام کسی کی ملکیت میں ہے اس کو آقا کی ملکیت سے مال دے کر آزاد کرانا زیادہ مشقت والا کام ہے جبکہ مذکورہ لوگوں کا حال ایسا نہیں ہے' جیسے مؤلفۃ القلوب۔ اب ان میں بعض تو تھے ہی غیر مسلم اور بعض مسلمان تھے مگر نیت کے کمزور' لہٰذا ان آخری چار مصارف کا مذکورہ مصارف سے تعارض نہیں ہوتا۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ مؤلفۃ القلوب کو صدقات دینے کا وجوب عنقریب منسوخ ہو جائیگا' اسی لئے اس مصرف کو قسمِ اوّل میں رکھا جو کہ اضعف ہے۔

سوال آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ آخری چار مصارف کو بیان کرنے کے سلسلہ میں کلمہ

''فی'' مکرر نہیں لائے؟

جواب یہ بتانے کے لیئے کہ آخری دو مصرف استحقاقِ صدقہ میں رقاب اور غارمین پر مقدم اور راجح ہیں' کیونکہ عامل کا اعادہ قوتِ تاکید کی زیادتی پر دلالت کرتا ہے' جیسے آپ کہتے ہیں: مررت بزید وبعمر و''۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس فرمان میں ایمان باللہ کے سلسلہ میں تو فعل ایمان کو ''باء'' کے ساتھ متعدی کیا اور ایمان بالمؤمنین میں ''لام'' کے ساتھ متعدی کیا ''یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ'' (ایمان لاتا ہے ساتھ اللہ کے اور یقین کرتا ہے واسطے مسلمانوں کے)

جواب اس لئے کہ اس سے مراد تصدیق باللہ ہے جو کفر باللہ کی ضد ہے' اس لئے اس کو ''باء'' کے ساتھ متعدی کیا' جیسے اس کی ضد کو ''باء'' کے ساتھ متعدی کیا جاتا ہے' اور ایمان مؤمنین سے مراد حضورؐ کا ان مسلمانوں کی خبروں کا انقیاد اور تسلیم ہے کیونکہ وہ مسلمان حضورؐ کے نزدیک صادق ہیں۔ اس لئے اس کو اس چیز کے ساتھ متعدی کیا گیا جس کے ساتھ تسلیم وانقیاد کو متعدی کیا جاتا ہے' اس کی تائید ان ارشادات سے ہوتی ہے: ''وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ'' ''فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ'' ''اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ مبارک: ''قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ'' مشترک الدلالات ہے' اس لئے کہ ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے: ''قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ''۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''باء'' اور ''لام'' زائد ہیں' اور ایمان سے ''تصدیق'' مراد ہے' معنی یہ ہو جائے گا کہ وہ اللہ کی اور مومنین کی تصدیق کرتے ہیں۔

سوال ارشادِ باری ہے: ''اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا'' (کیا ان کو خبر نہیں کہ جو شخص اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرے گا تو یہ بات ٹھہر چکی ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی آگ اس طور پر نصیب ہو گی کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب خلود فی النار کا مستحق ہے۔ اس لئے کہ ''محادۃ'' سے مراد مخالفت وعداوت ہے؟

جواب یہ خبر: ''اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا'' ان منافقین کے بارے میں ہے جن کا سابق میں ذکر ہوا ہے لہٰذا اس ''محادۃ'' سے مراد کفر ونفاق ہوگا' اور یہ چیز خلود فی النار کا سبب ہے۔

سوال اس ارشادِ الٰہی کا کیا مطلب ہے: ''يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ'' (ڈرتے ہیں منافق یہ کہ اتاری جائے اوپر ان کے کوئی سورت) حالانکہ قرآن کی سورتیں حضور نبی

کریم ﷺ پر نازل ہوتی تھیں نہ کہ منافقین پر؟

جواب اول اسکا معنی یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے بارے میں کوئی سورت نازل نہ ہو جائے۔یہاں "علیٰ" کلمہ "فی" کے معنی میں ہے جیسے اس ارشاد میں: "عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ"۔

جواب ثانی یہاں "انزال" قراءت کے معنی میں ہے مطلب یہ ہوگا کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی سورت ان کے خلاف نہ پڑھی جائے۔

سوال جب اس مذکورہ آیت میں منافقین کی طرف سے نزولِ سورت پر خوف وڈر واقع اور ظاہر ہو چکا ہے تو پھر اس کا کیا معنی ہے: "قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ج اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ" (آپ فرما دیجیے کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو بیشک اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم اندیشہ کرتے تھے)؟

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سورت نازل فرما کر تمہارے اس نفاق کا اظہار کریں گے جس کے اظہار سے تم ڈرتے ہو اور یہ (جواب) مناسب ہے کیونکہ اس کے آگے یہ ہے: "تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ"۔

جواب ثانی یعنی تم جو نزولِ سورت سے اندیشہ کرتے ہو اس کو اللہ آشکارا کر کے چھوڑیں گے۔

سوال اس کا کیا مفہوم ہے: "تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ" (کہ خبر دیوے ان کو ساتھ اس چیز کے کہ بیچ دلوں ان کے ہے) یہ تو تحصیلِ حاصل ہے کیونکہ وہ منافق تو اپنے مافی ضمیر سے پہلے ہی واقف ہیں پھر ایسے قول کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب مطلب یہ ہے کہ وہ سورت ان کے مافی الضمیر پر ان کو اطلاع دے گی کہ ان کے سربستہ راز اور پوشیدہ نفاق شائع ذائع ہے اور وہ سورت پھر ان کے اعتقادات کو طشت ازبام کر کے ان کو رسوا کرے گی وہ تو سمجھتے ہیں کہ ان کے علاوہ اور کسی کو بھی ان کے مخفی رازوں کی خبر نہیں ہے ظاہر ہے یہ تحصیلِ حاصل نہیں ہے؟۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ منافقین کے بارے میں تو یوں فرمایا: "اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ" (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں) اور مومنین کے بارے میں یہ طرز اختیار فرمایا: "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ" (اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں) حالانکہ کلمہ "مِنْ" مشابہت پر زیادہ دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ جزئیت اور بعضیت کا تقاضا کرتا ہے اس لئے مومنین کے لئے یہ کلمہ (مِنْ) زیادہ قرینِ قیاس تھا اس لئے کہ مومنین اخلاق وعادات میں زیادہ مشابہت رکھتے ہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ کے ارشادِ عالی: ''بَعْضُهُمْ مِنْ م بَعْضٍ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دین پر ہیں یعنی ایک دوسرے کی عادت وکردار پر ہیں' یہاں لفظ دین یا خُلق مضمر ہے۔ کیونکہ ''مِن'' ''علی'' کے معنی میں آتا ہے' جیسے: ''وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا''۔ نیز جیسے: ''لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ'' یعنی جو اپنی بیویوں سے ہمبستری پر قسم کھاتے ہیں۔ نیز حضورِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد میں بھی یہی معنی مراد ہے: ''فمن رغب عن سنّتي فليس منّي'' نیز ''مَن غشّنا فليس منّا'' اور اس ارشادِ باری: ''بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ'' سے مراد یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ہیں۔ اگرچہ دونوں فریق اس عبارت کے لائق ہیں مگر منافقین کو اس عبارت کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا تاکہ ان کی اس قسم میں تکذیب کی جائے جو انہوں نے پہلے کھائی تھی: ''وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ'' نیز تاکہ اس ارشادِ خداوندی: ''وَمَا هُمْ مِنْكُمْ'' کی تقریر وتاکید ہو جائے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کیا نکتہ ہے: ''فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ'' (تو انہوں نے اپنے حصہ سے خوب فائدہ حاصل کیا) جب کہ اللہ جل جلالہ کا یہ ارشاد: ''فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ'' (پس فائدہ اٹھایا تم نے بھی اپنے حصہ کے ساتھ جیسا کہ فائدہ اٹھایا ان لوگوں نے جو تم سے پہلے پہلے تھے اپنے حصّہ کے ساتھ) اسمِ ضمیر کی جگہ اسمِ ظاہر کو رکھتے ہوئے ماقبل جملہ کو مستغنی کر دیتا ہے' جیسے یہ ارشاد بلا تکرار کے ہے: ''وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا'' (اور بحث کی تم نے جیسے بحث کی تھی انہوں نے)؟

جواب اس کا فائدہ سابقہ لوگوں کی برائی کے ساتھ تشبیہ کی تقدیم وتصدیر ہے' جو آیت میں مشبّہ بہ ہیں' یعنی جیسے پہلے لوگوں کو دنیا کا مال ومتاع دیا گیا اور وہ اس سے محظوظ ہوئے اور اخروی صلاح وفلاح کی طلب کو چھوڑ کر ناپائیدار دنیوی شہوات میں پڑ گئے اسی طرح یہ لوگ بھی ہیں۔ گویا ان منافقین کی حالت کی شناعت وقباحت بیان کرنا مقصود ہے تاکہ بعد میں ان لوگوں کی سابقہ لوگوں کے ساتھ مذمت میں تشبیہ ابلغ درجہ کی ہو سکے۔ جیسے آپ کسی ظالم کو اس کے ظلم کی قباحت بتانے کے لئے کہتے ہیں۔ تم فرعون کے مثل ہو۔ وہ لوگوں کو ناحق قتل کرتا تھا اور ظلم وفسق کرتا تھا اور تم بھی اس کے فعل کے مثل کرتے ہو۔

اور باقی رہی بات اس ارشاد کی: ''وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا'' تو چونکہ یہ ماقبل پر معطوف ہے یعنی اس تشبیہ پر جو صدرِ کلام میں ہے' اس لئے اس سابقہ امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال اس فرمانِ الٰہی سے کیا مراد ہے: ''اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ''

(اوران لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے) حبطِ عمل سے مراد اگر ثواب کا بطلان ہے تو یہ صرف آخرت میں ہوگا اور اگر حبطِ عمل سے مراد منفعت کا بطلان ہے تو منافقین کے اعمال دنیا میں تو باطل المنفعت نہیں ہیں، کیونکہ وہ تو اپنی جان و مال کے محفوظ ہونے اور مسلمانوں والے احکام ان پر لاگو ہونے کی وجہ سے دنیا سے منتفع ہو رہے ہیں؟۔

جواب حبوط فی الدنیا سے مراد ان کے دنیوی اعمال ہیں، جیسے ان کا نفاق اور مکروفریب، جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات وبیّنات اور اس کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ بہرحال اپنے نور کا اتمام کریں گے خواہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو، چنانچہ ان کی یہ آرزو اور تمنا پوری نہ ہوئی کہ وہ دینِ خداوندی کو مغلوب اور نبوتِ محمدی ﷺ کو مستور کر دیں گے۔

اور حبوط فی الآخرۃ سے مراد ان کے دینی اعمال ہیں، یعنی ان کی عبادات وطاعات، اس لئے کہ انہوں نے تمام عبادتیں نفاق اور ریاکاری کے طور پر کی ہیں، اس لئے آخرت میں ان کا ثواب رائگاں ہوگا۔ اور اگر ان کے اعمال سے مراد محض دینی اعمال ہوں تو ان کے حبوط فی الدنیا سے مراد ان کا قبول نہ ہونا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں عبادت کو قبول کرتے ہیں اور آخرت میں پھر اس کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا حبوط فی الدنیا سے مراد ہے ان اعمال کا بارگاہِ خداوندی میں قبول نہ ہونا اور ان پر اچھے ناموں کا اطلاق نہ ہونا۔ جیسے عبادت اور قربت وحسنہ وغیرہ۔

اور یہ بات اس ارشاد کے مقابل میں ہے: ''وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ'' چنانچہ معلوم ہوا کہ طاعات پر دنیا میں بھی ایک ایسا اجرِ معجّل ہے جو آخرت کے اجرِ مؤجل کے علاوہ ہے۔ اور وہ ہے اعمال کی قبولیت، حسنِ ثناء، ذکرِ خیر اور مخلوق کے دلوں میں محبت کا القاء۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا'' بعض علماء کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرے گا اور بلا سبب اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دے گا، اور نافرمانوں اور فاسقوں کا حال برعکس ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بغض رکھتا ہے اور بندوں کے دلوں میں بھی بلا سبب بغض ڈال دیتا ہے۔

سوال ارشادِ باری ہے: ''وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ'' (اور ان کا زمین میں نہ کوئی یار ہے اور نہ مددگار) زمین کی تخصیص کی وجہ کیا ہے، حالانکہ منافقین کو عذابِ خداوندی سے بچانے والا کوئی یار و مددگار نہ زمین میں ہے اور نہ آسمان میں اور نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں؟

جواب چونکہ منافقین، خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی آخرت کو مانتے تھے اور یار و مددگار کے بارے میں ان کا اعتقاد صرف دنیا میں مقصور تھا اس لئے دنیا کو زمین کے

ساتھ تعبیر فرمایا ہے' اور صرف زمین کا ذکر کیا ہے۔

جواب ثانی یہاں ''ارض'' سے مراد ارضِ دنیا و آخرت ہے۔ گویا یوں فرمایا: ''وما لهم في الدنيا والآخرة من وّلي ولا نصير''۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں: ''اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ'' (اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا) ستر کا عدد خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ منافقین کی مغفرت کبھی نہیں کریں گے' خواہ رسول اللہ ﷺ ہزار بار بھی ان کے لئے مغفرت طلب کریں جس کی دلیل یہ ارشاد ہے: ''سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ'' نیز اس لئے کہ وہ مشرک ہیں' اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں فرمائیں گے؟۔

جواب اہلِ عرب کی عادت ہے کہ وہ اکائیوں میں سات کے عدد سے مثَل بیان کرتے ہیں اور دہائیوں میں ستر کے عدد سے مثَل بیان کرتے ہیں۔ اور سینکڑوں کے سلسلہ میں سات سو کے عدد سے مثَل بیان کرتے ہیں' اس سے ان کا مقصد اس امر کی کثرت کو بیان کرنا ہوتا ہے' یہ مقصد نہیں ہوتا کہ صرف یہی عدد مقصود ہے' یعنی اس کے ذکر سے حصر مقصود نہیں ہوتا۔ تو گویا یوں فرمایا ہے:

اگر آپ ان منافقین کے لئے سب سے بڑے عدد سے بھی مغفرت طلب کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ہرگز ان کی مغفرت نہیں فرمائیں گے۔ اس ارشاد کے بعد خود اس عدمِ مغفرت کا سبب بیان فرمادیا: ''ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ'' یعنی یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا۔

سوال اگر اس سے مراد وہی ہے جو بھی ذکر ہوا تو نبی کریم ﷺ پر یہ مراد مخفی نہ رہتی حالانکہ آپؐ افصح العرب تھے اور کلام کے اسالیب اور تمثیلات سے سب سے زیادہ واقف تھے۔ کیونکہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے رخصت دی ہے چنانچہ میں ستر مرتبہ سے زیادہ مغفرت مانگوں گا۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''میں نے ان کے لئے ستر بار سے بھی زیادہ مغفرت طلب کروں گا ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کردیں؟۔

جواب آپؐ پر یہ مراد مخفی نہ تھی' حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اس سے مراد آپؐ کا ان لوگوں پر رحمت و رأفت کا غلبہ ہے جن کی طرف آپؐ مبعوث فرمائے گئے۔ جیسے خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اوصاف میں فرمایا ہے: ''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ'' الآیۃ۔ آپؐ اپنی امّت پر بڑے مہربان اور شفیق تھے' اس میں امّت کو بھی ترغیب ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ رحمت

وشفقت کا برتاؤ کیا کرے۔ انبیاءِ کرام علیہم السلام کا یہی شیوہ رہا ہے۔ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول یاد نہیں ہے؟: ''وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ''

سوال اس کا کیا معنی ہے: ''مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'' ان نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔ مغفرت اور رحمت تو مسیئین (گنہگاروں) کے لئے ہوتی ہے' نہ کہ محسنین (نیک کاروں) کے لئے؟۔

جوابِ اول اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیئین کے لئے غفور و رحیم ہے جب وہ توبہ کریں۔ اس کا تعلق محذوف کے ساتھ ہے' محسنین کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ محسنین نے تو اپنے احسان (نیک کاری) کی وجہ سے عقاب و مذمت کی راہ کو مسدود کر دیا ہے لہٰذا ان پر کوئی الزام نہیں۔

جوابِ ثانی کوئی بھی محسن (نیک کار) ہو وہ اپنے احسان میں کتنا ہی منتہی ہو جائے اللہ تعالیٰ کی بے ادبی یا کسی مخلوق کی برائی سے خالی نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کر کے محسن بنے تو اللہ تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہ بھی معاف فرما دیتے ہیں اور اس پر رحمت فرماتے ہیں' جیسے فرمایا: ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ'' الآیۃ۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: ''فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ'' (پس البتہ اللہ دیکھے گا تمہارے عمل اور اس کا رسول) اللہ کی رویت کا معنی اللہ کا جاننا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو سب کے حال و مآل کو پہلے سے جاننے والے ہیں؟۔

جواب اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے وہ اس کو غیبی طور پر جانتا ہے اسی طرح واقع اور موجود ہونے کے اعتبار سے بھی جان لے گا' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے ہیں کہ وہ کس حالت میں ہے' چنانچہ منتظر کو منتظر امر کے طور پر اور واقع کو واقع کے طور پر جاننے والا ہے۔ اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں اس کا معنی اپنے ظاہری مفہوم پر ہے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ'' (اور بہت لائق ہیں کہ نہیں جانتے حدیں اس چیز کی کہ اتارا ہے اللہ نے اوپر اپنے رسولؐ کے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو جہالت کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ تو پھر اہلِ عرب کے الفاظ و اشعار سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ پر استدلال کیسے درست ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآنی احکام کے بارے میں جہالت کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ نہ کہ قرآنی الفاظ میں۔ ہم احکام کے سلسلہ میں لغتِ عرب سے استدلال نہیں کرتے ہیں' بلکہ الفاظ

کے معنی معلوم کرنے کے لیے ان کی لغت سے استدلال کرتے ہیں' کیونکہ قرآن اور سنّت' اہلِ عرب کی لغت پر نازل ہوئے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے اس جگہ تو منافقین کے بارے میں فرمایا: "لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ" (آپ ان کونہیں جانتے ہم ہی ان کو جانتے ہیں) اور دوسری جگہ یوں فرمایا: "وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ" (اور آپ ان کو طرزِ کلام سے ضرور پہچان لیں گے) یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوں گی؟۔

جواب یہ آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی' لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے' اس لئے کہ ایک زمانہ میں علم کی نفی ہے اور دوسرے زمانہ میں علم کا اثبات ہے۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: "خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا" (ملا دیا ہے عمل اچھا اور اَور برا) دونوں کو مخلوط قرار دیا ہے تو پھر مخلوط بہٖ (جس کے ساتھ ملایا) کہاں ہے؟

جواب ہر ایک مخلوط بھی ہے اور مخلوط بہٖ بھی' اس لئے کہ اس کا معنی ہے' انہوں نے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا۔ جیسے آپ کہتے ہیں' خلطت الماء واللبن 'یعنی میں نے پانی اور دودھ کو ملا دیا۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا' اس طرز میں وہ مبالغہ ہے جو اس قول میں نہیں ہے خلطت الماء باللبن یعنی میں نے پانی کو دودھ کے ساتھ ملا دیا۔ اس لئے "باء" کے ساتھ آپ نے پانی کو مخلوط اور دودھ کو مخلوط بہٖ بنا دیا۔ اور "واؤ" کے ساتھ آپ نے پانی اور دودھ دونوں کو مخلوط بھی اور مخلوط بہٖ بھی بنا دیا۔ گویا کہ آپ نے یوں کہا: میں نے پانی کو دودھ کے ساتھ اور دودھ کو پانی کے ساتھ ملا دیا' اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ واؤ بمعنی باء ہو۔ جیسے اہلِ عرب کہتے ہیں: بعت شاة ودرهما' مراد ہوتا ہے کہ بکری کو درہم کے عوض بیچا۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ "وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (اور بُری باتوں سے باز رکھنے والے ہیں) کو "واؤ" کے ساتھ اور ماقبل کی صفات کو بغیر واؤ کے ذکر کیا ہے؟

جواب اول اس لئے کہ یہ آٹھویں صفت ہے' اہلِ عرب سات کے بعد "واؤ" داخل کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ عدد تام ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک سات کا عدد عقدِ تام ہے جیسے ہمارے ہاں دس کا عدد ہے۔ اس لئے وہ حرفِ عطف لاتے ہیں جو معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی نظیر یہ ارشادِ خداوندی ہے: "وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ" جبکہ اس سے قبل دو مرتبہ عدد بغیر واؤ کے ذکر ہوا' اسی طرح جنت کی صفت میں یہ ارشاد ہے: "وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا" واؤ کے ساتھ لائے کیونکہ جنت کے ابواب آٹھ ہیں' اور جہنم کی صفت میں فرمایا: "فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا" یعنی بغیر واؤ کے۔ کیونکہ اس کے ابواب سات ہیں۔ لیکن یہ ارشاد: "ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا" اس قبیل

سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر اس میں واؤ حذف کر دیں تو معنی بدل جاتے ہیں۔ کیونکہ دونوں صفتیں (ثیبہ اور باکرہ) آپس میں متعارض ہیں۔

جواب ثانی اس پر واؤ اس لئے لائے تاکہ معلوم ہو کہ آمر بالمعروف' امر بالمعروف کی حالت میں ناہی عن المنکر بھی ہوتا ہے۔ تو یہ دونوں صفات ایسی ہیں کہ ان میں تلازم پایا جاتا ہے' جبکہ باقی مذکورہ صفات کا حال ایسا نہیں ہے یعنی ان میں تلازم نہیں ہے۔ یہ قاعدہ اس فرمانِ الٰہی کی وجہ سے مخدوش یا منقوض نہیں ہوتا: ''اَلرَّاکِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ'' کیونکہ یہ دونوں صفات متلازم نہیں ہیں۔ اس لئے کہ سجود تو رکوع کو لازم ہے لیکن رکوع' سجود کو لازم نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس کے سوا بھی سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر ہے۔ زمخشریؒ نے اس واؤ کے بارے میں کوئی بات نہیں بیان فرمائی ہے۔

سوال اس کا معنی کیا ہے: ''لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ'' (تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے) یعنی ان کے سب سے اچھے عمل کا بدلہ دے' حالانکہ ارشادِ خداوندی ہے: ''فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ'' یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی کا بھی بدلہ ملے گا؟۔

جواب اوّل اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اچھائی کا بدلہ دے گا جو وہ کیا کرتے تھے' اور وہ تمام نیکیوں میں کوئی بھی نیکی ہو' سورۃ الروم میں: ''وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ'' کے تحت اس کی وضاحت آئیگی' ان شاء اللہ تعالیٰ۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا خوب سے خوب بدلہ دے گا۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک: ''فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا'' (پس جو لوگ کہ ایمان لائے پس زیادہ کیا ان کو ایمان میں) اس سے معلوم ہوا کہ ایمان' زیادت کو قبول کرتا ہے؟

جواب امام مجاہدؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ وہ سورت ان کے علم میں اضافہ کرتی ہے' اس لئے کہ علم' ایمان کے ثمرات میں سے ہے' چنانچہ ایمان کو مجازاً ذکر کیا۔

سورۃ یونس

سوال اس کا کیا مطلب ہے: ''یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ'' (مفصّل بیان کرتا ہے نشانیوں کو واسطے اس قوم کے جو جانتی ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم اور اہلِ جہالت' سب کے

لئے آیات کو مفصل بیان کیا ہے؟

جواب چونکہ آیات کی تفصیل اور پھر اس تفصیل سے اکثر انتفاع علماء کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے تفصیل کی اضافت علم والوں کی طرف کر دی اور انہی کو خاص طور سے ذکر کیا۔

سوال اس کا کیا معنی ہے: "وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (اور ان کی اخیر بات یہ ہوگی الحمد للہ رب العالمین) حالانکہ جنتیوں کے اقوال واحوال کی کوئی اخیر نہیں ہے کیونکہ جنت' دار الخلود ہے؟۔

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ ہر مجلسِ ذکر ودعا یا ہر محفلِ تسبیح میں ان کی آخری بات یہ ہوگی۔ کیونکہ اہلِ جنت تسبیح پڑھا کریں گے اور ذکر کیا کریں گے تاکہ اس ذکر وتسبیح سے انہیں لذّت وسُرور حاصل ہو۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کفار کا مشیتِ خداوندی سے استدلال کرنا ناپسند کیا ہے' فرمایا: "وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا" اور اسی لئے کسی گنہگار اور نافرمان کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یوں کہے کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں یہ معصیت نہ کرتا' لہٰذا مجھ پر حد قائم نہ کرو' تو پھر نبی اکرم ﷺ نے یہ کیسے فرمایا: "لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ" (اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا تو میں تم کو یہ پڑھ کر نہ سناتا)؟۔

جواب حضور نبی کریم ﷺ نے یہ جملہ بامرِ خداوندی فرمایا' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو فرمایا: "قُلْ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ" (آپ کہہ دیجئے کہ اگر خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا تو میں تم کو یہ (کلام) پڑھ کر نہ سناتا)۔ جب اللہ تعالیٰ بندے کو مشیتِ الٰہیہ سے استدلال کرنے کا حکم دے تو پھر بندے کے لئے جائز ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی مشیت سے استدلال کرے۔ بصورتِ دیگر محض مشیتِ خداوندی سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے' مذکورہ سوال کا تعلق اسی سے ہے کہ حکمِ الٰہی کے بغیر صرف مشیتِ الٰہیہ سے استدلال کرنا ممنوع وناپسند ہے۔

سوال اس ارشاد کا کیا مطلب ہے: "فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ" (پس جب نجات دی ان کو ناگہاں وہ سرکشی کرتے ہیں زمین میں ناحق) حالانکہ "بغی" کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو ناحق ہو' کیونکہ "بغی" کا معنی ہے فساد وتعدّی۔ جیسے کہتے ہیں: "بغی الجرح یعنی زخم خراب ہو گیا کذا قاله الاصمعی' لہٰذا اس کو "بغیر الحق" کے ساتھ مقیّد کرنے میں کیا نکتہ ہے؟

جواب کبھی فساد بالحق بھی ہوتا ہے' جیسے مسلمانوں کا کفار کی سرزمین پر غلبہ پانا اور ان کے

گھروں کو منہدم کرنا' ان کے کھیتوں کا نذرِ آتش کرنا اور ان کے درختوں کو کاٹنا۔ جیسے خود رسولِ کریم ﷺ نے بنو قریظہ کے ساتھ کیا تھا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں حیاتِ دنیوی کو آسمان کے پانی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا: "اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ" (پس دنیوی زندگی کی حالت تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا) دونوں میں وجہ تشبیہ کیا ہے؟

جواب اول وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جیسے آسمان کے پانی یعنی بارش کے کسب میں بندے کا کوئی دخل عمل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کمی وزیادتی میں بندے کی کوئی تدبیر کارگر ہے اسی طرح حیات کی کمی وزیادتی میں بندے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

جواب ثانی جیسے آسمان کے پانی (بارش) سے نفع اٹھانے میں تمام مخلوق برابر ہے خواہ وہ مالدار ہو یا نادار' بلند مرتبہ ہو یا کم مرتبہ' حیوان ہو یا کوئی اور' جیسے حجر' شجر' ثمر وغیرہ' اسی طرح حیاتِ دنیوی ہے۔ چنانچہ حیات کو بارش کے ساتھ تشبیہ دینے میں بہت مناسبت ومطابقت ہے۔

سوال یہاں فرمایا: "وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ" (اور جس دن اکٹھا کرینگے ہم ان کو سب کو پھر کہیں گے ہم واسطے ان لوگوں کے کہ شریک لائے تھے کھڑے رہو اپنی جگہ پر تم اور تمہارے شریک) اور دوسری جگہ فرمایا: "وَلَا يُكَلِّمُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" (اور قیامت کے دن ان سے کلام نہیں کرینگے)۔ دونوں آیتوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟

جواب اول قیامت کے دن مقامات مختلف ہوں گے' چنانچہ ایک مقام میں تو اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کریں گے' اور ایک مقام میں کلام کریں گے۔ اس کی نظیر یہ ہے: "فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ" نیز یہ ارشاد بھی اس کی نظیر ہے: "فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔

جواب ثانی اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے اکرام والا کلام نہ فرمائیں گے بلکہ توبیخ والا کلام فرمائیں گے۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: "قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" آخر آیت تک۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق' رازق اور تمام مخلوقات کے امور کا مدبر ہے' ان تمام باتوں کے باوجود پھر کیسے وہ بت پرستی کرتے تھے؟

جواب اصل میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس بت پرستی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا قرب حاصل ہوتا

ہے' ایک گروہ کہتا تھا کہ ہم اپنی حقارت اور اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بلاواسطہ عبادت کرنے کے لائق نہیں ہیں' اس لئے وہ بتوں کو واسطہ بناتے تھے' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: "مَانَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" جب کہ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ہم اصل میں فرشتوں کی صورت پر بُت بناتے ہیں اور پھر ان کو اس لئے پوجتے ہیں تاکہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں اور ہمیں اس کا مقرب بنادیں۔ اور ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ یہ بُت اصل میں اللہ کی عبادت کے سلسلہ میں ہمارا قبلہ ہیں۔ جیسے کعبہ اس کی عبادت کے لئے قبلہ ہے۔ اور ایک گروہ جو کہ زیادہ تعداد میں تھا یہ خیال کرتا تھا کہ ہر بت پر ایک شیطان جو منجانب اللہ مقرر ہے' لہٰذا جو بت کی کماحقہ عبادت کرتا ہے تو وہ مقرر کردہ شیطان' اللہ کے حکم سے اس کی مراد کے مطابق اس کی حاجات کو پورا کرتا ہے' اور جو بُت کی عبادت میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ شیطان بحکمِ خداوندی اسے کوئی گزند پہنچا دیتا ہے' معلوم ہوا کہ یہ تمام گروہ جو بتوں کو پوجنے والے تھے اپنی اس بُت پرستی کو خدا تعالیٰ کی عبادت اور اس کے تقرب کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ البتہ ہر گروہ کا طریقِ کار مختلف ہوتا تھا۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ" (آپ کہئے کہ کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے جو پہلی بار بھی پیدا کرے پھر دوبارہ بھی پیدا کرے) مشرکین تو اعادہ (دوبارہ پیدا کرنا) کے تو بالکل بھی معترف نہیں تھے نہ اللہ کی طرف سے اور نہ کسی اور کی طرف سے؟۔

جواب چونکہ اعادہ' ظہورِ حجت کی وجہ سے ظاہر الوجود ہے اور وہ ہے پہلی بار پیدا کرنے کی قدرت۔ اور اعادہ ہماری نسبت سے اہون ہے اس لئے اعادہ ان کو لازم ہوا' لہٰذا یہ ایسا ہی جیسے وہ اس اعادہ کے وجود کو بحیثیتِ ظہورِ حجت تسلیم کرتے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ" (سو ہمارے پاس تو ان کو آنا ہی ہے پھر اللہ ان کے سب افعال کی اطلاع رکھتا ہے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے افعال پر اپنے مطلع ہونے کو قیامت کے دن ان کے رجوع الی اللہ پر مرتب کیا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں میں ان کے افعال پر مطلع ہیں؟

جواب اس آیت میں ذکر شہادت کا ہے اور مراد اس کا مقتضی اور نتیجہ ہے' اور وہ ہے جزاء وعقاب' گویا یوں فرمایا: "ثم اللہ یعاقب علی ما یفعلون" یعنی پھر اللہ ان کے افعال پر انکو عقاب دے گا۔ جیسے یہ ارشاد ہے: "وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ" قرآنِ عزیز میں اس

طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ یہاں پر "بَیَاتًا اَوْ نَھَارًا" کہا ہے "لَیْلًا اَوْ نَھَارًا" نہیں کہا۔ حالانکہ نہار کے ساتھ لیلًا کی زیادہ مطابقت ہے؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ کلامِ عرب میں ہلاکت، بطش، وعید و تہدید کے موقعوں پر معہود اور مانوس لفظ "بیات" ہے، خواہ اس کے ساتھ "نہار" کو ملایا جائے یا نہ ملایا جائے، اس لئے اس کے ساتھ "لیلا" نہیں کہا۔

سوال ارشادِ باری ہے: "مَاذَا یَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ" (کون چیز ایسی ہے کہ مجرم لوگ اس کو جلدی مانگ رہے ہیں) آیت کا اوّل حصہ مواجہت کے لئے ہے؟

جواب مجرمین کا ذکر کیا اور مراد ترکِ استعجال کے مقتضی پر دلالت ہے اور وہ جرم ہے۔ اس لئے کہ مجرم کو تو اپنے جرم پر عذاب کا خوف کرنا چاہئے اور عذاب کے آنے پر گھبرانا چاہئے، اگر چہ وہ عذاب مؤخر ہو چہ جائیکہ وہ عذاب کو جلدی طلب کرے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا" (آپ کہہ دیجئے تو بس لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے) جب مشار الیہ "فضل" اور "رحمت" تثنیہ ہے تو "فَبِذٰنِكَ" کہنا چاہئے؟

جواب اس طرح کا سوال و جواب سورۃ البقرۃ میں: "عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِكَ" کے تحت گزر چکا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَمَا ظَنُّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ" (اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ افتراء باندھتے ہیں ان کا قیامت کی نسبت کیا گمان ہے) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تہدید و تنبیہ پر مبنی ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اس بارے میں کیا گمان و خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے افتراء پر ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، جب اس میں تہدید مقصود ہے تو اس کے بعد والا ارشاد: "اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ" (تحقیق لوگوں پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے) اس کے مناسب کیسے ہوگا؟۔

جواب یہ مناسب ہے، اس لئے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر واقعی یہ بڑا فضل ہے کہ ان کو عقل و وحی اور ہدایت جیسی نعمت سے نوازا اور عذاب کو مؤخر کیا اور توبہ کا دروازہ کھول دیا، ان تمام تر نعمتوں کے ہوتے ہوئے یہ لوگ اللہ پر جھوٹ و افتراء کیسے باندھتے ہیں؟۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ: "وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ" (آپ کسی حال میں ہوں، آپ کہیں سے قرآن پڑھتے ہوں) میں تو صیغہ مفرد لائے (ماتکون، اور ماتتلوا) اور"

وَلَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ ''(اورتم جوکام بھی کرتے ہو) میں جمع کا صیغہ لائے ہیں؟ حالانکہ ان سب میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے؟

جواب ابن الانباریؒ فرماتے ہیں: تیسرے فعل کو جمع اس لئے لائے تاکہ معلوم ہوجائے کہ امّت پہلے دوفعلوں میں نبی ﷺ کے ساتھ شامل ہے۔ بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ فعلِ ثالث سے مراد بھی نبی ﷺ ہیں، آپؐ کی تفخیم و تعظیم کی خاطر جمع لائے۔ جیسے اس فرمانِ خداوندی میں ابن عباسؓ کے قول پر جمع لائے ہیں: ''اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ'' نیز جیسے ''یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ'' حالانکہ اس ''رُسُل'' سے مراد صرف نبی کریم ﷺ ہیں۔ كذا قاله ابن عباس والحسن وغيرهما واختاره ابن قتيبة والزجاج۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں: ''وَمَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ'' (اور نہیں چھپتی تیرے پروردگار سے کچھ چیز ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں) زمین کو آسمان پر مقدم ذکر کیا ہے اور سورۃ سباء میں اس آیتِ کریمہ کے اندر: ''عٰلِمُ الۡغَیۡبِ لَا یَعۡزُبُ عَنۡهُ مِثۡقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الۡاَرۡضِ'' آسمان کا ذکر زمین سے پہلے کیا گیا ہے؟۔

جواب اول اگرچہ آسمان کا یہ حق ہے کہ وہ زمین پر مطلقاً مقدم ہو، کیونکہ وہ اشرف ہے، لیکن چونکہ صدرِ آیت میں اللہ تعالیٰ کے مطلع ہونے کا ذکر ہے کہ وہ اہلِ ارض کے تمام افعال، اقوال اور احوال سے باخبر ہے اس لئے مناسب ہوا کہ زمین کو آسمان سے پہلے ذکر کردیا جائے۔

جواب ثانی واؤ کے ساتھ عطف، تثنیہ کے مثل ہے اور اس کا وہی حکم ہے جو تثنیہ کا ہے۔ لہٰذا یہ عطف بالواؤ، تثنیہ کی طرح رتبہ کا فائدہ نہیں دے گا۔

سوال یہاں تو فرمایا: ''اِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا'' (تحقیق عزت ساری اللہ کے واسطے ہے) جب کہ دوسری جگہ میں فرمایا: ''وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ'' (اور اللہ کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے)، دونوں میں تطبیق کس طرح ہوگی؟۔

جواب اللہ تعالیٰ کے حق میں ''عزۃ'' بمعنی قدرت وغلبہ ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے حق میں ''عزۃ'' اعلائے کلمہ اور اظہارِ دین کے معنی میں ہے اور مومنین کے حق میں دشمنوں کے خلاف نصرت و امداد کے معنی میں ہے۔ لہٰذا نفسِ عزۃ میں اشتراک ثابت کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ''اِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا'' سے مراد وہ عزتِ کاملہ ہے جس میں الٰہ ہونے، خلق کرنے، موت وحیات دینے کی عزت اور دائمی بقاء وغیرہ مندرج ہیں، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

سوال جب تمام آسمان و زمین' ان کے مابین کی مخلوقات اور ان کے ماسوا تمام چیزوں کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہیں تو پھر: "مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جتنے زمین میں ہیں) کی تخصیص کا کیا فائدہ ہے؟

جواب صرف ملائکہ اور جن وانس کو جو اہلِ عقل میں سے ہیں خاص طور پر اس لئے ذکر فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جب یہ ذی عقل مخلوق اس کی عبد ہے اور وہ ان کا رب ہے اور ان میں سے کوئی بھی نہ ربوبیت کا حقدار ہے اور نہ ہی خدا کے ساتھ شرکت کا اہل' تو پھر ان کے سوا جو غیر ذوی العقول ہیں جیسے کواکب' اصنام وغیرہ تو وہ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ وہ نہ خدا کے ہمسر ہوں اور نہ ہی شریک۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے بطورِ استفہام فرمایا: "اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَکُمْ ط اَسِحْرٌ ھٰذَا" (کیا کہتے ہو تم واسطے حق کے جب آیا تمہارے پاس کیا یہ جادو ہے) حالانکہ انکی قوم نے بصورت اخبار یا اِنَّ اور لامِ تاکید کے ساتھ کلام کو مؤکد بنا کر یوں کہا تھا: "فَلَمَّا جَآءَھُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ ھٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ" (پس جب آیا ان کے پاس حق ہمارے پاس سے تو انہوں نے کہا تحقیق یہ البتہ جادو ہے صریح) نہ کہ بطورِ استفہام؟۔

جواب عبارت مقدر ہے: "اتقولون للحق لما جاء کم ان ھذا لسحر مبین" پھر ان کے قول کا انکار کرتے ہوئے فرمایا: "اسحر ھذا" لہٰذا اس استفہام کا تعلق قولِ موسیٰؑ سے ہے نہ کہ قومِ موسیٰؑ کے قول کا مفعول ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشادِ عالی میں خطاب کو مختلف انواع میں لائے ہیں: "وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَةً وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ" (اور وحی بھیجی ہم نے موسیٰؑ کی طرف اور ان کے بھائی کی طرف یہ کہ اپنی قوم کے واسطے جگہ دو مصر میں گھر اور اپنے گھروں کو کرو روبقبلہ یعنی مسجدیں بناؤ اور قائم رکھو نماز کو اور بشارت دو ایمان والوں کو)؟۔

جواب پہلے حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ سے خطاب کیا گیا کہ اپنی قوم کے لئے عبادت خانہ کا انتخاب کرو یہ ایسا کام ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سپرد کیا جاتا ہے پھر عام خطاب کیا گیا جس میں حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ بھی اور ان کی قوم بھی شامل ہے کہ مسجدیں بناؤ اور ان میں نماز قائم کرو اس لئے کہ یہ جمہور پر واجب ہے۔ پھر صرف موسیٰ علیہ السلام کو بشارت کے لئے خاص کیا گیا' اس بشارت کی عظمت و شرافت یا خود موسیٰ علیہ السلام کی عظمت کی بناء پر۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُعا کی نسبت موسیٰ وہارون علیہما السلام دونوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا'' (تحقیق تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی) حالانکہ دُعا صرف موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی' جیسے ارشادِ خداوندی ہے: ''وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِیْنَةً'' الآیة؟۔

جواب اول منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام ان کی دعا پر آمین کہتے جاتے تھے' آمین کہنا بھی ایک معنی میں دُعا ہے۔ اس لئے دعا کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے۔

جواب ثانی یہ بھی ممکن ہے کہ ہارون علیہ السلام نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دعا کی ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صرف موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا' یا تو اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام دعا میں سبقت لیجانے والے تھے یا دعا کے زیادہ حریص تھے یا ان کی دعا میں اخلاص زیادہ تھا۔

سوال اگر بات ایسی تھی تو پھر تثنیہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ فرماتے؟۔

جواب چونکہ ''دعوت'' مصدر ہے اور مصدر واحد' تثنیہ اور جمع سب کو شامل ہے' اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: ''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ''۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ''فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ'' (پس اگر آپ شک میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے) ''اِن'' تو محتمل الوجود چیز پر داخل ہوتا ہے حالانکہ حضور ﷺ کا قرآن کے بارے میں شک کرنا قطعاً منتفی اور باطل ہے؟

جواب یہاں خطاب نبی ﷺ کو نہیں ہے بلکہ اس شخص کو ہے جو قرآنِ کریم کے متعلق اور حضورِ اکرم ﷺ کی نبوت ورسالت کے متعلق شک کرنے والا ہو' گویا کہ یوں فرمایا: ''اے انسان! اگر تو کسی شک وشبہ میں ہے''۔

سوال آیت کا یہ حصہ: ''مِمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ'' بتاتا ہے کہ خطاب صرف نبی کریم ﷺ کو ہے اور کسی کو نہیں ہے؟

جواب اول اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا' اس کی دلیل یہ آیات ہیں: ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔ ''یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ''

جواب ثانی خطاب تو حضور ﷺ کو ہے مگر مراد آپ ؐ کے علاوہ دوسرے ہیں۔ جیسے اس فرمانِ خداوندی میں ہے ''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ'' نیز اس کی تائید ان آیاتِ کریمات سے بھی ہوتی ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا'' اور ''قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ

كُنْتُمْ فِىْ شَكٍّ مِنْ دِيْنِىْ ''

جواب ثالث یہاں ''اِن'' ''ما'' کے معنی میں ہے: تقدیر عبارت یہ ہوگی: ''فما کنت فی شك مما انزلنا الیك فسئل ــــــــــ'' مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کو اس بات کا حکم نہیں دیتے کہ آپ یہود و نصاریٰ کے عالموں سے اپنی کتاب کی صداقت کے بارے پوچھیں کیونکہ آپ اس کے متعلق شک میں ہیں بلکہ اس لئے تاکہ آپ کی بصیرت اور یقین و اطمینان میں ترقی ہو۔

جواب رابع خطاب' نبی کریم ﷺ کو ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ سے شک قطعی طور پر منتفی ہے یا اس سے مراد شک کرنے والے کافروں پر الزامِ حجت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے: ''ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' حالانکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوگا کہ یہ بات عیسیٰ علیہ السلام نے نہیں فرمائی تھی' معلوم ہوا صرف نصاریٰ پر حجت لازم کرنے کے لئے فرمائیں گے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا'' (اور اگر چاہتا تیرا پروردگار البتہ ایمان لاتے جو کوئی ہیں زمین کے بیچ میں سب سارے) جب ''كُلُّهُمْ'' فرمادیا تھا تو پھر مزید ''جَمِيْعًا'' فرمانے میں کیا نکتہ ہے؟ ''کلّھم'' تمام چیزوں کے شمول اور احاطہ کا فائدہ دیتا ہے؟۔

جواب ''کل'' کا لفظ شمول اور احاطہ کا فائدہ دیتا ہے مگر اجتماعی صفت کے ساتھ وجودِ ایمان پر دلالت نہیں کرتا۔ جبکہ ''جمیعًا'' بحالتِ واحدہ وجودِ ایمان پر بھی دلالت کرتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں: ''جاء نی القوم جمیعًا'' یعنی میرے پاس قوم مجتمع ہو کر آئی۔ اس کی نظیر یہ ہے: ''فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ''

سوال ارشاد ہوتا ہے: ''قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو (اور دیکھو) کہ کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں) یہ حکم کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ ہم آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں نہ جانتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں؟۔

جواب یہ حکم عام ہے اور اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ہم اپنی بصارت سے ادراک کر سکتے ہیں جیسے سورج' چاند' ستارے' پہاڑ' دریا' سمندر' کانیں' حیوانات اور نباتات وغیرہ' جو صانع کے وجود' اس کی توحید اور عظیم قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ ان چیزوں سے ماوراء پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ'' الآیۃ اس میں کیا

حکمت ہے کہ ''ضُرٍّ'' (تکلیف) کے ساتھ مس کا لفظ ذکر فرمایا ہے اور ''خیر'' (راحت) کے ساتھ ارادہ کا لفظ ذکر فرمایا ہے؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ مس اور ارادہ دونوں کا استعمال ضُر اور خیر دونوں کے لئے ہے۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ تکلیف پہنچانا چاہے یا راحت پہنچانا چاہے تو اس کو کوئی دور نہیں کر سکتا اور نہ اس کو ہٹا سکتا ہے۔ مگر یہاں کلام میں اختصار کیا گیا کہ ایک میں مس کا ذکر کر دیا اور دوسرے میں ارادہ کا ذکر کر دیا' تا کہ یہ چیز غیر مذکور پر دلالت کرے' جبکہ سورۃ الانعام میں مس کا ذکر ضُر اور خیر دونوں کے ساتھ کیا گیا ہے' لہٰذا سورۃ الانعام میں جو لفظِ مس مذکور ہے یہاں اس سے عدول کیا اور لفظِ ارادہ لے آئے' اس لئے کہ یہاں پر شرط کی جزا ''فلا رادّ لفضله'' ہے اور ''ردّ'' اس چیز میں ہوتا ہے جو تا حال واقع نہ ہوئی ہو۔ اور ''مس'' کا تعلق اس چیز کے ساتھ ہوتا ہے جو واقع ہو چکی ہو' اسی لئے وہاں یوں فرمایا: ''وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس خیر کو دائمی کر دے اور اگر چاہے تو اس کو زائل کر دے لہٰذا کسی چیز کی زیادتی اور دوام اسی ذاتِ اقدس سے طلب کرنی چاہیے۔

سورۃ ھود

سوال اللہ تعالیٰ نے: ''وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ'' (اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر تم توبہ کرو) کیوں فرمایا' حالانکہ توبہ استغفار سے پہلے ہوتی ہے؟

جواب اوّل اس آیت کا مطلب یہ ہے پہلے اپنے رب سے شرک کے گناہ کی معافی طلب کرو پھر اطاعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو' جیسا کہ مقاتلؒ نے فرمایا ہے: ''اور اس قسم کا استغفار توبہ سے مقدم ہوتا ہے''۔

جواب ثانی اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔

جواب ثالث ''ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ'' میں لفظ ''ثم'' واو کے معنی میں ہے اور واو مطلق جمع کے لئے آتی ہے جمع مع الترتیب کا فائدہ نہیں دیتی لہٰذا کوئی اشکال نہیں رہا۔

سوال فرمان باری ہے: ''وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا'' بقول ابن عباسؓ اور ابن قتیبہؒ جو شخص توبہ و استغفار نہ بھی کرے اس کو بھی اللہ تعالیٰ وقتِ مقررہ تک متاعِ حسن عطا فرماتا ہے۔ تو اس آیت میں متاعِ حسن کو توبہ اور استغفار کے ساتھ مشروط کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ابن قتیبہؒ کے علاوہ دیگر مفسرین نے اس کی تفسیر ایسی حیات سے کی ہے جو اطاعت الٰہی اور قناعت کے ساتھ ہو' اس قسم کی زندگی صرف توبہ و استغفار کرنے والوں کو ہی حاصل ہے۔

سوال فرمانِ الٰہی : '' وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ '' میں فِي الارض فرمایا: علی الارض کیوں نہیں فرمایا؟ حالانکہ دابۃ کے ساتھ ''علیٰ'' بہت زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ ''دابۃ'' کہتے ہیں زمین کے اوپر رینگنے والے کو۔

جواب اول جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ''وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ ''میں لفظ ''فی'' اور ''أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ'' میں ''فی'' ''علی'' کے معنی میں ہیں اس طرح یہاں بھی ''فی'' ''علی'' کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی ''علیٰ'' کے مقابلے میں لفظ ''فی'' میں عموم وشمول زیادہ ہے یعنی ''فی'' زمین کے اوپر چلنے والی مخلوقات کو بھی شامل ہے اور زیر زمین چلنے والوں کو بھی شامل ہے جبکہ ''علی'' صرف زمین کے اوپر چلنے والوں کو شامل ہے (اس لئے آیت میں ''علی'' کے بجائے ''فی'' استعمال کیا گیا)۔

سوال اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف زمین پر چلنے والی مخلوق کو رزق دینے کا ذمہ لیا حالانکہ ہوا میں اڑنے والے پرندوں کو بھی اللہ ہی رزق عطا فرماتا ہے۔ اور یہ ''دابۃ'' میں داخل بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ'' میں ''طائر'' کا ''دابۃ'' پر عطف بھی مغائرت پر دلالت کرتا ہے؟۔

جواب ''دابۃ'' کے خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ چوپائے' پرندوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں اور پرندوں کے مقابلے میں زمین پر چلنے والی مخلوق میں بڑے بڑے جسم والے جانور ہیں جیسا کہ ہاتھی' بڑی بڑی عظیم الجثہ مچھلیاں ہیں جو رزق کے زیادہ ضرورت مند ہیں اسی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بطورِ خاص رزق کی بہم پہنچانے کا ذکر فرمایا۔

سوال اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا'' (مگر اللہ کے ذمے ہے اس کی روزی) جبکہ ''علی'' وجوب کے لئے آتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ پر کس کو رزق دینا واجب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل اور مہربانی سے مخلوق کو رزق عطاء فرماتا ہے؟۔

جواب اول یہاں ''علی'' ''من'' کے معنی میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول: ''إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ'' (جب ماپ لیں لوگوں سے پورا بھر لیں) میں ''علی'' ''مِنْ'' کے معنی میں

ہے۔

جواب ثانی وجوب کے صیغے کے ساتھ ذکر اس لئے کیا تا کہ بندوں کو حصولِ رزق کے متعلق مزید سکون واطمینان نصیب ہو جائے۔

سوال "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" (تا کہ تم کو آزمادے کہ تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے) کیسے فرمایا: حالانکہ خطاب عام ہے، مؤمنین اور کافرین سب کو شامل ہے۔ کافر کے اعمال میں تفاوت حسن اور احسن کے اعتبار سے نہیں ہوتا۔ عمل کا اچھا اور سب سے اچھا ہونا مؤمن کے اعمال میں ہوتا ہے۔ کافر کے اعمال میں تفاوت قبح میں ہوتی ہے۔ تو اس آیت میں دونوں کو کیسے مخاطب کیا گیا؟۔

جواب "لِيَبْلُوَكُمْ" عام ہے مراد اس سے خاص لیا گیا ہے یعنی مومنین ہی مراد ہیں۔ عام بول کر خاص مراد لینے کی وجہ مومنین کو خصوصیت اور شرف دینا ہے۔

سوال آیت میں "وَضَائِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ" فرمایا گیا ہے 'ضیق بہ صدرک نہیں فرمایا گیا' کیوں؟

جواب یہ بتانے کے لئے ایسا کیا گیا کہ آپ ﷺ کا دل تنگ ہونا عارضی ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کا سینہ مبارک سب سے وسیع تھا' یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ اہلِ عرب کہتے ہیں زید سائد و جائد' جب اس کی سیادت وسخاوت عارضی ہو۔ اور یہ بتانا مقصود ہو کہ زید سیادت اور سخاوت کے ساتھ ہمیشہ متصف ہے تو کہتے ہیں "زید سید" "زید جواد" زمخشریؒ نے بھی اس طرح بیان کیا ہے۔

سوال فرمان باری تعالیٰ ہے: "فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ" ترجمہ (تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنائی ہوئی لے آؤ) اس آیت میں قرآن کے مثل لانے کا حکم دیا گیا' حالانکہ کفار جو پیش کریں گے وہ ہرگز قرآن کی طرح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو وہ لائیں گے وہ یقیناً من گھڑت ہوگا' اور قرآن من گھڑت نہیں ہو سکتا۔

جواب اول یہاں مثلِ قرآن سے مراد مضامین میں مثل نہیں بلکہ فصاحت وبلاغت میں مثل مراد ہے۔

جواب ثانی بعض نے کہا: تم بھی گھڑ کر لاؤ قرآن کی طرح جیسا کہ تمہارے زعم کے مطابق قرآن من گھڑت ہے۔

سوال فرمانِ باری تعالیٰ: "قُلْ فَاْتُوْا" (آپ فرمادیجئے پس لاؤ) میں "قل" کو مفرد اور "فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْا" (پھر یہ کفار تم لوگوں کا کہنا نہ کرسکے تو تم یقین کرلو) میں "لکم" اور "فاعلموا" کو جمع کے صیغے کے ساتھ لایا گیا ہے' کیوں؟۔

جواب اول دونوں جگہ خطاب نبی کریم ﷺ ہی کو ہے البتہ آپ کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کرنا آپ ﷺ کی تعظیم اور تفخیم شان کے لئے ہے۔

جواب ثانی "لکم" اور "فاعلمو" سے خطاب صرف حضور اکرم ﷺ کو نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کو بھی ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ قرآن کریم کے ذریعے کفار کو چیلنج کرتے تھے۔ لیکن اس آیت: "فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ" (پھر اگر یہ لوگ آپ کا کہنا نہ کر سکے تو آپ یقین کر لیں) سے پہلے جواب کی تائید ہوتی ہے۔

جواب ثالث "لکم" اور "فاعلموا" میں خطاب مشرکین کو ہے۔ اور "لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا" کی ضمیر من استطعتم کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے اگر وہ لوگ جن کو تم اس کام کی دعوت دے رہو اس کلام کے ساتھ معارضہ کرنے کے متعلق تم کو جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لو یہ کلام کسی انسان کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتارا ہوا کلام ہے۔ یہ لطیف جواب ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا" (اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا آخرت میں ناکارہ ہوگا)۔ یہ آیت دلالت کر رہی کفار کے اعمال کے باطل ہونے پر۔ پھر اس کے بعد "وبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟۔

جواب "وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْهَا" کا مطلب ہے، دنیا میں ان لوگوں نے جو نیک اعمال کئے ان کا ثواب باطل ہو گیا اور "بَاطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" کا مطلب ہے جو عمل وہ دکھلاوے کے لئے کرتے تھے وہ تو تھے ہی باطل۔

سوال حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا: "وَیٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ" واو کے ساتھ خطاب کیا یہی الفاظ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی استعمال کئے اور فرمایا "یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ" بغیر واو کے۔ فرق کی کوئی وجہ؟

جواب دونوں جگہ "علیہ" میں "ہ" ضمیر تبلیغ رسالت کی طرف لوٹ رہی جس پر دونوں قصے دلالت کر رہے ہیں۔ البتہ نوح علیہ السلام کے قصے میں ضمیر اور مرجع کے درمیان دوسرے کلام سے فصل آئی ہے۔ تو واو ابتداء لایا گیا۔ اور ہود علیہ السلام کے قصے میں ضمیر اور مرجع کے درمیان کوئی دوسرا کلام واقع نہیں ہوا تو واوَ ابتداء میں لانے کی ضرورت بھی نہ پڑی۔ میری سمجھ میں یہی آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال فرمان تعالیٰ: "لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ" (آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا

نہیں)۔ سے (الا مَنْ رَحِمَ) (لیکن جس پر ہم رحم کریں) کا استثناء بظاہر درست نہیں اس لئے کہ مرحوم معصوم ہوتا ہے ظاہر کلام کا تقاضہ یہی ہے "لَا مَعْصُوم الامن رَحِمَ" ہونا چاہئے یعنی طوفان میں غرق ہونے سے کوئی نہیں بچ سکتا مگر وہ بچ جائے گا جسے اللہ تعالیٰ کشتی کے ذریعے بچائیں گے؟۔

جواب اول آیت میں "عاصم" معصوم کے معنی میں ہے: جیسا "مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ" میں دافق مدفوق کے معنی میں ہے۔ اس طرح "فَهُوَ فِي عِيْشَةٍ رَاضِيَةٍ" میں راضیۃ مرضیہ کے معنی میں ہے۔ اور اہل عرب کا قول اور سِرٌّ کاتم" میں کاتم مکتوم کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی مَنْ رَحِمَ مرحوم کے معنی میں نہیں بلکہ رَاحِمٌ کے معنی میں ہے۔ وہ ہے راحم اللہ تعالیٰ۔ تو مطلب یہ ہوگا لا عاصم الیوم الا اللہ۔ یعنی بچانے والا صرف اللہ ہی ہیں۔

جواب ثالث اِلَّا مَنْ رَّحِمَ میں مضاف مقدر ہے۔ یعنی الامکان من رحم ہے یعنی غرق ہونے سے کوئی بچانے والا نہیں سوائے ان لوگوں کی جگہ جن پر اللہ کا رحم ہوا ہے یعنی مومنین کا مکان یعنی کشتی ہی اللہ کے حکم سے بچانے والا ہے اور فرمان تعالیٰ: "وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (اور فرمایا کہ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ ہی کے نام سے ہے۔ بالیقین میرا رب غفور ہے رحیم ہے) آخری جواب اس آیت کے مناسب ہے۔ اس لئے کہ جب نوح علیہ السلام کے بیٹے نے کہا پہاڑ مجھے غرق ہونے سے بچائے گا تو جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: آج اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے اللہ کے یا اس مکان کے جسمیں پناہ لینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور وہ ہے کشتی۔

سوال "وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ" ترجمہ (اور حکم ہو گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا)۔ اس آیت میں زمین و آسمان کو حکم دیا گیا ہے حالانکہ حکم عاقل کو دیا جاتا ہے جب کہ زمین آسمان غیر عاقل ہیں؟۔

جواب اول زمین و آسمان کو یہ حکم صورۃً دیا گیا ہے درحقیقت یہ امر ان فرشتوں کو ہے جو زمین و آسمان کے امور کی تدبیر کرتے ہیں۔

جواب ثانی یہ امر، امر ایجاد ہے امر ایجاب نہیں۔ امر ایجاد کے لئے عقل و فہم شرط نہیں ہے۔ اس لئے کہ تمام اشیاء امر ایجاد کے اعتبار سے مطیع اور فرمانبردار ہیں، جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے: "اِنَّمَا اَمْرُنَا لِشَيْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" (جب ہم کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف کُن کہتے ہیں تو وہ ہو جاتا ہے)۔ اس طرح اس آیت "فَقَالَ لَهَا

وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا ”میں“فقال” کو (ف) کے ساتھ لایا اور حضرت زکریاؑ کے قصے میں آیت ”اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا قَالَ رَبِّ“ میں قال بغیر فاء کے لایا۔ کیوں؟

جواب ثالث یہاں سورۃ ہود میں نداء سے مراد ارادۂ نداء ہے تو ”ف“ لائے جو سببیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے کہ ارادۂ ندا' نداء کا سبب ہے۔

گویا یوں فرمایا: ”واراد نوح نداء ربه فقال کیت و کیت“ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے قصے میں نداء سے ارادہ نداء نہیں بلکہ حقیقت نداء مقصود ہے۔ لہٰذا یہاں سبب نداء نہ ہونے کی وجہ سے ”ف“ لانے کی ضرورت نہ رہی۔

سوال حضرت ہودؑ نبی تھے مگر انہوں نے کوئی معجزہ ظاہر نہیں کیا جیسا کہ ان کی قوم نے بھی ان سے یہ کہا: ”يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ“ (اے ہود آپ نے کوئی معجزہ ہمارے سامنے پیش نہیں کیا) جب انہوں نے کوئی معجزہ پیش نہیں کیا تو ان کی رسالت کو ماننا ان کی قوم پر کیسے لازم ہو گیا؟۔

جواب اول معجزہ لانے کی ضرورت اس رسول کو پیش آتی ہے جو صاحب شریعت ہو۔ تاکہ ان کی امت ان کی پیروی کرے۔ یہ ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ ہر شریعت میں بظاہر کوئی نہ کوئی امر عقل کی کسوٹی میں نہیں اترتا۔ تو رسول کو خرق عادت امر یعنی معجزہ لانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے ان کا اشکال ختم ہو اور رسول کی تصدیق کریں' اور یہ معجزہ ان کی صداقت پر گواہ ہو۔ اور وہ رسول جو صاحب شریعت نہ ہو' اور خلاف عقل امور کا حکم نہ دیتا ہو۔ اس کے لئے معجزہ لانے کی ضرورت نہیں ہوتی تو حضرت ہود علیہ السلام بھی صاحب شریعت نبی نہ تھے اس لئے انہیں بھی معجزہ دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

جواب ثانی حضرت ہودؑ سے بھی معجزہ ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ سخت تند و تیز ہوا آپ کے حکم سے چلتی تھی جو ان کے لئے مسخر تھی۔

سوال بقول آپ کے ہود علیہ السلام کے احکامات سارے کے سارے اگر عقل کے موافق ہوں تو قوم ان کی مخالفت نہ کرتی' اور نہ ان کو جھٹلاتی اور نہ ہی ان کو مجنون کہتی جیسا کہ اس آیت میں انہوں یہ سب کچھ کہا انہوں نے کہا: ”يٰهُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِكِىۡۤ اٰلِهَتِنَا عَنۡ قَوۡلِكَ وَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ“ ترجمہ (اے ہود! آپ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں لائے اور ہم آپ کے کہنے پر اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑتے۔ اور نہ ہی تجھ پر ایمان لاتے ہیں)۔

جواب یہ قول ان کی امت کے عقلمندوں کا نہیں بلکہ یہ کم عقل اور معاند و مکابر قسم کے لوگوں کا ہے۔ جیسا کہ ہر نبی کے ساتھ واضح معجزہ لانے کے باوجود ایسا معاملہ ہوتا ہے۔

سوال ”اِنِّیْ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ“ (بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ تمہاری شرک سے میں بے زار ہوں ”واشہدو“ (تم گواہ بنو) کے بجائے ”اُشہدکم“ (میں تمہیں گواہ بناتا ہوں) لاتے تو پہلے اور دوسرے دونوں جملوں میں تناسب ہوتا۔ ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟۔

جواب شرک سے براءت پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانا تو صحیح اشہاد ہے اور توحید کی تاکید میں مفید ہے مگر کافروں کو گواہ بنانے میں ان کی توہین اور تہکم ہے مگر نا اہل کو گواہ بنانا لازم آئے گا اس لئے کہ کافر گواہی کا اہل نہیں ہے تو تعبیر بدل دی جس میں ان کی توہین اور تہکم تو ہے مگر عدم مبالات لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ زیادہ اصرار کرنے والے کو اشہدانی لاحبک کہا کرتے ہیں۔

سوال ”فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ“ (پھر اگر تم پھرے رہو گے تو میں تم کو پہنچا چکا ہوں) آیت میں تبلیغ کو تولی (روگردانی) کے لئے جزاء بنایا گیا ہے حالانکہ تبلیغ پہلے اور روگردانی بعد میں ہوتی ہے تو تولی کو شرط اور ابلاغ کو جزاء بنانا کیسے درست ہوا؟۔

جواب اول ابلاغ تولّی کے لئے جزاء نہیں ہے۔ بلکہ جزاء یہاں محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ”فَاِنْ تَوَلَّوْا لَمْ اُعاتب علی تفریط فی الابلاغ او تقصیر فیه یعنی فقد ابلغتکم“ جزاء نہیں ہے بلکہ جزاء لَمْ اُعاتب ہے۔ جزاء کے محذوف ہونے پر ”فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ“ دلالت کر رہا ہے۔

جواب ثانی امام مقاتل فرماتے ہیں: تقدیر عبارت یوں ہے: ”فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ لَهُمْ قَدْ اَبْلَغْتُكُمْ“ اگر وہ روگردانی کریں تو ان سے کہہ دو تحقیق میں اللہ کا پیغام تم تک پہنچا چکا ہوں‘ یہاں جزا ”فَقُلْ لَهُمْ“ ہے لہٰذا کوئی اشکال نہیں۔

سوال ”وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ“ (اور جب ہمارا حکم پہنچا ہم نے ہود کو اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے ان کو اپنی عنایت سے بچالیا۔ اور ان کو ایک بہت ہی سخت عذاب سے بچالیا)۔ ”نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ“ کے بعد دوبارہ نَجَّیْنٰهُمْ کو مکرر لانے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس میں تکرار نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلی نجات سے مراد قوم ہود پر باد سموم کے عذاب سے نجات ہے۔ اور دوسری نجات سے مراد عذاب آخرت سے نجات ہے جس کی قوم ہود اپنے کفر کی وجہ سے مستحق ہوتی تھی۔

سوال ”اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ“ ترجمہ (خوب سن لو رحمت سے دوری ہوئی عاد کو جو کہ ہود کی

قوم تھی) "بُعد" کہتے ہیں بار بار ہلاکت کے لئے بددعا کرنے کو؟۔

جواب یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ لوگ ہلاکت کے مستحق اور اس کے لائق ہیں جب کہ اس کی نقیض سے معلوم ہوتی ہے۔

شعر: اخوتی لا تبعدوا بدا وبلی واللہ قد بَعُدُوا

بار بار ہلاک نہ ہونے کی دعاء کرکے شاعر یہ بتلانا چاہتا ہے۔ کہ میرے بھائی بار بار ہلاک ہونے کے مستحق وسزاوار نہیں ہیں۔

سوال آیت "لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ" (ناپ تول میں کمی نہ کرو) ناپ تول میں کمی کرنے سے روکنا دراصل ناپ تول پورا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا "لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ" کے بعد "وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ" ترجمہ (اے میری قوم: پورا پورا ناپ تول کرو) لانے کا کیا فائدہ؟۔

جواب ناپ تول میں کمی کے وہ عادی تھے۔ اس عمل کی زیادہ برائی بیان کرنے اور ان کے مرتکبین کو عار دلانے کے لئے پہلے صراحۃً اس سے روکا پھر عدل و برابری کے بہتر ہونے کی وجہ سے اس کی طرف ترغیب دینے کے لئے صراحۃً پورا پورا ناپنے تولنے کا حکم دیا۔

سوال آیت: "وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" ترجمہ (اور زمین میں فساد کرتے ہوئے حد سے مت نکلو)۔ "عثو" کا معنی فساد ہے تو آیت کا معنی ہوگا: "وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ" فساد کرتے ہوئے فساد مت کرو)؟

جواب بعینہٖ یہی سوال مع جواب سورۂ بقرہ میں گذرا ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت کا مطلب ہے زمین میں کفر کا فساد اور ناپ تول میں کمی کا فساد بار بار مت کرو۔

سوال فرمانِ الٰہی ہے: "بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (اللہ کا دیا ہوا جو کچھ بچ جائے وہ تمہارے لئے بدرجہا بہتر ہے اگر تم کو یقین آئے)۔ آیت میں بقیۃ اللہ کی بہتری کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا۔ حالانکہ اس کی بہتری مشروط بالایمان نہیں ہے۔ بلکہ مطلق ہے۔ اس لئے کہ بقیۃ اللہ کا مطلب ہے صحیح صحیح ناپ تول کے بعد جو مال باقی بچے گا وہ بقیۃ اللہ ہے۔ اور وہ مسلمان اور کافر سبھی کے لئے خیر ہے اس لئے کہ اس وجہ سے ناپ تول میں کمی کے عذاب سے بچیں گے؟۔

جواب اول البقیۃ کے بہترین ہونے کو ایمان سے مشروط اس لئے کیا گیا کہ اس کا بہترین ہونا اور فائدہ مند ہونا ایمان کی موجودگی کے ساتھ زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔ اس لئے کہ ایمان کی وجہ سے

عذاب سے بچنے کے ساتھ ساتھ ثواب کا بھی مستحق ہوگا۔
جبکہ کفر کی موجودگی میں اس کا فائدہ و بہتری پردہ خفاء میں جائیگا کیوں کہ کفر کا عذاب اتنا شدید ہے کہ ناپ تول میں عذاب نہ بھی ہوتب بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔

جواب ثانی ''اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ'' میں مومنین کا اصطلاحی معنی مرادنہیں ہے بلکہ ایمان کا لغوی معنی تصدیق مراد ہے۔تو ان کنتم مصدقین کے معنی میں یعنی تم اگر میری باتوں پر یقین کروگے تو بقیۃ تمہارے لئے بہتر ہے۔

سوال ''وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِیْدٍ'' (قوم لوط تم سے کوئی دور تو نہیں ہے) لفظ قوم کا اطلاق مردوں کی جماعت پر ہوتا ہے اس لئے ''بعید'' کے بجائے ''بعیدین'' ہونا چاہیے: قرآن کریم میں دوسری جگہوں میں قوم کی طرف جمع کی ضمیر لوٹائی گئی۔جیسا کہ فرمانِ الٰہی: ''اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَهُمْ'' یاتیھم میں ''ھم'' اور ''لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ'' میں ''یکونوا'' کی ضمیر ہے اور منھم بھی سب ضمیریں قوم کی طرف لوٹ رہی ہیں؟۔

جواب اول یہاں مضاف مقدر ہے تقدیر عبارت یوں ہے ''ماھلاك قوم لوط'' قوم لوط کا ہلاک ہونا یا ''وما کان قوم لوط'' ہے۔قومِ لوط کا مقام ومکان ان سے زیادہ دور نہیں تھا۔اور نہ ہی ان کی ہلاکت کا زمانہ دور تھا۔فعیل کا صیغہ واحد تثنیہ اور جمع سبھی کے لئے برابر استعمال ہوتا ہے۔
جوہری فرماتے ہیں: اہل عرب کہتے ہیں ''وما انتم منا ببعید'' قرآنِ کریم میں بھی جمع کے لئے ''فعیل'' کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔فرمانِ الٰہی ہے ''وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ'' دوسری جگہ ارشاد ہے: ''عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ''۔

سوال فرمانِ الٰہی ہے: ''لَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ'' (اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو ہم سنگسار کرتے۔ ہماری نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں) حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کے بھائی بندوں کے متعلق ہے یعنی بھائی بندوں کو حضرت شعیبؑ سے برتر اور معزز سمجھ رہے تھے تو حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ کہنا ''اَرَهْطِیْۤ اَعَزُّ عَلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ'' (اللہ کے مقابلے میں میرے بھائی بند تمہارے لئے زیادہ معزز ہیں) کیسے درست ہوگا؟

جواب اللہ کے نبی کے ساتھ بے احترامی کا معاملہ کرنا اللہ کے ساتھ بے احترامی کرنا ہے۔لہٰذا جب انہوں نے اللہ کے نبی پر ان کی قوم کو ترجیح دی اور معزز سمجھا تو گویا قوم کو اللہ کے مقابلے میں بھی معزز گردانا۔دیکھئے: قرآن کریم میں رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ'' جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس طرح پیغمبر کے ہاتھ میں بیعت کرنے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت قرار دیا گیا' ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ " (جولوگ آپ کے ساتھ بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی کے ساتھ بیعت کرتے ہیں)

سوال فرمایا: "وَیٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ط سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ" (اے میری قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام کرتا ہوں' آگے معلوم کرلو گے' کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور جھوٹا کون ہے) حضرت شعیب علیہ السلام نے کفار اور اپنے عمل کے اپنی اپنی جگہ بیان کرنے کے بعد عمل کرنے والوں کا انجام بیان کیا ظاہر فہم کے مطابق وموافق یوں کہنا تھا "وَمَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ وَمَنْ هُوَ صَادِقٌ" (کس پر آتا ہے عذاب رسوا کرنے والا اور کون سچا ہے) تا کہ رسوا کرنے والے عذاب کی نسبت ان کی طرف اور سچائی کی نسبت حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف ہوتی؟۔

جواب قیاس تو وہی ہے جو سوال میں ذکر کیا گیا' لیکن کفار اپنے زعم میں حضرت شعیبؑ کو جھوٹا سمجھتے تھے "من ھو کاذب" کہہ کر یہ بتلایا جا رہا ہے۔ کہ وقت بتائے گا کہ کون جھوٹا ہے۔ تم یا حضرت شعیب۔

سوال کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "وَاِذَا اَخَذَ الْقُرٰی وَهِیَ ظَالِمَةٌ" (اور جب پکڑتا ہے بستیوں کو اس حال میں کہ وہ ظلم کرتے ہوتے ہیں) حالانکہ بستیاں ظلم نہیں کیا کرتی ہیں۔ اس لئے کہ ظلم کرنا ذوی العقول یا حیوانات کی صفت ہے نہ کہ جمادات کی؟۔

جواب بستی کی طرف ظلم کو مجازاً منسوب کیا گیا ہے۔ مراد اس سے اہل بستی ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد باری ہے: "اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا" بیان التباس کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے ظلم کو قریہ کی طرف منسوب کیا۔

سوال ان آیات میں کیسے تطبیق ہوگی (۱) "یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" ترجمہ (اور جس وقت وہ دن آئے گا کوئی شخص بدوں خدا کی اجازت کے بات تک نہ کر سکے گا)۔

(۲) "یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا"

اس روز ہر جان اپنے ساتھ مجادلہ کرتی ہوئی آئے گی۔

(۳) "هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ" ترجمہ (یہ وہ دن ہے کہ نہ بولیں گے اور نہ ان کو حکم ہوگا کہ توبہ کریں)

چنانچہ تیسری آیت نفی اذن میں پہلی آیت کی معارض ہے' اور دونوں آیتیں عدم کلام

میں پہلی آیت کے معارض ہیں؟۔

جواب شروع کی دو آیتوں میں تطبیق تو ظاہر ہے۔ کیوں کہ دوسری آیت کا معنی ہے تجادل عن نفسها باذنه "یعنی مجادلت عن النفس بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوگی' اس طرح اگر پہلی آیت میں ہم یوں کہیں کہ استثناء عن النفی اثبات نہیں ہے' اس لئے کہ پہلی آیت وجود اذن کی متقاضی نہیں ہے' بلکہ انتفاء اذن کی وجہ سے نفی کلام کا تقاضا کرتی ہے' تو تیسری اور پہلی آیتوں میں کوئی تناقض نہ ہوگا۔ ہاں اگر یوں کہیں کہ نفی سے استثناء ہے تو بظاہر تعارض ہوسکتا ہے مگر حقیقت میں کوئی تناقض نہیں ہے اس لئے کہ قیامت کا دن ایک انتہائی طویل دن ہے جس میں مختلف موقف وموطن ہوں گے چنانچہ بعض مقامات میں بولنے پر پابندی ہوگی اور اجازت کلام نہیں ملے گی۔ اور بعض مقامات پر ان کی زبانوں پر مہر سکوت ثبت کردی جائیگی۔ ان کے ہاتھ بول پڑیں گے ٹانگیں شہادت دیں گی۔ لیکن آیت "هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ" یہ ایک ایسا دن ہے کہ نہ بول سکیں گے) سے اس جواب پر اشکال وارد ہوگا۔ جسمیں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کوئی بول نہ سکے گا۔ عموم نفی کا تقاضا ہے کہ اس تمام دن میں کسی کو بولنے کی اجازت نہ ہو۔ لہٰذا تمہارا مذکورہ جواب صحیح نہیں ہوا۔

مگر اس اشکال کا جواب یہ دیا جائے گا کہ تیسری آیت سے ایک خاص طبقہ مراد ہے۔ جو ان لوگوں کے علاوہ ہے جن کا تذکرہ پہلی دو آیتوں میں کیا گیا ہے' ثابت ہوا آیتوں میں کوئی تناقض وتعارض نہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے آیت "فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ" (ان میں بد بخت اور نیک بخت ہیں) کو "من" "تبعیضیہ کے ساتھ کیسے بیان کیا' حالانکہ یہ واضح بات ہے کہ لوگوں کے صرف دو طبقات ہیں۔ نیک بخت اور بد بخت؟۔

جواب اول یہاں تبعیض صحیح ہے۔ اس لئے کہ قیامت کے دن لوگوں کے طبقات ہوں گے۔ ایک طبقہ نیک بخت ہوگا جو جنت میں جائیگا۔ ایک قسم بدبختوں کی ہوگی جو جہنم میں جائیگی۔ ایک قسم نہ نیک بخت ہوگی نہ بد بخت رہے گی جو اعراف میں رہیں گے۔

جواب ثانی "فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّمِنْهُمْ سَعِيْدٌ" کچھ ان میں سے شقی ہیں اور کچھ ان میں سے سعید ہوں گے۔ اس کا تقاضا ہے کہ شقی بعض لوگ میں اور سعید دونوں بعض میں۔ معاملہ بھی ایسا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ شقی اور سعید بعض لوگ ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا "من الحیوان انسان من الحیوان غیر انسان' کل الحیوان اما انسان او غیر انسان"

سوال ''خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ '' ترجمہ (جنت میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین باقی رہیں گے)۔آیت سے معلوم ہوتا ہے جنتی جنت میں زیادہ دیر رہیں گے۔یعنی جب تک زمین وآسمان رہیں گے۔حالانکہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔اور زمین آسمان کا دوام منقطع ہوگا۔اس لئے کہ قیامت کے دن یہ دونوں منہدم ہوں گے۔جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:''کَلَّآ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا'' دوسری جگہ ارشاد ہے:''اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ''ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہے:''یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ'' یہ آیات اوران جیسی بہت سی آیات آسمان وزمین کے خراب ہونے پر دلالت کرتی ہیں؟۔

جواب اول اہلِ عرب ابد کے معنی کے لئے مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں۔جسمیں ابد کا معنی مراد ہوتا ہے'توقیت مقصود نہیں ہوتا۔مثلاً کہتے ہیں:''لا افعل کذا ما اختلف اللیل والنھار''میں اس کام کو نہیں کروں گا جب تک دن رات کا اختلاف باقی ہے کہتے ہیں۔''مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ''یعنی جب تک زمین وآسمان دائم ہیں میں اس کام کو نہیں کروں گا۔مراد اس سے یہ ہے کہ اس کام کو ہمیشہ تا ابد نہ کروں گا۔قطع نظر اس سے کہ اس کام میں توقیت ہے یا نہیں۔

جواب ثانی ''مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ''ان کے عقیدے کے مطابق کہا کیوں کہ ان کے عقیدے کے مطابق زمین وآسمان بھی زائل نہیں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے۔

جواب ثالث اس سے مراد ان لوگوں کے اپنی قبروں میں ہونے کی حالت ہے۔کہ قبور میں یا اچھی حالت میں ہوں گے۔یا مبتلاء عذاب ہوں گے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے'قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے'لہٰذا جو ان باغوں میں سے کسی باغ میں ہے تو وہ گویا جنت میں ہے۔اور جو آگ کے گڑھوں میں ہے تو وہ جہنم میں ہے۔ تو اس صورت میں''مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ''کا مطلب ہوگا۔جب تک آسمان وزمین برقرار ہیں اس وقت تک وہ ان حالات میں ہوں گے یعنی قیامت تک جو جس حالت میں ہے اسی حالت میں رہے گا۔

جواب رابع یہاں السموات والارض سے مراد دنیا کے آسمان اور دنیا کی زمین مراد نہیں۔بلکہ آخرت کے آسمان وزمین مراد ہیں چنانچہ قرآنِ کریم میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے'فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔''یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ''(جس روز دوسری زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے علاوہ آسمان بھی) آخرت کے آسمان وزمین قائم دائم ہوں گے زائل ہوں گے نہ فناء۔یا اس سے مراد عرش الٰہی ہے۔جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔اہلِ جنت عرشِ

الٰہی کے سائے کے نیچے ہوں گے۔ عربی زبان میں ہر سایہ کرنے والی چیز کو سماء کہتے ہیں' اسی طرح جنت کے متعلق احادیث میں آیا ہے جنت کی مٹی زعفران کی ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کی زمین بھی ہے' تو "مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" سے مراد بھی جنت کے آسمان وزمین مراد ہیں۔

سوال اگر اس دوام سے ایسا دوام خلود ہو جس کی کوئی انتہا نہ ہو تو (اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ۔ مگر جو آپ کا رب چاہے) کا استثناء کیسے صحیح ہوگا؟۔

جواب اول یہاں "اِلَّا" غیر اور سوی کے معنی میں ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوگا وہ جنت میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین موجود رہیں گے علاوہ مشیت خداوندی کے یعنی اس وقت تو رہیں گے ہی اس کے علاوہ ہمیشہ اور ابد الاباد تک رہنا مشیت الٰہی سے ہے۔ یہ جواب اس صورت میں صحیح ہوگا جب السموات والارض' سے دنیاء کے زمین وآسمان مراد ہوں۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں: اس کی مثال کلام میں عرب میں یوں ہے: جیسا کہتے ہیں "لأسكنك في هذه ا الدار حولا الا ماشئتُ" (ایک سال تجھ کو اس گھر میں سکونت دوں گا علاوہ میری چاہت کے یعنی فراخی چاہا تو ایک سال سے زیادہ بھی ٹھہرا سکتا ہوں۔

جواب ثانی یہاں استثناء "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ" کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول: "وَقَدْ شَآءَ ان يخلدوا فيها" کا مطلب بھی یہی مطلب ہے۔ زجاجؒ نے کہا: اس استثناء کے ذریعے ہمیں بتانا مقصود ہے اگر اللہ ان کو تا ابد رکھنا نہ چاہتے تو نہ رکھتے۔ مگر اللہ نے ان کو ہمیشہ تا ابد رکھنے کا ہی ارادہ فرمایا ہے۔

جواب ثالث یہ استثناء بعث بعد الموت' میدان حشر میں جمع ہونے اور حساب وکتاب کے لئے پیش کرنے کے لئے وقوف کے لئے ہے' اس لئے کہ نیک بخت اور بد بخت اس سارے زمانے میں نہ جنت میں ہوں گے نہ ہی جہنم میں۔

جواب رابع "الا ماشاء" میں لفظ "ما" "من" کے معنی میں ہے۔ تو اس صورت میں "اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ" کا مطلب ہوگا۔ توحید پرستوں میں جو لوگ جہنم میں داخل ہوں گے' وہ اپنے گناہوں کی بقدر عذاب پائیں گے پھر جہنم سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے۔ مگر استثناء کا یہ مطلب جب ہوگا جبکہ استثناء صرف اشقیاء سے ہو۔

جواب خامس مستثنیٰ اہلِ اعراف کا جنت میں داخل ہونے سے قبل اعراف میں رہنے کا زمانہ ہے۔ مگر یہ اس وقت درست ہوگا جب استثناء سُعداء سے ہو۔ اس لئے کہ سعداء جھنم میں داخل نہیں

ہوں گے۔

جواب دائل یہ خلود فی عذاب النار اور خلود فی نعیم الجنۃ سے استثناء ہے۔ اس لئے کہ بدبختوں کا عذاب صرف آگ میں جلنے سے نہیں ہوگا۔ بلکہ زمہریر (انتہائی ٹھنڈک) وغیرہ سے بھی عذاب دئے جائیں گے۔ اور غضب الٰہی کا عذاب تو اور بھی سخت ہے۔

اس طرح نیک بخت جنت کی نعمتوں کے علاوہ اور بھی انعامات الٰہی سے نوازے جائیں گے جو جنت کی نعمتوں سے بھی بڑھکر نعمتیں ہوں گی۔ وہ زیارت ہے جسکا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے: "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" جن لوگوں نے اچھے اعمال کیئے ان کے لئے جنت ہے اور زیادہ ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی نعمت جو تمام نعمتوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" (وعدہ دیا اللہ نے ایمان والے مردوں اور عورتوں کو باغ بہتی ہے نیچے ان کے نہریں رہا کریں ان میں اور مکان ستھرے رہنے کے باغوں میں اور رضامندی اللہ کی سب سے بڑی یہی ہے بڑی مراد ملنی۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ: "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ" "کسی کو معلوم نہیں جو چھپا رہتا ہے ان کے واسطے جو ٹھنڈک ہے آنکھوں کی اسی طرح "الا ما شاء ربك" کے بعد "اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" "بے شک تمہارا رب کر ڈالتا جو چاہے۔ ذکر کرنا بھی اس جواب کے لئے مؤید ہے۔ اسی طرح سعداء کے ذکر کے بعد "عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ" لانے سے بھی جواب سادس کی تائید ہوتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ جہنمیوں کو جو چاہے عذاب دے سکتا ہے۔ اور اہل جنت کو نہ ختم ہونے والے انعامات سے نوازتا ہے۔

سوال "وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ" "ہم ان کے حصے پورے پورے دیں گے" کے بعد "غَيْرَ مَنْقُوْصٍ" "بغیر کمی کے" لانے کا کیا فائدہ ہے اس لئے کہ پورا پورا اعطاء کرنا جب ہوتا ہے جب اسمیں کمی نہ ہو تو غیر منقوص لانے کا کوئی بظاہر فائدہ نہیں؟۔

جواب یہ ماقبل کی تاکید ہے۔

سوال آیت "وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ" میں "لذلك" سے کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟

جواب دائل اس کا مشار الیہ سابق میں بیان کردہ دو فریق اہل اختلاف اور اہل رحمت کا منشاء اختلاف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اہلِ اختلاف کو دین میں اختلاف کرنے اور اہلِ رحمت کو رحمت

کے لئے پیدا فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو فریق پیدا فرمائے: ایک فریق کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا تو وہ اختلاف میں نہ پڑا اور ایک پر اللہ کی نظر کرم نہیں ہوئی تو اختلاف کرنے لگا۔

جواب ثانی یہ بھی کہا گیا ہے "ذلک" کا مشار الیہ رحمۃ ہے یعنی ایک دوسرے پر رحم کرنا' اس صورت میں "خَلَقَهُمْ" میں "هم" ضمیر کا مرجع وہ لوگ ہوں گے جن کے ساتھ رحمت خداوندی شامل حال رہی جس کی برکت سے اختلاف سے بچ گئے۔

جواب ثالث بعض نے کہا: ذلک کا مشار الیہ اختلاف ہے جس کا سابق میں ذکر ہوا "خَلَقَهُمْ" میں "هُم" ضمیر مختلفین (اختلاف کرنے والوں) کی طرف لوٹے گی۔ اور "لذلک" کا "ل" پہلے اور تیسرے جواب کے اعتبار سے لام المعاقبۃ (انجام بتانے والا) ہوگا۔ نہ کہ لام کی (سبب بیان کرنے والا) ہوگا۔ اس لئے کہ دین میں اختلاف کرنے کے لئے پیدا کرنا حکمت و دانائی کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس لام کی مثال فرمانِ الٰہی: "فَالْتَقَطَهُ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا" (تو فرعون کے لوگوں نے موسیٰ کو اٹھالیا' تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنے) میں "لِيَكُوْنَ" کا "ل" ہے۔ اسی طرح شاعر کے اس شعر:

اَعِدُّوْا لِلْمَوْتِ وابنوا للخراب ☆ فكلكم يصير الى التراب

(موت کے لئے تیاری کرو بے آباد کی تعمیر کرو' تم سب مٹی کی طرف لوٹ جاؤ گے) میں "للموت" کا "لام" ہے۔

جواب رابع بقول بعض یہ لام لام تمکین (قدرت وطاقت کے معنی دیتے ہیں) جیسا کہ آیت: "جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ" "لتسكنوا" کا "ل" اور آیت: "وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا" میں "لتركبوا" کا "ل" لام تمکین ہے۔ تو "لِذٰلك" کا لام بھی لام تمکین ہے۔ یہاں آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو حکم اختلاف کو قبول کرنے کی طاقت و تمکین دی ہے۔

جواب خامس "لذلك" کا لام بمعنی علیٰ ہے یعنی علیٰ ذلک کے معنی میں ہے جیسا کہ فرمانِ باری "وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ" اور ارشادِ خداوندی "يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا" (تو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑے) دونوں جگہ "ل" "علیٰ" کے معنی میں ہے۔

سوال آیت "وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ" (اور سب چیز

بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو اور آیت " وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ "میں بظاہر تعارض ہے تطبیق کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟۔

جواب اوّل پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم رسولوں کے احوال سے جو کچھ آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں اس کے ذریعے آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ "مَا نُثَبِّتُ فُؤَادَكَ" میں لفظ ما حالتِ رفعی میں ہے مبتداء محذوف کی خبر ہے' وہ ہے لفظ "ھو"۔ تو اس صورت میں آیت سے تمام انبیاء کے اخبار و احوال بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی تعارض بھی نہیں ہے۔

جواب ثانی "کلاً" میں لفظ کل سے کل مراد نہیں بلکہ بعض مراد ہے جیسا کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں "کل" بعض کے معنی میں مستعمل ہوا ہے جیسا کہ آیت: "ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا" دوسری آیت " وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اور اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اور آیت "كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ۔ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ" وغیرہ آیات ہیں اسی طرح "لبید" کا شعر

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهُ بَاطِلٌ ☆ وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلُ

خبردار: اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی باطل ہے۔ ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے۔

حالانکہ بہت سے ماسوا اللہ حق بھی ہیں' جیسا کہ نبی علیہ السلام' ایمان' جنت وغیرہ' اسی طرح جنت کی نعمتیں زائل ہونے والی نہیں ہیں تو معلوم ہوا ان تمام مقات پر لفظ "کل" بعض کے معنی میں استعمال ہوا ہے' اسی طرح مذکورہ آیت کے اندر رہوا۔

سوال " وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ " (اور آئی تیرے پاس اس سورۃ میں تحقیقی بات)۔ حق کو اس سورت کے ساتھ خاص کیوں کیا گیا حالانکہ قرآن کریم کی ہر سورت میں حق ہی آیا ہے؟۔

جواب اوّل اس کی وجہ اس سورۃ کو مزید فضیلت و شرافت دینا ہے دوسری سورتوں کے اس میں مشارکت کے ساتھ ساتھ بھی اس حق جیسا کہ فرمانِ الٰہی اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ (تمام مسجد اللہ کی ہیں) اور آیت " وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ اور حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ کے بعد وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى "لانا ان کی مزید خصوصیت اور تشریف کے لئے ہے۔

جواب ثانی بعض حضرات نے کہا: "فی هذه الحق" میں "هذه" کا مشار الیہ سورۃ نہیں ہے بلکہ اس کا مشار الیہ "الدنیاء" ہے۔ البتہ جمہور علماء و مفسرین "هذه" کا مرجع السورۃ ہی قرار دیتے ہیں۔

اور اس سورۃ کو' دوسری سورتوں پر خصوصیت دینے کی وجہ یہ قرار دینا کہ اس میں موجود آیت "

"وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ" (استقامت اختیار کیجئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا) میں استقامت کا ذکر ہوا ہے' اور عارفین کے نزدیک استقامت اعلیٰ مقام ہے درست نہیں۔ اس لئے کہ یہ آیت سورۃ "ہود" کے علاوہ دوسری جگہ بھی آیا ہے جیسا کہ حٰمٓ عٓسٓقٓ میں فرمان خداوندی ہے" فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ" تو یہ اس تخصیص کی علت نہیں ہوسکتی۔

سورۃ یوسف

سوال "اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" (میں نے گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا) "فرمایا گیا:" ثلاثة عَشَرَ كَوْكَبًا "میں نے تیرہ ستارے دیکھے) نہیں فرمایا' حالانکہ یہ مختصر بھی ہے؟۔

جواب "والشّمس والقمر" کو کواکب پر عطف کر کے علیحدہ طور پر ان کا نام لینے سے ستاروں پر ان کی فضیلت اور افادیت کو بیان کرنا مقصود ہے' یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ ملائکۃ پر جبریل اور میکائیل کو عطف کر کے علیحدہ بیان کرنا اور "حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ" پر والصّلوٰة الوسطٰى کو عطف کر کے علیحدہ ذکر کرنا ان کی افادیت اور خصوصیت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اس طرح یہاں بھی دوسرے تمام ستاروں پر شمس وقمر کو فضیلت دینے کے لئے ان دونوں کا مستقل بیان کیا۔

سوال "رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ" (میں نے ان کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھا) میں رؤیت کو مکرر لانے کا کیا فائدہ؟۔

جواب علامہ زمخشری نے فرمایا ہے: یہاں رؤیت کا تکرار نہیں ہے بلکہ یہ نیا کلام ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے پیدا ہونے والے ایک سوال مقدرّ کا جواب ہے' جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا میں نے گیارہ ستاروں' چاند سورج کو دیکھا تو سوال پیدا ہوا ان کو کس حالت دیکھا؟ تو جواب دیا "رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ" ان کو سجدہ کرنے کی حالت میں دیکھا۔ علامہ زجاج نے فرمایا:" فعل رؤیت" کا تکرار کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے تاکید کے لئے کیا۔ جیسا کہ اس آیت" هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ' وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ "میں "هم" کا تکرار ہے' بعض مفسرین نے فرمایا: تکرارِ فعل اس خواب کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

سوال ستاروں کو عقلاء کے درجے میں لاکر "هم" کی ضمیر کیوں لائے؟ حالانکہ وہ غیر عاقل ہیں لہٰذا "رَاَيْتُهَا" کہنا چاہئے تھا۔

جواب جب ان کی صفت "ساجدین" (جو عقلاء کی صفت ہے) بیان کی تو ان کو بھی عقلاء کا

درجہ دیا۔ کلامِ عرب میں یہ طریقہ شائع ذائع ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کی نظیر ملتی ہے، جیسا کہ آیت: ’’ قَالَتۡ نَمۡلَةٌ يَّاَيُّهَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا ‘‘ میں نمل غیر عاقل کے لئے ’’ادخلوا‘‘ کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

اس طرح ارض و سماء کے متعلق فرمایا گیا: ’’ قَالَتَاۤ اَتَيۡنَا طَآئِعِيۡنَ ‘‘ یعنی آسمان و زمین کے لئے طائعین جمع مذکر سالم کا صیغہ جو عقلاء کے لئے استعمال ہوتا ہے لایا گیا۔

سوال ’’ نَرتع ونلعب ‘‘ (ہم کھیلیں گے) جب یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کھیلنے کی اجازت طلب کی حالانکہ وہ عاقل بالغ تھے اور بعض کے قول کے مطابق نبی بھی تھے تو حضرت یعقوبؑ نے انہیں اجازت کیوں دی؟۔

جواب اس میں ایک قراءت ’’ يَرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ ‘‘ بھی ہے یعنی وہ (یوسف) کھیلے گا اس صورت میں کوئی اشکال نہیں ہے، اس لئے کہ بچے کے لئے کھیلنے کی اجازت ہے۔ نرتع کی قراءت کے مطابق جواب یہ ہوگا۔ وہ ناجائز کھیل نہیں کھیلتے تھے بلکہ بھاگنے میں مقابلہ، تیر اندازی میں مسابقت کرتے تھے یہ دونوں نہ صرف جائز ہیں بلکہ جہاد کی تیاری اور دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے خود کو ان چیزوں کی عادت ڈلوانا محمود اور مستحسن امر ہے۔ اور ’’ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ ‘‘ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے؟ چونکہ یہ صورت کھیل کی طرح ہے، اس لئے لعب کا لفظ اختیار کیا گیا۔

سوال حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے جانے کی جب اجازت طلب کی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو عذر بیان کئے۔ (۱) یہ کہ جب تم اس کو ساتھ لے جاؤ گے تو میں سخت غمگین ہوں گا حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے بغیر ایک لحہ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

(۲) دوسرا عذر یہ بیان کیا کہ کہیں بھیڑیا اس کو نہ کھا جائے۔ تو بیٹوں نے دوسرے عذر کا جواب دیا۔ پہلے کا جواب نہ دیا۔ کیوں؟

جواب سارا جھگڑا ہی اس بات پر تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت یوسف علیہ السلام کے ساتھ زیادہ تھی۔ دوسرے بیٹوں پر ان کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے بغیر ایک گھڑی بھی نہیں رہ سکتے۔ یہی ان کے غیظ و غضب میں اضافے کا باعث اور ان کے لئے تکلیف کا سبب تھا۔ اس لئے اس کو سرے سے ذکر نہیں کیا اور جواب بھی نہیں دیا۔

سوال ’’ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡهِ ‘‘ (اور ہم نے یوسف کی طرف وحی بھیجی) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہم

نے ان کی طرف وحی بھیجی۔ حالانکہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام بالغ بھی نہیں ہوئے تھے۔ جبکہ وحی چالیس سال کی عمر بعد آتی ہے۔؟

جواب اس وحی سے مراد وحی الہام ہے' وحی رسالت نہیں۔ چالیس سال کے بعد وحی رسالت آتی ہے۔ الہام پر بھی وحی کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: " وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ " اور آیت " وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ " دونوں جگہ وحی سے الہام مراد ہے۔

سوال حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: " وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا " (اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے فرمایا: " وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا " (اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو اور برابر ہوگیا' دیا ہم نے اس کو حکم اور علم) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں " واستویٰ " فرمایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق کیوں نہیں فرمایا؟۔

جواب قوت کو پہنچنے سے مراد چالیس سال سے کم عمر ہے' اور " استویٰ " سے مراد چالیس سال یا اس سے زیادہ کی عمر ہے' اور ان سے ہر ایک کو حکم اور علم دینا اس زمانے کے اعتبار سے ہے۔ اس کو بیان کیا گیا۔

سوال " وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ " میں " ابواب " کو جمع اور " وَاسْتَبَقَا الْبَابَ " (وہ دونوں دروازے کی طرف بھاگے) میں الباب کو واحد لانے کی وجہ کیا ہے؟

جواب احتیاط کے لئے تمام دروازوں کو بند کیا جاتا ہے۔ تمام دروازوں کو بند کئے بغیر مکمل احتیاط نہیں ہوسکتا۔ اور بھاگنا پہلے ایک دروازے پھر دوسرے دروازے کی طرف ہوتا ہے۔ اور یوسف علیہ السلام بھاگتے وقت لازمی طور پر پہلے قریب تر دروازے کی طرف گئے ہوں گے۔ پھر دوسرے اس کے بعد تیسرے دروازے کی طرف اس لئے اول نکلنا قریب دروازے سے ہے۔ اسی لئے اس کو واحد لائے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: " وَشَهِدَ شَاهِدٌ " (اور گواہی دی ایک گواہ نے) حالانکہ بولنے والے بچے کے الفاظ میں شہادت کے الفاظ نہیں تھے۔

جواب اس قول سے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات کی تصدیق اور زلیخا کے قول کا بطلان ہورہا تھا۔ اس لئے " شہادت " کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ دوسرا جواب یہ ہے یہاں " شہد " کا معنی بیان کرنا اور سمجھانا ہے۔

سوال " وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ " (اور اگر کرتا اس کا

پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے) آیت دلالت کر رہی ہے کہ زلیخا جھوٹی ہے اور وہی ان کے پیچھے چلی اور ان کی قمیص پیچھے سے کھینچی اور وہ پھٹ گئی۔ پیچھے سے قمیص پھٹنے سے زلیخا کا جھوٹا ہونا کیسے ثابت ہوا؟۔

جواب تصدیق دو وجہ سے ہوتی ہے۔

وجہ اوّل: اگر بالفرض یوسف علیہ السلام "زلیخا" سے دست درازی کی کوشش کرتے اور ہاتھا پائی ہوتی تو یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹتی۔

وجہ ثانی: اگر بالفرض "زلیخا" خود کو بچانے کے لئے بھاگتی اور یوسف علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے۔ اور کرتا کسی چیز میں پھنستا اور پھٹ جاتا۔

سوال " وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ " میں "اُخْرُج" کے صلہ میں "علی" کیسے لایا۔ حالانکہ خرج کا صلہ "الی" ہوتا ہے؟۔

جواب خروج اگر غصے' غلبے یا جمال وزینت یا کسی امر عظیم کی وجہ سے ہو تو "علیٰ" کے ذریعے بھی متعدی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: " خَرَجَ علینا فی سفرنا قطاع الطریق " ہمارے سفر کے دوران ڈاکو ہمارے سامنے آگئے۔ قرآنِ کریم میں بھی اس طرح آیا ہے جیسا کہ آیت: " فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ " اس طرح "فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ " میں دونوں جگہ خروج کے صلہ میں "علیٰ" آیا ہے۔

سوال مصر کی عورتوں نے: " مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ " (یہ شخص آدمی نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے) کہہ کر یوسف علیہ السلام کو فرشتہ کے ساتھ تشبیہ کیسے دی؟ حالانکہ وہ فرشتوں کو بھی دیکھا تک نہیں۔ ان دیکھے تشبیہ دینا کیسے درست ہوگا؟۔

جواب اوّل فرشتوں کو اگرچہ دیکھا نہیں لیکن ان کی صفات سے تو واقف تھیں اور ان کے متعلق معلومات تو رکھتی تھیں۔

جواب ثانی اللہ تعالیٰ نے انسانی طبیعتوں میں فرشتوں کی اچھائی کو بھی اسی طرح جاگزین کیا ہے جیسا کہ شیطان کی قباحت کو دل میں ڈالدیا ہے۔ یہی وجہ ہے ہر انتہائی خوبصورت چیز کو فرشتہ کے ساتھ اور ہر قبیح ترین چیز کو شیطان کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

سوال یوسف علیہ السلام نے کیسے فرمایا" اِنِّىْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ " (میں نے چھوڑا دین اس قوم کا کہ وہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں) حالانکہ "ترک " کہتے ہیں کسی کام کے ارتکاب کے بعد اس کو چھوڑنے کو

۔جیسا کہ کہتے ہیں فلاں نے شراب پینا چھوڑ دیا، سؤر کھانا چھوڑ دیا' جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کبھی بھی ملّت کفر میں نہیں تھے؟۔

جواب ترک کی دو قسمیں ہیں۔(۱) کسی کام کو کرنے کے بعد اسے چھوڑنا' اس ترک کو ترک انتقال کہتے ہیں۔(۲) کسی کام کو شروع ہی سے نہ کرنا' اس کو ترک اعراض کہا جاتا ہے۔جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے" وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ " اور تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیگا حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے کسی وقت بھی فرعون یا اس کے معبودوں کی عبادت نہیں کی ہے' لہٰذا مذکورہ آیت میں ترک سے مراد ترک اعراض ہے کہ نہ ترک انتقال۔ اس کی نظیر سورۂ ابراہیم میں" اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِىْ مِلَّتِنَا " ہے۔

سوال " اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ "(اس نے حکم دیا نہ پوجو مگر اسی کو) اس میں امر کی تفسیر نہی سے کی گئی ہے۔یا جز و نہی سے کی گئی ہے۔حالانکہ امر اور نہی آپس میں متضاد ہیں۔(امر حکم دینے کو اور نہی روکنے کو کہتے ہیں)۔

جواب اول یہاں ایک لفظ امرًا محذوف ہے۔تقدیر عبارت یوں ہے۔" امرا امرا اقتضى ان لا تعبد وا الا اياه "یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دیا جسکا مقتضی یہ ہے کہ صرف اس کی عبادت کی جاتی اور حکم یہ ہے" فَاِيَّاىَ فَاعْبُدُوْنِ " خاص میری ہی عبادت کرو۔یہاں مفعول کے مقدم ہونے سے حصر پیدا ہوا (اس لئے کہ تقدیم ما حقہ تاخیر حصر کا فائدہ دیتی ہے) جیسا کہ" اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ " ہے ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

جواب ثانی " اَمَرَ " کے بعد" نَهٰى " محذوف ہے' تقدیر عبارت یوں ہے۔" امر ونهى " پھر امر اور نہی کی علیحدہ علیحدہ تفسیر" اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ " اور" فَاِيَّاىَ فَاعْبُدُوْنِ " سے کی۔

جواب ثالث لفظ" اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا " اگرچہ لفظاً نہی ہے مگر من حیث المعنی امر ہے۔

سوال حضرات انبیاء کرام تمام لوگوں سے بڑھ کر آخرت کی فکر کرنے والے اور دنیاوی مناصب کو ترک کرنے والے ہوتے ہیں۔تو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کیوں فرمایا:" قَالَ اجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ "(حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا:" مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر"۔آپ نے ملک کے خزانوں کے متولی ہونے کا مطالبہ کیا یہ تو بہت بڑا دنیاوی منصب ہے۔

جواب یوسف علیہ السلام نے اس منصب پر فائز ہونے کا مطالبہ اس لئے کیا تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کے احکامات کو نافذ کرنے اور عدل وانصاف قائم کرنے پر قادر ہو جائیں۔

جو انبیاء کرام کی بعثت کے مقاصد میں سے ہے۔ اور اس بات کو یقین کی حد تک جاننے کی وجہ سے کہ یہ کام اس کے علاوہ کسی اور صحیح طریقے سے سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ مطالبہ کرنا اللہ کی رضامندی اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو نفع پہنچانے اور ان کی مصلحتوں کے لئے تھا۔ ملک ومنصب اور حبِ دنیا کے لئے نہیں تھا۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے' فرماتے ہیں: '' وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ '' یعنی اگر میں غیب جانتا ہوتا کہ قحط کب آئے گا تو قحط کے زمانے کے لئے بہت کچھ کھانے پینے کی اشیاء جمع کر لیتا۔ یہ جمع کرنا مالی لالچ اور حرص کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ضرورت وتنگدستی کے زمانے میں فقیروں محتاجوں اور ضعیفوں کی اشک شوئی اور مدد کے لئے ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا علم صرف انہیں کے پاس ہو۔ اور کسی کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے اس کا مطالبہ کرنا ان پر واجب ہو۔

سوال یوسف علیہ السلام کے لئے کیسے جائز ہوا کہ وہ اعلان کرنے والے سے یہ اعلان کرائیں: '' اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ '' (اے قافلہ والو! تم تو البتہ چور ہو) یہ تو کھلا بہتان ہے۔ غیر چور کو چور کے نام سے پکارنا اور بے ضرر شخص کو جھٹلانا ہے۔

جواب اول '' اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ '' کا یہ لفظ بطورِ توریہ تھا۔ کہ انہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ ایک طرح چوری کا فعل تھا۔ ان کے اس فعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو '' سارق '' کے لفظ کے ساتھ پکارا گیا۔

جواب ثانی یہ اعلان' اعلان کرنے والے شخص کے الفاظ تھے حضرت یوسفؑ کے الفاظ نہیں تھے۔

جواب ثالث یہ حیلہ شرعیہ ہے۔ جس کے ذریعے ضروری مصلحتوں اور منافع دینیہ تک رسائی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت ایوبؑ کے متعلق فرمان الٰہی ہے: '' وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ '' (اور پکڑ اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا پھر ان سے مارلے اور تم میں جھوٹا نہ ہوئیں ہے) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کافر بادشاہ کے ہاتھ سے بچانے کے لئے اپنی بیوی کو میری بہن کہنا وغیرہ۔

سوال '' يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ '' (اور بولا اے افسوس! یوسف پر) حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے نہ آنے پر افسوس نہیں کیا۔ بلکہ یوسفؑ پر افسوس کیا۔ حالانکہ نئی مصیبت پرانی مصیبت کے مقابلے میں نفس پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے؟

جواب نئی مصیبت پرانی سے زیادہ شدید اس وقت ہوتی ہے جب دونوں برابر ہوں۔ یہاں معاملہ ایسا نہیں۔ بلکہ یوسف کی گم شدگی پر زمانہ دراز گذرنے کے باوجود غم تازہ تھا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: " وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ "(ان کی آنکھیں غم سے سفید ہوگئیں) حالانکہ غم سے آنکھوں کا سفید ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ نہ طب کے رو سے اور نہ ہی عقل کے اعتبار سے۔

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے " مِنَ الْحُزْنِ " کی تفسیر "ای من البکاء (رونے کی وجہ سے) سے کی ہے یعنی حزن کی وجہ سے رونا پڑتا ہے' رونے سے آنکھیں خراب ہوتی ہیں۔ اور کثرت بکاء سے آنکھ کی سیاہی جاتی رہتی ہے' حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی کچھ تھا۔

سوال حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیسے فرمایا: " اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ " (بے شک نا امید نہیں ہوتے اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں) حالانکہ بعض ایمان والے بھی شدید مصیبت میں مبتلا ہوکر یا گناہوں کی کثرت کی وجہ سے اللہ کے فیض سے ناامید ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے مرتے وقت اپنے گھر والوں کو حکم دیا کہ مرنے کے بعد اس کو جلا کر اس کی راکھ سمندر اور خشکی میں پھیلا دیں۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء نے ایسا ہی کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی بخشش کردی جیسا کہ صحیح حدیث شریف میں مذکور ہے۔ اس شخص نے رحمت خداوندی سے ناامیدی ظاہر کی اور اس ناامیدی کی وجہ سے ایک اور گناہ کر بیٹھا۔ وہ یہ کہ یہ عقیدہ رکھا کہ تم اگر اس کو جلا کر اس کی راکھ سمندروں اور ہوا میں پھیلا دی جائے تو اللہ تعالیٰ عذاب دینے پر قادر نہیں ہوں گے اور عذاب سے بچ جائے گا' اس سب کچھ کے باوجود اسے معاف کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص ایمان کی حالت میں مرا ہے نہ کہ کفر کی حالت میں۔

جواب ظاہر آیت کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ لہٰذا جس مؤمن سے اللہ سے ناامیدی متحقق ہوجائے وہ کافر ہوگا جب تک کہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پرامید ہوکر دوبارہ حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوجائے۔ اور حدیث شریف میں جس شخص کی مغفرت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ ہم نہیں مانتے وہ اللہ کی رحمت سے ناامید ہوکر کافر نہیں ہوا۔ بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو دوبارہ دنیا میں پیدا کیا تو وہ رحمتِ خداوندی پر یقین کرتے ہوئے دوبارہ مسلمان ہوا۔ اسی وجہ سے اس کی مغفرت ہوئی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موت سے کچھ دیر قبل رحمت الٰہی سے پرامید ہوا ہو اور اپنی وصیت سے رجوع کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ اور حالتِ اسلام میں مرا ہو۔

سوال " وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا "(اور سب گر گئے ان (یوسف علیہ السلام) کے سامنے سجدہ میں) غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا ان کے لئے کیسے جائز ہوا؟۔

جوابِ اوّل ہوسکتا ہے یہ سجدہ' سجدۂ تعظیمی وتکریمی ہو۔ جیسا کہ ہم کسی کی عزت وتکریم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں۔

جوابِ ثانی یہ پیشانی کو زمین پر رکھ کر سجدہ نہیں تھا۔ بلکہ رکوع کی مانند محض جھکنا تھا۔ مگر لفظ خرّ اس جواب کے منافی ہے۔ جہاں تک "خَرَّ رَاكِعًا" کا تعلق ہے اس سے مراد رکوع نہیں سجدہ ہے۔ جیسا کہ "وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" میں رکوع سے مراد نماز ہے۔

جوابِ ثالث بقول بعض علماء یہ ہے کہ "خَرُّوْا لَهٗ" میں "ل" تعدیہ کے لئے نہیں ہے بلکہ "ل" سببیہ ہے۔ یعنی حضرت یوسف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کے شکرانے کے لئے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے۔

جوابِ رابع بعض نے کہا: کہ "لَهٗ" میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی اللہ کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ مگر اگلی آیت "يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا" ابا جان! یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا۔ اس کو میرے رب نے سچ کر دیا) اس جواب کی مساعد نہیں۔

سوال حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے نکلنے کی نعمت کو ان الفاظ "وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ" (اس (اللہ) نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانے سے) سے ذکر کیا' مگر کنویں سے نکلنے کی نعمت عظمیٰ کو بیان نہیں کیا' حالانکہ کنواں سے نکلنا جان بچنے کی وجہ سے سب سے بڑی نعمت ہے؟۔

جواب قید خانہ سے خلاصی کی نعمت کا تذکرہ کرنا اور کنویں سے نجات پانے کی نعمت کو ذکر نہ کرنے کی چند وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ: قید کی محنت ومشقت مدّت کے طویل ہونے کی بنا پر کنویں کی تکلیف سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ قید خانے میں سالہا سال رہے۔ اور کنویں میں چند دن رہے۔

دوسری وجہ: کنویں کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ بھائیوں کو معاف کرنے کے بعد ان کے لئے توبیخ وتقبیح نہ ہو۔

تیسری وجہ: قید خانے سے نکلنا حکمرانی وعزت وشرف ملنے کا سبب بنا اور کنویں سے نکلنا غلامی اور قیدی کا پیش خیمہ ہوا' اس لئے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

چوتھی وجہ: قید خانہ کی زندگی کنویں کی زندگی سے زیادہ دشوار اور مشکل تھی۔ اس لئے کہ اس میں اوباش' رذیل لوگوں اور دین کے دشمنوں کے ساتھ مصاحبت تھی' جبکہ کنویں کی زندگی میں حضرت

استثناء استثناءِ حقیقی ہوگا۔اور اگر "لک" کے لام کو اپنے تینوں معانی ملک' استحقاق' اختصاص اور علیت میں مشترک مانیں تو بھی ان کا قول "لا شریك لك" عام ہوگا ان لوگوں کے نزدیک جو عموم مشترک کے قائل ہیں تو اس صورت میں بھی استثناء استثناءِ حقیقی ہوگا۔

اور جو لوگ عموم مشترک کے قائل نہیں ہیں تو اس وقت لام اپنے معانی میں سے کسی ایک معنی پر محمول ہوگا جو شرکت کے تعلق کے لئے ہوگا۔اس صورت میں استثناء مجازی ہوگا جو مدح کی تاکید کے لئے ہوگا جو بظاہر مشابہ ذم ہے۔یہ بھی بلاغت کی ایک قسم ہے جو علم بیان میں مذکور ہے۔جیسا کہ مندرجہ ذیل شعر میں ہے۔شعر:

ولا عیب فیھم غیران سیوفھم ☆ بھن فلول من قراع الکتائب

ان میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ ان کی تلواریں فوجوں کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے کند ہوگئیں ہیں۔

مطلب یہ ہے: اگر یہ عیب ہے تو ان میں یہ عیب موجود ہے حالانکہ یہ عیب نہیں ہے۔تو ان میں بھی کوئی عیب نہیں ہے۔اس طرح مسئلہ زیر بحث میں ہے کہ اگر تیرے مملوک کے اندر تیرے برابری کی صلاحیت ہے تو یہ تیرے شریک ہوں گے حالانکہ ان میں تیرے شریک بننے کی صلاحیت ہرگز نہیں' تو پھر تیرا شریک بھی کوئی نہیں' اس لئے کہ جو کوئی بھی آپ کا شریک ہونے کا دعوی کریگا وہ آپ کا مملوک ہے۔

جواب رابع پہلی صورت کی بابت ہم کہیں گے یہ صحیح نہیں ہے۔اس لئے کہ اگر ہم "لام" کو اس کے حقیقی معنی عام یعنی اختصاص پر محمول کریں گے تو اس سے کفر لازم آئے گا' اس طور پر کہ شریک کی نفی بغیر استثناء کے کی گئی۔

سورة الرعد

سوال "سَوَآءٌ مِّنكُم مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ ۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ" (برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر' اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے دن کو) کیا وجہ ہے مَن هو مستخف میں مَن لایا اور "سارِبٌ" سے پہلے مَن نہیں لایا۔یعنی مَن هو سارب نہیں فرمایا: حالانکہ اس صورت میں چھپنے اور ظاہر ہونے والے دونوں برابر ہوتے۔اور ماقبل کے جملوں من اسرّ اور من جَهَرَ" کے ساتھ موافقت بھی ہوتی؟

جواب "سَارِبٌ" کا عطف "مستخفٍ" پر نہیں ہے بلکہ "مَنْ" پر ہے۔تو استواء کا معنی

"مستخف" پر ہوا اور لفظ "مَنْ" تثنیہ کے معنی میں ہے۔ یعنی دونوں کو شامل ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے: "نکن مثل من یاذئب یصطحبان" (اے بھیڑیے! ہم ان دونوں کی طرح ہوں گے جو ایک ساتھ ہوتے ہیں) کہ یہاں لفظ من تثنیہ کے معنی میں ہے اسی طرح آیت مذکورہ میں ہے یعنی تم میں سے رات کو چھپنے والا اور دن کو ظاہر ہونے والا دونوں برابر ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ" (اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی اور بے کار ہے)۔ حالانکہ سخت شدائد و خوفناک وقت میں بھی جب کفار دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاء قبول فرماتے ہیں؟۔

جواب اس کا مطلب ہے کہ کفار جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ گمراہی ہے یعنی یہاں دعاء عبادت کے معنی میں ہے۔ اور آیت (وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں یدعون یعبدون کے معنی میں ہے۔

سوال "لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" (کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے) اور آیت "قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ" (کہہ دے اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے اور راہ دکھلاتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع کرے) میں مطابقت کیسے ہوگی۔

جواب اصل یہ کلام تعجب کے قائم مقام ہے یعنی تعجب کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ آپ ﷺ کو جو کثیر معجزات عطا کئے گئے ہیں۔ آپ سے پہلے کسی نبی کو اتنے معجزات سے نہیں نوازا گیا۔ صرف ایک قرآن معجزہ در معجزہ ہے جب ان کفار نے آپ کے اس عظیم معجزے کو معجزہ ہی شمار نہیں کیا اور کہنے لگے کہ کوئی معجزہ آپ سے صادر نہیں ہوا تو یہ انتہائی تعجب کا مقام ہے۔ گویا ان سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا عناد کتنا بڑا ہے؟ اور اپنے کفر پر تم کس طرح برقرار رہتے ہو؟۔

سوال فرمانِ الٰہی: "اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ ۭبِمَا كَسَبَتْ" (بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے)۔ اور آیت "وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ" (اور اللہ کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں) کے درمیان مطابقت کیسے ہوگی۔

جواب اس میں کچھ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "افمن هو رقيب على كل نفس صالحة وطالحة يعلم ماكسبت من خير وشر وبعد لكل جزاء كمن ليس كذلك وهو صنم" یعنی کیا وہ ذات جو ہر نفس نیک ہو یا بد کے ہر عمل کو جانتی ہے اور ہر عمل کا بدلہ اور سزا دے سکتی ہے برابر ہو سکتی ہے اس چیز کے جو اس جیسی نہیں ہے۔ نہ جانتی ہے نہ سن سکتی

ہے ہرگز برابر نہیں ہوسکتی۔ یہ بیان کرنے کے بعد کفار کے بارے فرمایا کہ یہ کفار اللہ تعالیٰ کے لئے شریک ٹھہراتے ہیں' یا تقدیر عبارت یوں ہوگی" افمن کان بهذه الصفة يغفل عن اهل مكة "یعنی جو ذات ان عظیم صفات سے متصف ہو کیا وہ اہل مکہ کے اقوال وافعال اور ان کی بت پرستی سے غافل ہوسکتی ہے؟۔

سوال فرمانِ الٰہی:" قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ "(مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی) کا ماقبل آیت:" وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ "(اور بعض فرقے نہیں مانتے اس کی بعض بات) کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟۔

جواب اصل میں یہ منکرین کو جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے پاس جو وحی آئی ہے اس میں مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف ایک اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں۔ ان کا بعض چیزوں کا انکار اللہ کی عبادت اور توحید کا انکار ہے' یہی جواب علامہ زمخشری نے دیا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان:" وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ "(اور فریب کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے) سے ان کے لئے مکر کو ثابت کیا اور اپنے فرمان:" فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا " (سو اللہ کے ہاتھ میں ہے سب فریب) سے ان کے مکر کی نفی کی؟۔

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ ماکرین کا مکر بھی اللہ کا پیدا کردہ ہے' سب کام اللہ کے ارادے سے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ کی طرف مکر کو منسوب کرنا درست ہوا۔

جواب ثانی ان کی سازش ومکر کو اللہ کی تدبیر کے مقابلے میں گویا کالعدم قرار دیا' لہٰذا ان کے لئے مکر کا اثبات باعتبارِ کسب اور ان سے اس کی نفی باعتبار خلق کے ہے۔

سورۃ ابراہیم

سوال آیت:" وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ "(اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی۔ تا کہ ان کو سمجھائے) یہ قول نبی کریم ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاءِ کرام کے حق میں تو مناسب ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاءِ کرام تمام عالم کے لئے مبعوث نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اپنی اپنی قوم کے لئے مبعوث ہوتے تھے' تو اسی قوم کی زبان میں انہیں پیغام پہنچاتے تا کہ وہ پیغامِ الٰہی کو سمجھ سکیں' اور پیغام الٰہی کو نہ سمجھنے کا بہانہ نہ کرسکیں۔

جہاں تک نبی کریم ﷺ کا تعلق ہے۔آپ تو تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:"قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا"(آپ فرما دیجئے: اے لوگو! میں تم سب کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں) دوسری آیت میں ارشاد ہے:"وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ "(ہم نے نہیں مبعوث کیا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے) اگر یوں کہا جائے کہ آپ کو اپنی قوم عرب کی طرف ساتھ مبعوث کرنا اہلِ عرب کی حجت کو قطع کرنے کے لئے ہے تو عرب کے علاوہ دیگر انسانوں کی حجت تو جوں کی توں برقرار رہے گی؟۔

جواب اوّل ایک زبان میں قرآن کا نزول تمام کے لئے کافی ہے۔اس لئے کہ ترجمہ باقی زبان والوں کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

جواب ثانی ایک زبان میں نازل ہونا تحریف وتبدیل کے لئے بعید تر ہے اور نزاع سے محفوظ ہے۔

جواب ثالث اگر تمام لوگوں کی زبانوں میں نازل ہوتا۔اور ہر زبان میں معجزہ ہوتا اور نبی ہر قوم کی زبان میں ان سے کلام کرتے تو یہ ایک قسم کا مجبور کرنا ہوتا۔انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد کسی کو مجبور کر کے اسلام میں داخل کرنا نہیں بلکہ ہر ایک کو اختیار ہے۔لہٰذا ایک زبان میں نازل ہونا کافی ہے تو بہتر ہے کہ اس زبان میں نازل ہو جو نبی کے قریب ترین لوگوں کی زبان ہے تاکہ ان کے قریب تر ہونے کی وجہ سے ان سے فیض یاب ہونے میں آسانی ہو۔

سوال "وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ"(اور آل فرعون ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو) سورۃ بقرہ میں "يُذَبِّحُونَ" اور سورۃ اعراف میں "یقتلون" بغیر واؤ کے لاتے اور یہاں "وَيُذَبِّحون" واؤ کے ساتھ لائے حالانکہ قصہ ایک ہی ہے؟۔

جواب جہاں بغیر واؤ کے "يُذَبِّحُونَ" ہے وہاں ذبح اور قتل کو عذاب کی تفسیر وتفصیل کے طور پر لایا گیا ہے اور جہاں "واؤ" کے ساتھ لایا گیا ہے وہاں مستقل طور پر عذاب کو علیحدہ بیان کیا گیا ہے اس لئے اس کا مستقل عذاب ہونا زیادہ واضح ہے۔اس لئے اس کے مکمل عذاب ہونے کو بیان کرنے کے لئے واؤ کو لایا گیا۔جو زیادہ ابلغ ہے۔

سوال فرمانِ باری تعالیٰ:"لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ "(تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے) میں کچھ گناہ بخشنے کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب اوّل مِن تبعیضیہ کے ساتھ مغفرت صرف کفار سے خطاب میں آئی ہے جیسا کہ سورۂ نوح میں"لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ "اور سورۃ الاحقاف میں"يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ "(اے قوم میری مانو! اللہ کے بلانے والے کو اور اس پر یقین لاؤ کہ

بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے) اور مومنین کے ساتھ خطاب میں بغیر تبعیض کے آیا ہے جیسا کہ سورۃ الصف میں " یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُو اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ " ان آیات اور دوسری آیات میں مسلمانوں کے ساتھ خطاب میں من تبعیضیہ نہیں لائی گئی جبکہ اور خطاب کفار میں لائی گئی ہے۔

یہ صرف دونوں مخاطبین کے ساتھ خطابوں میں فرق بیان کرنے کے لئے کیا گیا۔ تا کہ وعدہ میں دونوں مخاطبین برابر نہ ہوں یہ مطلب نہیں کہ کفار کے کفر پر برقرار رہنے کے باوجود ان کے بعض گناہ معاف ہوں گے' اس جواب کی تائید سورۂ نوح اور سورۃ الاحقاف کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے کہ جن میں مغفرت کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔

جواب ثانی بعض گناہوں کو معاف کرنے کا مطلب ہے کہ حقوق اللہ میں کمی کے گناہ معاف ہوں گے' اور حقوق العباد کے گناہ معاف نہیں ہوں گے۔

جواب ثالث " مِنْ ذُنُوْبِکُمْ " میں لفظ "مِنْ" زائد ہے۔

سوال پہلے فرمایا: " وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ " (اور اللہ پر بھروسہ چاہیئے بھروسے والوں کو) تو کل کو مکرر کیوں لایا گیا؟

جواب پہلا امر تو کل پیدا کرنے کے لئے ہے اور دوسرا امر تو کل کو اپنے قلب ونظر میں جاگزیں کرنے کے لئے ہے۔ اسی بنا پر تو کل کو دوبارا استعمال کیا گیا۔

سوال کفار نے رسولوں سے: " اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا " (یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں) کیوں کہا؟ عود تو سابقہ حالت کی طرف لوٹنے کو کہتے ہیں۔ اور رسولؑ کبھی بھی ملتِ کفر پر نہیں ہوتے تو لوٹنے کا کیا مطلب؟۔

جواب اول لفظ "عود" کلام عرب میں اکثر تبدیلی کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے' اہلِ عرب کہتے ہیں: "عاد فلان یکلمنی " فلاں شخص مجھ سے باتیں کرنے لگا" وعاد لفلان مال " فلان کو مال مل گیا" جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں بھی "عود" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ " حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ "۔

جواب ثانی کفار نے اپنے زعم فاسد کے مطابق رسولوں کو خطاب کیا۔ کہ ان کے زعم کے مطابق رسول پہلے اپنی قوم کی ملت میں ہوتا ہے بعد میں اس سے پھر جاتا ہے۔

جواب ثالث کفار نے رسولؑ اور ان پر ایمان لانے والے مومنین سب کو خطاب کیا۔ اور خطاب میں اکثریت کو واحد پر غلبہ دیا (یعنی امت پہلے اپنے کفریہ دین پر ہوتی ہے پھر اپنے دین کو چھوڑ کر نبی

کے دین کی طرف منتقل ہو جاتی ہے)۔
اس آیت کی نظیر سورۃ الاعراف: ''اَوْلَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا'' اور سورۃ یوسف میں: ''تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ'' کے الفاظ کے ساتھ گذر گئی ہے۔

سوال اس آیت میں جواب سوال کے کس طرح مطابق ہے: ''وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ قَالُوْا لَوْهَدٰنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰکُمْ'' (اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے، پھر کہیں گے کمزور بڑائی والوں کو، ہم تو تمہارے تابع تھے سو بچاؤ گے ہم کو اللہ کے عذاب سے کچھ؟ وہ (بڑائی والے) کہیں گے، اگر ہدایت کرتا ہم کو اللہ تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے)۔

جواب اول تابع لوگ جب اپنے مذکورہ قول سے اپنے بڑوں کی توبیخ کریں گے تو مستکبرین گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کے گناہ کو اللہ تعالیٰ پر ڈال دیں گے اور کہیں گے ''لَوْهَدٰنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰکُمْ'' اور ''لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَاؤُنَا'' (اگر اللہ چاہتے تو ہم نہ ہمارے اباء واجداد شرک کرتے) اور ''وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ'' (اور اگر اللہ چاہتے تو ہم ان کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرتے ہوتے)۔
یہی بات منافقین بھی کہیں گے، جس کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے: ''یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ کَمَا یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ'' اس دن اللہ تعالیٰ ان (منافقین) کو اٹھائیں گے تو وہ اللہ کے سامنے قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔

جواب ثانی اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں آخرت میں راہ نجات پر ڈال دیا تو ہم تمہاری رہنمائی کریں گے اور تمہیں بھی راہِ جنت میں ساتھ لے چلیں گے۔ جیسا کہ دنیا میں تمہیں راہِ ہلاکت پر چلاتے تھے۔

سوال ''سَوَآءٌ عَلَیْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا'' (اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بیقراری کریں یا صبر کریں) کا ماقبل کے ساتھ کیا ربط ہے؟۔

جواب ماقبل سے اس کا جوڑ اور ربط یہ ہے کہ ضعفاء کا اپنے مقتداؤں کو ڈانٹنا اور عذاب میں مبتلا ہو کر جزع وفزع کی وجہ سے ہے۔ تو جواب میں ان کے سرداروں اور مقتداؤں نے کہا:
''سَوَآءٌ عَلَیْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ'' (یعنی ہم اور تم دونوں اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ جزع وفزع سے کچھ کام نہیں بنتا نہ ہی توبیخ وعتاب کا کوئی فائدہ ہے۔ کیوں کہ معاملہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

سوال "وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ الخ" (اور بولا شیطان جب فیصلہ ہو چکا سب کا' بے شک اللہ نے تم سے کیا تھا سچا وعدہ) اللہ نے شیطان کے قول کو لفظ ماضی سے تعبیر کیا حالانکہ اس قول کو شیطان قیامت کے دن کہے گا؟۔

جواب اگر التباس کا خطرہ نہ ہو تو ماضی کی جگہ مضارع اور مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کرنا جائز ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ اس کی مثالیں موجود ہیں' ماضی کی جگہ مضارع کا صیغہ استعمال ہونے کی مثال: "وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ" میں تتلوا مضارع کا معنیٰ "تلَت" ہے اسی طرح دوسری مثال: فرمان باری تعالیٰ: "فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ" تقتلون بمعنی قتلتم ہے' اور حطیئہ نامی شاعر کا شعر ہے۔

شهد الحطيئة يوم يلقى ربه ☆ ان الوليد احق بالغدر

لہٰذا مذکورہ مثالوں میں علی ملك سليمٰن "من قبل" اور لفظ لما قضى الامر" کی وجہ التباس نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے ماضی کی جگہ مضارع اور مضارع کی جگہ ماضی استعمال کی گئی۔

سوال اللہ تعالیٰ نے "وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ" (بچلا دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو) کیسے فرمایا؟ جب کہ ہم دیکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بہت سے ظالموں کو ہدایت کی دولت سے نوازا۔ اسلام سے مشرف ہوئے۔ سابقہ سرکشیوں سے توبہ کی اور متقی بن گئے؟۔

جواب اول "يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ" کا مطلب ہے کہ یہ ظالم لوگ جب تک اپنے ظلم اور کفر پر مسلسل برقرار رہیں گے اور غور و فکر سے کام نہیں لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نہیں دیں گے۔

جواب ثانی اس سے مراد وہ ظالمین ہیں جن کے بارے میں ازل سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ لوگ مرتے دم تک ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس گمراہی سے نہیں نکال لیں گے بلکہ ان کو گمراہی پر برقرار رکھیں گے۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مومنین کو کلمۂ توحید پر ثابت قدم رکھتے ہیں۔

جواب ثالث آیت کا معنیٰ ہے کہ قیامت کے دن مشرکین کو جنت کی راہ پر نہیں چلائیں گے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں یہ کیسے فرمایا: "وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ" (اور ٹھہرائے اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے) حالانکہ بت پرستی سے ان کا مقصود دوسروں کو بہکانا نہیں تھا بلکہ وہ تو بتوں کی عبادت تقرب الی اللہ کی غرض سے

کرتے تھے جیسا کہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے: " مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى "

جواب اس سے قبل سورۃ یونس میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ "لِيُضِلُّوْا" کا "ل" لامِ غرض نہیں ہے بلکہ انجام و عاقبت کے لئے ہے۔ جیسا کہ آیت " فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا " میں لیکون کا "لام" عاقبت وانجام کار کے معنی میں ہیں۔

اور شعر: لدوا للموت وابنوا للخراب

میں بھی لام انجام کے معنی میں ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں بھی "ل" اسی معنی میں ہے۔

فللموت تغذوا الوالدات سخالها ☆ کما لخراب الدھر تبنی المساکن

تو آیت کا مطلب یہ ہے: اللہ کے ساتھ دوسروں کو برابر ٹھہرانا مفضی الی الضلال یا اضلال ہے تو گویا انہوں نے بت پرستی ہی گمراہ کرنے کے لئے اختیار ہے۔

سوال " قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ " (کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں' قائم رکھیں نماز اور خرچ کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ اور ظاہر' پہلے اس سے کہ آئے وہ دن جسمیں نہ سودا بازی ہے اور نہ دوستی)۔ اس دن "لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلَالٌ" کے وصف کے ساتھ امر بالصلوۃ اور حکم بالانفاق کی کیا مطابقت ہے؟

جواب آیت کا معنی ہے' کہ میرے بندوں سے کہہ دیجئے اس دن (یوم القیامۃ) آنے سے پہلے کہ جس میں دنیاوی تجارت اور عوض معاوضے کام نہیں آئیں گے نماز' صدقات وغیرہ نیک اعمال کو ادا کریں تا کہ وہ اس دن کام آئیں گے۔ دنیاوی سکے وہاں نہیں چلیں گے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا (لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلَالٌ) قیامت کے دن نہ کوئی بیع ہوگی نہ دوستی) حالانکہ قیامت کے دن دوستی ہوگی۔ جیسا کہ دوسری آیت سے معلوم ہو رہا ہے: " اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ " اور حدیث سے بھی قیامت کے دن کی دوستی کا ثبوت ملتا ہے' فرمان رسول ہے " المرء مع من احب " انسان کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہو۔

جواب نماز نہ پڑھنے والوں اور زکوۃ نہ دینے والوں میں اس دن کوئی دوستی نہیں ہوگی۔ جہاں تک نماز قائم کرنے والوں اور زکوۃ اداء کرنے والوں کا تعلق ہے ان کی آپس میں دوستی ہوگی۔ جیسا کہ اوپر کی آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ" (اور کام پر لگا دیا تمہارے سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو)۔ حالانکہ مسخر اس کو کہتے ہیں جو انسان کی اطاعت کرتا ہو اور جیسے چاہے ان کو استعمال کر سکتا ہو۔ اور اپنے کے حکم کے مطابق چلا سکتا ہو جیسا کہ غلام' چوپائے وغیرہ ہیں جب کہ شمس وقمر' لیل ونہار انسان کے اختیار سے نہیں چلتے؟۔

جواب اول جب سورج و چاند کا طلوع وغروب اور دن ورات کے یکے بعد دیگرے آمد ورفت ہمارے فائدے کے لئے ہے۔ اور ان سے ہماری منفعتیں متعلق ہیں چاہے یہ مخلوقات چاہیں یا نہ چاہیں یہ منفعتیں انسان کو حاصل ہیں۔ تو مسخر کے مشابہ ہو گئے۔ اسی وجہ سے اس کے لئے تسخیر کے الفاظ استعمال کئے گئے۔

جواب ثانی یہ مخلوقات ہماری منفعت اور ہماری ضروریات کی وجہ سے بحکم الٰہی چلتی ہیں انہی کو مسخر کہتے ہیں۔ تسخیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف درست ہے۔ اس لئے کہ وہ فاعل تسخیر ہیں۔ اور بندوں کی طرف بھی درست ہے۔ اس کی اس تسخیر کے منافع سے ہم بہرہ مند ہو رہے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ" (اور عطا کرتا ہوں تمہیں جو کچھ تم مانگتے ہو) جب کہ جو کچھ ہم مانگتے ہیں تمام کا تمام عطاء نہیں ہوتا بلکہ بعض دعا قبول ہوتی ہے اور بعض نہیں؟

جواب اول یعنی یہاں "من" تبعیضیہ ہے' مطلب ہے تمہارے کل مسئولات میں بعض تمہیں عطاء کرتا ہوں۔

سوال جواب مذکور دو وجہوں سے صحیح نہیں ہے۔

پہلی وجہ: پورا عطاء نہ کر کے احسان جتلانا اچھا نہیں ہے۔

دوسری وجہ: یہ جواب: "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو پوری شمار نہیں کر سکو گے) کے مطابق نہیں ہے۔

جواب اول اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کردہ نعمتیں منع کردہ سے زیادہ ہیں' اور ہماری مصلحتوں کی وجہ سے جو کچھ نہیں ملا ہے اس کا بھی انفع اور فائدہ اس لئے اور جو ہمارے فائدے میں نہیں ہے ان کا عطا نہ ہونا ہی بہتر ہے اور اس پر احسان جتلانا بھی اچھا ہے' اس طرح مابعد کی آیت سے بھی ربط ہو گیا۔

جواب ثانی اصل سوال کا دوسرا یہ جواب بھی دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام دعاء کرنے

والوں کے دعاؤں اور مانگنے والوں کے ہر ہر سوال کے بعض حصے عطاء کئے ہوں۔ اس صورت میں: "وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ" کہنا درست ہوگا۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ ہوسکتا ہے ایک شخص نے جو کچھ مانگا۔ وہ اس کو نہیں دیا گیا لیکن کسی خاص مصلحت اور خاص فائدے کے لئے کسی دوسرے کو دے دیا گیا۔ لہٰذا انسانوں کو مانگی ہوئی تمام چیزیں عطاء تو ہوئیں لیکن سب کو سب چیزیں نہیں ملیں۔ مصلحت اور حکمت کے تقاضے کے مطابق بعض کو بعض' اور بعض کو دوسری چیزیں عطاء کی گئیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا" حالانکہ احصاء اور "عدد (شمار کرنا) دونوں ہم معنی ہیں "جوہری نے دونوں کو ہم معنی بتایا ہے" تو آیت کا معنی یہ ہوگا: "وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَعُدُّوهَا" اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو گے تو نہیں گنو گے۔ یہ تو باہم متناقض ہے' یہ بالکل ایسا ہے! جیسا کہ کہو۔ اگر تم زید کو دیکھو گے تو نہیں دیکھو گے"؟۔

جواب بعض مفسرین نے احصاء کا معنی حصر بتایا ہے لہٰذا اگر نعمت کے اعتبار سے احصاء حصر کے معنی میں ہو تو سوال ہی نہیں ہوتا۔ زمخشری کے "لاتحصوھا" کی تفسیر "لا تحصروھا ولا تطیقوہ عدھا وبلوغ آخرھا" تم مکمل طور نہیں گن سکو گے اور شمار کر کے اس کی انتہاء کو نہیں پہنچ سکو گے' سے کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دوسرا جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: " وان ترید واعد نعمة الله لا تعدوھا" (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننے کا ارادہ رکھتے ہو تو گن نہیں سکتے)

سوال اللہ نے "لا تحصوھا" کیسے فرمایا؟ حالانکہ نعماءِ الٰہی کے لامتناہی ہونے کا وہم ہوتا ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے جس نعمت سے بھی نوازا ہے وہ مخلوق ہے' اور ہر مخلوق متناہی ہے؟

جواب ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے نعمت الٰہی کا لامتناہی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان نعمت الٰہیہ کو شمار نہیں کرسکتا۔ یا شمار کر کے پورا نہیں کرسکتا۔ اور ممکن ہے کہ ایک چیز فی نفسہ متناہی تو ہو لیکن انسان اس کو مکمل شمار نہ کرسکے۔ جیسا کہ میدان و بیابان کی ریت کے تمام ذرات محدود و متناہی تو ضرور ہیں لیکن انسان ان کو گن کر پورا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح دریا کے قطرات اور درختوں کے پتے وغیرہ۔

سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیسے فرمایا: "وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ" (مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے دور رکھئے) جب حضرات انبیاء کرامؑ بالاجماع کفر سے معصوم ہوتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس طرح کی دعاء کیسے زیبا ہے؟۔

جواب آپؐ نے یہ سوال انتہائی خوف کی حالت میں کیا تھا جس کی وجہ سے اس علم کا ذہول ہوا۔ اس لئے کہ حضرات انبیاءِ کرام کو تمام لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ سب سے زیادہ خوف الٰہی کے حامل بھی یہی ہوتے ہیں۔ خوف کی حالت میں اس طرح کی دعا کرنا عذر کی بناء پر ہے۔

سوال اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ'' (اے میرے رب! ان بتوں نے بہت سارے لوگوں کو گمراہ کیا) اس آیت میں بتوں کو گمراہ کرنے والے بتایا گیا ہے اور گمراہ کرنے والا نقصان دینے والا بھی ہوتا ہے۔ اور ایک آیت میں فرماتے ہیں: ''وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ'' اور وہ (کفار) اللہ کے سوا بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان'' یعنی نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں تو ان دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت ان کی طرف تشابہ کی بنا پر مجازاً ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کفار ان بتوں کی عبادت کر کے گمراہ ہوئے تو گویا ان بتوں نے ان کو گمراہ کیا۔ جب کہ عام محاورے میں کہا جاتا ہے کہ دنیاء نے ان کو فتنہ میں ڈال دیا اور دھوکہ دیا۔ مطلب ہے کہ دنیا کے سبب سے دھوکہ میں پڑ گئے۔ اسی طرح سے ''دواء مسہل'' ''سیف قاطع'' کاٹنے والی تلوار' طعام مُشبع 'پیٹ بھرنے والا کھانا' ماء مُرّ ''کڑوا'' پانی' اور ان جیسی بہت سی مثالیں ہیں ان سب کا مطلب یہ ہے اثرات ان اشیاء کے سبب سے ہیں فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں۔

سوال ''فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىْٓ اِلَيْهِمْ'' (سو رکھ بعض لوگوں کے دل مائل ہوں ان کی طرف) میں ''اَفْئِدَةَ النَّاسِ'' کیوں نہیں کہا گیا جیسا کہ'' قلوبا من الناس'' کی جگہ قلوب الناس کہا جاتا ہے۔

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی دعاء میں ''افئدۃ من الناس'' کی بجائے اگر'' افئدۃ الناس'' فرماتے تو تمام ملتوں والے حج کرتے' کعبہ کے پاس لوگوں کا رش زیادہ ہوتا جس کی وجہ سے مومنین کو جگہ نہ ملتی جبکہ غیر موحدین کا حج غیر معتبر اور غیر مفید ہے۔ لہٰذا ''من الناس'' فرمایا: دوسرا جواب دیا جاسکتا ہے۔ کہ یہاں ''اَفْئِدَة'' جماعت کے معنیٰ میں ہے یعنی جماعۃ من الناس۔

سوال جب اللہ نے اپنے بندوں کو رزق پہنچانے کا خود ذمہ لیا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ'' (اے اللہ ان کو ثمرات میں سے رزق عطاء فرما) کہہ کر اپنی اولاد

کے لئے رزق کی دعاء کیوں کی؟۔

جواب اللہ تعالیٰ نے بندوں کے اس رزق کا ذمہ لیا ہے جو ان کی حیات کے لئے ضروری ہے' پھل دینے یا اور کسی خاص قسم کا رزق پہنچانے کا ذمہ نہیں لیا ہے۔

جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاص ثمرات کی دعاء کی تھی۔

سوال فرمانِ الٰہی ہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ'' (شکر ہے اللہ کی جس نے بخشا مجھ کو بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق) کی بعد والی آیت ''اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَاءِ'' (بے شک میرا رب سنتا ہے پکار) کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟۔

جواب جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے ان الفاظ: ''رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ'' سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اولاد عطاء فرما کر ان کی دعاء قبول کی۔ اس لئے آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے شکر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الخ سے ادا کیا۔ اس کے بعد اپنے رب کی صفت ان ربی لسمیع الدعاء بیان کی' جو کہ شکر کے مناسب ہے اس لئے کہ سمع یہاں اجاب (قبول کیا) کے معنی میں ہے اگر بادشاہ کسی کے درخواست قبول کرے تو کہا جاتا ہے ''وسمع الملك قول فلان ''یعنی یہی معنی ''سمع الله لمن حمده'' کا ہے یعنی جو بھی اللہ کی تعریف وتحمید بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماتا ہے اور ثواب عطاء کرتا ہے۔

سوال ''رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ'' (اے میرے رب! مجھے اور میرے والد کو بخش دے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کی بخشش کی دعاء کی حالانکہ وہ کافر تھے۔ اور کافروں کے لئے دعاءِ استغفار جائز نہیں؟۔

جواب اول والدین کے لئے یہ استغفار ایمان کے ساتھ مشروط ہے' تقدیر عبارت یوں ہے: ''وَلِوَالِدَیَّ اَنْ اٰمَنَّا'' (بخش دے میرے والدین کو اگر وہ مؤمن ہوں) ہے۔

جواب ثانی یہاں ''وَالِدَیَّ'' سے مراد آدم وحواء علیہما السلام ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی نخعیؒ اور زہریؒ اس کو ''وَلِوَالِدَی'' (میرے بچوں کو بھی) پڑھا اس قرات کی صورت میں کوئی اشکال ہی نہیں ہوتا ہے۔

جواب ثالث بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے جو یہ مشہور قراءت ''وَلِوَالِدَیَّ'' (میرے والدین کو) کے مطابق ہی ہے۔ کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک لغزش تھی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ'' (میری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت میری خطاء معاف فرمائیں گے)۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ غفلت سے مبرّا ومنزّہ ہیں۔ اور حضور ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان' اس کی صفات وکمال سے واقف ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کو غافل کیسے سمجھ سکتے ہیں حتیٰ کہ ان کو تنبیہ کی گئی کہ: "لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ" (اور مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے ان کاموں سے جو کرتے ہیں بے انصاف)؟

جواب اوّل ممکن ہے کہ یہ نہی آپ ﷺ کے علاوہ لوگوں کے لئے ہو جو اپنی جہالت کی بنا پر ایسے گمان کرتے ہوں۔ اور اس کے بعد آنے والا فرمانِ الٰہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ممکن ہے اس سے آپ ﷺ کے علاوہ کوئی مراد اور ہو اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے۔

جواب ثانی یہاں معنی مجازی مراد ہے۔ یعنی تم یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کے بارے اہمال سے کام لیں گے۔ اور ان کو سزا دیئے بغیر چھوڑ دیں گے۔ چونکہ انسانوں سے ایسا عمل صادر ہوتا ہے غفلت کی وجہ سے۔ اس وجہ سے یہاں پر غفلت کے الفاظ سے تعبیر کی گئی۔

جواب ثالث نہی مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اور خطاب بھی نبی کریم ﷺ کو ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر اور غافل نہ ہونے کے عقیدے پر ثابت قدم رہو۔ جیسا کہ آیت: "وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (ہرگز مشرکین میں سے مت ہو جائیو) اور دوسری آیت: "لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ" (اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو)

ان تینوں آیات کا یہی مفہوم ہے کہ جس صفت پر ہو اسی صفت پر ثابت قدم ہو۔

سورۃ الحجر

سوال کافروں نے یہ کیسے کہا کہ: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ" (اے شخص! کہ تجھ پر اتری ہے نصیحت' تو مقرر دیوانہ ہے)۔

کفار نے پہلے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا اعتراف کیا پھر مجنون کہا۔ اس لئے کہ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ نزول قرآن وحی ہے کا کا اعتراف کرنا نبوت کا اعتراف کرنا ہے؟۔

جواب اوّل "نزل علیه الذکر" تصدیق کے لئے نہیں۔ بلکہ استہزاء وتمسخر کے طور پر کہا گیا ہے۔ جیسا کہ فرعون نے اپنے کارندوں کو خطاب کر کے کہا تھا: "اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ" (جو پیغمبر تمہاری طرف مبعوث ہے وہ مجنون ہے)۔ اور جس طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: "اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ"۔

جواب ثانی یہاں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "يَا اَيُّهَا الَّذِيْ تَدَّعِيْ اَنَّكَ نُزِّلَ

عَلَیْكَ الذِّكْرُ"۔ ترجمہ: "اے وہ شخص جو دعویٰ کرتا ہے کہ تجھ پر ذکر نازل ہوا ہے"۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ" (اور تحقیق ہم ہی جلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہم ہی سب کے وارث ہیں)۔ وارث اسے کہتے ہیں جو مورث کے انتقال کے بعد نئی ملکیت ملے۔ یعنی وہ مال ملے جو پہلے اس کی ملک میں نہ ہو۔ جب کہ اللہ تعالیٰ ہی ازل سے تمام عالم کا مالک ہے۔ تو وارث کا لفظ استعمال کرنا کیسا درست ہوگا۔

جواب اول بعض کے فنا ہونے کے بعد باقی بچے ہوئے کی ملکیت کو ہونا لغت میں وارث ہیں۔ چاہے تجدد ملک ہو یا نہ ہو۔ تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ مخلوق کے فنا ہونے کے بعد ہم باقی رہنے والے ہیں۔

جواب ثانی مخلوق (انسان و جنات) بھی خود کو اپنے پاس موجود اموال کا جب مالک سمجھتے ہیں تو مجازاً یا اللہ تعالیٰ کے نائب ہونے کی بنا پر ان کو مالک کے نام سے موسوم بھی کیا جاتا ہے۔ جس پر آیت: "تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ" (آپ جس کو چاہتے ہیں ملک عطا فرماتے ہیں) دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا جب تمام مخلوق مر جائے گی۔ تو سارے اموال اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوں گے۔ اس اعتبار سے وارث کہنا صحیح ہے۔ فرمانِ الٰہی: "لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ" (آج کی بادشاہت کس کی ہے) اس کی نظیر ہے۔ اس لئے کہ ازل سے ابد تک تمام بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے۔ لیکن دنیا میں دوسرے بادشاہوں کو مجازاً بادشاہ کا نام دیا گیا ہے۔ قیامت کے دن وہ مجازی بادشاہت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس طرح انسان ان اموال کا مجازی مالک ہے۔

سوال آیت: "فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ" (تمام فرشتوں نے سجدہ کیا) تمام فرشتوں کے سجدہ کرنے پر دلالت کرتی ہے تو "اَجْمَعُوْنَ" لانے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب امام خلیل اور امام سیبویہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تاکید در تاکید ہے جس سے مفہوم ذہن میں پختہ ہوتا ہے لہٰذا یہ بے فائدہ نہیں ہے۔ اور امام مبرد فرماتے ہیں: لفظ "اَجْمَعُوْنَ" زمانہ سجود میں سب کے یک جا ہونے پر اور کلمہ "كُلُّهُمْ" تمام کے سجدہ کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ گویا آیت کے معنی یہ ہوئے تمام کے تمام فرشتوں نے ایک ہی وقت سجدہ کیا۔ ابن الانباریؒ نے مبرد کے قول کو پسند کیا۔ امام زجاج اور اکثر علماء نے سیبویہ کے قول کو ترجیح دی ہے۔ اس وجہ سے کہ اگر امام مبردؒ کے قول کو مان لیا جائے تو "اجمعون" ترکیبی اعتبار سے حال ہونا چاہئے کیونکہ یہ حال کے مقام میں واقع ہے حالانکہ ترکیب میں حال واقع نہیں ہو رہا۔ کیونکہ یہ مرفوع ہے۔ اور حال منصوب ہوتا ہے۔ اور یہ تمام الفاظ تاکید کی طرح معرفہ ہیں جبکہ حال کے لئے نکرہ ہونا شرط ہے۔

سوال آیت: "نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ" (اور حال سنا دے ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا) اور ماقبل کی آیت: "نَبِّئْ عِبَادِيْٓ" میں کیا تعلق ہے۔ بظاہر کوئی معنوی ارتباط معلوم نہیں ہو رہا ہے؟

جواب اول جب اللہ پاک نے "نَبِّئْ عِبَادِيْٓ" سے آخر تک دو آیتیں نازل فرمائیں اور اہل بخشش اور اہلِ عذاب کو متعین نہیں کیا۔ تو صحابہؓ پر خوف طاری ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ ذکر فرمایا: تاکہ صحابہ کرام کا خوف جاتا رہے۔ اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے والے مہمان (فرشتے) (حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے دوست کے پاس بشارت اور ان کے دشمنوں یعنی قوم لوط کے پاس عذاب لیکر آئے تھے اس طرح ماقبل کی دو آیتیں دوست اور دشمن دونوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں صرف دوست کے متعلق نہیں۔

جواب ثانی دونوں آیتوں میں وجہ ارتباط یہ ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی انسان اپنے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے مغفرت الٰہی سے ناامید بھی ہو جائے تو بعید نہیں کہ رحمت الٰہی اس کے ساتھ شاملِ حال ہو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ گناہوں کی کثرت اور اپنی مغفرت سے ناامیدی کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو بخشش دے اور اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سو سال کی عمر کو پہنچ کر اولاد کی پیدائش کے متعلق ناامید ہو گئے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عمر میں سے اولاد سے نوازا دیا۔

سوال فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کے متعلق: "قَدَّرْنَآ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ" (ہم نے فیصلہ کیا وہ ہے رہ جانے والوں میں) کیسے کہا۔ حالانکہ فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے نہ کہ فرشتوں کا؟۔

جواب فیصلے کی نسبت فرشتوں کی طرف مجازی ہے۔ جیسا کہ بادشاہ کے خاص کارندے بادشاہ کے حکم سے کوئی کام سرانجام دیکر کہتے ہیں ہم نے اس کی منصوبہ بندی کی، ہم نے حکم دیا، ہم نے فلاں کام سے فلاں کو روکا حالانکہ یہ سب کرنے والے بادشاہ ہیں۔ مگر اس کے نائبین اس کی نسبت اپنی طرف مجازاً کرتے ہیں۔ اس طرح مذکورہ آیت میں فیصلے کو اپنی طرف مجازاً منسوب کیا گیا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ" (اور تحقیق جھٹلایا حجر والوں نے رسولوں کو)" اصحب الحجر" سے مراد صالح علیہ السلام کی قوم

ہے۔ حجران کے شہر یا وادی کا نام ہے جس کی طرف نسبت کر کے انہیں اصحاب الحجر کہا گیا۔ سوال یہ ہے اصحاب حجر کی طرف کئی پیغمبر نہیں بلکہ صرف حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ تو انہوں نے صرف صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا نہ کہ رسولوں کو؟۔

جواب ایک رسول کو جھٹلانا گویا تمام رسولوں کو جھٹلانا ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینے میں تمام رسول متفق ہیں۔

سوال آیت: "فَوَ رَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" (سو قسم ہے تیری رب کی ہم کو پوچھنا ہے ان سب سے جو وہ کام کرتے تھے) اور فرمانِ الٰہی: "فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ" (اس روز کسی جن وانس سے اس کے گناہ کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا) میں بظاہر تعارض ہے۔ پہلی آیت میں کہا جارہا ہے یہ ضرور پوچھیں گے۔ اور دوسری میں کہار ہا ہے کہ نہیں پوچھا جائے گا؟۔

جواب اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب سورہ ھود میں گذرا ہے وہاں دیکھا جائے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں جو کہا جارہا ہے کہ ہم ضرور پوچھیں گے یہ سوال توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر ہوگا یعنی یہ فلاں کام تم نے کیوں کیا؟۔ اور سورہ رحمٰن کی آیت جسمیں کہا جارہا ہے کہ ہم ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کریں گے۔ اس سے مراد سوال استعلام ہے یعنی ہم معلومات حاصل کرنے کے لئے کہ یہ کام تم نے کیا ہے یا نہیں کیا؟' ایسا سوال نہیں ہوگا۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں؟۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ قیامت کے مختلف مقامات ہیں۔ بعض مقامات میں سوال جواب ہوں گے۔ اور بعض مقامات پر نہیں ہوں گے۔ اس کی نظیر ماقبل میں گذر چکی ہے۔

سورۃ النحل

سوال "وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ" (اور تم کو ان (چوپایوں) سے رونق ہے جب شام کو پھیر لاتے ہو اور جب چراتے ہو)۔ "اراحۃ" (چرا کر شام کو گھر واپس لانا) کو "سروح" (صبح چرانے کے لئے لے جانا) پر کیوں مقدم کیا گیا؟ حالانکہ فی الواقع چرانے کے لئے پہلے لے جاتے ہیں بعد میں واپس لاتے ہیں۔

جواب اراحۃ کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ جانور چر کر شام کے وقت آتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ اس لئے اس وقت وہ بھرے پیٹ اور بھرے تھنوں کے ساتھ آتے ہیں۔ اور چلتے ہوئے سکون اور اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہیں۔ بخلاف صبح چرانے کے لئے لے جاتے

وقت کہ نہ ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔ نہ تھنوں میں دودھ ہوتا ہے اور وہ بھوک کی وجہ سے صحیح چل بھی نہیں سکتے۔

سوال ''وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَكُمۡ اِلٰى بَلَدٍ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا بٰلِغِيۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ'' (اٹھا کر چلتے ہیں بوجھ تمہارے ان شہروں تک کہ تم نہ پہنچتے وہاں مگر مشقت کے ساتھ) اگر آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم مشقت کے ساتھ پہنچتے ہو۔ تو اس میں احسان جتلانا کیسا ہے؟ اگر مطلب یہ ہے تم ان جانوروں کے بغیر وہاں مشقت سے پہنچتے تھے' تو ان جانوروں کی موجودگی میں بھی مشقت سے پہنچا جاتا ہے تو ان کا کیا فائدہ؟۔

سوال ''تحمل اثقالکم'' کا مطلب ہے کہ تم اپنے جسموں کو اپنے سامان کے ساتھ دور دراز کے شہروں تک ان جانوروں کے بغیر مشقت سے پہنچاتے تھے۔ اب ان کی موجودگی میں خود بھی ان پر سواری کرتے ہو۔ اور اپنے سامان کو بھی ان پر لادتے ہو۔ اگر یہ نہ ہوتے تو پیدل سامان کو پشت پر اٹھا کر سفر کرنا بھی کتنا باعث مشقت ہوتا' آیت میں مذکور مشقت سے مراد پیدل چلنے یا سامان پیٹھ پر اٹھا کر چلنے کی مشقت ہے۔ مطلق سفر کی مشقت مراد نہیں ہے۔ اس سے ان جانوروں کا فائدہ مند ہونا خوب واضح ہو گیا۔

سوال آیت: ''وَّالۡخَيۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِيۡرَ لِتَرۡكَبُوۡهَا وَزِيۡنَةً'' (اور گھوڑے اور خچریں اور گدھے کہ ان پر سوار ہو اور زینت حاصل کرو) جس طرح خچر اور گدھے کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طرح گھوڑے کی حرمت کی بھی متقاضی ہے۔ اس لئے کہ آیت میں ان کی منفعت زینت اور سواری کرنا بتلایا گیا ہے' لہٰذا یہی منفعتیں اس سے حاصل کی جائیں گی۔ اس لئے کہ کسی کام کی علّت بیان کرنے سے وہ اس میں منحصر رہتا ہے۔ لہٰذا اس سے رکوب اور زینت کے علاوہ اور کام لینا اس قاعدے کے خلاف ہو گا۔

جواب یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض جگہ ٹوٹ جاتا ہے' مثلاً گدھے وغیرہ کو سواری کے علاوہ سامان لادنے اور دوسرے امور میں استعمال کرنا' بالاتفاق جائز ہے۔ حالانکہ آیت میں یہ نہیں بتلایا گیا ہے۔

سوال اگر کوئی اس جواب کو رد کرتے ہوئے یوں کہہ دے کہ سامان وغیرہ لادنے کا حلال و جائز ہونا بھیڑ بکریوں پر قیاس کرنے کی وجہ سے ہے۔ اور چوپایوں سے یہ کام لینا منصوص علیہ ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا لَـكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ وَّمَنَافِعُ'' (اور اس نے چوپایوں کو بنایا' ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے)۔ اس منفعت سے منفعتِ عرفی مراد ہے۔ نہ کہ

تمام منفعت' اور یہی منفعت گھوڑے خچر اور گدھے میں بھی پائی جاتی ہے۔

سوال آیت :"یُنۡبِتُ لَکُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرَاتِ "(اس پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اُگاتا ہے)۔

یہاں (مِنۡ کُلِّ الثَّمَرَاتِ ہر قسم کے پھلوں میں سے اگاتا ہے) فرمایا۔ حالانکہ تمام پھل پانی کے ذریعے ہی اگتے ہیں؟۔

جواب اول دنیاء میں تمام پھل نہیں ہیں۔ تمام پھل صرف جنت میں ملیں گے۔ دنیاء میں تو صرف جنت کے بعض پھلوں کے نمونے ہیں۔ لہٰذا آیت میں "من" تبعیضیہ اس اعتبار سے استعمال کیا گیا۔

جواب ثانی جو لوگ کلام اثبات میں "من" کے زائد ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک "من" زائد بھی ہوسکتا ہے۔

سوال "اَفَمَنۡ یَخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ" (بھلا جو پیدا کرے برابر ہے اس کے جو پیدا نہ کرے) میں "مَنۡ لَّا یَخۡلُقُ" سے مراد بت ہے۔ اگلی آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بت غیر عاقل ہیں۔ غیر عاقل کے لئے لفظ ما استعمال ہوتا ہے نہ کہ "مَن" تو آیت میں مَنۡ لَّا یَخۡلُقُ کیوں فرمایا گیا؟

جواب اللہ نے کفار کے اعتقاد کے مطابق ان سے خطاب فرمایا اس لئے کہ ان کفار نے ان بتوں کو الٰہ کا نام دیا ان کی پرستش کی اور ان کو عقلاء کا درجہ دیا۔ قرآنِ کریم میں اس جیسی مثالیں موجود ہیں مثلاً اس آیت میں فرمایا گیا: "اَلَهُمۡ اَرۡجُلٌ یَّمۡشُوۡنَ بِهَا "ان کے لئے عقلاء کی ضمیر استعمال کی گئی۔ قاعدے کے رو سے الْها ہونا چاہئے۔

مگر اس جواب پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ان کا اعتقاد غلط اور باطل تھا تو حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ اس غلط اعتقاد کی بیخ کنی ہو دل و دماغ سے اس کو اکھاڑ پھینکا جائے نہ کہ ان کو اس پر برقرار رکھا جائے اور ان کو ان کے اعتقاد کے مطابق خطاب کیا جائے اور ان کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے معتقدات کو درست سمجھیں۔

جواب اول کفار کو سمجھانے کے لئے یہ کہا گیا ہے۔ اگر ان کے اعتقاد کے خلاف یوں خطاب کیا جاتا: "اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ" تو کفار سمجھتے کہ اس میں بتوں کے علاوہ دوسرے جمادات مراد ہیں۔ (اور اپنے بتوں کی بے بسی و بے کسی کو نہ سمجھتے)۔

جواب ثانی ابن الانباری نے کہا بتوں کے لئے عاقل کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا' کہ ان کو عالم کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ تو ان پر عالم کا حکم غالب آ گیا۔

سوال کفار کو غیر اللہ کی عبادت اور ان کو الٰہ کہنے پر ملزم ٹھہرایا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یوں بیان کیا جاتا: "اَفَمَنْ لَا يَخْلُقُ كَمَنْ يَخْلُقُ" (کیا وہ جو پیدا نہیں کر سکتا ہے برابر ہو سکتا ہے اس کے جو پیدا کر سکتا ہے)۔

جواب جب انہوں نے بتوں کو خدا سمجھ کر اللہ کی عبادت کی طرح ان کی عبادت کی۔ تو گویا انہوں نے بتوں اور ان کے خالق کے درمیان قطعی برابری کی لہٰذا کسی کو بھی مقدم کیا جائے بتوں کا انکار ثابت ہوتا ہے۔ البتہ خالق کو مقدم کرنے کی وجہ اس کے اشرف ہونے کی وجہ سے یا تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ کلام سے مقصود ہی خالق کا بیان ہے اس کی تنزیہ و تعظیم کی بناء پر۔

سوال "اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ" (مردے ہیں جن میں جان نہیں) اموات کہنے کے بعد غیر احیاء (زندہ نہیں ہیں) کہنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اول غیر احیاء کہنا بے فائدہ نہیں۔ اس سے مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد حیات نہیں ہے جب کہ بعض مردوں کے لئے مرنے کے بعد حیاۃ ہے۔ جیسے کہ نطفہ' انڈے' دوسرے اجسام' غیر احیاء کا لفظ ان کے مردہ پن کو خوب ظاہر کرتا ہے فی الحال بھی مردے ہیں۔ فی المال غیر احیاء ہیں۔

جواب ثانی "غیر احیاء" بتوں کی صفت نہیں ہے۔ بلکہ بت پرستوں کی صفت ہے مطلب یہ ہے کہ ان بتوں کی عبادت کرنے والوں کے دل زندہ نہیں ہیں۔

جواب ثالث "غیر احیاء" کہنا یہ بتانے کے لئے ہے کہ یہ فی الحال بھی مردے ہیں (تم مردوں کی عبادت کرتے ہو) نہ یہ کہ اب زندہ ہیں بعد میں مر جائیں گے۔

سوال "وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ" (ان کو یہ بھی خبر نہیں کہ مردے کب اٹھائے جائیں گے) اس آیت میں بتوں اور بت پرستوں کا عیب بیان کیا گیا ہے کہ وہ قیامت میں اٹھائے جانے کے وقت سے بے خبر ہیں۔ حالانکہ مؤمنین وموحدین کو بھی اس وقت کا علم نہیں وہ بھی بے خبر ہیں تو یہ عیب جوئی کیسے؟۔

جواب ان بتوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کی عبادت کرنے والے کب اٹھائے جائیں گے۔ تو جاہل کیسے معبود ہو سکتا ہے؟ آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ بتوں کی عبادت کرنے والے بعث بعد الموت کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے نہ تفصیلی نہ ہی اجمالی۔ اس لئے بعث بعد الموت کے منکر

ہو گئے۔ بخلاف موحدین کے کہ وہ بعث بعد الموت کو مجملاً جانتے ہیں کہ وہ قیامت کا دن ہے۔ اگر چہ تفصیلاً نہیں جانتے۔

سوال ''وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ''(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا چیز نازل فرمائی تو کہتے ہیں وہ تو محض بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے (منقول) چلی آرہی ہیں)۔

جواب اس طرح کا سوال و جوب سورۃ الحجر میں آیت ''وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِىْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ'' کے تحت گذر چکے ہیں۔

سوال اس سورۃ میں فرمان ہے''لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ''(ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور جن کو یہ لوگ بے علمی سے گمراہ کر رہے ان کے گناہوں کا بھی کچھ بوجھ اپنے اوپر اٹھانا پڑیگا)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى''(کوئی شخص بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔

جواب پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ اٹھائیں گے چنانچہ اپنے کفر کا بوجھ اور سبب بننے کی وجہ سے دوسروں کے کفر کا بوجھ اٹھائیں گے' اور دوسری آیت جس میں ہے کہ دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے' اس کا مطلب ہے کہ ایک دوسرے کا ایسا بوجھ نہیں اٹھائے گا جس کے ساتھ اس کا ادنیٰ تعلق بھی نہ ہو۔ نہ ارتکاب کا اور نہ سبب کا۔

سوال ''اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَىْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ''(ہم جس چیز کو (پیدا کرنا) چاہتے ہیں بس اس سے ہمارا اتنا کہنا (کافی) ہوتا ہے کہ تو ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے)۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ معدوم چیز بھی شئی ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معدوم کو خطاب کرنا جائز ہے۔ حالانکہ اکثر علماء کے نزدیک معدوم شئی نہیں ہے۔ اور معدوم کو خطاب کرنا بالاجماع جائز نہیں ہے؟

جواب معدوم کو مایؤل یعنی آئندہ ہونے کے اعتبار سے مجازاً شئی کہا گیا ہے۔ قرآن میں اس کی نظریں موجود ہیں۔ مثلاً یہ آیت:''اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَىْءٌ عَظِيْمٌ'' اور دوسری آیت:''اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ'' اور شئی معدوم کو یہ خطاب' خطاب امر و نہی نہیں ہے بلکہ خطاب تکوین ہے' اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس خطاب میں مخاطب کا خطاب سے پہلے موجود ہونا ممتنع ہے بخلاف خطاب امر و نہی کے اس میں مخاطب کا موجود نہ ہونا ممنوع ہے۔

سوال ''وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ'' (اللہ ہی کے مطیع ہیں جتنی چیزیں چلنے والی آسمان میں (جیسے فرشتے) اور جتنے چوپائے زمین میں موجود ہیں)۔
آیت میں لفظ ما ''استعمال کیا گیا ہے اگر لفظ ''مَن'' لایا جاتا اور یوں کہا جاتا۔ ''مَنْ فِي السّٰموات وَمَنْ فِي الْاَرض'' تو عقلاء کو غلبہ حاصل ہوتا' اور غیر عقلاء تبعاً شامل ہو جاتے)۔

جواب ''مَنْ'' کو چھوڑ کر ''ما'' اس لئے لایا گیا تا کہ یہ تمام دابۃ کو شامل ہو۔ چونکہ دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر من لایا جاتا تو صرف عقلاء کے ساتھ خاص ہو جاتا۔

سوال ''وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ'' (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے ظلم کے سبب دارو گیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے)۔
اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ظالمین پر عذاب آتا تو غیر ظالم بھی اس کے زد میں آتے اور زمین پر چلنی والی تمام مخلوق ہلاک ہو جاتی۔ حالانکہ ظالم کے ظلم کی وجہ سے غیر ظالم کو سزا دینا حکیم ذات کو زیب نہیں دیتا۔

جواب اول یہاں ظلم سے مرد کفر ہے۔ اور دابہ سے دابہ ظالمہ یعنی کافر مراد ہے' حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی اس طرح فرمایا ہے۔ بعض نے جواب دیا' اگر آباء کو ہلاک کیا جاتا تو ابناء بھی نہ ہوتے۔

جواب ثانی یہ ممکن ہے ظلم اور ظلم کے اثر تک کو زمین سے مکمل طور پر ختم کرنے کے لئے سب کو ہلاک کر دیا جاتا تا کہ ظلم کا اثر ختم ہو جیسے پچھلی امتوں کے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے ظلم کی بنا پر طوفان آیا اور تمام مخلوق کو بہا لے گیا۔ کشتی میں سوار لوگوں اور جانوروں کے علاوہ سطح زمین پر چلنے والی تمام مخلوق غرقاب ہو گئی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً'' البتہ غیر ظالم جو اس عذاب کے زد میں آ گئے ان کو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے قیامت کے دن اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

جواب ثالث ہر انسان مکلف ہے ظاہر بات ہے کہ کوئی انسان گناہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر چہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو۔ گناہ کرنا ظلم ہے' تو ہر انسان ظالم ہوا۔ تو اگر انسان اپنے ظلم کی پاداش میں ہلاک ہوگا۔ تو جانوروں کو بھی ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ انسانوں کی ضرورت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جب انسان نہیں رہے۔ تو ان جانوروں کی ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ لہٰذا یہ بھی ختم ہوں گے۔

سوال ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کے علاوہ مخلوق انسانی مصالح کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

اس لئے کہ کتب شرعیہ سے ثابت ہے کہ ان کی تخلیق انسان سے پہلے ہے۔حدیث میں اس مخلوق کی انسان سے پہلے پیدائش پر صراحت موجود ہے۔اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیں کہ یہ انسان کی مصلحت کے لئے پیدا ہے پھر تو ان مخلوقات کا انسان کے ساتھ ہلاک ہونا انسان کے عذاب اور مصیبت میں کمی کریگا۔خصوصاً اگر ہلاکت کا سبب بھی ایک ہی ہو۔کیونکہ کہا جاتا ہے کہ مصیبت اگر عام ہو جائے تو آسان ہو جاتی ہے۔

جواب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا'' (پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب)۔چنانچہ انسان کی تخلیق سے ان مخلوق کی پیدائش انسانی مصالح کے لئے پیدا کئے جانے کے منافی نہیں ہے۔جیسا کہ بڑے لوگ اپنی اولاد کی پیدائش سے پہلے ان کے لئے مکانات' محلات' سواریاں خدام اور کپڑے وغیرہ تیار کر رکھتے ہیں۔جہاں تک مصیبت کے عام ہونے سے تکلیف میں تخفیف ہونے کا تعلق ہے۔ہم یہ نہیں کہتے کہ سب اکٹھے ہلاک ہوں گے۔بلکہ یہ مال مویشی وغیرہ ان کے سامنے پہلے ہلاک کر دئے جائیں گے تا کہ ان کی چیزیں ہلاک ہونے سے ان کی تکلیف میں اضافہ ہو۔

سوال ''اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ'' (کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے اور درختوں میں) ''فی الجبال' اور فی الشّجر'' کے بجائے من الجبال اور من الشجر کیوں فرمایا؟ حالانکہ عام استعمال میں اس کے لئے فی استعمال ہوتا ہے۔

جواب علامہ زمخشریؒ نے فرمایا ہے: ''فی'' کے بجائے ''من'' کا استعمال بعضیت کے معنی پیدا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔اس لئے کہ ہر پہاڑ یا ہر درخت میں مکان نہیں بنایا جاتا۔یہ تھا زمخشریؒ کا قول' جہاں تک میرا خیال ہے کہ ''فی'' کی جگہ ''من'' استعمال کر کے یہ بتلایا جا رہا ہے۔کہ ان کے مکانات پہاڑ اور درختوں کے مجموعے سے بنائے جاتے تھے۔کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شہد کی مکھیاں پہاڑوں میں اپنے لئے چھتے لکڑیوں سے بناتی ہیں۔اگر ''من'' کے بجائے لفظ ''فی'' استعمال کیا جاتا تو یہ مفہوم ادا نہیں ہوسکتا تھا۔اس کی نظیر دوسری جگہ بھی ہے چنانچہ ارشادِ گرامی ہے: ''وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا''۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا'' (اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیبیاں بنائیں) جب کہ ہماری بیویاں ہمارے نفسوں میں سے نہیں ہیں۔اور وہ بھی ہو نہیں سکتیں اس لئے کہ ہمارے نفسوں سے ہوتیں تو ہمارے لئے ان سے فائدہ اٹھانا حلال نہ ہوگا۔اس لئے کہ اپنے جزء سے نکاح جائز نہیں ہے؟۔

جواب اول آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کے پہلو سے حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا کیا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: "اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا"

جواب ثانی "من انفسکم" کا مطلب ہے "من جنسکم" ہے جیسا کہ فرمانِ تعالیٰ ہے: "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ"

سوال "وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ" (اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہے۔ اور نہ زمین سے اور نہ وہ قدرت رکھتے ہیں)۔

بتوں کے لئے جمع مذکر سالم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جب کہ وہ غیر عاقل ہیں۔

جواب بعض کفار عقلاء کی عبادت کرتے رہے ہیں۔ مثلاً یہودی حضرت عزیرؑ، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی اور بعض کفار فرشتوں کی عبادت کرتے رہے ہیں، اس وجہ سے عقلاء کو غلبہ دیکر عاقل کا صیغہ استعمال کیا۔

سوال ان بتوں کے لئے "مالا یملك" میں مفرد کا صیغہ اور لا یستطیعون جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، کیوں؟۔

جواب "ما" کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد کی ضمیر اور معنیٰ کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کی ضمیر لوٹائی گئی، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں "ما" کے لفظ کا اعتبار کر کے ضمیر مفرد اور معنیٰ کا اعتبار کر کے "ظهور" کو جمع لایا گیا: "وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ"

سوال لَا يَمْلِكُ (قدرت نہیں رکھتے) کے بعد (وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ) (طاقت نہیں رکھتے) کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ دونوں ہم معنیٰ ہیں؟۔

جواب اول "یستطیعون" میں مفعول (رزق) کی ضمیر نہیں ہے۔ بلکہ مطلق استطاعت کی نفی ہے یعنی رزق اور غیر رزق دونوں کی طاقت ہی ان میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ جماد محض ہیں۔ اور "لا یملك" کا مفعول رزق ہے۔ یعنی رزق پہنچانے پر قادر نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ "لا یستطیعون" بے فائدہ نہیں ہے۔

جواب ثانی اگر "لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ" میں مفعول کی ضمیر محذوف ہو یعنی "لا یستطیعونه ہو اور وہ رزق کی طرف لوٹے تب بھی "لا یملك" کے بعد اس کو لانا فائدے سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ بسا

اوقات انسان کسی چیز کا مالک تو نہیں ہوتا لیکن اس کا مالک بننے کی استطاعت رکھتا ہے برخلاف ان بتوں کے کہ نہ تو یہ کسی چیز کے مالک ہیں اور نہ ہی ان میں مالک بننے کی استطاعت وصلاحیت ہے۔

سوال ”ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا“ (اللہ نے بتلائی ایک مثال کہ ایک غلام مملوک ہے کہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا اور جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف سے (اچھی روزی) سوال یہ ہے ”عَبْدًا“ کے مملوکا لانے اور ”مملوکاً“ کے بعد لا یقدر علی شیء (کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا) لانے کا کیا فائدہ ہے؟ اس لئے کہ عبد ہوتا ہی مملوک ہے اور مملوک کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا؟۔

جواب لفظ عبد' غلام اور آزاد دونوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے اس لئے کہ آزاد اور غلام دونوں اللہ کے عبید ہیں۔ لہٰذا ”عَبْدًا“ کے ”مملوکاً“ لانا آزاد سے ممتاز کرنے کے لئے ہے اور 'مملوکاً' کے بعد ”لا یقدر“ لانا 'عبد ماذون اور مکاتب سے جدا کرنے کے لئے ہے۔ اس لئے کہ عبد ماذون اور مکاتب مستقل تصرف پر قادر ہوتے ہیں۔

سوال مذکورہ آیت جس کو بطور مثال بیان کیا گیا ہے وہ دو ہیں ایک مملوک' دوسرا وہ شخص جس کو رزق حسن دیا گیا' لہٰذا قاعدے کے رو سے تثنیہ کا صیغہ ”ہل یستویان“ ہونا چاہئے۔ جبکہ آیت میں جمع کا صیغہ ”ہل یستوون“ ہے؟۔

جواب اول آیت میں معین مالک اور متعین مملوک مراد نہیں ہے۔ بلکہ جنس مالکین اور جنس مملوکین مراد ہے۔

جواب ثانی دو کو جماعت کے حکم کر دے دیا گیا۔

جواب ثالث ”مَنْ رَزَقْنَا“ میں لفظ ”مَنْ“ جمع کے معنی میں ہے۔

سوال ”وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ“ (اور قیامت کا معاملہ بس ایسا ہوگا جیسے آنکھ جھپکنا یا اس سے بھی جلدی) ”اَوْ“ خبر میں شک کے لئے آتا ہے' اور اللہ تعالیٰ کے لئے شک محال ہے۔ تو آیت مذکور میں ”اَوْ“ کیسے استعمال کیا گیا؟۔

جواب اول بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے' کہ بیان ”اَوْ“ 'بَلْ' بلکہ معنی میں ہے' جیسے آیت ”اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ“ میں او بلکہ کے معنی میں ہے یعنی ”بل یزیدون“ ہے۔ اور آیت ”فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً“ میں بھی او کے معنی میں ہے۔ اسی طرح ”فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى“ میں بھی ”اَوْ“ بلکہ کے معنی میں ہے۔ لیکن اس جواب پر یہ اشکال ہوگا کہ بل

(بلکہ) ماقبل کلام سے رجوع کرنے کے لئے آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے۔

جواب ثانی ان آیات میں ''اَوْ'' واو کے معنی میں ہے۔

جواب ثالث تمام آیات میں لفظ ''اَوْ'' شک کے لئے ہے لیکن ہمارے لئے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے۔

اسی طرح ''فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى'' میں نبی کریم ﷺ کے دیکھنے کے اعتبار سے ہے۔

اور علامہ زجاج نے فرمایا ہے کہ: آیت کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت پلک جھپکنے سے بھی جلدی واقع ہوگی بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے جلدی ہی لانے پر قادر ہے۔

سوال ''وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ'' (تمہارے لئے ایسے کرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں)۔ کرتے صرف گرمی سے بچاؤ ہی کے لئے نہیں بلکہ سردی سے بچاؤ کے لئے بھی ہوتے ہیں' آیت میں صرف گرمی سے بچاؤ کا ذکر ہے' سردی سے بچاؤ کا ذکر نہیں؟

جواب قرینہ کی موجودگی میں اس کو حذف کیا گیا' اس لئے کہ اس کی ضد (گرمی) اس پر دلالت کر رہی ہے۔ جیسا کہ ایک آیت میں فرمایا گیا ''بِيَدِكَ الْخَيْرُ'' والشر نہیں فرمایا گیا۔ اس طرح کسی شاعر نے بھی کہا۔

وَما ادری اذا يممت ارضا ☆ اريد الخير ايهما يلينی

(جب میں کسی جگہ جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو خیر و بھلائی چاہتا ہوں۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ مجھے خیر و شر میں سے کس سے واسطہ پڑتا ہے) تو شاعر نے بھی ''خیر'' کو ذکر کر کے شر کو حذف کیا۔ اس لئے ''خیر'' اس پر دلالت کر رہی ہے۔

سوال اگر ایسا ہے تو برد (سردی) اور ''شر'' کو ذکر کر کے الحر اور الخیر کو محذوف کرتے' انہیں چھوڑ کر انہیں ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟۔

جواب اس میں یہ حکمت ہے کہ خیر مطلوب و مرغوب ہے' اللہ سے لوگ خیر ہی مانگتے ہیں۔ اور شر کے مقابلے میں وجود کے لحاظ سے زیادہ بھی ہے۔ اور ''الحر'' کو ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب اہل حجاز ہیں۔ ان کے لئے گرمی سے بچاؤ کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ ان کے ہاں سردی کے مقابلے میں گرمی سے بچاؤ کا اہتمام زیادہ ہے۔

سوال اللہ نے کیسے فرمایا: ''يَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ'' (خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں تو مگر پہچان کر پھر اس کے منکر ہو جاتے ہیں اور زیادہ ان میں سے ناشکرے ہیں) حالانکہ وہ سب کافر ہیں۔

جواب زمخشریؒ نے کہا: بہتر یہ ہے کہ یہاں اکثر سے تمام مراد لئے جائیں' مگر یہ جواب قابل غور ہے۔ اس لئے کہ بعض کا اطلاق کل پر نہیں ہوتا' البتہ کل کا اطلاق بعض پر ہوتا بھی ہے۔

سوال قیامت کے دن کفار کا اپنے معبودوں کو دیکھ کر یہ کہنے کا کیا فائدہ کہ: ''رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِیْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ'' (جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! وہ ہمارے شریک ہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کی پوجا کرتے تھے) کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم پہلے سے ہے۔

جواب اول جب کفار ''وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ'' کہہ کر شرک کرنے کا انکار کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ بطور عقاب کے ان کی زبانوں پر سکوت طاری کر کے ان کے اعضاء سے بلوائیں گے۔ وہ جب ان شریکوں کو دیکھیں گے جن کی وہ دنیا میں پوجا کرتے تھے تو کہہ اٹھیں گے ''رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا'' (اے ہمارے رب! یہی ہمارے شرکاء ہیں) یعنی گویا وہ یہ کہیں گے کہ ہم انکار کے بعد اقرار کرتے ہیں' جھوٹ بولنے کے بعد سچ بتاتے ہیں اے اللہ! آپ کی رحمت کے طلب گار ہونے کے لئے اور آپ کے غضب سے بچنے کے لئے۔ لہٰذا ان کا یہ بتانا کہ یہ ہمارے معبود تھے اپنے گناہوں کے اعتراف کے لئے ہوگا نہ کہ اللہ تعالیٰ کو بتانے کے لئے۔

جواب ثانی کفار جب سخت ترین عذاب کا نظارہ کریں گے اور اللہ کی سخت ترین ناراضگی کا مشاہدہ کریں گے۔ تو خود کو بچانے کے لئے بتوں کو موردالزام ٹھہرا کر بول پڑیں گے ''رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا'' اس لئے کہ یہ لوگ اپنی دانست میں ان بتوں کو عاقل سمجھتے ہیں' اور یہ کہیں گے۔ کہ ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

سوال یہ معبود مشرکین کو: ''اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ'' (بیشک تم جھوٹ بولتے ہو) کیوں کہیں گے؟ حالانکہ مشرکین اپنے اس قول (کہ یہ ہمارے شرکاء ہیں) میں سچے ہیں۔

جواب یہ اس لئے ہوگا تاکہ ان مشرکین کی فضیحت وذلت میں مزید اضافہ ہو۔ وہ اس طرح ہوگا کہ بت تو جماد ہیں' بے روح ہیں وہ یہ جانتے تک نہیں کہ ان کی کوئی عبادت بھی کرتا ہے۔ تو اس سے ظاہر ہوگا وہ ایسی مخلوق کی عبادت کرتے تھے جو اپنے عابدین کو جانتی تک نہیں' اس سے ان کفار کو مزید شرمندگی ہوگی۔ اس کی نظیر یہ آیت بھی ہے: ''وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّیَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا كَلَّا سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَیَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا''

سوال ''وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ'' ترجمہ (ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جو ہر چیز کو بیان کرنے والی ہے) سوال یہ ہے اگر قرآن دین کے تمام امور کے لئے واضح

بیان ہے تو ائمہ کے درمیان دینی معاملات میں اختلاف کیوں ہوا؟

جواب حضرت ائمہ کے درمیان اختلاف اس لئے واقع ہوا کہ قرآن کریم میں تمام امور دین بیان نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض کا بیان صراحۃً ہے اور بعض احکام بذریعہ غور و فکر مستنبط ہیں' اور ہر ایک امام کا طریقہ استدلال علیحدہ ہے۔ اس لئے اختلاف واقع ہوا۔

سوال شریعت کے بہت سے احکامات قرآن سے نہ نصاً ثابت ہیں اور نہ ہی استنباط و استخراج کے ذریعے سے۔ جیسا نماز کی رکعات کی تعداد' مدت سفر' مدتِ مسح' مدت حیض' چوری کا نصاب اور اس جیسے بہت سارے احکامات۔

جواب قرآن کریم نے تمام دینی امور کو بیان کیا ہے۔ بعض کو خود بیان کر دیا ہے اور بعض کو سنت رسولؐ پر یہ کہہ کر چھوڑ دیا: ''وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا'' ترجمہ (جو کچھ تم کو رسولؐ اللہ دیں اس کو لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىۗ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى'' ترجمہ (اور آپؐ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وحی ہے جو اللہ کی طرف سے آپؐ پر کی جاتی ہے)

اور یہ بھی فرمایا ''وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ''

اور: ''فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ'' فرما کر قیاس کرنے کا حکم دیا۔ یہ چار طریقے ہیں۔ شریعت کا کوئی حکم ان چار سے باہر نہیں۔ ان چاروں کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کو'' تبیانا لکل شیء'' کہنا صحیح ہوا۔

سوال ''لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا'' (اور نہ ٹھہراؤ قسموں کو دھوکا آپس میں کہ ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے) میں لفظ ''قَدَمٌ'' کو مفرد اور نکرہ کیوں لایا گیا۔ معرفہ ''القدم'' یا جمع ''الاقدام'' کیوں نہ فرمایا گیا ایمان جمع کے ساتھ زیادہ مناسب بھی ہے؟۔

جواب ''قَدَمٌ'' کو مفرد اور نکرہ لانا اس بات کی اہمیت اور بڑائی کو بیان کرنے کے لئے کیا۔ اگر ایک قدم راہ جنت سے دوری کا سبب بن سکتا ہے تو بہت سارے اقدام کیسے نہ پھسل جائیں گے؟

سوال ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى'' (جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت) لفظ من مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے اس کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل آیات میں ان دونوں کو شامل ہے: ''مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ'' (جو نیک کام کرے) ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا'' اس طرح: ''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ'' جو

مثقال بھر عمل کریگا اچھا اس کو دیکھ لے گا'' وغیرہ آیات میں مِنْ مرد وعورت دونوں کو شامل ہے تو یہاں آیت مذکور میں مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى لانے کی کیا ضرورت ہے؟۔

جواب یہاں دو صنفوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ عورتوں نے کہا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کا خیر کے ساتھ ذکر کیا ہے مگر عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اگر ہمارے اندر خیر و بھلائی ہوتی تو ہمارا بھی تذکرہ قرآنِ کریم میں ہوتا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات اتاری: ''اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ الخ'' اور آیت: ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً'' جب یہ آیات اتریں جن میں عورتوں کا بھی تذکرہ ہے تو ان کا وہم دور ہو گیا۔

سوال آیت میں فرمایا گیا ہے۔ جو مرد یا عورت نیک عمل کریگا ہم اس کو پاکیزہ زندگی دیں گے۔ حالانکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ بہت سے صلحاء و اتقیاء کی زندگیاں مصائب و تکالیف' محنت و مشقت اور مختلف آزمائشوں میں صرف ہوئی ہیں۔ جو جتنا نیک ہوا اتنی مشکلات سے دوچار ہوا؟۔

جواب یہاں حیات سے مراد حیاتِ قناعت ہے۔ اور بعض نے کہا: اس سے رزقِ حلال مراد ہے۔ اور بعض نے کہا اس سے مراد نیکیوں کی توفیق نصیب ہونا ہے۔ اور بقول بعض طاعت کی لذت و شیرینی مراد ہے۔ بعض علماء کے نزدیک حیات طیبہ سے مراد فیصلہ خداوندی پر راضی ہونا ہے۔ اور بعض نے کہا۔ اس سے قبر کی زندگی مراد ہے۔ جیسا کہ آیت میں فرمایا گیا ہے: ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ'' (اور اللہ کے راستے میں قتل کئے جانے والوں کو تم مردہ مت سمجھو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ ان کے رب کے ہاں ان کو رزق دیا جاتا ہے)۔

بعض نے کہا اس سے مراد آخرت کی زندگی ہے' درحقیقت اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ اس لئے کہ اس کے بعد پھر موت نہیں ہے اور یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی نعمتوں میں ہوں گے۔ مگر چند آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو بظاہر اس سے دنیا کی زندگی مراد ہے۔ ''وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ وَعَدَ اللّٰهِ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ'' ''فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ''

سوال اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ'' اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا)

حالانکہ بہت سارے صحابہ کافر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی دولت سے نوازا؟۔

جواب ان کافروں سے وہ کافر مراد ہیں جنکی موت اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کفر پر آئیگی۔ بعد کی دو آیتوں سے بھی اس جواب کی تائید ہوتی ہے۔

سوال "یَوْمَ تَاْتِیْ کُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا" (جس دن آئے گا ہر جی جواب وسوال کرتا اپنی طرف سے) آیت میں نفس کی اضافت نفس کی طرف ہے حالانکہ نفس کے لئے اور کوئی نفس نہیں ہوتا؟۔

جواب نفس سے مراد روح ہے جو جوہر ہے اور قائم بذاتہ ہے اور جسم کے ساتھ اس کا تعلق انتظام کا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ نفس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" دوسری جگہ ارشاد ہے: "کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ" اور نفس کا اطلاق ذات شئی پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "نفس الذهب والفضة محبوبة" سونا چاندی کی ذات پسندیدہ ہے لہٰذا آیت میں پہلے نفس سے مراد انسان اور دوسرے سے مراد اس کی ذات ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان قیامت کے دن اپنی ہی ذات سے محو گفتگو ہوگا۔ کسی کی طرف دھیان نہیں جائے گا۔ اور ہر ایک کہیگا۔ نفسی نفسی۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ" (اور پھر چکھایا اس کو اللہ تعالیٰ نے بھوک اور خوف کا لباس) حالانکہ لباس کے ساتھ چکھانے کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مناسب پہنانا ہوتا ہے۔

جواب لفظ اذاقہ (چکھانا) مستعار لہ جوع (بھوک) کے مناسب ہے جو متقاضی الاکل کے ہے۔ جس کے لئے چکھنا استعمال ہوتا ہے۔ مگر مستعار (لباس) کے مناسب نہیں ہے۔ اگر "اذاقہا' کے بجائے کساہا" (اس کو پہنایا) مذکور ہوتا تو مستعار کے موافق تو ہوتا مگر مستعار لہ کے مطابق نہیں ہوتا۔ دونوں طریقے علم بیان میں رائج ہیں۔ پہلے کو تجرید الاستعارہ کہتے ہیں اور دوسرے کو ترشیح الاستعارہ کہا جاتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں تجرید الاستعارہ سے کام لیا ہے۔ ان تمام طریقوں کو میں نے اپنی تصنیف "روضۃ الفصاحۃ" کے اندر تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔"

لباس الجوع والخوف "ان اہل بستی پر پیلا پن اور کمزوری کے اثرات سے کنایہ ہے۔ جیسا "لباس التقوی" استعارہ ہے متقی کے چہرے پر تقوی کے اثرات کے لئے۔

اور بعض نے کہا: کہ آیت میں عبارت محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ طُعْمَ الْجُوْعِ وَكَسَاهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ" (اللہ تعالیٰ نے ان کو بھوک کا مزہ چکھایا اور خوف کا لباس

پہنایا)

سورۃ الاسراء

سوال "سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا" (پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات) آیت میں "بعبدہ" فرمایا گیا "بنبیہ" یا برسولہ یا بحبیبہ یا بصفیہ نہیں فرمایا۔ حالانکہ اس سے آپ کی تعظیم مراد ہے)۔

جواب آپ کو عظیم ترین مقام میں لفظ عبد کے ساتھ یاد کیا گیا جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: "فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی" اس لئے کہ آپ کی امت غلط فہمی میں مبتلاء ہو کر عیسائیوں کی طرح گمراہ نہ ہو جائے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "الٰہ" کہا' جبکہ بعض حضرات نے کہ عبد اس لئے کہا گیا کہ آپ عجب میں مبتلا نہ ہوں۔

سوال اسراء کہتے ہیں رات کے وقت چلانے کو تو پھر "لیلا" کے اضافے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب لیلا لانے کا فائدہ یہ ہے کہ لیلا کو نکرہ لایا گیا ہے جو یہ بتارہا ہے کہ مکہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمانوں کا سفر' پھر وہاں سے واپس مکہ مکرمہ آمد رات کے بعض حصے میں ہوئی۔ حالانکہ مکہ سے بیت المقدس کا یک طرفہ سفر چالیس دن کا ہے۔ یعنی یہ عظیم سفر کم ترین وقت میں ہوا۔

تنکیر بعضیت پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت عبداللہؓ اور حضرت حذیفہؓ کی قراءت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو اسریٰ بعبدہٖ من اللیل ہے یعنی رات کے کچھ حصے میں۔ اسی طرح اس آیت "وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ" میں مِنْ تبعیضہ ہے۔

سوال حضور ﷺ کو معراج کے لئے لے جاتے وقت مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کی طرف لے جانے میں کیا حکمت ہے؟ اگر مکہ سے سیدھا آسمان کی طرف لے جایا جاتا تو کیا حرج تھا؟۔

جواب اول کیوں کہ بیت المقدس تمام خلائق کی جمع ہونے کی جگہ ہے۔ آپؐ کے قدم مبارک وہاں پڑنے کی برکت سے امت کے لئے وہاں ٹھہرنا آسان ہو جاتا۔ اس لئے آپ کو بیت المقدس لے جایا گیا۔

جواب ثانی بیت المقدس انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ارواح جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو آنحضرت ﷺ کی زیارت سے مشرف کرنے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ آپ کو وہاں لے

جایا گیا۔

جواب ثالث بیت المقدس اس لئے لے جایا گیا تاکہ آپ ﷺ بیت المقدس کے احوال و کیفیات اور اس کی صفات کا مشاہدہ فرمائیں تاکہ لیلۃ المعراج کی صبح کو کفار کو اس سفر کے متعلق بیت المقدس کی صفات اور اس کے احوال بتا سکیں اور اپنے رب کی تصدیق کریں۔

سوال "بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ" (جس کے آس پاس ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں) "بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ" فرمایا بارکنا علیہ یا بارکنا فیہ" نہیں فرمایا باوجودیکہ برکت آس پاس کے مقابلے میں مسجد میں زیادہ ہوتی ہے۔ خصوصاً بیت المقدس تو برکتوں کا مرکز ہے؟۔

جواب اول یہاں برکت سے دنیاوی برکت مراد ہے یعنی انہار' اشجار اور پھل وغیرہ یہ سب خارج مسجد میں ہیں نہ کہ داخل مسجد میں۔

جواب ثانی برکت سے برکت دینی مراد ہے۔ اس لئے کہ بیت المقدس حضرات انبیاء کرام کے رہنے کی جگہ' ان کا مقام عبادت اور ان پر وحی کا مقام نزول اور ملائکہ کا مقامِ نزول ہے۔ اور "مَا حَوْلَہٗ" " اس لئے فرمایا تاکہ برکت عام ہو اور سب کو شامل ہو۔ اور جب کے اس کے آس پاس برکت ہے تو بیت المقدس میں برکتیں یقیناً زیادہ ہوں گی۔

اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد برکت دنیاویہ اور دینیہ دونوں ہیں مذکورہ وجوہ کی بنا پر

سوال آیت: "اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا" (بے شک وہ (نوح علیہ السلام) بڑے شکر گذار بندے تھے) کا ماقبل کے ساتھ کیا ربط و مناسبت ہے؟۔

جواب آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے علاوہ کسی کو رب مت مانو ایسا کرنے کی صورت میں تم بھی ناشکر بن جاؤ گے اور حضرت نوح علیہ السلام' زیادہ شکر ادا کرنے والے بندہ تھے اور تم ان پر ایمان لانے والوں کی اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر بچ جانے والوں کی اولاد ہو۔ لہٰذا تم بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح شکر کرو۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا" (اگر برائی کی تو اپنے لئے) اور آیت: "وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْھَا" کی طرح یہاں "وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَعَلَیْھَا" نہیں فرمایا؟۔

جواب اول یہاں "لہا" کا لام "علیٰ" کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ "وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ" میں لام "علیٰ" کے معنی میں ہے اور اس آیت میں لام علیٰ کے معنی میں ہیں۔ "وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ" اور بعض نے کہا اس کے بعد عبارت مقدر ہے: "فلھا رجاء بالرحمۃ یا فلھا مخلص بالتوبہ

والاستغفار ''ہے۔

صحیح یہ ہے کہ لام اپنے حقیقی معنی یعنی اختصاص کے لئے ہے۔ اور ہر عمل کرنے والا اپنے عمل کی جزاء کے ساتھ متصف ہوتا ہے چاہے وہ عمل نیک ہو یا بد۔ یہ بحث پوری تفصیل کے ساتھ سورۃ بقرہ کی آیت: ''لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ'' کے تحت گذر چکی ہے۔

سوال ''وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ايَتَيْنِ'' (ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا) میں ایتَیْنِ کو تثنیہ لایا اور آیت: ''وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ'' میں اور ''وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ اٰيَةً'' دونوں جگہ آیۃ کو مفرد لایا گیا۔ حالانکہ اکیلے حضرت مسیح علیہ السلام کے اندر کئی آیات (نشانیاں) تھیں۔ مثلاً انہوں نے پنگوڑے میں لوگوں سے بات کی۔ مردوں کو زندہ کرتے تھے' مادرزاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو ٹھیک کیا کرتے ہیں۔ مٹی سے پرندے بنا کر اڑا دیتے تھے وغیرہ وغیرہ وہ ان معجزات کے حامل تھے' اور ان کی والدہ مستقل ایک معجزے کی حامل تھیں۔ یعنی بغیر شوہر کے حاملہ ہونا۔ تو آیۃ کو مفرد لانا کیسے درست ہوگا؟۔

جواب اول یہاں آیت سے مراد وہ آیت (نشانی) ہے جو ماں بیٹے کی مشترکہ نشانی ہے' اور ان دونوں کے بغیر نامکمل ہے۔ اور وہ ہے بغیر مرد کے بچے کی پیدائش ہے۔ بخلاف لیل ونہار' شمس وقمر کے کیونکہ وہاں ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ نشانی مراد ہے۔

جواب ثانی آیت میں عبارت محذوف ہے' وہ یہ ہے۔: '' وجعلنا ابن مريم آية وامه آية ''

سوال ''وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً'' (اور ہم نے بنایا دن کی نشانی کو دیکھنے والی) دیکھنا زندوں کی صفت اور آیت النہار سے یا تو سورج مراد ہے یا خود دن۔ دونوں دیکھنے کی صفت کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتے؟۔

جواب اول المبصرة لغت میں المضيئه (روشن کرنے والا) کے معنی میں ہے۔ امام جوہری بھی یہی کہتے ہیں۔ اور دوسرے اہلِ لغت کہتے ہیں کہ المبصرة کا معنی واضح نشانی ہے۔ اور آیت: ''وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً'' میں مُبْصِرَة اسی معنی میں ہے آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے ثمود کو اونٹ کی صورت میں واضح نشانی عطاء کی۔ اسی طرح آیت: ''فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً'' میں بھی مُبْصِرَة بھی واضح نشانی کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی مبصرة کا معنی ہے اس کے مدد سے دیکھا جانا اگر سورج کی طرف نسبت ہو اور اس کے معنی روشن کے ہیں اگر دن کی طرف نسبت ہے۔

جواب ثالث یہ رباعی ہے جو ثلاثی سے ہمزہ کے ساتھ منقول ہے' جس کے معنی ہے سمجھنے اور بصیرت

حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔آیت کا مطلب ہے نشانیاں بصیرت پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ چنانچہ امام اخفش نے۔آیت: ''فَلَمَّا جَآءَ تْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً'' میں بھی مُبْصِرَةً کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

سوال آیت ''لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ'' ترجمہ (برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو۔سالوں کا شمار حساب میں داخل ہے) میں عَدَدَ سنین لانے کا کیا فائدہ ہے صرف لتعلمو الحساب فرماتے تو بھی تو عدد السنين اس میں داخل ہوتا۔

جواب حساب کا موضوع تمام اعداد ہیں۔ جیسا کہ بدن انسان علم طب کا ''اورافعال المکلفین'' علم فقہ کا موضوع ہے۔ ہر علم کا موضوع اس کا مغایر ہوا کرتا ہے۔اس کا جزء نہیں ہوتا ہے۔جیسا کہ بدن انسانی علم طب کا جز نہیں ہے اس طرح عدد علم الحساب کا جز نہیں ہے۔ لہذا السنین کا ذکر اور اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے رات کے محو ہونے اور دن کے مبصر ہونے سے اصل مقصود مہینوں اور سالوں کے عدد کو جاننا ہے۔پھر اس سے تاریخ کے حساب مدتوں اور اوقات کی پہچان ہے۔

سوال یہاں: ''كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا'' آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے) فرمایا: اور دوسری جگہ كفى بنا حاسبين'' (ہم کافی ہیں حساب لینے والے) فرمایا؟

جواب قیامت کے مواقف مختلف ہیں۔بعض مقامات میں ان کے حساب کو خود ان کے حوالہ فرمائیں گے۔اللہ کو اس سب کا علم ہے اور بعض مواقف میں اللہ تعالیٰ خود حساب لیں گے جبکہ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ احتساب تو اللہ تعالیٰ خود کریں گے کوئی اور نہیں کریگا۔اور ''كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا '' کا مطلب یہ ہوگا کہ اے انسان تو اپنے نفس کے گناہوں کا خود شاہد عدل ہے گویا یہ آیت توبیخ وتقریع کے لئے ہے نہ کہ تفویض احتساب کے لئے۔

سوال ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى'' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔اور حدیث شریف میں آیا ہے۔کہ قیامت کے دن غیبت کرنے والے مدیون کی نیکیاں قرض دینے والے کو اور جس کی غیبت کی گئی اس کو دی دی جائیں گی اور اگر ان کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو ان کے گناہ ان پر ڈال دیئے جائیں گے۔

جواب آیت کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی کا بوجھ اپنے اختیار سے نہیں اٹھا سکتا۔اصل میں یہ آیت کفار کے قول کے رد میں نازل ہوئی۔کفار مومنین سے کہتے تھے: ''اِتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ'' (تم ہماری راہ چلو (اگر یہ راہ غلط ہو) تو تمہارے گناہ ہمارے اوپر) تو اس قول کو رد کرنے

کے لئے فرمایا گیا: "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اصحابِ حقوق کے گناہ زبردستی ڈال دیئے جائیں گے۔ یہی سوال مع جواب سورۃ انعام میں بھی گزرا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا" (ہم نے حکم بھیج دیا اس کے عیش کرنے والوں کو پھر انہوں نے نافرمانی کی) حالانکہ دوسری جگہ فرماتے ہیں: "قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ" (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ برائی کا حکم نہیں دیتے)۔

جواب اول اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے "اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا بِالطَّاعَةِ فَفَسَقُوْا" یعنی ہم نے ان کو اطاعت گذاری کا حکم دیا اور انہوں نے نافرمانی کی۔ امام زجاج کہتے ہیں کہ اہلِ عرب کا مقولہ: امرته فعصاني و امرته فخالفني۔ بھی اس آیت کی طرح ہے ان قولوں سے نافرمانی کا حکم دینا مفہوم نہیں ہورہا ہے۔

جواب ثانی "اَمَرْنَا" یہاں "كَثَّرْنَا" کے معنی میں ہے "یعنی ہم نے زیادہ کیا" کلامِ عرب میں لفظ "اَمَرْتُ" كَثُرْتُ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور ایک قراءت "كَثُرْتُ" بھی ہے، اور مندرجہ ذیل حدیث میں ماموره بھی اس معنی میں ہے۔ حدیث مبارک ہے: "خير المال مهرة مأمورة وسكة مابورة" یعنی زیادہ نتیجہ ونسل دینے والا ہے۔

جواب ثالث "امرنا" یہاں امّرنا (بالتشدید) کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے اَمَّرْتُ فُلَانًا میں نے فلان کو امیر بنایا۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ان کو حکمرانی دی تو انہوں نے سرکشی و نافرمانی کی۔ اس جواب کی تائید تشدید والی قراءت "اَمَّرْنَا" سے بھی ہوتی ہے۔ امام زمخشری کہتے ہیں: "امرنا" کے بعد بالطاعۃ مقدر ماننا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب لفظ کو دلیل وقرینہ کے بغیر حذف کرنا جائز نہیں ہے تو اس کے خلاف دلیل وقرینے کی موجودگی میں حذف کرنا کیسے درست ہوگا؟ وہ طور یہ ہے کہ لفظ "ففسقوا" دلالت کررہا ہے کہ مامور بہ محذوف فسق ہے اور یہ عام کلام ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے "امرته فقعد" میں نے اس کو حکم دیا وہ بیٹھ گیا۔ "امرته فقرء" (میں نے اس کو حکم دیا۔ اس نے پڑھا) "امرته فقام" میں نے اس کو حکم دیا وہ کھڑا ہوا۔

ان تینوں مثالوں سے قعود، قراءت، قیام ہی کا مامور بہ ہونا مفہوم ہورہا ہے۔ بخلاف امرته فعصاني اور امرته فخالفني کے۔ اس میں مامور بہ معصیت اور مخالفت نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ یہ امر کے مناقض ومنافی ہے۔ اور امر کے مناقض ومنافی مامور بہ نہیں ہوسکتا۔ تو اس کلام (امرته فعصاني) میں مامور بہ غیر مدلول علیہ ہے۔ یعنی اس پر کوئی متعین منوی نہیں ہے۔ اس قسم کے کلام سے متکلم کوئی خاص مامور بہ مراد نہیں لیتا۔ بلکہ گویا یوں کہہ رہا ہوتا ہے کہ میری طرف سے

حکم تھا اس نے بجا آوری نہیں کی۔ یا اس کی طرف سے مخالفت تھی۔ جیسے اگر تم یوں کہو: "مُرْ زید یطعك" زید کو حکم دو تیری تابعداری کریگا۔ یا یوں کہو: فلان یا مر وینھی' یعطی و یمنع' یصل ویقطع ویضر وینفع' ان میں کوئی مخصوص مفعول نیت میں نہیں ہوتا۔

اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اس تشریح سے تو صریح فسق کا حکم دینا معلوم ہوتا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ اس آیت میں فسق مقدر ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ فسق مامور بہ ہو۔ تو ہم جواب میں کہیں گے۔

اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ کا برائی کا حکم نہ دینے کا یقین ہونا اور طاعت' عدل اور خیر کا حکم دینا لفظ "لطاعة" کے محذوف و مقدر ہونے پر دلیل ہوسکتا ہے لہٰذا یوں کہا جاسکتا ہے کہ: "اَمَرَهُمْ بِالطَّاعَةِ فَفَسَقُوْا" کہہ سکتے ہیں تو جواب یہ دیا جائے گا کہ اس صورت میں تو لازم آئیگا کہ متکلم اپنے مخاطب سے علم غیب کا ارادہ کرتا ہے۔ اس لئے اس نے ایسی چیز کو محذوف کیا جس پر کلام میں لفظی لحاظ سے اس پر کوئی دلیل وقرینہ نہ صرف نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف قرینہ ہے۔ گویا اس نے ایک چیز کو ذکر کیا اور اس کے نقیض کو محذوف کیا۔ لہٰذا لفظ "امرنا" کو مجاز ماننا ہی بہتر ہے۔ یہ سارا کلام امام زمخشری کا ہے۔ کسی اور مفسر کا اس قول کو اختیار کرنا میرے علم میں نہیں ہے۔

سوال جوابِ اوّل پر اشکال ہے۔ وہ یہ کہ اگر امرنا کے بعد "الطاعة" کو مقدر مانیں تو امر بالطاعۃ صرف مترفین کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ مترفین اور غیر مترفین سبھی کو عام ہے۔

جواب ٹھیک ہے امر بالطاعۃ عام ہے۔ مگر امراء ورؤساء کا صلاح وفساد رعیت کے صلاح وفساد کو مستلزم ہے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا۔ اور اس حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے "فساد الوالی فساد الرعیة وصلاح الوالی صلاح الرعیة" ہے۔ حکمران کی خرابی رعیت کی خرابی ہے اور حکمران کی درستگی رعیت کی درستگی ہے۔

سوال "مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ" (جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا ہی میں جتنا چاہیں گے اور جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دیدیں گے۔ پھر ہم اس کے لئے جہنم تجویز کریں گے) آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص زہد اختیار نہیں کریگا اور دنیا کو ترک نہیں کریگا وہ جہنمی ہے حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔

جواب آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے اسلام' اپنی عبادت و طاعت کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنائے گا۔ یعنی اسلام ہی دنیاوی غرض سے لائے' اور عبادت سے صرف دنیا مقصود ہو یہ

صفت کافر یا منافق کی ہے۔اس کے متعلق حضرت ابن جریرؒ فرماتے ہیں: یہ آیت آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے متعلق ہے' البتہ اتنی دنیا طلب کرنا کہ جس کے ذریعے سے آخرت کے لئے توشہ ہو مذموم نہیں ہوسکتا ہے ویسے بھی دنیا سے مکمل طور پر بے تعلق ہونا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔حتیٰ کہ انبیاء کرام کیلئے بھی: لہٰذا معلوم ہوا آیت کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا'' (اور آپ کے رب کی عطاء بند نہیں)۔حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بعض لوگوں کو دولتوں کے انبار عطاء کئے اور بعض ایک ایک دانے کو ترستے ہیں؟۔

جواب یہاں عطاء سے مراد رزق ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے نیک و فاجر اور مطیع وعاصی سبھی کو برابر رزق پہنچانے کا ذمہ لیا ہے۔۔کسی گناہگار سے اس کے گناہ کی وجہ سے رزق نہیں روکتے۔تو اصل رزق میں تفاوت نہیں فرماتے' تفاوت تو املاک کی مقدار میں ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کفار سے توفیق وہدایت کو روکا مگر رزق کو نہیں روکا اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اول رزق کو اس لئے نہیں روکا گیا کہ اگر رزق کو روکتے تو وہ ہلاک ہو جاتے اور قیامت کے دن اس کو حجت بنا کر کہتے: یا اللہ! اگر آپ ہمیں رزق دیتے تو ہم زندہ رہتے اور آپ پر ایمان لے آتے مگر ہمیں موقع ہی نہیں ملا۔

جواب ثانی اگر ان کے گناہوں کی پاداش میں رزق بند کر کے ان کو ہلاک کرتے تو سزا میں جلدی ہوتی جو اللہ کے اسم گرامی ''الحلیم'' کے خلاف ہوتا۔اس لئے کہ حلیم اسے کہتے ہیں اپنے نافرمان کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

جواب ثالث کھانے پینے سے منع کرنا خسیس قسم کے لوگوں اور بخیلوں کا کام ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بخل سے منزہ ہے اور پاک ہے' اور بعض نے یہ بھی کہا ہے تمام بندوں کو رزق دینا عدل ہے' اور اللہ تعالیٰ کا عدل عام ہے۔اور توفیق وہدایت عطاء فضل ہے' وہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عطاء فرمادے۔

سوال آیت: ''اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا'' (اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ایک ان میں سے یا دونوں)۔میں لفظ ''عِنْدَكَ'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ دونوں بڑھاپے میں اس کے گھر میں ہوتے ہیں اور اس پر ان کے نان ونفقہ کا بوجھ پڑتا ہے۔اس کے علاوہ ان کا کوئی کفالت کرنے والا نہیں ہوتا۔ اور بسا اوقات انتہائی بڑھاپے کی وجہ سے اس کو مشقت میں بھی ڈالتے ہیں۔اور یہ ان کی مشقت برداشت کرتا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ "لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی" (زنا کے قریب مت جاؤ) فرمایا: اور لا تزنوا (زنا مت کرو) نہیں فرمایا؟۔

جواب اگر صرف "لا تزنوا" فرماتا تو صرف زنا منع ہوتا۔ دواعی زنا اور اسبابِ زنا یعنی ہاتھ لگانے چومنے اور معانقہ وغیرہ کرنے سے نہی نہیں ہوتی اور جب "لَا تَقْرَبُو الزِّنٰی" فرمایا تو زنا اور مقدمات زنا دونوں سے نہی ہوگئی۔ اس لئے کہ مقدمات کا ارتکاب کرنا زنا کے قریب ہونا ہے۔

سوال "کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا" (یہ سارے کام تیرے رب کے نزدیک (بالکل) ناپسند ہیں) میں "ذٰلِکَ" کا مشارالیہ کیا ہے؟۔

جواب "وَقَضٰی رَبُّکَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ" سے لیکر اس آیت تک جتنے بھی منہیات بیان ہوئے ہیں وہ سب اس کا مشارالیہ ہیں۔ کل مذکور مشار الیہ نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں حسنات کا بھی تذکرہ ہے۔ امام ابوعلی نے فرمایا: "ذٰلِکَ" سے "لَا تَقْفُ" اور اس کے مابعد کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں کوئی بہتری نہیں ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ" (پاکی بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے)۔ لفظ "مَنْ" عام ہے جو تمام اہل زمین کو شامل ہے۔ اور اہلِ زمین میں کفار بھی شامل ہیں۔ اور تسبیح کہتے ہیں ہر اس چیز سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفت جلال وکمال کے شایان شان نہیں' جبکہ کافر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف بیوی' اولاد اور شریک وغیرہ منسوب کرتے ہیں تو (من فی الارض) کی تسبیح کہاں ہوئی؟۔

جواب اول "مَنْ فِیْھِنَّ" میں "ھُنَّ" کی ضمیر صرف سموات کی طرف لوٹ رہی ہے۔

جواب ثانی "ھُنَّ" کی ضمیر "السموات" اور "الارض" دونوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور آیت کا مطلب ہے "مَنْ فِیْھِنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ" (یعنی زمین وآسمان میں جو مومنین ہیں وہ تسبیح وتقدیس بیان کرتے ہیں) تو یہ عام بولکر خاص مراد لینے کی قبیل سے ہوگا۔ اس صورت میں تسبیح سے مراد زبانی پاکی بیان کرنا ہوگی۔

جواب ثالث اس تسبیح سے تسبیح قالی نہیں بلکہ تسبیح حالی مراد ہے۔ یعنی وہ تسبیح جو زبان حال سے ہو۔ تسبیح کہتے ہیں جو صانع کے وجود اس کی عظیم قدرت اور حکمت پر دلالت کرتی ہے گویا انسان زبانِ حال سے کہہ کر اس کا اظہار کرتا کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شی سے منزہ اور پاک ہے جو آپ کے شایانِ شان نہیں۔ اس جواب کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ" (

ہر چیز اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے) چنانچہ تمام موجودات کو شامل تسبیح، تسبیح حالی ہی ہے۔

سوال اگر تسبیح سے مراد زبانِ حال کی تسبیح ہے تو: "وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" (مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو) کیوں فرمایا؟ کیوں کہ زبانِ حال کی تسبیح ہمیں معلوم ہے اور ہم اس کو سمجھتے ہیں؟۔

جواب "وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" سے خطاب کفار کو ہے۔ وہ زبانِ حال سے تسبیح کرنے کے باوجود موجودات کی تسبیح کرنے کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور اللہ تعالیٰ کے بیوی بچے مان لئے تو معلوم ہوا کہ وہ موجودات کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہیں اور دلائل وحدانیت کو نہیں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

سوال "مَنْ فِيْهِنَّ" ملائکہ' جنات اور انسانوں اور جمادات وحیوانات سبھی کو شامل ہے۔ چنانچہ ملائکہ' جنات وانسان کی تسبیح زبانی حقیقی اور جمادات کی حالی ومجازی ہے۔ تو ایک لفظ "تُسَبِّحُ" سے معنیٰ حقیقی ومجازی ایک وقت میں مراد لینا کیسے درست ہوا؟۔

جواب تسبیح مجازی یعنی زبانِ حال سے تسبیح سبھی کو حاصل ہے لہٰذا اسی پر محمول کیا جائیگا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ" حالانکہ کلام عرب میں شائع زائع یہ ہے "دَعَا فَاستجاب لامره" یا کہتے فاستجاب بامره فاستجاب بحمده نہیں کہتے؟۔

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ "بحمده" سے بامره مراد ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں: جس وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو دوبارہ اٹھا کے بلائیں گے تو وہ مٹی جھاڑتے ہوئے اپنی قبور سے اٹھیں گے اور کہیں گے "سبحانك اللهم وبحمدك" اور بعض حضرات کے بقول "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ" کہتے ہوئے اٹھیں گے اس صورت میں "بحمده" میں "ب" "مع" کے معنیٰ میں ہوگا۔ جیسا کہ آیت: "تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ" اور آیت: "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ" میں دونوں جگہ "با" مع کے معنیٰ میں ہے۔

سوال "وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ" (تحقیق ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی) میں انبیاء کرام کا اجمالی تذکرہ کیا۔ پھر "وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا" کہہ کر خاص طور حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر فرمایا؟۔

جواب اول اس لئے کہ ان کے لئے جو چیزیں مجتمع فرمائی تھی کسی اور نبی کے لئے نہیں فرمائیں۔ مثلاً رسالت' کتابت' خطابت' خلافت' بادشاہت' قضا' وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَشَدَدْنَا

مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابَ ''(ہم نے ان کی حکومت کو مضبوط کیا اور عطاء کی ان کو حکمت اور فصل خطاب)۔

جواب ثانی ''وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ'' سے تمام انبیاء کرام پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی افضلیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور: ''وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا'' سے اس وجہ تفضیل کی طرف اشارہ ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کی امت خیر الامم ہے۔ اور یہ بات حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں لکھی ہوئی ہے۔ اور فرمان الٰہی: ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ'' عبادی الصالحون سے مراد محمد ﷺ اور ان کی امت ہے۔

سوال ''وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا'' میں زبور کو نکرہ اور آیت: ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ'' ''الزبور'' کو معرفہ لایا گیا کیوں؟۔

جواب اول ممکن ہے زبور ان اعلام میں سے ہو جو الف لام اور غیر الف لام دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں: جیسے العباس، الفضل، الحسن، الحسین وغیرہ۔

جواب ثانی یہاں نکرہ لانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد بعض الزبور یعنی بعض الکتب ہو۔

جواب ثالث یہاں ''زبور'' سے کل زبور مراد نہیں ہے۔ بلکہ زبور کا وہ حصہ مراد ہے جس میں آپ ﷺ کا ذکر مبارک آیا ہو اور اس حصے کو زبور کہنا تسمیۃ الجزء باسم الکل کے قبیل سے ہے یعنی جزء کو کل کا نام دیا گیا ہے۔ جیسا کہ بعض قرآن کو قرآن کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ'' اور ارشاد گرامی ہے۔: ''بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ'' میں القرآن سے سورۃ یوسف مراد ہے اسی طرح: ''وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ'' سے قرآن کا وہ حصہ مراد ہے جو فجر کی نماز میں پڑھا جائے۔

سوال ''فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا'' (وہ (بت) نہ تم سے تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا)۔

''فَلَا يَمْلِكُوْنَ'' کے بعد ''وَلَا تَحْوِيْلًا'' کی ضرورت نہیں اس لئے کہ جب نقصان و تکلیف کو دور کرنے پر قادر نہیں ہیں تو تحویل پر بھی قادر نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ تحویل کہتے ہیں۔ ایک چیز اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ فٹ کرنے کو۔ اور کشف الضر کسی چیز کے صرف ہٹانے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا جب محض ہٹانے پر قادر نہیں ہیں۔ تو ہٹا کر دوسری جگہ رکھنے پر بطریقہ اولیٰ قادر نہیں ہوں گے' اور آیت میں کشف الضر سے مراد مرض' قحط وغیرہ تکالیف کو ہٹانا ہے؟۔

جواب اصل میں لفظ تحویل کے دو معانی ہیں۔ ایک وہ جو اوپر سوال میں ذکر ہوا۔ دوسرا معنیٰ

تبدیل ہے۔ چنانچہ اہلِ عرب کہتے ہیں "حولتُ القمیص قباء" میں نے قمیص کو جبہ بنایا۔ "والفضة خاتما" چاندی کو انگوٹھی بنالیا۔ یہاں دوسرا معنی تبدیل کے معنی میں ہے۔ تبدیل سے یہاں مراد ہٹانا اور دور کرنا ہے۔ اور آیت میں جس (کشف) دور کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد تبدیل ہے اس لئے کہ جب مرض دور ہوگا تو اس کی جگہ صحت آئے گی۔ اور محتاجی دور ہوگی اس کے بدل خوشحالی ہوگی۔ اسی طرح تمام اضداد میں یہی ہوگا لہٰذا تحویل بولکر کشف (دور کرنا) مراد لیا گیا۔ البتہ اس سے کشف الضر مراد نہیں۔ بلکہ مطلق کشف (ہٹانا، دور کرنا) مراد ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ تکلیف کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی اور چیز کو۔ اسی وجہ سے وَلَا تَحْوِيلًا نہیں فرمایا گیا۔ اس جواب کو میں نے کسی کتاب سے حاصل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خزائن غیب سے میرے دل میں ڈالدیا۔

سوال "وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا" (اور ہم کو خاص فرمائشی معجزات کے بھیجنے سے صرف یہی بات مانع ہے کہ پہلے لوگ ان کی تکذیب کر چکے ہیں) اس میں نو سوالات ہیں۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ ارسال آیات کا ارادہ فرمادیں تو گذشتہ امتوں کی تکذیب اس کو کیسے روک سکتی ہے؟ اور اگر معجزات بھیجنے کا ارادہ نہ فرمائیں تو تکذیب وعدم تکذیب برابر ہے۔ تو عدم ارسال معجزات عدم ارادے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ تکذیب امم سابقہ کی وجہ سے؟

دوسرا سوال: لفظ "ارسال" مفعول کی طرف بنفسہٖ متعدی ہوتا ہے۔ کسی حرف جر کے واسطے نہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: "اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖۤ" میں "نوحًا" کی طرف بغیر واسطہ حرف جر کے متعدی ہے۔ تو آیت مذکورہ بالا میں "بالایات" میں باء کے ذریعے کیوں متعدی بنایا گیا؟

تیسرا سوال: یہاں آیت میں آیات (معجزات) سے مراد وہ تجاویز ہیں جو اہل مکہ نے آپ کے سامنے پیش کئے تھے یعنی صفا پہاڑ کو سونا بنا دینا۔ اور مکہ کے پہاڑوں کو ختم کر کے زراعت کے لئے قابل بنانا اور آسمان سے لکھی ہوئی کتاب نازل ہونا وغیرہ۔ اور یہ معجزات پہلی امتوں میں رونما نہیں ہوئے تھے اور نہ انہوں نے دیکھے تھے۔ تو جھٹلائے کیسے؟

چوتھا سوال: پہلوں کا معجزات کو جھٹلانا، بعد والوں کے لئے معجزات اتارنے میں مانع نہیں ہے۔ ممکن ہے بعد والے انکار نہ کریں اور مان لیں؟۔

پانچواں سوال: شروع آیت کا آخر آیت: "وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً" کے ساتھ کیا ربط ومناسبت ہے؟۔

چھٹا سوال: ناقہ کو وصف مبصرۃ کے ساتھ موصوف کرنے کا کیا مطلب ہے؟۔

ساتواں سوال: اور لفظ ظلم بھی بغیر حروف جر کے واسطے کے بنفسہ متعدی ہوتا ہے ارشادِ گرامی: "وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ" میں "يَظْلِمْ" "نَفْسَهٗ" کی طرف بغیر حرف جر کے متعدی ہوا ہے۔ آیت مذکورہ میں "فَظَلَمُوْا بِهَا" میں "با" کے ساتھ کیوں متعدی کر دیا گیا؟ یوں کیوں نہیں کہا گیا "فظلموھا"؟

آٹھواں سوال: فرمانِ الٰہی: "وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا" تو ارسال المعجزات پر دلالت کر رہا ہے اور ارشادِ گرامی: "وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ" عدم ارسال الایات پر دلالت کر رہا ہے تو بظاہر تعارض ہے؟

جوابات:

جواب ۱: آیت میں منع ترک ارسال آیات کے معنی میں ہے۔ یعنی کہ معجزات کے اظہار کو ترک کرنے کے معنی میں ہے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کو اس لئے ترک کیا گیا کہ اس سے پہلی امتیں معجزات آنے کے باوجود بھی رسولوں کی تکذیب کرتی رہیں۔

جواب ۲: "باء" لفظ ارسال کو مرسل بہ کی طرف متعدی کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ مرسل کی طرف۔ اس لئے کہ مرسل یہاں محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "ومنعنا ان نُرسل الرسل بالاٰیٰت" ارسال مُرسل کی طرف بنفسہ اور مرسل بہ کی طرف "باء" کے ذریعہ متعدی ہے کیونکہ یہ مرسل بہ کی طرف باء کے ساتھ اور مرسل الیہ کی طرف "الی" کے ذریعے متعدی ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت میں اس طرح آیا ہے جیسے: "وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ترجمہ (ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات (معجزات) اور واضح دلائل دے کر فرعون کے پاس بھیجا) دیکھئے اس آیت میں موسیٰ مرسل اور فرعون مرسل بہ اٰيٰتِنَا مُرْسَلٌ اِلَيْهِ" ہے تو موسیٰ کی طرف بنفسہٖ ایاتنا کی طرف بذریعہ باء اور فرعون کی طرف بذریعہ الی متعدی ہوا ہے۔

جواب ۳: "كَذَّبَ بِهَا" میں "ھا" ضمیر مجرور جنس آیاتِ مقترحہ کی طرف راجع ہے نہ کہ ان کی تجویز کردہ آیات (معجزات) کی طرف، گویا اللہ تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں۔ ان کے طلب کردہ معجزات کو ہم نے اس لئے کہ روکا کہ ان سے پہلی امتوں نے بھی معجزات کا مطالبہ کیا مگر آنے پر انکار کیا لہٰذا یہ بھی انکار کر دیں گے) چنانچہ پہلی امتوں نے نزول مائدہ (دستر خوان) اور اخ…

ناقہ وغیرہ کا مطالبہ کیا۔اور جب مطالبہ پورا ہوا تو انکار کرنے لگے۔

جواب ۴: اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ حضرات انبیاء سے معجزات کا مطالبہ کرنے والوں کے مطالبے اور رائے کے مطابق معجزات کا ظہور ہوا۔نہ ماننے پر فوراً ان کو عذاب میں مبتلا کر دیا' اور سب منکرین کو ہلاک کر ڈالا۔مگر اللہ تعالیٰ مشرکین مکہ کو فوراً ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ان کی اولاد اسلام کی دولت اور ایمان کی نعمت سے سرفراز ہوں گے۔یا عدم ارسال معجزات کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جن کی طرف محمد ﷺ مبعوث ہوئے وہ قیامت تک برقرار رہیں۔اگر ان کے طلب کردہ معجزے کا ظہور ہوتا اور وہ ایمان نہ لاتے تو ہلاک کر دیئے جاتے۔تو حکمت الٰہی کا تقاضا عدمِ اہلاک کا ہوا' لہٰذا معجزہ بھی ظاہر نہ کرایا گیا۔تو اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپؐ پر کفار کے طلب کردہ معجزے اس لئے ظاہر نہیں کئے گئے کہ پہلی امتوں نے مطالبہ کیا پھر معجزہ آنے پر انکار کیا اور ایمان نہیں لائے جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک کر دیئے گئے۔ اور اگر آپ کی قوم بھی انکار کرتی تو وہ بھی ہلاک کر دی جاتی۔

جواب ۵: آیت کے دونوں حصے آپس میں مربوط ہیں۔اس لئے کہ ان سے پہلے قوم صالح نے حضرت صالح علیہ السلام سے خاص قسم کی اونٹنی خاص جگہ سے برآمد کرنے کا مطالبہ کیا تھا چونکہ یہ مقام ان کے قریب ہے' ان کے آنے جانے کے راستے پر واقع ہے اور آتے جاتے دیکھتے ہیں لہٰذا اس سے عبرت پکڑنی چاہیے۔

جواب ۶: ''مُبْصِرَۃً'' دلالۃ کے معنی میں ہے۔بعض علماء نے کہا: مبصرۃ کا معنی مبصر بہا ہے۔ یعنی ناقہ کے ذریعہ بصیرت حاصل کی جائے۔

بقول بعض مبصرۃ کا معنی آلہ بصیرت ہے یعنی یہ ناقہ حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کے صحیح ہونے کو دکھاتی ہے۔اس قول کی تائید ''مبصرۃ'' ''بفتح المیم والصاد'' کی قراءت سے بھی ہوتی ہے۔

بعض نے کہا: مبصرۃ موصوف محذوف کی صفت ہے' ناقۃ کی نہیں ہے۔تقدیر عبارت یوں ہوگی ''آیۃ مبصرۃ'' یعنی واضح نشانی یا واضح معجزہ۔

جواب ۷: ''فَظَلَمُوْا بِهَا'' میں ''باء'' ظلم کو ناقۃ کی طرف متعدی کرنے کے لئے نہیں بلکہ آیت کا معنی یوں ہے۔''فظلموا انفسھم بقتل الناقہ'' ہے لہٰذا ظلم مفعول کی طرف بنفسہٖ متعدی ہے۔ بعض نے کہا یہاں ظلم کفر کے معنی میں ہے''فظلموا بھا'' کا معنی ہے کفروا بھا' جب ظلم کفر کے معنی کو متضمن ہوا۔تو باء کے ذریعے اس کو متعدی کرنا درست ہوا۔اس لئے کہ کفر کے صلہ میں

باء آتا ہے۔

جواب ۸: ''وما نرسل بالآیٰت الا تخویفًا'' میں ''آیات'' سے مراد کفار کے طلب کردہ معجزات نہیں ہیں بلکہ اس سے عبرت اور دلالت مراد ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ'' (اور جس درخت کی قرآن میں لعنت کی گئی ہے) حالانکہ قرآن کریم میں کسی درخت پر لعنت نہیں کی گئی ہے۔

جواب اول: یہاں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ الْمَذْكُوْرَةِ فِي الْقُرْاٰنِ''

جواب ثانی: اس درخت سے کھانے والے ملعون ہیں اور وہ کافر لوگ ہیں۔

جواب ثالث: ملعونہ کا معنی مذمومہ ہے۔ یعنی وہ درخت جس کی مذمت کی گئی ہے یہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: وہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ درخت ہے جس کی مذمت قرآن میں ان الفاظ سے کی گئی ہے: ''اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ'' (زقوم کا درخت گناہگاروں کا کھانا ہے) اور ''طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ'' سے مذمت کی گئی ہے۔

جواب رابع: اہل عرب ہر نقصان دہ اور ناپسندیدہ کھانے کو ملعون کہتے ہیں۔ قرآن میں اس درخت کے ضرر اور کراہت کا تذکرہ ہے۔

جواب خامس: لعنت کا لغوی معنی دور کرنے اور دھتکار دینے کے ہیں اور ملعون اس چیز کو کہتے جس کو اللہ کی رحمت سے دور کیا گیا ہو۔ اور جس شجر کو ملعون کہا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اترنے کی جگہ یعنی جنت سے کوسوں دور ہے یعنی وہ قعر جہنم میں ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ'' (وہ ایسا درخت ہے جو جہنم کے اندر نکلتا ہے) علامہ ابن الانباری نے فرمایا ہے: اس کو ملعون اس لئے کہا گیا کہ وہ اہلِ فضل کے مقام سے دور ہے۔

سوال: ''فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا'' (پھر جس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ تو ایسے لوگ اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جاوے گا) صرف اصحاب یمین کو اپنا نامہ اعمال پڑھنے ان کے ساتھ ذرا برابر ظلم نہ کئے جانے کے ساتھ مخصوص کیوں کیا گیا۔ حالانکہ اصحاب الشمال بھی اپنے نامہ اعمال پڑھیں گے اور ان کے ساتھ بھی ذرا برابر ظلم نہیں کیا جائیگا؟۔

جواب اول: اعمال نامہ پڑھنے کو صرف اصحاب الیمین (اہل جنت) کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا

کہ اصحاب الشمال (جہنمی) جب اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے تو اس میں موجود اپنی بداعمالیوں کو دیکھ کر شرمندہ اور خوف زدہ ہوں گے اور زبان بولنے سے قاصر ہوگی گویا ان کا پڑھنا نہ پڑھنے کی طرح ہے۔ جبکہ اہلِ جنت کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ یقینی طور پر وہ اپنی اپنی فائیلیں انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ پڑہیں گے۔ بلکہ صرف اپنے پڑھنے پر ہی اکتفا نہ کریں گے بلکہ دوسروں سے کہیں گے آؤ میرا نامہ اعمال پڑھ لو' اور آیت: ''لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا'' کا تعلق صرف اصحاب الیمین کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ تمام لوگوں کے بارے میں ہے۔

جواب ثانی یہ آیت ''لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا'' خاص اصحاب الیمین (اہل جنت) کے ساتھ متعلق ہے۔ ان کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا کہ وہ اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہرگز ظلم نہیں کیا جائیگا بخلاف جہنمیوں کے کیونکہ وہ بزعم خود یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ظلم ہوگا۔ اس جواب کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: ''وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا'' (جو شخص نیک عمل کرے اور وہ مؤمن ہو تو وہ ظلم اور ذلت کا خوف نہیں کریگا)

سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کیسے فرمایا: ''قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۤءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۤئِرَ'' (موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لئے (کافی) ذرائع ہیں)

حالانکہ فرعون ان کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس لئے اگر وہ جان چکا ہوتا تو حضرت موسیٰ پر ایمان لے آتا اور یوں نہ کہتا: ''اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا '' (اے موسیٰ میں تجھے مسحور سمجھتا ہوں) یا ساحر سمجھتا ہوں' علی اختلاف الاقوال۔ اور وہ سمجھ بھی کیسے سکتا تھا؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر مہر لگادی تھی۔ اور اس کو گمراہ کیا تھا۔ اور وہ ورشد و ہدایت سے کوسوں دور کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ علیہ اسکو'' عَلِمْتُ'' تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے'' واللہ ما علم عدو اللہ '' اللہ کی قسم دشمن خدا نہیں پہچان پایا تھا۔ موسیٰ ہی نے پہچان لیا تھا۔ چنانچہ امام کسائی اور ثعلب نے حضرت علیؓ کی قرءات کو اختیار کیا ہے؟

جواب آیت کا مطلب یہ ہے' کہ اے فرعون! اگر تو صحیح طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمالات پر غور کرتا اور دلائل و براہین کی طرف درست نظر کرتا تو یقیناً جان لیتا لیکن تو معاند ہے۔ اور میری تصدیق کی صورت میں تمہارا خدائی دعوی بھی ختم ہو جائیگا۔ اس لئے تو انکار کر رہا ہے۔ فرعون کو علم

ہونے کے باوجود اللہ نے ان کو گمراہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو حضرت علیؓ کی قراءت یعنی "علمت "ت" کے ضمہ کے ساتھ پڑھنے) کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس آیت کو بطور استدلال پیش کیا۔ "وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" ترجمہ: اس کا انکار کیا ان کے نفسوں نے ظلم اور تکبر کے ساتھ یقین کرلیا۔

سوال حضرت موسیٰؑ نے کیسے فرمایا: "وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا" (اور میرے خیال میں اے فرعون! ضرور تیری کمبختی کے دن آگئے ہیں) جبکہ حضرت موسیٰؑ یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ فرعون ہلاک ہوگا نہ صرف یہ کہ خیال وشک کے ساتھ۔

جواب اکثر مفسرین کی رائے کے مطابق "ظن" یہاں یقین کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں یقین کے معنی میں ہے: "اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ" (ان لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے) پھر سوال پیدا ہوتا کہ جب یہاں یقین مراد ہے تو یقین کا لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا "ظن" کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے حضرت موسیٰؑ نے ظن کا لفظ اس لئے لایا تاکہ فرعون کے "ظن" کے ساتھ معارض ہوجائے۔ گویا یوں فرمایا "ان ظننتنی مسحورا فانا ظننتك مثبورا" یعنی اگر تم مجھ کو مسحور خیال کرتا ہے میں تجھے ہلاک ہونے والا سمجھتا ہوں۔

سوال "يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا" اور "يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ" میں لفظ یخرّون کو مکرر کیوں لایا گیا؟۔

جواب اول اس لئے مکرر لایا گیا تاکہ فعل کے تکرار پر دلالت کرے۔

جواب ثانی اس لئے مکرر لایا گیا تاکہ دونوں حالتوں، حالت سجود اور حالت بکاء پر دلالت کرے۔

جواب ثالث پہلے یخرّون (سجدے میں گرنا) سماع قرآن وتلاوت کی حالت اور دوسرا یخرّون عام حالات کے متعلق ہے۔

سوال "وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا" (اور کہہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو نہیں رکھتا اولاد) تحمید کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے پر انعام کی بنا پر جیسا کہ آیت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ" اور آیت: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا" اور آیت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" میں تحمید کی گئی ہے۔ کہ ان میں ہمارے لئے بے شمار اور ان گنت منافع ہیں۔ لیکن اللہ کے لئے نہ ہونے میں ہمارے لئے کیا نعمتیں مضمر ہیں؟

جواب: اس میں بھی انسان کے لئے نعمت ہے۔ اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اولاد ہوتی تو اپنے بندوں پر نعمت اس وقت نازل فرماتے ہیں جب وہ نعمتیں اولاد سے بچ جائیں جب اہل وعیال نہیں تو ان کی تمام مہربانیاں اور ان کی عطاء وانعامات سب کی سب ان کے غلاموں کے لئے ہے۔

سورۃ الکہف

سوال: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا'' (تمام خوبیاں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی۔ بالکل استقامت کے ساتھ موصوف بنایا)۔

سوال یہ ہے کہ ''لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا'' (اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی) کے بعد قَيِّمًا (مستقیم) لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ جس میں کجی نہیں ہوگی وہ یقیناً سیدھا اور مستقیم ہوگا۔ ''قَيِّمًا'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟ یہاں عدم عوج سے مراد مضامین میں عدم اختلاف اور معانی میں عدم تعارض ہے اور قیما کا بھی یہی معنی ہے؟

جواب ثانی: امام فراء فرماتے ہیں: یہاں قَيِّمًا سے مراد قائما علی الکتب السماویہ کلھا ہے یعنی سابقہ تمام کتب سماویہ کے مضامین پر مشتمل۔ ان کی تصدیق کرنے والی اور ان کے صحیح ہونے کی تصدیق کرنے والی ہے۔ نیز ان کے بعض احکامات کو منسوخ کرنے والی ہے۔ اس صورت میں کوئی تکرار نہیں ہوگا۔ اور مشہور قول کے مطابق اس کو تاکید پر محمول کیا جائیگا۔

سوال: ''قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا مَالَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ'' (وہ کفار کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے لاڈ کچھ خبر نہیں ان کو اس بات کی نہ ان کے باپ دادوں کو)۔

کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ (ان کو کچھ خبر نہیں) یہ جب کہا جاتا ہے کہ جب شی موجود ہو۔ اور اس کے بارے کسی کو علم نہ ہو تو کہا جاتا ہے اس کو کچھ خبر نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا ہونا محال ہے، ناممکن ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بلند وبالا اور پاک ومنزہ ہے۔

جواب: آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو کسی چیز کا علم نہیں ہے۔ اس لئے اس کے محال ہونے کی وجہ سے جاننا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ بسا اوقات علم کی نسبت موصل الیہ کے طریق پر جہل کیطرف ہوتی ہے۔ اور کبھی اس تک رسائی کے محال ہونے کو بھی عدم علم سے تعبیر کرتے ہیں یعنی کوئی چیز فی نفسہ محال ہو۔ اس کی طرف علم کو منسوب کرنا درست نہ ہو اس کی طرف بھی جہل کی نسبت یعنی عدم علم کی اضافت ہوتی ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا" (پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ ہم معلوم کریں کہ کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدّت سے زیادہ واقف تھا) اللہ تعالیٰ کو تو پہلے سے معلوم تھا۔

جواب مطلب یہ ہے جیسا کہ ہم اس کو علم غیب کے ذریعے سے جانتے ہیں تو اسی طرح مشاہدۃً بھی جان لیں۔

سوال "فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ" (اب بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر اپنے اس شہر میں) فرمایا "واحد کم" نہیں فرمایا: وجہ؟۔

جواب اس لئے کہ انہوں نے کسی ایک کو متعین کر کے نہیں فرمایا بلکہ ان میں سے کسی ایک کو بھیجنے کا کہا۔ اگر "واحدکُم" کہتے تو اشارہ ہوتا کہ اپنے رئیس اور بڑے کو بھیجو۔ اس لئے کہ اہل عرب کسی قوم میں سے کسی فرد کو دیکھ کر کہتے ہیں "رایت احد القوم" میں نے قوم کا ایک فرد دیکھا۔ قوم کے رئیس یا کسی بڑے معظم روی کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ "رایت واحد القوم"۔

سوال اس مضمون میں "یقولون" تین دفعہ استعمال ہوا ہے مگر شروع فعل میں "سیقولون ثلاثۃ" میں سین استقبال کے ساتھ اور باقی دو میں بغیر سین کے استعمال ہوا ہے کیوں؟۔

جواب آخر کے دو فعلوں کو بمقتضاءِ عطف پہلے کے حکم میں مانا گیا ہے' اختصار کے لئے پہلے فعل کے سین پر اکتفاء کیا گیا جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ زید قد یخرج ویرکب۔

جواب "وَیَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ" (اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے) سوال یہ ہے اس سے پہلے جملوں میں "ثلاثۃ رابعھم' خمسۃ سادسھم" میں "واؤ" نہیں ہے اور بسابعۃ کے بعد وثامنھم میں واؤ بھی ہے۔ پہلوں جملوں میں کیوں نہیں؟

جواب یہ واؤ ثمانیۃ ہے' جس کا تذکرہ آپ نے سورۃ توبہ کے آخر میں پڑھا ہے۔ اور علامہ زجاجؒ کہتے ہیں: نکرہ کی صفت میں اس واؤ کا آنا نہ آنا برابر ہے۔ قرآنِ کریم میں دونوں طرح آیا ہے۔ ان کے علاوہ باقی علماء تفسیر فرماتے ہیں: پہلے جملوں میں بھی واؤ موجود ہے مگر محذوف ہے تخفیف کے لئے اور تیسرے جملے میں اس کو ظاہر کیا تا کہ شروع کے جملوں میں محذوف واؤ پر دلالت کرے۔ مگر اس قول پر یہ اشکال وارد ہوگا کہ اگر یہی بات ہے تو جملہ اولیٰ میں مذکور اور باقی جملوں میں محذوف ہونا چاہئے۔ تا کہ اول میں ذکر ثانی اور ثالث کے حذف پر دلالت کرے جیسے کہ پہلے سین استقبال میں گذرا۔

علامہ زمخشری اور بعض علماء فرماتے ہیں: یہ وہ واؤ ہے جو نکرہ کی صفت واقع ہونے والے جملے پر

داخل ہوتا ہے۔اور معرفہ سے حال واقع ہونے والی صفت پر آتا ہے جیسا کہ ''جاء نبی رجل ومعه آخر ''اور''مررت بزید وفی یده سیف ''اور فرمانِ الٰہی: ''وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ'' میں ''ولها'' کا واو بھی اسی قسم کا ہے۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ صفت کے موصوف کے ساتھ اتصال کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔اور یہ بتاتا ہے موصوف کا اس صفت کے ساتھ متصف ہونا امر واقع اور امر ثابت ہے۔اور آیت مذکورہ میں یہی واو بتاتا ہے کہ جن لوگوں نے ''سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ'' کہا وہ ثبات علم اور طمانیت نفس کے ساتھ کہا ہے۔محض اٹکل نہیں ہانکا ہے جیسا کہ دوسروں نے گمان اور اٹکل سے کام لیا ہے ان کے قول کے اٹکل اور ظن ہونے کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے جو ان کے قول بعد مذکور ہے یعنی رَجْمًاۢ بِالْغَيْبِ اور تیسرے قول کے بعد :''وَمَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ '' لایا گیا۔حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: واو قطع عدد کے لئے واقع ہوا ہے۔یعنی اس عدد کے بعد اور کوئی عدد مذکور نہیں جو پہلے بیان کردہ عدد کی نفی کرتا ہو۔اس سے ثابت ہوا۔کہ یہ اصحاب کہف کل سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔یہ قول درست اور قطعی ہے۔اور امام ثعلبی فرماتے ہیں۔یہ واو واوِ حکم اور واوِ تحقیق ہے۔گویا اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق لوگوں کے اختلاف کو بیان کیا۔اور سبعة میں کلام مکمل ہوا۔پھر نئے کلام سے بیان فرمایا آٹھواں ان کا کتا تھا۔تو آخری عدد کا ثبوت متحقق ہو گیا اس لئے کہ آٹھواں ساتویں کے بعد ہی ہوتا ہے۔اس تشریح کی رو سے: ''وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ''حقیقتہ یا تقدیراً اللہ کا کلام ہو سکتا ہے۔

اس واو کے بعد: ''قُلْ رَّبِّيْ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ ''اور فرمان باری تعالیٰ: ''مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ''بقاءِ ابہام اور التباس کے ختم نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ''(کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ'' تبدیل آیت بالا یت تبدیل کلمات کو مستلزم ہے۔تو بظاہر تعارض ہے؟۔

جواب اول پہلی آیت کا مطلب ہے قرآن کریم میں کوئی بشر تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔یہ قول نبی کریم ﷺ سے کفار کے اس مطالبے کے جواب میں فرمایا گیا۔''ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ''اور دوسری آیت کا مطلب ہے نسخ اور تبدیلی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی منافات اور تعارض نہیں ہے۔

سوال ''فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ''(سو جس کا جی چاہے ایمان لاوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے) اس آیت سے تو کفر کی اباحت ثابت ہوتی ہے؟۔

جواب اول حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: شاء کا فاعل محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے "فَمَنْ شَآءَ رَبُّكُمْ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ رَبُّكُمْ فَلْيَكْفُرْ" یعنی ایمان یا کفر اللہ کی مشیت سے ہے۔

جواب ثانی یہ تہدید اور وعید کے طور پر ہے۔

جواب ثالث آیت مطلب ہے کہ تم اپنے ایمان سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نفع اور کفر سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہو۔ تو یہ اظہار غنٰی ہے نہ کہ اباحتِ کفر۔

سوال دنیا میں مردوں کے لئے کنگن پہننا عیب ہے۔ یہی وجہ ہے سونا چاندی لینے والے مرد بھی کنگن نہیں پہنا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لئے ان الفاظ سے کنگن پہننے کا وعدہ کیسے فرمایا "يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ" (انہیں جنت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے)؟

جواب روم اور فارس کے بادشاہوں کی عادت تھی کہ وہ دوسروں سے خود کو ممتاز کرنے کے لئے کنگن اور تاج پہنا کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے اس کا وعدہ فرمایا: کہ یہ بھی آخرت کے بادشاہ ہیں۔

سوال "وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" پہلے جنت کو تثنیہ پھر اس آیت میں مفرد کیوں ذکر کیا گیا؟۔

جواب مفرد اس لئے لایا گیا تا کہ حصر پر دلالت کرے۔ مطلب یہ ہے۔ اپنی اس جنت (باغ) میں داخل ہو جس کے علاوہ اس کی کوئی جنت نہیں ہے۔ بس یہی دنیاوی جنت ہے۔ اس جنت میں اس کا کوئی حصہ نہیں جس کا متعلقین کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔ بس صرف وہی اس کی جنت ہے جس کا دنیا میں مالک بنا ہے۔ اور سابقہ ذکر کردہ جنتین سے کوئی معین جنت مراد نہیں بلکہ جنس جنت مراد ہے۔

سوال دو بھائیوں کے تذکرے میں مومن بھائی نے دوسرے کافر بھائی سے کہا: "لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا" (لیکن میں کہتا ہوں اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا) اس کلام میں اس بات کی تعریض ہے کہ اس کا بھائی شرک میں مبتلا ہوا۔ حالانکہ اس کے کلام سے شرک مترشح نہیں ہوتا البتہ محض کفر ثابت ہوتا ہے جو کہتا ہے: "وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً" (میرا خیال نہیں کہ قیامت قائم ہو جائے)

جواب الفاظ میں تو شرک نہیں البتہ اعتقاد کے لحاظ سے شرک کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے باغ کا پھلنا پھولنا بڑھنا محض اس کی محنت وقوت کا ثمرہ ہے۔ کسی اور طاقت کا اسمیں

کوئی عمل دخل نہیں ہے یہی وجہ ہے اس کے بھائی نے اس سے کہا: ''وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' (تم نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کیوں نہیں کہا) خود اس نے اپنے باغ کو دیکھ کر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا'' (اے کاش کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا) گویا اس نے شرک کا خود اعتراف کیا۔

سوال ''اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا'' (اگر تو دیکھتا ہے مجھ کو کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں)۔ سوال یہ ہے کہ ترنی انا میں یاءِ متکلم کے بعد ''انا'' لانے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس مقام پر ''اَنَا'' خبر کو مخبر عنہ میں محصور کرنے کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ: ''اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ'' اور ''اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ'' میں ہے اس کی مثالیں قرآنِ کریم میں بہت زیادہ ہیں۔

سوال مندرجہ ذیل آیات میں لفظ ''دُوْنَ'' کا کیا معنی ہے؟ ''وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' اور ''وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّیَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا'' اور: ''وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ'' ''وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ''۔

جواب لفظ ''دون'' کلام عرب میں غیر (علاوہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اہل عرب کہتے ہیں ''مال دون ہذا'' اور ''من دون ہذا'' یعنی غیر ہذا۔ جیسے آیت ''وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ'' (وہ اس کے علاوہ عمل کرتے ہیں) اور لفظ ''دون'' قبل (آگے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں ''المدينة دون مكه'' یعنی مدینہ مکہ سے آگے ہے۔

اور کہتے ہیں ''لا اقوم من مجلسي دون ان تجيء'' آپ کے آنے سے پہلے نہیں اٹھوں گا۔

''ولا افادقك دون ان تعطيني حقي'' اپنا حق لینے سے پہلے میں آپ سے جدا نہیں ہوں گا۔

البتہ لفظِ دون قبل (پہلے) کے معنی میں قرآنِ کریم میں استعمال نہیں ہوا، بلکہ صرف غیر (علاوہ) کے معنی میں استعمال ہوا۔

سوال ''هُنَالِكَ الْوَلَایَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ'' یعنی قیامت کے دن ولایت اللہ ہی کے لئے ہوگی ''ولایۃ'' واو کے کسرہ کے ساتھ بادشاہت کے معنی میں ہے۔ اور ''ولایۃ'' واو کے فتحہ کے ساتھ تولی ونصرت کے معنی میں ہے تو تولی ونصرت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے دنیا وآخرت دونوں میں جس کو چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کردے۔ جس کی چاہے مدد کرے جس کی چاہے مدد نہ کرے۔ تو یوم القيامة کی ولایت ونصرت کو خاص کرنے کا کیا فائدہ؟

جواب دنیا میں اس کے دعوے دار بہت سارے ہیں۔ قیامت کے دن یہ سب دعوے دار بھی

ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت بادشاہت صرف اللہ ہی کے لئے ہوگی کوئی مجازی بادشاہ نہیں ہوگا۔
اس سوال کی نظیر سورۃ انعام میں اس آیت کے تحت گذری ہے: "قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ"

سوال "هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا" (اسی کا ثواب سب سے اچھا ہے اور اسی کا نتیجہ سب سے اچھا ہے) اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ثواب دینے والا ہے ہی نہیں، پھر اللہ تعالیٰ کا ثواب سب سے اچھا ہونے کا کیا مطلب؟

جواب یہ علی سبیل الفرض والتقدیر ہے۔ مطلب یہ ہے: کہ بالفرض والمحال اگر اللہ کے علاوہ کوئی ثواب دے سکتا تب بھی اللہ تعالیٰ کا جزا و ثواب دینا اس سے اچھا ہوتا۔ اور اگر اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت جائز ہو جاتی تب بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت نتیجہ اور انجام کے لحاظ سے اس سے کئی گنا بہتر ہوتی۔

سوال "وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ" (اس دن کو یاد کرنا چاہئے جس دن ہم پہاڑ کو ہٹادیں گے اور آپ زمین دیکھیں گے کہ ایک کھلا میدان پڑا ہے۔ اور ہم ان سب کو جمع کر دیں گے)۔

سوال نُسَيِّرُ اور تَرَى کو صیغہ مضارع اور "حَشَرْنٰهُمْ" کو ماضی کے صیغے کے ساتھ کیوں تعبیر کیا گیا؟۔

جواب "حَشَرْنٰهُمْ" (ہم ان کو جمع کریں گے) کو ماضی لانے کی وجہ یہ ہے حشر پہاڑوں کے چلانے اور زمین کے میدان ہونے سے پہلے ہوگا۔ تاکہ سب لوگ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

سوال کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا"۔

جب کہ اللہ ہی نے بتایا ہے کہ کبائر سے اجتناب پر صغائر معاف ہونگے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
"اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ"

جواب اول پہلی آیت کفار کے متعلق ہے بدلیل آیت "فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ"
حضرت امام مجاہدؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں مجرمین سے مراد کفار ہیں۔ اور دوسری آیت سے مراد مؤمنین ہیں۔ اس لئے کہ کبائر سے اجتناب کفر کے ہوتے ہوئے نہیں ہو سکتا۔

جواب ثانی مجرمین سے مراد اگر مطلق گناہگار (مسلمان' کافر) ہوں تب بھی کوئی تعارض واقع نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ انسان کے تمام گناہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ لکھے جاتے ہوں۔ اور حشر میں اس کے سامنے پیش کر کے پھر معاف کردئے جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم کی نعمت کا مشاہدہ ہو۔ اس لئے کہ انسان اپنے اکثر گناہ کو بھول جاتا ہے۔

سوال ''وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ'' (جبکہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ جنات میں سے تھا)۔

یہ آیت تو دلالت کررہی ہے ابلیس کے جنات کی نسل سے ہونے پر اور دوسری آیت یعنی: ''وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ'' (اور یاد کرو اس وقت کو کہ ہم نے فرشتوں سے کہا۔ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا) سے معلوم ہوتا ہے ابلیس فرشتہ تھا۔ بظاہر دونوں آیات میں تعارض واقع ہوا؟۔

جواب اس میں دو قول ہیں۔ پہلا قول: یہ ہے کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے ابلیس حقیقۃً جنات میں سے تھا۔ اس لئے کہ ابلیس کی ذریت واولاد موجود ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے: ''اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ'' کیا تم مجھے چھوڑ کر ابلیس اور اسکی ذریت کو دوست بناتے ہو؟۔ اور ملائکہ کی ذریت واولاد نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ ابلیس جن تھا۔ جن ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ابلیس دنیا کا سب سے بڑا کافر اور سب سے بڑا فاسق ہے۔ جبکہ فرشتے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام رساں ہوتے ہیں۔ ان میں معصیت ونافرمانی کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ عقول مجردہ ہیں' خواہشات وشہوات سے خالی ہیں اور گناہ شہوات ہی کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: ''لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ'' (وہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ ان کو جو حکم دیا جاتا ہے اس کو کر گذرتے ہیں)

ایک اور جگہ ارشادِ گرامی ہے: ''وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ''

تو ابلیس اس پاکیزہ مخلوق میں سے کیسے ہوسکتا ہے کہ سجدے کا حکم دیا جائے اور انکار کرے لہٰذا معلوم ہوا کہ ابلیس فرشتوں کے قبیل سے نہیں تھا۔ یعنی مستثنیٰ' مستثنیٰ منہ کی جنس میں سے نہیں ہوگا اگر متصل ہو تو کہا جائے گا کہ جنس ماموریٰن بالسجود سے ہے نہ کہ جنس ملائکہ سے' تو اس صورت تقدیر

عبارت یوں ہوگی: ''وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ وَاِبْلِیْسَ اسْجُدُوْ لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ'' جیسا کہ یوں کہا جائے کہ ''امرت اخوتی وعبیدی هکذا فاطاعونی الا عبیدی'' میں نے اپنے بھائیوں اور غلاموں کو حکم دیا۔ انہوں نے میری بات مانی مگر غلاموں نے نہیں مانی' چنانچہ غلام بھائیوں میں داخل نہیں ہیں ہاں البتہ کام کرنے کے حکم میں شامل ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے: ابلیس نافرمانی کرنے سے پہلے فرشتہ تھا۔ جب نافرمانی کا ارتکاب کیا تو مسخ ہو کر شیطان بن گیا۔ لہٰذا حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول ''وَکَانَ مِنَ الْجِنِّ'' لمخالفته میں کان صارَ کے معنی میں ہوگا۔ یعنی ابلیس اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی پاداش میں 'جن' بن گیا اس قول کے مطابق ابلیس نافرمانی سے پہلے فرشتہ تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ بھی روایت کی گئی ہے۔ کہ ابلیس پہلے جنت کے خازنوں میں سے تھا۔ فرشتوں کی اس جماعت کو ''جن'' کہا جاتا تھا تو اس تفسیر کے مطابق ''کَانَ مِنَ الْجِنِّ'' کا مطلب ہوگا کہ ابلیس فرشتوں کی ''جن'' نامی جماعت کا فرد تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے فسق کیا۔ تو اس صورت میں مستثنیٰ متصل ہوگا۔

علامہ زمخشری سورۃ بقرۃ کی آیت ''فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ اس لئے کہ ہزاروں فرشتوں کے درمیان یہی ایک جن تھا ان میں گھرا ہوا تھا اور کثرت کا اعتبار کر کے اس کو بھی فرشتہ شمار کیا گیا۔ پھر فرمایا۔ یہ تعلیل محلِ نظر ہے۔ اس کے بعد فرمایا ممکن ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہو۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ'' اولیاء ولی کی جمع ہے اور ولی کہتے ہیں دوست احباب کو جو عدو کی ضد ہے' اور لوگوں میں سے کوئی بھی ابلیس کی ذریت کے ساتھ محبت نہیں کرتا' نہ وہی ان کے ساتھ دوستی کرتا ہے؟

جواب یہاں موالاۃ (دوستی) سے مراد شیطان کی اطاعت کرنا ہے' وہ برائی اور فحش کاموں کا حکم دیتا ہے۔ لوگ اس کی باتوں میں آ کر اس کی اطاعت کرتے ہیں گو اطاعت لازم دوستی ہے۔ یعنی جس سے دوستی ہو اس کی نافرمانی نہیں کی جاتی لہٰذا اطاعت کو مجازاً موالاۃ (دوستی) سے تعبیر کیا گیا۔

سوال فرمانِ الٰہی ہے: ''وَیَوْمَ یَقُوْلُ نَادُوْا شُرَکَآءِیَ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ'' (اور یاد کرو اس دن کو کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اپنے جن شرکاء کا دعویٰ کرتے تھے ان کو بلاؤ لیکن انہیں جواب نہیں دیا جائے گا)۔

جبکہ سورۃ نحل میں فرماتے ہیں: ''وَاِذَا رَاَی الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا شُرَکَآءَ ھُمْ قَالُوْا رَبَّنَا ھٰٓؤُلَآءِ شُرَکَآؤُ نَا الَّذِیْنَ کُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِکَ فَاَلْقَوْا اِلَیْھِمُ الْقَوْلَ اِنَّکُمْ لَکٰذِبُوْنَ '' پہلی آیت میں بتوں سے کلام کی نفی کی گئی ہے۔اور دوسری آیت میں ان کے لئے کلام ثابت کیا گیا ہے۔تو ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے؟۔

جواب اول الذکر آیت میں: ''نَادُوْا شُرَکَآءِ یَ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ'' سے مراد ہے شرکاء کو سفارش اور عذاب کو ہٹانے کے لئے پکارو' اور وہ (کفار) پکاریں گے اور شرکاء اس کا جواب نہیں دیں گے۔لہٰذا اس آیت میں ان سے کلام کو نفی کرنا اس اعتبار سے ہے۔یعنی نہ عذاب ہٹا سکیں گے اور نہ سفارش کر سکیں گے۔اور نہ جواب دیں گے۔اور سورۃ نحل والی آیت میں ان کے لئے جو کلام ثابت کیا گیا ہے وہ مشرکین کو دعوی عبادت میں جھٹلانے کے لئے ہے۔لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

سوال یہاں سورۃ کہف میں فرمایا شرکاء ی جبکہ سورۃ نحل میں شرکاء ھم (ان کے شرکاء) مذکور ہے؟

جواب ''شرکاء ی فی زعمکم واعتقادکم ''یعنی تمہارے زعم وگمان اور اعتقاد کے مطابق میرے شرکاء ہیں۔حقیقت میں نہیں' یہ بطور تہکم فرمایا گیا اور ''شرکاءھم'' سے ان کے وہ معبود مراد ہیں جن کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں اور جنہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

سوال ''نَسِیَا حُوْتَھُمَا'' (وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے) نسیان کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت یوشعؑ کی طرف کیوں منسوب کیا گیا حالانکہ مچھلی کو حضرت یوشع علیہ السلام نے بھولا تھا۔وہ خود فرماتے ہیں: ''فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ ''یعنی میں مچھلی کے قصے کو بھول گیا۔: ''وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَہ ''''اس کی یاد کو شیطان ہی نے بھلا دیا؟۔

جواب اول دونوں کی طرف نسیان کی نسبت مجازی ہے۔مراد اس سے حضرت یوشع علیہ السلام ہی ہیں۔امام فراء فرماتے ہیں۔اس کی نظیر قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ''یَخْرُجُ مِنْھُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ''ان دو دریاؤں (کھارے اور میٹھے) سے لؤلؤ اور مرجان نکلتے ہیں' حالانکہ یہ کھارے دریاء سے نکلتے۔میٹھے سے نہیں نکلتے ہیں مگر منسوب دونوں کی طرف کیا گیا۔

جواب ثانی حضرت موسیٰؑ مچھلی کے متعلق پوچھنا بھول گئے۔اور حضرت یوشعؑ مچھلی کے واقعے کو بتانا بھول گئے۔لہٰذا نسیان کی اضافت دونوں کی طرف کرنا صحیح ہے۔واقعہ اس طرح ہے کہ انہوں نے ایک مچھلی تل کر ایک تھیلے میں رکھ کر بطور زادِ سفر ساتھ لی' جب آبِ حیات کے پاس پہنچے' وہاں

تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئے حضرت موسیٰ کسی ضرورت کے لئے تھوڑا دور گئے۔ ادھر یوشعؑ نے اس پانی سے وضوء کیا۔ اس کے چھینٹے تلی ہوئی مچھلی پر پڑے، جس سے وہ زندہ ہو کر وہاں سے کھسک کر سمندر کے اندر چلی گئی۔ یوشعؑ یہ واقعہ بتانا اور موسیٰ اس مچھلی کے متعلق پوچھنا بھول گئے۔

سوال مذکورہ تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور یوشعؑ سے یا صرف یوشعؑ سے نسیان کا صدور مچھلی کے زندہ ہو کر دریا میں جانے کے بعد ہوا ہے۔ اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی کے زندہ ہونے سے قبل مجمع البحرین پہنچ کر وقوع نسیان ہوا تھا۔ چنانچہ فرمان باری ہے: ''فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا''

جواب آیت میں تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: ''فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا اتَّخَذَ الْحُوتَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا فَنَسِيَا حُوتَهُمَا'' یعنی جب وہ مجمع البحرین پر پہنچ گئے تو مچھلی دریا کو چیرتی ہوئی چلی گئی' ان کو یاد نہ رہا)۔

سوال حضرت یوشعؑ اس عجیب واقعے کو کیسے بھول گئے' حالانکہ یہ واقعہ یعنی مچھلی کا گم ہونا ہی حضرت خضر علیہ السلام کو پانے کی علامت قرار دیا گیا تھا اس جیسے واقعات کو نہیں بھولا جا سکتا۔ اگرچہ زمانہ دراز ہی کیوں نہ گذر جائے' پھر ان سے کیسے نسیان واقع ہوا ہے؟۔

جواب اس بھولنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام نے حضرت موسیٰ کے ساتھ رہ کر بہت سے عجیب وغریب واقعات خوارق عادت دیکھے تھے۔ اس وجہ سے اس واقعے کو سابقہ کی طرح ایک واقعہ سمجھا۔ اس لئے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

سوال ''حَتّٰى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا'' (یہاں تک کہ جب چڑھے کشتی میں اس کو پھاڑ ڈالا) میں جزا ''خرقہا'' کو ''بغیر فاء'' کے اور ''حَتّٰى اِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهٗ'' (یہاں تک کہ جب ملے ایک لڑکے سے تو اسے مار ڈالا) میں ''فقتلہ'' کو فاء کے ساتھ کیوں لایا گیا؟۔

جواب ''خرقہا'' مکمل جزاء شرط ہے۔ لہٰذا اس میں ''فاء'' لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور قتلہ جزاء نہیں۔ بلکہ شرط کا جز ہے۔ لہٰذا پہلے جز پر عطف کرنے کے لئے فاء عاطفہ لایا گیا۔ اور شرط کی جزاء ''قَالَ اقتلت الخ'' ہے۔

سوال لڑکے کو قتل کرنے کے واقعے میں حضرت موسیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا: ''لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا'' (بیشک تو نے کی ایک نامعقول چیز) اور کشتی توڑنے پر فرمایا: ''لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا'' (البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری) ایک جگہ ''نکرا'' اور ایک جگہ ''امرا'' کیوں فرمایا؟۔

جواب بعض علماء نے کہا ہے کہ "امرا" "نکرا" کا ہم معنی ہے۔لہٰذا دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔دونوں کا معنی ایک ہے۔

اور بعض نے کہا "الامر" عجیب اور خوفناک کام کو کہتے ہیں۔کشتی کو توڑنا قتل غلام سے بڑھ کر قتل ہے۔اس لئے کہ قتل غلام میں ایک فرد کا قتل اور تخریب سفینہ میں بہت سوں کا قتل ہے۔اس لئے "امرا" استعمال کیا۔لیکن کچھ علماء کی رائے اس کے برخلاف ہے۔یعنی وہ کہتے ہیں "الامر" کے مقابلے میں "النکر" زیادہ عظمت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا قتل غلام کے لئے "نکرا" اور تخریب سفینہ کے لئے "امرا" استعمال کیا' اس لئے کہ قتل غلام کا کوئی تدارک نہیں ہوسکتا۔اور کشتی کے خرق (سوراخ) کو بند کرنا ممکن تھا۔

سوال کشتی کے واقعے میں: "اَلَمْ اَقُلْ اِنَّکَ" (بولا میں نے نہ کہا تھا تو نہ ٹھہر سکے گا) فرمایا' اور لڑکے قتل کے متعلق: "اَلَمْ اَقُلْ لَّکَ" (میں نے تجھ کو نہ کہا تھا) فرمایا کیوں؟

جواب دوسری مرتبہ وصیت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے متنبہ کرنے کے لئے "اِنَّ" تاکید کا کلمہ اختیار کیا گیا۔اور بار بار بے صبری سے پوچھنے پر تنبیہ کے لئے ایسا کیا گیا۔

سوال "اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا" "بستی والوں سے کھانا طلب کیا"

ماقبل آیت میں اہل کا ذکر آیا ہے تو اس کو دوبارہ ذکر کرنے کے بجائے ضمیر لائی جاتی جیسا کہ عام اصول ہے۔تو ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کیوں لایا گیا؟ کہا جاتا "اِسْتَطْعَمَاهُمْ"۔

جواب اہل کو دوبارہ ذکر کرنا محض تاکید کے لئے ہے۔

سوال فرمانِ الٰہی ہے: "يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ" "دیوار گرنا چاہ رہی تھی" میں چاہنے کو دیوار کی طرف کیوں منسوب کیا گیا' چاہنا' ارادہ کرنا ذی روح کا فعل ہے نہ کہ جماد کا؟۔

جواب دیوار کی طرف ارادے کی نسبت مجازاً ہے' جب کہ بالکل آخری حالت میں دیکھا گویا آپ گر رہی ہے تو گویا وہ گرنا چاہتی ہے۔اہلِ عرب عقلاء کے افعال کو مالا یعقل کی طرف بطور مجاز منسوب کیا کرتے ہیں۔جیسا کہ کسی شاعر کا قول ہے۔شعر:

يريد الرمح صدر ابي براء ☆ ويعدل عن دماء بني عقيل

(نیزہ براء کے سینے میں لگنا چاہتا ہے اور بنو عقیل کے خون سے عدول کرتا ہے)

حضرت حسن بن ثابتؓ فرماتے ہیں۔

ان دهراً يلف شملي بحمل ☆ لزمانٍ يهمّ بالاحسان

قرآن کریم میں اس کی مثال: "لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ"

جب موسیٰ کا جوشِ غضب ٹھنڈا ہوا (دوسری مثال) ''قَالَتَا اَتَیْنَا طَائِعِیْنَ''

سوال حضرت خضر علیہ السلام نے پہلے اور دوسرے سوال پر حضرت موسیٰؑ سے جدائی اختیار کیوں نہیں کی۔ تیسرے سوال پر کیوں جدا ہوئے؟۔

جواب اس کی دو وجہیں ہیں: پہلی وجہ یہ ہے: کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ تین اعتراضات تک ساتھ رکھیں اس کے بعد جدائی کا وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام راضی تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے: کہ پہلا اور دوسرا اعتراض تورع اور دینی صلاحیت کی بنا پر تھا۔ جبکہ تیسرا اعتراض اپنی خواہش یعنی کھانا طلب کرنے اور پیٹ کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے تھا اس لئے اس کے بعد جدائی اختیار کی۔

سوال ''وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ'' (ذوالقرنین کو سورج ایک سیاہ پانی میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا)۔ سورج زمین سے ایک سو ساٹھ گنا' ایک قول کے مطابق ایک سو پچاس گنا اور تیسرے قول کے مطابق ایک سو بیس گنا بڑا ہے' تو زمین کے ایک چشمے میں ایسی وسعت کہاں کہ سورج اس میں غروب ہو جائے؟

جواب اللہ تعالیٰ کا قول: ''وجدھا'' (سورج کو پایا) کا مطلب ہے: ''وَجَدَهَا فِیْ زَعْمِهٖ وَظَنِّهٖ'' یعنی اپنے گمان و زعم کے مطابق غروب ہوتا ہوا پایا' یعنی درحقیقت سورج اس میں غروب نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ذولقرنین کی نظر اور دانست میں ایسا لگ رہا تھا۔ جیسا کہ سمندر میں سفر کرنے والا اگر سمندر کے وسط میں جائے' اور آس پاس کے ساحل نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو سورج کو سمندر سے طلوع اور سمندر ہی میں غروب ہوتا دیکھے گا۔ اسی طرح ذوالقرنین چلتے چلتے مغرب تک پہنچ گئے وہاں ایک عظیم چشمہ پایا۔ اور دیکھا گویا سورج اس میں غروب ہو رہا ہے۔

سوال ذوالقرنین علی اختلاف الاقوال' نبی' مردِ صالح یا حکیم ہیں۔ ایسے عظیم آدمی پر سورج کے غروب ہونے کا معاملہ کیسے مشتبہ ہوا۔ حتیٰ کہ عقلاً ایک محال و مستحیل چیز (سورج کا زمین کے چشمے میں غروب ہونے) کا گمان کرنے لگے۔

جواب اول انبیاء' اولیاء اور دانا لوگوں کے گمان بھی کبھی غلط ہوتے ہیں۔ اگرچہ انبیاء گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ دیکھئے حضرت موسیٰؑ نے تینوں واقعات میں حضرت خضرؑ پر نکیر فرمائی۔

جواب ثانی اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں بڑے سے بڑے جسم کو چھوٹا کر سکتے ہیں۔ اور سورج کے عظیم جسم کو چھوٹا کر کے زمین کو وسعت دینے پر قادر ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سورج کو سکیڑ کر زمین میں غروب کر دیں۔ اور ہمیں اس کا ادراک نہ ہو۔

سوال ''قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّا اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّا اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا'' (ہم نے کہا اے ذوالقرنین یا تو تو لوگوں کو تکلیف دے اور یا رکھ ان میں خوبی) یہ آیت ذوالقرنین کے نبی ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب کیا۔

جواب جو لوگ ان کی نبوت کے قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں۔ یہ خطاب اس وقت کے نبی کے واسطے سے کیا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے ''یابنی اسرائیل'' وغیرہ بنی اسرائیل کو یہ خطاب وقت کے نبی کی وساطت سے ہے۔

سوال کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا'' (قیامت کے دن ہم ان کے لئے ترازو مقرر نہیں کریں گے) یعنی ہم کفار کے اعمال کو تولنے کے لئے ترازو مقرر نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ ترازو اعمال کو وزن کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کافروں کے افعال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ مگر دوسری آیت میں فرماتے ہیں: ''وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ''۔

اس آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے اعمال وزن کئے جائیں گے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض واقع ہوا تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب پہلی آیت کفار کے متعلق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال کی ہمارے یہاں کچھ قدر و منزلت نہ ہوگی۔ جبکہ دوسری آیت ان مؤمنین کے متعلق ہے جن کی سیئات (برائیاں) ان کی حسنات (نیکیوں) سے زیادہ ہوں۔ ان سیئات کی پاداش میں وہ جہنم میں داخل ہوں گے مگر ہمیشہ اس میں نہیں رہیں گے۔ سزا بھگتنے کے بعد اس سے خلاصی پا کر جنت میں داخل ہوں گے۔ لہٰذ کچھ تعارض نہ رہا۔

سورۃ مریم

سوال ''اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا'' (جس وقت کہ انہوں نے اپنے پروردگار کو آہستہ آواز میں پکارا)۔ ''نداء'' کہتے ہیں آوازِ بلند کو چیخ کر بلانے کو۔ تو اس کی صفت ''خفیا'' آہستہ کیسے آسکتی ہے؟

جواب نداء یہاں دعاء کے معنی میں ہے' اور دعا کو آہستہ اس لئے کیا۔ تا کہ اخلاص کے قریب تر ہو جائے۔ یا اس لئے آہستہ دعاء کی' کہ لوگ انہیں ملامت نہ کریں کہ اتنے بوڑھے ہو کر اولاد کی دعا کرتے ہیں' یا اس لئے دھیمی آواز میں دعاء کی کہ ان کے بنو الاعمام نہ سن سکیں۔ اور ان کے ساتھ

دشمنی کرنے لگیں کہ یہ اس لئے بیٹے کی دعا کر رہے ہیں کہ کہیں ان کے بعد ہم ان کے قائم مقام یعنی نائب نہ بن جائیں۔

سوال کیسے فرمایا: ''یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ'' جو میرا بھی وارث ہو اور اولاد یعقوب کا بھی وارث ہو' جب کہ نبی وراثت نہیں چھوڑتا۔ فرمان رسول ﷺ ہے۔ ''نحن معاشر الانبیاء لا نورث 'ماتر کناہ صدقۃ'' ہم انبیاء کی جماعت مال نہیں چھوڑتی' جو کچھ ہم چھوڑیں گے وہ صدقہ ہے''؟

جواب یہاں ''وراثت'' سے مراد وراثت مال نہیں۔ بلکہ وراثت علم و نبوت مراد ہے' اور ''یرث من ال یعقوب'' سے مراد ملک ہے' بعض نے کہا اخلاق فاضلہ مراد ہیں اور آپ ﷺ کا قول مبارک ''لا نورث'' کا مطلب ہم مال بطور میراث نہیں چھوڑتے اگلا جملہ ''ماتر کناہ صدقۃ'' سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور ''یعقوب'' سے حضرت یعقوب علیہ السلام مراد ہیں۔ بعض نے کہا: یعقوب سے حضرت یوسف علیہ السلام کے والد مراد نہیں بلکہ اس سے مراد حضرت ذکریاؑ کے برادر ہیں۔

سوال ''یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ'' (میرا وارث بنے اور یعقوب کے خاندان کا وارث بنے) یَرِثُنِیْ کو مفعول کی طرف بلا واسطہ حرف جر کے اور دوسرے یرث کو ''من'' کے ساتھ متعدی کیا گیا۔ حالانکہ دونوں ایک ہی ہیں دونوں کو بنفسہٖ متعدی ہونا چاہئے۔ یا دونوں متعدی بواسطہ حرف جر کو ہونا چاہئے؟

جواب ''وَرِثَ'' میں دونوں لغت ہیں۔ دونوں لغتوں کو جمع کیا گیا۔ بعض نے کہا: 'من' یہاں تعدیہ کے لئے نہیں بلکہ تبعیض کے لئے ہے اس لئے کہ اولاد یعقوبؑ سب کے سب انبیاء نہیں تھے۔

سوال حضرت زکریا علیہ السلام نے: ''فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا'' سے ولدِ صالح کی دعاء کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے بچے کی خوشخبری ان الفاظ میں دی: ''یٰزَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ نِ اسْمُہٗ یَحْیٰی'' (اے زکریا ہم تمہیں ایک لڑکے جسکا نام یحییٰ ہے کی خوشخبری دیتے ہیں) تو اس کو مستبعد سمجھا اور تعجب کر کے کہا: ''اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ'' میرے لئے بچہ کیسے ہوگا؟ ایسا کیوں ہے۔

جواب اول حضرت زکریا علیہ السلام کا یہ پوچھنا: بطور انکار و استبعاد کے نہیں بلکہ مزید اطمینان وایقان کے لئے تھا۔ ورنہ حضرت زکریا علیہ السلام کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اسباب سے مستغنی ہے۔ یعنی اسباب کے بغیر پیدا کرنے پر قادر ہے۔ سوال بچے کی پیدائش کی کیفیت کے بارے میں پوچھا کہ پیدائش کی صورت کیا ہوگی۔ بچہ پیدا ہونے نہ ہونے میں تردد نہیں تھا۔

جواب ثانی یہ سوال تعجب سرور و فرحت کی بنا پر تھا۔ نہ کہ تعجب استبعاد وانکار کے طریقے پر۔

سوال ''رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ اٰیَۃً'' (اے اللہ میرے لئے کوئی نشانی وعلامت بنا دے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے بچے کی خوشخبری ملنے کے بعد علامت کو طلب کیا' کیا اس میں شک تھا؟۔

جواب حمل کی علامت اس لئے طلب کی تا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کی طرف جلدی کریں' اور جلدی خوشی نصیب ہو۔ اس لئے کہ ابتدائی مراحل میں حمل کا پتہ نہیں چلتا۔ کافی مدت گزرنے کے بعد حمل کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لئے حمل ٹھہرنے کی علامت معلوم کرنا چاہا تا کہ خوشی کا ادراک جلدی ہو جائے۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کی علامت یہ ہے کہ تم تین دن بات چیت نہ کر سکو گے۔

سوال ''اِنِّیْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا'' (کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو مرد متقی ہے) حضرت مریمؑ نے یہ کیوں کہا۔ میں تجھ سے پناہ مانگتی ہوں پناہ تو فاسق سے مانگی جاتی ہے نہ کہ متقی سے؟۔

جواب اول مطلب یہ ہے کہ اگر تو ان لوگوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں تو میرے قریب آنے سے باز رہ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں حضرت مریمؑ کے زمانے میں ایک آدمی تھا۔ اس کا نام تقی تھا۔ مگر وہ متقی نہ تھا۔ بلکہ فاجر تھا۔ جبرائیل کو دیکھ حضرت مریمؑ یہ سمجھیں کہ یہ وہ شخص ''تقی'' ہے اس لئے اس سے پناہ مانگی۔ مگر محققین کے نزدیک پہلا قول ہی درست ہے۔

جواب ثانی بعضوں نے کہا: یہ مبالغہ کے طور پر ہے' مطلب یہ ہے۔ اگر تو متقی ہے تو تجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔ اگر تو متقی نہیں ہے تو قریب ہونا کیسے ممکن ہے۔ اس کی نظیر وہ حدیث ہے' جس میں فرمایا گیا: ''نعم العبد صھیب' لولم یخف اللہ لم یعصہ'' صہیب بہت اچھا بندہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے نہ بھی ڈرتا تو بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرتا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر نہ بھی ہوتا تب بھی نافرمانی نہ کرتا۔ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی صورت میں کیا حال ہوگا۔ کیسے نافرمانی ہوگی۔ اور ''ابورجاء'' اور ابن مسعودؓ کی قراءت میں: ''الا اَنْ تَكُوْنَ تَقِیًّا'' ہے۔

سوال تمام علماء کرام کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ کسی عورت پر وحی نازل نہیں ہوئی' اور نہ کسی عورت کے پاس حضرت جبریلؑ کو رسالت دیکر بھیجا گیا ہے۔ اسی وجہ سے آیت: '' وَاَوْحَیْنَا اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ''میں وحی کو وحی الہام پر محمول کیا ہے۔ بعض نے وحی منام کہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا وَقَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ'' (ہم نے جبریلؑ کو ان

(مریمؑ) کے پاس بھیجا۔ اور اس نے کہا: میں تیرے رب کا رسول ہوں)۔

جواب ہم کبھی بھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ کسی عورت کے پاس کوئی وحی آئی ہی نہیں ہے حضرت مقاتلؒ نے فرمان الٰہی: ''وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ'' کے متعلق فرمایا ہے۔ یہ وحی حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے سے تھی۔ علماء کرام کے درمیان متفق علیہ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کسی عورت کے پاس پیغمبری کی وحی لیکر نہیں آئے۔ مطلق وحی کی نفی نہیں ہے۔ یہاں جبرئیلؑ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس رسالت کی وحی لیکر نہیں بلکہ بیٹے کی بشارت کی وحی لیکر آئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی صورت میں تشریف لائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا'' (پس وہ پورا بن کر مریم کے سامنے نمودار ہوا)۔

سوال ''لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا'' (تا کہ تجھ کو پاک اور پاکیزہ لڑکا عطا کروں)۔ حضرت جبریلؑ نے کیسے فرمایا کہ میں تجھ کو پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔ حالانکہ عطاء اور ہبہ کرنے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں جبریلؑ نے عطاء کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔

جواب اول ابن الانباریؒ نے کہا: آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں تیرے رب کا یہ پیغام لیکر آیا ہوں۔ کہ میں تجھ کو ایک بچہ عطاء کرنے والا ہوں۔ چنانچہ اس صورت میں عطاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہوتی ہے۔ جبریلؑ محض اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو لانے والے ہیں۔

جواب ثانی حضرت جبریلؑ کی طرف عطاء کی نسبت بطور سبب کے مجازاً ہے۔ یعنی تیرے گریبان میں پھونکر اس بچے کی پیدائش کا سبب بنوں)۔

سوال ''قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا'' (مریمؑ نے کہا: میرے لڑکا کہاں سے ہوگا اور مجھ کو تو کسی آدمی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اور نہ تھی میں کبھی بدکار) حضرت مریم علیہا السلام نے اپنے لئے مذکر کا صیغہ بغیا کیوں استعمال کیا۔ قاعدے کی رو سے ''بَغِيَّةً'' ہونا چاہیے۔

جواب ابن الانباریؒ کہتے ہیں: یہ وصف عورتوں کے لئے اکثر استعمال ہوتا ہے اہلِ عرب رجل بغی بہت کم کہتے ہیں۔ تانیث کی علامت اس کے ساتھ نہیں لگاتے۔ جیسے لفظ حامل، حائض، عاقر وغیرہ الفاظ عورتوں ہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ علامت تانیث نہیں لگائی جاتی۔

امام الازہریؒ نے تو یہاں تک کہا ہے۔ کہ یہ لفظ ''بغیا'' مؤنث کے ساتھ مختص ہے، اور اس کا لام کلمہ ''ی'' ہے۔ کہا جاتا ہے ''بَغَتْ تَبْغِيْ'' امام مبردؒ کے نزدیک یہ فعول کے وزن پر ہے۔ اصل

میں بغوی تھا۔ واو کو یاء میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اور یاء کو یاء میں مدغم کیا ہے۔ اور ی کی وجہ سے غین کو کسرہ دیا گیا ہے۔ اور فعول کے صیغے کے ساتھ تانیث نہیں آتا۔ یہ صیغہ مذکر مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لفظ صبور اور شکور ہے۔ اور "ابن جنیؒ" اپنی کتاب 'التمام' میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں: فعیل کے وزن پر ہے۔ اگر فعول کے وزن پر ہوتا۔ تو بغو ہوتا اور اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی: "اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ" میں "قریب" اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے کہا۔ بغیۃ اس لئے نہیں ہی لایا گیا تاکہ دوسری آیات کے اواخر کی رعایت ہو۔

سوال "يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا" (کاش کہ میں اس حالت سے پہلے مرجاتی اور بھولی بھلائی ہو جاتی) سوال یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا یہ غم و حزن کس وجہ سے تھا؟ کیا بے سر و سامانی اور عدم دستیابی اشیاء ضرورت کی وجہ سے تھا یا بدنامی اور تہمت لگائے جانے کے ڈر سے تھا؟۔

جواب ان کی پریشانی دونوں وجہوں سے تھی۔ ایک تو تہمت کا خوف۔ دوسرا وہ مقام ایسا تھا' کہ وہاں نہ کھانے پینے کی اشیاء تھی اور نہ پینے اور پاکی حاصل کرنے کیلئے کوئی پانی کا نام و نشان۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا اس خشک زمین میں جہاں پانی کا تصور ہی نہ تھا۔ نہر جاری کرنا اور خشک درخت سے تازی کھجوریں لانا دونوں غموں کو دور کرنے کا باعث بنا۔ دونوں پریشانیوں کو ختم کر دیا۔ خوراک اور پانی کے غم کا دور ہونا تو واضح ہے' البتہ تہمت کا خوف اس طرح دور ہوا۔ کہ دونوں معجزے ہیں خشک وادی سے چشمہ کا جاری ہونا۔ اور خشک درخت پر تازی کھجوریں لگنا دونوں حیرت انگیز معجزے ہیں۔ جو حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت و عفت و پاکبازی پر دلالت کر رہے ہیں جو خشک درخت سے تازہ پھل' خشک وادی سے پانی جاری کر سکتا ہے۔ وہ بغیر مرد کے بچہ بھی دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب پر قادر ہے۔

سوال "فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا فَقُوۡلِىۡۤ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا" (پس اے مریم! اگر تو اس کے بعد کسی آدمی کو دیکھے تو کچھ نہ بولنا (بلکہ) یہ کہہ دینا۔ کہ میں نے رحمٰن کے واسطے روزہ کی نذر کی ہے۔ سو اس وجہ سے میں آج کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی)۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو نہ بولنے کی نذر کی حالت میں "فَقُوۡلِىۡۤ" (کہہ دو) کہہ کر بولنے کا حکم کیوں دیا؟۔

جواب جبریلؑ نے اس قول کا حکم اس لئے دیا۔ کہ یہ ان کی نذر تمام نذر ہے اس لئے کہ حضرت مریمؑ کو مطلق سکوت کی نذر ماننے کا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ جسمیں زبان ہلے ہی نہ۔ حتی کہ ذکر' تسبیح' دعاء وغیرہ تک نہ ہو۔ بلکہ صرف کسی انسان سے بات چیت نہ کرنے کی نذر تھی۔ جب نذر کی تکمیل سے اس قول "فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا" سے ہوئی تو اس کے بعد کسی انسان سے بات نہ کرنے کی نذر شروع ہوئی۔

سوال "قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا" (وہ لوگ بولے کہ ہم اس بچہ سے کیسے بات کریں جو ابھی ماں کی گود میں بچہ ہے) اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا "ماں کی گود میں بچہ ہے" ہر ایک گود میں بچہ ہی ہوتا ہے؟۔

جواب لفظ "کان" یہاں زائد ہے۔ اور "صبیا" حال ہونے کی وجہ سے حال واقع ہے' خبر ہونے کی وجہ سے نہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ "كيف نكلم من في المهد في حال صباه" اور بعض نے کہا: یہاں "كَانَ" "وَقَعَ اور وَجَدَ کے معنی میں ہے اور "صَبِيًّا" حال ہے۔

سوال خطاب تکلیف (ماموارت کا حکم' منہیات سے منع) تمام شرائع میں بالغ ہونے کے بعد یا کم از کم ماموارت کی بجا آوری پر قدرت اور سمجھ بوجھ کے بعد ہوتا ہے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گود میں دودھ پیتے ہیں ان کو نماز اور زکوۃ کا حکم کیسے دیا گیا جس کا تذکرہ فرماتے ہیں: "وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا" (اور تاکید کی گئی مجھ کو نماز کی اور زکوۃ کی جب تک میں جیتا رہوں)۔

جواب بلوغ تک خطاب کو مؤخر کرنا حصول عقل کے بعد حکم دینے کے لئے ہے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہلے ہی اس صفت سے متصف ہیں۔ تو ان کو حکم ہوا کہ ان افعال پر اگر قادر ہیں تو ان کو بجا لائیں۔ بعض لوگوں نے کہا: یہی وجہ ہے کہ ان کو نبوت بچپن میں ملی۔

سوال زکوۃ تو اغنیاء پر واجب ہے۔ جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تک زمین میں رہے ہیں فقیر (بے مال) رہے ہیں۔ اور ان کی یہ حالت اللہ تعالیٰ کو معلوم تھی۔ اس کے باجود زکوۃ دینے کا حکم انہیں کیوں دیا گیا؟۔

جواب یہاں زکوۃ سے مراد زکوۃ مال نہیں ہے۔ بلکہ تزکیۂ نفس مراد ہے۔

سوال "وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا" (سلامتی ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں قبر سے زندہ اٹھایا جاؤں گا)۔ کیا وجہ ہے لفظ "سلام" حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قصے میں نکرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے میں

معرفہ لایا گیا ہے؟۔

جواب اول بقول بعض ان جیسے الفاظ میں معرفہ اور نکرہ برابر ہوتے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

جواب ثانی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قصے میں چونکہ پہلے لفظ ''سلام'' کا تذکرہ آیا بطور نکرہ کے تھا۔اس لئے دوبارہ معرفہ لایا گیا۔ جو اصول اور قاعدہ ہے۔جیسا کہ اس آیت میں ہے: ''كَمَآ اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ'' دیکھیے اس آیت میں بھی دوسرا ''لفظ رسول معرفہ آیا ہے۔

سوال لفظ اسلام میں الف لام عہدی کیسے ہے حالانکہ پہلا سلام یحییٰؑ پر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور دوسرا اسلام عیسیٰؑ پر ہے خود انکی اپنی طرف سے؟۔

جواب لفظ ''اَلسَّلٰمُ'' کا معرفہ ہونا ماہیت سلام کے اعتبار سے ہے۔نہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہونے کے اعتبار سے۔

سوال ''وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ'' (اور یاد کرو ابراہیم کو کتاب میں) اور اس جیسی دوسری آیات جیسے ''وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ'' (اور یاد کرو ادریس کو کتاب میں) وغیرہ کا کیا مطلب ہے یہ لفظ اس وقت استعمال ہوسکتا ہے کہ جس وقت ''مامور'' جس کو حکم دیا جاتا ہے) ذکر کرنے اور نہ کرنے میں مختار ہو جیسے کسی کا ساتھی وغیرہ خط یا کتاب لکھ رہا ہو تو اس کو کہا جاتا ہے۔ کتاب میں میرا بھی تذکرہ کرو یا فلاں کا تذکرہ کرو۔جبکہ رسول اللہ ﷺ اس میں کمی زیادتی کرنے میں مختار نہیں۔تو پھر ان کو ''وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ'' کیسے فرمایا گیا؟۔

جواب امر کو پہنچانے میں تاکید کے لئے فرمایا گیا ہے۔

سوال ''سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ'' (میں عنقریب آپ کے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا)۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد سے کیسے وعدہ فرمایا کہ میں آپ کے لئے مغفرت طلب کروں گا؟ جب کہ کافر کے لئے استغفار جائز نہیں ہے۔

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے آپ کے لئے توبہ کرنے کی توفیق طلب کروں گا اور توبہ سے تجھے مغفرت ملے گی۔اور اس طرح استغفار کافر کے لئے جائز ہے۔مثلاً یہ دعا کرنا ''اے اللہ اس کو مسلمان ہونے کی توفیق عطا فرما۔یا اس کی توبہ قبول فرما۔یا اے اللہ اس کو ہدایت نصیب فرما وغیرہ۔

جواب ثانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے مغفرت کی دعا شرطِ اسلام پر کی۔یعنی وہ جب اسلام لائے گا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے طلب مغفرت فرمائیں گے۔

جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ وعدہ کافر کے لئے استغفار کے ناجائز ہونے سے پہلے کیا تھا۔ نفس استغفار عقلاً ناجائز نہیں ہے۔ البتہ شریعت کے رُو سے ناجائز ہے۔

سوال ''وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ'' (اور پکارا ہم نے اس کو دائیں طرف طور پہاڑ کے) ''طور'' ایک پہاڑ ہے۔ اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں ہاتھ نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے ''من جانب الطور الایمن'' کیسے فرمایا؟۔

جواب اہلِ عرب کے استعمال کے مطابق خطاب کیا۔ اہلِ عرب کہتے ہیں ''عن یمین القبلة عن شمال القبلة'' حالانکہ قبلے کے بھی دایاں یا بایاں ہاتھ نہیں ہوتا۔ اگر کلام میں التباس واقع نہ ہو رہا ہو تو ایسا کہتے ہیں۔ اور یہاں دایاں سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دایاں پہلو ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ کے دائیں پہلو کے جانب والا کوہِ طور کا حصہ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی جانب سے آواز آئی تھی مذکورہ اشکال ''ایمن'' کو یمین کے معنیٰ میں لینے کی صورت میں وارد ہوتا ہے۔ اگر ایمن'' یمن (برکت) سے ہو تو کوئی اشکال نہیں۔ کیونکہ اس وقت معنیٰ ہوگا ''طور مبارک کی جانب''۔

سوال ''وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا'' (اور ہم نے اپنی رحمت اور مہربانی سے انہیں ان کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر عطا کیا)۔ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ تو ہم نے موسیٰؑ کو ہارونؑ عطا کیا کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب مطلب یہ ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعاء: ''وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي'' (اور میرے واسطے میرے کنبے میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو) قبول فرما کر انعام فرمایا: ''سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ'' (ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرے بازو مضبوط کریں گے)۔ اسی کو ہبہ سے تعبیر فرمایا۔

سوال ''اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا'' (جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو اور وہ روتے ہوئے زمین پر گر جاتے تھے) یہ آیت انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ہے اور اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ سے مراد قرآن ہے۔ اور انبیاء سابقین علیہم السلام پر قرآن کی آیات تو نہیں پڑھی جاتی تھیں؟۔

جواب اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہر وہ کتاب جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس میں آیات ہیں۔

سوال ''فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ

يَلْقَوْنَ غَيًّا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ ‘‘ (پھر ان (اہل سعادت) کے بعد بعض کچھ ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور نفسی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے سو یہ لوگ عنقریب بدی اور خسارے میں مبتلا ہوں گے مگر جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا)۔

یہ آیت نماز کو ترک کرنے اور ضائع کرنے والے کے کافر ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ کیوں کہ اس سے توبہ کے لئے ایمان کو شرط قرار دیا گیا ہے؟

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں یہاں ان ناخلف سے مراد یہود ہیں جنہوں نے فرض نماز کو ترک کر دیا اور شراب پینے کے لئے اور علاتی بہن کے ساتھ نکاح کو حلال سمجھا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے: ’’اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا‘‘ (بے شک ہے اس کے وعدہ پر پہنچنا) کیسے فرمایا؟ ’’وعدا اتیا‘‘ ولاتِ نہیں فرمایا کیوں؟

جواب اول یہاں وعدہ سے مراد جنت ہے۔ یہ آنے کی جگہ ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے اولیاء آئیں گے۔

جواب ثانی یہاں ’’ماتیا‘‘ اسم مفعول ’’اتیا‘‘ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ آیت ’’حِجَابًا مَّسْتُوْرًا‘‘ میں مستورا ساترا کے معنی میں ہے۔

سوال ’’تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا‘‘ (وہ بہشت ہے جو میراث دیں گے ہم اپنے بندوں میں جو کوئی ہوگا پرہیزگار) اور آیت ’’وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ‘‘ (اور وہ جنت جس کی چوڑائی آسمان وزمین ہیں تیار کی گئی ہے متقین کے لئے) وغیرہ آیات اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ غیر متقین جنت میں داخل نہیں ہوں گے؟

جواب یہاں تقوی سے مراد شرک سے اجتناب ہے۔ اور شرک سے اجتناب میں تمام مؤمنین، متقین ہوں یا غیر متقین سبھی برابر ہیں۔

سوال ’’تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا‘‘ (قریب ہے آسمان پھٹ پڑے۔ اور زمین پھٹ جائے۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے رحمٰن کے لئے اولاد ٹھہرائی ہے)۔

کفار کے اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ٹھہرانے میں آسمان کے پھٹنے، زمین کے شق ہونے اور پہاڑوں کے گرنے کا کیا مطلب۔ یہ تو جمادات ہیں۔ اور ان پر اس کلمے کا اثر کیسے ہوگا؟

جواب اول مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ ان لوگوں نے ایسی غلط بات کہی ہے

کہ اگر میرا حلم اور میرا ان کو مہلت دینا نہ ہوتا تو قریب تھا کہ میں سزا کے طور پر آسمان اور پہاڑوں کو ان پر گراتا۔ زمین شق ہوتی اور یہ اس میں دھنس جاتے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا''۔

سوال شرک کے بارے اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا کہ: ''تَكَادُ السموٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا'' یہ تو کلمہ کفر کی قوت اور اس کی شدت پر دلالت کرتا ہے۔ اور سورۃ ابراہیم میں شرک کے متعلق یوں فرمایا ہے: ''وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ'' (کلمہ خبیثہ کی مثال شجر خبیثہ کی طرح ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو اس کے لئے کوئی قرار نہیں ہے)

کلمۃ خبیثہ سے مراد کلمہ شرک ہے' حضرت ابن عباسؓ بھی یہی فرماتے ہیں۔ اور شجرہ خبیثہ سے مراد درخت حنظل ہے۔ یہ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ آیت کلمہ شرک کے ضعیف اور کمزور ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا ان دو آیتوں میں تعارض واقع ہوا؟

جواب سورۃ ابراہیم میں کلمہ شرک کے ضعف کو اور یہاں اس کے قبح اور برائی کو بیان کیا گیا۔ کہ یہ انتہائی کمزور اور انتہائی قبیح ہے۔ یہاں اس کے قبح وشناعت کی انتہا کو بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''لَقَدْ اَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا''۔ (ان نے سب کو احاطہ کر رکھا ہے اور سب کو شمار کر رکھا ہے) حالانکہ الاحصاء اور العد دونوں شمار کرنے کے معنی میں۔ مترادف ہیں تکرار لازم آئے گا۔ اور بقول بعض مفسرین لفظ ''العد'' حصر کے معنی میں ہے جیسا کہ آیت: ''وان تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا'' (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار کر کے ختم نہیں کر سکتے) سے واضح ہے۔ لہٰذا اگر ''عد'' کا معنی احصاء (شمار کرنا) ہے تو تکرار لازم آتا ہے۔ اور اگر حصر کے معنی میں لیں تو ''احصاء'' کے بعد اس کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے؟

جواب لفظ ''احصاء'' علم کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت: ''وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا'' میں علم ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے کسی شاعر کا شعر ہے:

وکن للذی لم تحصه متعلّما ☆ واماالذی احصیت منه فعلّم''

(جس چیز کا علم تجھے نہیں ہے اس کا علم حاصل کر' اور جو علم حاصل کیا ہے اس کو آگے پڑھا)۔ تو یہاں اوپر آیت ''لقد احصاھم'' میں احصاء علم کے معنی میں ہے۔

تو "احصاهم" کا معنی عَلِمَهُمْ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے افعال واقوال اور ان کی ذات وصفات وعدد کے متعلق جانتے ہیں۔ لہٰذا کوئی تکرار یا بے ضرورت کلام واقع نہیں ہوا۔

سورۃ طٰہٰ

سوال "هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى اِذْ رَاٰى نَارًا" اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور میں آگ دیکھنے کا واقعہ سورۃ "طٰہٰ" سورۃ "النمل" اور سورۃ "قصص" میں ذکر فرمایا ہے مگر تینوں جگہ مختلف الفاظ وعنوان سے بیان فرمایا۔ حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے؟۔

جواب سورۃ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کے تحت یہ سوال اور اس کا جواب مذکور ہے وہاں دیکھا جائے۔

سوال "فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا" (مبادا تم کو (قیامت کی تصدیق سے یا اس کے فکر سے) وہ شخص باز نہ رکھے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا) ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت پر ایمان نہ لانے والے شخص کو موسیٰؑ کے ایمان میں رکاوٹ بننے سے روکا جارہا ہے۔ حالانکہ آیت کا مقصود ہے موسیٰ علیہ السلام کو تکذیب سے روکنا؟

جواب آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین میں ایسے مضبوط اور پختہ ہو جائیے' کہ کسی بے ایمان کو آپ کے ایمان بالقیامت کے متعلق کمزوری کا تصور تک نہ ہو۔ چہ جائیکہ آپ کو ایمان سے ہٹائے۔

سوال "مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى" (موسیٰ) تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟) اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ان کے ہاتھ میں کیا ہے۔ پھر پوچھنے کا کیا فائدہ؟

جواب اول اس سوال کا فائدہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلام ہوتے وقت اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور دہشت' جو ان پر طاری ہوئی تھی اس میں کمی کرنا۔ جیسا کہ ہم میں سے کوئی اگر کسی بچے کو ہیبت زدہ دیکھے اور بچے کے ہاتھ میں پھل یا اور کوئی چیز موجود ہو تو اس کے ساتھ ملاطفت اور موانست کے لئے پوچھتا ہے کہ تیرے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی ملاطفت اور موانست کے لئے پوچھا۔

جواب ثانی اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ موسیٰؑ اپنی زبان سے اقرار کریں کہ یہ لکڑی سے بنی ہوئی بے جان چھڑی ہے اور اس کا بے جان ہونا ان کے دل میں پختہ ہو جائے۔ تاکہ جب یہ اژدھے کی صورت اختیار کرے تو قدرت الٰہی کے کمال کا مشاہدہ ہو۔ اور دل میں یہ وسوسہ تک نہ آئے کہ کہیں یہ پہلے سے جاندار تو نہیں تھی۔

سوال اللہ تعالیٰ نے صرف یہ پوچھا تھا: ''وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى'' اس کا جواب تھا صرف (هِيَ عَصَايَ) مگر موسیٰؑ نے مزید فرمایا: ''أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى'' (اس پر سہارا لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام ہیں) اصل جواب پر زیادتی بلغاء کا کام نہیں۔ خصوصاً ملک الاعلیٰ۔ بادشاہوں کے بادشاہ کے ساتھ ہمکلامی میں زائد بات تو بالکل نہیں کی جاتی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا؟۔

جواب اول حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: جب موسیٰ علیہ السلام نے ''ھی عصای'' (یہ میری چھڑی ہے) فرمایا تو سوال کیا گیا ''ماتصنع بھا'' (آپ اس سے کیا کرتے ہیں) تو جواب میں وہ باقی الفاظ بیان کئے۔

جواب ثانی اس کے مزید فوائد اس لئے گنے کہ کہیں اس کو پھینک دینے کا حکم نہ دیا جائے جیسا کہ ''فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ'' فرما کر جوتے اتارنے کا حکم ہوا۔

جواب ثالث اس لئے بھی لاٹھی کے مزید فوائد شمار کئے کہ ان کو فضول لاٹھی اٹھانے کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔

سوال اس لاٹھی کے بارے میں یہ بھی آیا ہے کہ وہ رات کے وقت روشن ہوتی تھی کیڑے مکوڑوں اور نقصان دہ چیزوں کو ہٹاتی اور دور کرتی تھی، اگر پھل کھانے کی خواہش ہوتی تو اس کو زمین میں گاڑ دیتے تو اسی وقت ان کی خواہش کے مطابق پھل دیتی۔ اور پانی کی ضرورت پر زمین سے پانی نکالتی۔ اور کنویں سے پانی نکالنے کا بھی کام دیتی۔ کنواں اگر گہرا ہو تو اس کی گہرائی کے مطابق طویل ہوتی۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے یہ تمام فوائد نہیں گنے کیوں؟

جواب اول اوّل کلام کو طویل کر کے کلام اللہ میں حائل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ بعض کو بیان کر کے بعض فوائد کو: ''وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى'' فرما کر اجمال سے کام لیا۔

جواب ثانی جن منافع کو ذکر کیا ان کی ضرورت زیادہ تھی۔ اس لئے بیان کیا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے متعلق الحیۃ، الثعبان اور الجان فرمایا ہے۔ حالانکہ ثعبان اور جان میں فرق ہے۔ اس لئے کہ جان چھوٹے سانپ کو اور ثعبان بہت بڑے سانپ کو کہتے ہیں۔

جواب اول صورۃً وہ بڑے سانپ کی طرح اور حرکت اور تیزی میں چھوٹے سانپ کی طرح سریع الحرکت تھی۔ اس لئے کسی جگہ ثعبان اور کسی جگہ جان سے تعبیر فرمایا۔ اور ''فَلَمَّا رَآهَا كَأَنَّهَا

جَانٌ ‘‘ سے بھی اس جواب کی تائید ہوتی ہے۔

جواب ثانی لاٹھی سانپ میں تبدیل ہو کر چھوٹے سانپ کی صورت اختیار کرتی تھی پھر بڑھتے بڑھتے بڑے سانپ کی صورت میں ہو جاتی تھی۔ آیت میں جان کہہ کر پہلی حالت اور ثعبان کہہ کر دوسری حالت کو بیان کیا گیا۔

سوال ’’اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّكَ مَا یُوْحٰٓی‘‘ (جبکہ ہم نے تیری ماں کی طرف وحی بھیجی تھی) اس آیت میں جو وحی آئی اس کا بیان نہیں ہے تو پھر ’’مَا یُوْحٰی‘‘ کہنے کا کیا فائدہ؟۔

جواب اول مایوحٰی سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ عورتوں کے پاس تمام امور کی وحی نہیں آتی۔ بلکہ بعض باتوں کی وحی آتی ہے۔

جواب ثانی ’’مَا یُوْحٰی‘‘ تاکید کے لئے ہے جس طرح ’’فَغَشِیَهَا مَا غَشِیَ‘‘ میں ما غشی تاکید کے لئے ہے۔ گویا وہاں فرمایا گیا ’’اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّكَ ایحاء‘‘۔

جواب ثالث تفخیم و تعظیم کی غرض سے پہلے اس کو مبہم رکھا پھر اس کی توضیح و تبیین: ’’اِنِ اقْذِفِیْهِ الخ‘‘ سے کی۔

سوال ’’فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی‘‘ (پھر گر پڑے جادوگر سجدہ میں بولے ہم یقین لائے رب پر ہارون اور موسیٰ کے) میں ہارون علیہ السلام کا ذکر موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کیوں کیا گیا جب کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وزیر و معاون کے طور پر تھے اور ان کے تابع تھے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ’’وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا‘‘۔

جواب ہارونؑ کو مقدم اس لئے بیان کیا تاکہ موسیٰؑ آیت کے آخر میں آئیں۔ اور آیات کے اواخر ہم وزن ہوں۔ آیات کے فواصل کے تناسب کو برقرار رکھنے کے لئے موسیٰؑ کو مؤخر کیا گیا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے ’’لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی‘‘ (وہاں نہ مریگا نہ زندہ ہوگا) موت و حیات انسان کی صفات میں سے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی نقیض ہیں پھر انسان سے دونوں کیسے مرتفع ہو سکتی ہیں؟

جواب اول مطلب یہ ہے کہ ایسی موت واقع نہیں ہوگی جس سے عذاب سے چھٹکارہ ملے۔ اور نہ ایسی حیات ہوگی جو باعث تلذذ اور نفع مند ہو۔

جواب ثانی مطلب یہ ہے کہ ایسی موت نہیں آئے گی جو مسلسل رہے۔ بلکہ عذاب کی شدت سے مرتے ہی پھر زندہ ہوگا۔ پھر مریگا پھر زندہ ہوگا نہ مکمل مریگا نہ مکمل زندگی گذاریگا۔ دنیاوی روز کے

مطابق روزانہ ستر مرتبہ مریگا اور ستر مرتبہ زندہ ہوگا۔

سوال خوف وخشیت ہم معنی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "لَا تَخَافُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى"

جواب لَا تَخَافُ دَرَكًا کا معنی ہے کہ فرعون کے قبضے میں آنے کا خوف نہ ہو اور لَا تَخْشٰى کا معنی ہے دریا میں غرق ہونے کی خشیت نہ ہو۔

سوال "وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى" (اور فرعون نے اپنی قوم کو بے راہ کیا) کے بعد "وماہدٰی" لانے کا کیا فائدہ۔ گمراہ کرنا' راہ راست پر نہ لگانا دونوں ایک ہی ہیں؟۔

جواب اول یعنی گمراہ کرنے کے بعد دوبارہ راہ راست پر نہیں لگایا۔ اس لئے کہ بعض دفع راہِ راست سے ہٹانے والا بھی دوبارہ سیدھے راستے لگا دیتا ہے۔

جواب ثانی اپنی قوم کو گمراہ تو کیا مگر خود بھی راہِ راست پر نہ چلا۔

جواب ثالث فرعون نے اپنی قوم کو دین حق قبول کرنے سے ہٹا کر غرق کیا۔ دریا میں راستہ دیکر انہیں نکال نہ سکا۔

سوال بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ" (اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور ہم نے تم سے کوہ طور کی داہنی جانب آنے کا وعدہ کیا) حالانکہ بنی اسرائیل سے کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا وعدہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا تھا کہ آپؑ کو تورات ملے گی' تو آیت میں "واعدنا کُم" کہہ کر بنی اسرائیل کو کیوں خطاب کیا گیا؟۔

جواب ٹھیک ہے خطاب تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھا۔ لیکن اس کتاب (توراۃ) میں بنی اسرائیل کے لئے احکامات' ان کی شریعت اور معاش کی درستگی وغیرہ کے احکامات تھے۔ اس وجہ سے مواعدہ (وعدہ کرنے کو) ان کی طرف منسوب کیا گیا۔

سوال "وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ" (اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ کہا وہ یہ ہیں میرے پیچھے)۔

یہ سوال کا سبب دریافت کرنے کے لئے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طور کی جانب توراۃ نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام نے وقت مقررہ پر جانے کا ارادہ فرمایا' اور اپنے ساتھ اپنی قوم کے ستر افراد کو لیکر اس مقام کی طرف چل پڑے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ تو قوم کو پیچھے چھوڑ کر جلدی آنے پر انہیں عتاب کیا گیا۔ اور جلدی میں آنے کا سبب پوچھا گیا تو جواب میں فرمایا "هُمْ اولآء علی اثری" (وہ میرے

پیچھے آرہے ہیں) موافق سوال یہ جواب نہیں تھا سوال کے موافق جواب یہ تھا۔ یا اللہ تیری رضا کی زیادہ طلب اور تیسری لقاء کے شوق اور تیرے وعدہ میں جلدی آیا ہوں لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس جواب کو بعد میں اور "ھم اولآء علی اثری" کو پہلے کیوں بیان کیا؟۔

جواب اس سوال میں دو باتیں تھیں۔ ایک قوم کو پیچھے چھوڑ کر جلدی آنے کو ناپسند کرنا دوسرا اس کا سبب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے جلدی آنے میں عذر خواہی کرتے ہوئے فرمایا: وہ مجھ سے کوئی زیادہ دور نہیں ہیں۔ بلکہ میرے پیچھے ہی آرہے ہیں پھر جلدی آنے کی وجہ یوں بیان فرمائی "وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی" (میں جلدی اس لئے آیا کہ تا کہ تو راضی ہو۔

سوال "لَا تَرٰی فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا" (اے دیکھنے والے تو ان پہاڑوں میں نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی اونچائی) سوال یہ ہے کہ لفظ "عِوَج" (عین کے کسرہ کے ساتھ) باتوں یا عمل وغیرہ میں کجی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کسی ٹھوس چیز اور لاٹھی وغیرہ کی کجی کو بیان کرنے کے لئے "عوج" (عین کے فتح کے ساتھ) ہوتا ہے۔ یعنی پہاڑ' زمین وغیرہ کی کجی کو بیان کرنے کے لئے عوج (عین کے زبر کے ساتھ) استعمال ہوتا۔ مگر قرآن میں پہاڑ کے لئے عین عوج (عین کے کسرہ کے ساتھ) استعمال ہوا ہے کیوں؟۔

جواب اول ابن سکیتؒ نے کہا کھڑی کی جانے والی چیز میں کجی کو عوج (بالفتح العین) اور زمین میں پڑی ہوئی چیز یا دینی اور عملی چیز میں کجی کے لئے عِوج (بکسر العین) استعمال ہوتا ہے۔

جواب ثانی اس سے الاعوجاج (ٹیڑھے پن) کی نفی کی گئی ہے کہ ماہر انجینئر ہی اس کا ادراک کرسکتا ہے۔ یعنی ذرہ برابر بھی ٹیڑھا پن نہیں ہے اور اس اعوجاج کے لئے عِوَج استعمال ہوتا ہے' یہ ہوسکتا ہے کہ مثلاً ایک آدمی نے صاحب بصیرت لوگوں کو لیکر ایک زمین کو اپنے اندازے کے مطابق برابر کیا۔ اور سب نے دیکھ کر اس کے برابر ہونے کا کہا۔ پھر انجینئر کو حکم دیا گیا کہ وہ زمین ناپنے کے آلہ کے ذریعے اسے ناپے۔ اس نے ناپا اور بعض جگہ ٹیڑھی نکلی۔ مگر بظاہر کوئی کجی نہیں تھی۔ تو آیت میں "لا عوج" کہہ کر اس غیر مرئی کجی کی نفی کی گئی۔ اور وہ کجی انتہائی قلیل ہونے کی وجہ سے غیر محسوس ہے۔ اور غیر محسوس کے لئے عِوَج استعمال ہوتا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: کہ "وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ" "ہم نے پہلے آدم سے عہد لیا۔ سو وہ بھول گئے) سوال یہ ہے کہ بھولنا عذر ہے۔ اور بھولنے کو اللہ تعالیٰ نے "وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى" کہہ کر عصیان سے کیوں تعبیر فرمایا اور جنت سے نکال کر بڑی سزا کیوں دی؟

جواب یہاں ''فَنَسِیَ'' میں نسیان سے مراد بھولنا نہیں بلکہ ترک کرنا ہے۔ جیسا کہ آیت ''اِنَّا نَسِینٰکُمْ'' (ترکنا کم) کے معنی میں ہے یہاں نسیان بھول کے معنی میں کیسے ہوسکتا ہے؟ کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے درمیان اس درخت سے کھانے کے متعلق مجادلہ ومناظرہ رہا ہے۔ لہٰذا یہاں نسیان بھول کے معنی میں نہیں ہے۔

سوال ''فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی'' (سو نہ نکلوا دے تم کو جنت سے پھر تو تکلیف میں پڑیگا) سوال یہ ہے۔ ''یخرجنکما'' کو تثنیہ اور ''تشقٰی'' کو مفرد کیوں لایا گیا؟ حالانکہ خطاب دونوں کو ہے اس رو سے ''فَتَشْقَیَان'' ہونا چاہیے تھا؟۔

جواب اول ''فتشقٰی'' کو تثنیہ نہ لانے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مرد اپنے اہل وعیال کا ذمہ دار اور قیم ہوتا ہے۔ تو اس کی مشقت تمام کی مشقت کو شامل ہے۔ جیسا کہ کسی گھر کے سربراہ سے دشمنی سارے گھر والوں سے دشمنی ہوتی ہے۔ تو یہاں کلام کو مختصر کر کے مشقت کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا جس میں حضرت حواء علیہا السلام خود بخود داخل ہوگئیں۔

جواب ثانی اس مشقت سے طلب معاش کی مشقت مراد ہے جو مرد کی ذمہ داری ہے عورت کی نہیں چنانچہ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو آسمان سے سرخ رنگ کا ایک بیل عطاء کیا گیا تھا۔ جس سے وہ زمین پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ جب پیشانی پر پسینہ آتا تو ہاتھ سے صاف کرتے۔ اسی کو شقاوت سے تعبیر کیا۔

سوال ''وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا'' (جس نے میری نصیحت سے منہ موڑا پس تحقیق اس کی زندگی تنگ ہوگی) یعنی جس نے میری نصیحت سے یا قرآن سے منہ موڑا' اس پر ایمان لایا نہ اس کی اتباع کی تو اس کی زندگی تنگ ہوگی۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں ایمان اور قرآن سے اعراض کرنے والے لوگ مالی لحاظ سے مستحکم اور خوش عیشی کی زندگی گذارتے ہیں؟۔

جواب اول حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں! ''تنگ زندگی'' سے مراد گناہ کی زندگی ہے اگرچہ مالی اعتبار سے مستحکم ہو اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اس سے مراد عذابِ قبر ہے۔

جواب ثانی اس سے مراد آخرت میں جہنم کی زندگی ہے۔

جواب ثالث ''مَعِیْشَةً ضَنْکًا'' سے مراد دنیا اور اسبابِ دنیا پر شدید حریص ہونا ہے۔ یہ آیت سورۃ نحل کی آیت ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً'' کے مقابل ہے۔ چنانچہ وہاں سورۃ نحل کی اس آیت میں ''حیاۃ طیبۃ'' کی جو فضلتیں ہم نے بیان کی

ہیں تو اُن کی "مَعِیْشَۃً ضَنْکًا" کی تفسیر ہے۔

سوال "وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا" (اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب الٰہی ان کو چمٹ جاتا) سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کونسے کلمات گذرے ہیں جو لزوم عذاب کی راہ میں رکاوٹ نہیں؟

جواب بعض علماء کے بقول اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ" مگر اس پر اشکال ہوگا وہ یہ کہ "کلمۃ" اس کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

بعض نے کہا: "کلمۃ سبقت" سے مراد نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ" (آپ کے ان کے درمیان موجودگی میں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہیں دیں گے)۔

بعض نے کہا: اس سے مراد یہ فرمانِ الٰہی ہے: "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" اور بعض نے کہا: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر آیت یوں ہے۔ "وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى" اس سے مراد وہ وقت مقرر ہے جس کے پورے ہونے تک عالم کی بقاء ہے۔

سوال "فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى" (آگے جان لوگے کون ہیں سیدھی راہ والے، اور کون سوجھے ہیں)۔

سیدھی راہ والے اور ہدایت یافتہ دونوں ہم معنی ہیں لہٰذا "الصراط السوی" لانے کے بعد "مَنِ اهْتَدٰى" لانا تکرار ہے۔ اس تکرار کا فائدہ کیا ہے؟۔

جواب سیدھی راہ والوں سے مراد صراطِ مستقیم پر منزل کی طرف چلنے اور آگے بڑھنے والے لوگ ہیں۔ اور من اهتدیٰ 'ہدایت یافتہ' سے مراد منزل پر پہنچے ہوئے لوگ مراد ہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے۔ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ سے مراد مسلسل صراط مستقیم پر چلنے والے لوگ اور "مَنِ اهْتَدٰى" سے وہ لوگ مراد ہیں جو پہلے سیدھے راستے پر نہیں تھے بعد میں اس راہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور بعض علماء کی رائے یہ ہے۔ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ سے مراد دنیا میں راہ حق پر گامزن لوگ ہیں اور مَنِ اهْتَدٰى سے منزل مقصود جنت کی طرف قیامت میں پہنچنے والے لوگ ہیں گویا آیت میں یوں فرمایا گیا۔ تم جان لوگے دنیا میں حق پر اور آخرت میں فائز و کامیاب کون لوگ ہیں۔

سورۃ الانبیاء

سوال "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ" (لوگوں کے لئے حساب کا وقت بہت قریب آ لگا ہے)

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں حساب بہت قریب آ گیا ہے جب کہ اس فرمان کے نزول کے بعد سے اب تک چودہ سو سال گذر گئے ہیں مگر اب تک یوم حساب (یوم القیامۃ) کا کوئی وجود نہیں ہے؟

جواب اول: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قریب ہے اگرچہ لوگوں کے اعتبار سے بعید ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: "اِنَّهُ يَرَوْنَهُ بَعِيْدًا وَّنَرَاهُ قَرِيْبًا" اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ......... كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ"

جواب ثانی: قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی گذری ہوئی مدت کے مقابلے میں آنے والا وقتِ قیامت قریب ہے جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ بھی ہے: "ان مثل مابقی من الدنیا فی جنب ما مضی کمثل خیط فی ثواب"

جواب ثالث: آیت کا مطلب یہ ہے ہر ایک کا حساب کا وقت قریب ہے یعنی اس کی قبر جب وہ مر جائے۔ اس جواب کی تائید آپ ﷺ کے اس قول مبارک سے ہوتی ہے۔ "من مات فقد قامت قیامۃ" (جو مر گیا سو اس کی قیامت قائم ہو گئی)

جواب رابع: یہ ہے کہ ہر آنے والا قریب ہے۔

سوال: "مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ" (نہیں پہنچتی ان کو کوئی نصیحت ان کے رب کی طرف سے نئی) اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا ذکر قرآنِ کریم ہے اور قرآنِ کریم قدیم ہے حادث نہیں ہے؟۔

جواب اول: مطلب یہ ہے کہ اس کا اُتارنا محدث ہے۔

جواب ثانی: اس سے مراد قرآن نہیں ہے بلکہ قرآن کے علاوہ مواعظ رسول ﷺ ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا کہ ہر واعظ کی موعظت اللہ تعالیٰ کے الہام اور ہدایت پر ہے، اور حدیث بھی تو وحی خفی ہے۔

جواب ثالث: ذکر سے مراد ذکر رسول اللہ ﷺ ہیں اور سیاق آیت بھی اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی "هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" ہے۔

سوال: "وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى" اسرّوا اور النجویٰ دونوں ہم معنی ہیں یعنی خفیہ سرگوشی کرنے کے معنی میں تو اسروا کے بعد "النجویٰ" لانا تکرار ہے، اس کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب: مطلب ہے کہ بات کو چھپانے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ اتنا چھپایا کہ کسی کو ان کے بات کرنے اور سرگوشی کرنے تک علم نہ ہوا، اجمالاً نہ تفصیلاً۔

سوال ''فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ''(اے مشرکین عرب اہل کتاب سے پوچھو) یعنی انبیاء سابقین کے متعلق تم اہل کتاب سے پوچھو کہ کیا وہ بشر تھے یا فرشتے؟ حالانکہ مشرکین نے کہا تھا: ''لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ''

جواب مشرکین اگر چہ اہلِ کتاب کی کتاب پر ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن عقلی معاملے میں اہلِ کتاب کا مسلسل نقل' مفید علم ہے ایمان لانے اور نہ لانے والے دونوں کے لئے۔

سوال فرشتوں کی صفات میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ'' (لیکن وہ بندے ہیں عزت دیئے ہوئے) سے ''مُشْفِقُوْنَ'' تک اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ فرشتے کسی قیمت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے تو سوال یہ ہے۔ اگر وہ نافرمانی نہیں کرتے ہیں تو ڈرتے کیوں ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے متعلق فرمایا گیا: ''وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ'' (اور وہ اس اللہ کی ہیبت سے ڈرتے ہیں)؟۔

جواب اول چونکہ ابلیس بھی بڑا عبادت گذار تھا لیکن اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا اور ھاروت اور ماروت بھی تو فرشتے تھے قضاء قدر سے ان کی حالت کیسی تبدیل ہوئی ان حالات کو پیش نظر رکھ کر وہ خوف وخشیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

جواب ثانی اللہ تعالیٰ کی زیادہ معرفت مزید خوف کا موجب ہے جیسا کہ اہل تحقیق کا قول ہے۔'' ومن كان بالله اعرف كان من الله اخوف'' جس کو معرفت الٰہی حاصل ہو وہی خوف الٰہی رکھے گا۔ اور جس کو جتنا قرب حاصل ہوگا اتنا خشیت الٰہی سے سرشار ہوگا۔

سوال کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ''اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا'' (اور کیا نہیں دیکھا ان منکروں نے؟ کہ آسمان اور زمین کے منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھولا)۔ حالانکہ کفار نے ان حالات کو دیکھا نہیں تھا؟۔

جواب یہاں رویت جاننے کے معنی میں ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ یہ لوگ سابقہ اطلاعات پر غور کر کے جانتے نہیں ہیں۔

سوال ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ'' (ہم نے پانی سے ہر زندہ شیء کو پیدا کیا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ حالانکہ فرشتے اور جنات زندہ شیء ہیں اور پانی سے پیدا نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی پیدائش نور اور نار سے ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ''وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ'' اس طرح انسان مٹی سے اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پتھر سے پیدا ہے۔

جواب اول: كُلَّ شَيْءٍ سے بعض شئی مراد ہے جیسا کہ آیت: "وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" اور "جَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ" اور اسی جیسی بہت ساری آیات میں کل سے بعض مراد ہے۔

جواب ثانی: پیدا تو ابتداءً تمام مخلوق پانی سے ہیں۔ البتہ بعض بالواسطہ اور بعض بلاواسطہ ہیں۔ اسی بنا پر بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ہوا سے پیدا فرمایا ہے۔ اور ہوا کو پانی سے پیدا کیا ہے' اور جنات کو آگ سے اور آگ کو پانی سے تخلیق فرمایا ہے۔ اور انسان کو مٹی سے اور مٹی کو پانی سے تخلیق دی ہے۔

سوال: "خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ" (انسان عجلت سے پیدا شدہ ہے) کے بعد "فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنَ" لایا گویا یہ تکلیف مالا یطاق ہے؟

جواب: یہ ایسا ہے گویا انسان کو شہوت دیکر اس کو شہوت پر قابو پانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ انسان کو اس شہوت اور عجلت پر قابو پانے کی قدرت وطاقت بھی دی گئی ہے۔

سوال: کیسے فرمایا اللہ پاک نے: "وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ إِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ" (اور نہیں سنتے بہرے پکارنے کو جب ان کو کوئی پکارے) حالانکہ بہرہ تو ڈر کیا خوشخبری کو بھی نہیں سن سکتا ہے؟۔

جواب: "اَلصُّمُّ" میں الف لام' لامِ جنس نہیں ہے بلکہ لامِ عہد ہے۔ ماقبل: "قُلْ إِنَّمَا أُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ" (آپ کہہ دیجئے کہ میں آپ کو ڈراتا ہوں حکم کے موافق) میں منذرین کی طرف اشارہ ہے۔

سوال: "بَلْ فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا" بلکہ اس بڑے (بت) نے توڑا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو خود توڑ کر یہ کیوں فرمایا کہ اس بڑے نے یہ عمل کیا ہے؟۔

جواب اول: ان پر استہزاء اور تہکم کے طور پر فرمایا بطور حقیقت کے نہیں فرمایا۔

جواب ثانی: توڑنے کی نسبت بڑے بت کی طرف ایک شرط کے ساتھ مشروط کیا' جو مقتضی ہے۔ مطلقاً اس کو منسوب نہیں کیا' تقدیر عبارت یوں ہے: "فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا إِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ فَاسْئَلُوْهُمْ" اس بڑے نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اگر بولتا ہے تو اس سے پوچھ کے دیکھ لو)

سوال: "يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ" (اے آگ ابراہیم کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی کا ذریعہ بن جا)۔ سوال یہ ہے آگ کو کیسے خطاب کیا گیا حالانکہ خطاب عقلاء کو ہوتا ہے جبکہ آگ غیر عاقل ہے؟

جواب: یہ خطاب' خطاب تکوین ہے اور خطاب تکوین عقلاء کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ غیر

عقلاء کو بھی مخاطب بنایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہاڑوں، زمین اور آسمان کو قرآن کریم میں خطاب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا: "یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ" فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا اور آیت "قِیْلَ یٰاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ"۔

سوال یہاں فرمایا گیا: "وَالَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا" میں ھا ضمیر مؤنث "وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا" میں "فیہ" ضمیر مذکر کے ساتھ لایا گیا کیوں؟۔

جواب جہاں تانیث کی ضمیر ہے وہاں ان کی ذات میں نفخ مراد ہے اگر نفخ (پھونکنے) کی جگہ گریبان یا شرم گاہ ہے مگر نسبت ان کی ذات کی طرف کی گئی ہے۔ جہاں مذکر کی ضمیر لائی گئی وہاں ضمیر فرج کی طرف لوٹ رہی ہے جو مذکر ہے۔

سوال فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ" (اور حرام ہے اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کیا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے) اس بستی والوں کے واپس لوٹ کر آنے پر دلالت کرتا ہے' اس لئے کہ جس کے نہ پایا جانے کو حرام کر دیا جائے تو وہ موجود ہوگا۔ یعنی نہ پایا جانا حرام ہے تو پایا جانا ضروری ہوگا۔؟

جواب اول یہاں حرام واجب کے معنی میں ہے' کہ ہم نے اس بستی والوں پر واجب کر دیا کہ وہ کفر سے اسلام کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں اور حضرت ابن عباسؓ نے بھی یہاں حرام کو واجب کے معنی میں لیا ہے۔

شاعر کا یہ شعر بھی اس پر دال ہے:

فان حراما لاارى الدهر باكيا ☆ على شجوة الابكيت على عمرو

جواب ثانی حرام یہاں اپنے اصل معنی میں ہے اور "لا یرجعون" میں "لا" زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "حرمنا" "مَنَعْنَا" کے معنی میں ہے جیسا کہ آیت "حَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ اور اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الْكٰفِرِیْنَ" میں دونوں جگہ "حرّم" "مَنَعَ" کے معنی ہیں۔

سوال "اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ" (سو وہ لوگ جن کے لئے ٹھہری ہماری طرف سے پہلے سے نیکی وہ اس سے دور رہیں گے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوکار جہنم سے دور ہوں گے۔ جبکہ اس آیت: "وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا" سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگ اس سے دور نہیں ہوں گے بلکہ اس کے قریب ہوں گے تو تطبیق کس طرح ہوگی؟۔

جواب مطلب یہ ہے کہ اس کی تکلیف والم سے دور ہوں گے اگر چہ اس سے گذریں گے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اس سے وارد ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نجات ملنے پر ہمیشہ کے لئے اس کے دور ہوں گے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا: "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) حالانکہ جن لوگوں کی وفات حالت کفر میں ہوئی ان کے لئے رحمت تو نہیں ہیں، بلکہ ان کے لئے باعث تکلیف ہیں۔ اس لئے کہ آپ ﷺ مبعوث نہ ہوتے تو یہ لوگ عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ کیوں کہ فرمانِ الٰہی ہے۔: "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا"

جواب اول بلکہ آپ ﷺ کفار کے لئے بھی رحمت ہیں۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کی وجہ سے عمل ختم ہونے کا عذاب ان سے مؤخر ہو گیا۔

جواب ثانی آپ ﷺ سب کے لئے رحمت بنا کر مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ مبعوث اس لئے ہوئے کہ جو لوگ آپ ﷺ کی تابعداری کریں گے وہ نیک بخت ہوں گے، اور جو ان کی تابعداری نہیں کرتے یہ ان کی اپنی کمزوری اور سستی ہے اور اپنے عظیم حصے کو ضائع کرنا ہے۔ آپ ﷺ کی مثال چشمے کے شیرین پانی کی سی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جاری فرمایا کچھ لوگ نے اس سے اپنی فصلوں اور مال مویشیوں کو سیراب کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اس سے خوب فیض یاب ہوئے اور سیراب ہوئے اور کچھ لوگوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا اور اس سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ اپنے حصے کو ضائع کیا اور چشمہ اپنی جگہ پر دونوں جماعتوں کے لئے نعمت اور رحمت ہے اگر چہ دوسری جماعت نے اس سے فائدہ حاصل نہیں کیا۔

جواب ثالث "رحمة" سے مراد رحم کرنے والے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ دونوں فریقوں کے لئے مہربان ہیں۔ ذرا غور کیجئے غزوہ احد میں کفار نے آپ کو زخمی کر دیا۔ آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید کر دیے۔ آپ ﷺ بے ہوش ہو گئے۔ جب افاقہ ہوا تو فرما: "اللّٰهمّ اهد قومي فانهم لا يعلمون" (اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے۔ کیوں کہ یہ لوگ جانتے نہیں)۔

سوال "اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ" (اللہ کا امر آ چکا) "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ" (قیامت قریب آ گئی) کے ہوتے ہوئے: "وَاِنْ اَدْرِيْ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ" (مجھے نہیں معلوم کہ جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے قریب ہے یا بعید) کہنے کا کیا مطلب؟

جواب آیت کا مطلب ہے: کہ جس عذاب کا تم سے وعدہ کیا گیا۔ اور اس سے تم کو ڈرایا جاتا

ہے۔ وہ جلدی آئے گا یا تاخیر سے مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اس سے قیامِ قیامت مراد نہیں ہے۔

سوال جب مؤمنین کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق ہی فیصلہ کرتے ہیں باطل فیصلہ نہیں کرتے تو "رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ" (اے اللہ حق کے ساتھ فیصلہ فرما) کہنے کا کیا مطلب؟۔

جواب یہاں "حق" باطل کے مقابل نہیں ہے۔ بلکہ حق سے مراد یہاں مسلمانوں کی مدد اور کفار کو ذلیل کرنے کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہی ہوتا ہے۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! اپنے وعدے کو جلدی عملی جامہ پہنا دیجئے۔

سورۃ الحج

سوال "اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ" (یقیناً قیامت کا زلزلہ بھاری چیز ہوگی) یہ آیتِ مبارکہ معدوم کے شئی ہونے پر دلالت کرتی ہے؟۔

جواب ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کا زلزلہ پایا جائے گا تو شئی کہلائے گا فی الحال شئی نہیں ہے۔ اس قول کی تائید لفظِ "عظیم" سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ معدوم عظمت سے متصف نہیں ہوسکتا۔

سوال "يَوْمَ تَرَوْنَهَا" (جس دن اس کو دیکھیں گے) میں "تَرَوْنَ" کو جمع اور "تَرَى النَّاسَ" (تو دیکھے گا لوگوں کو) میں "تَرَى" کو واحد کے صیغے کے ساتھ کیوں لایا گیا؟۔

جواب پہلی آیت کو زلزلہ کے ساتھ معلق کیا جس کو سارے لوگ دیکھیں گے اور دوسری آیت کو لوگوں کی بے ہوشی کی کیفیت کے ساتھ معلق کیا۔ کیونکہ ہر ایک ان میں سے دوسروں کو دیکھنے والا ہوگا۔

سوال "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدون واقفیت اور بدون دلیل اور بدون کسی روشن کتاب کے تکبر کرتے ہوئے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں)۔

نضر بن حارث کے بارے یہ کیسے فرمایا گیا کہ وہ گمراہ کرنے کے لئے جدال کرتا ہے حالانکہ وہ مباحثہ دوسروں کو گمراہ کرنے کے لئے نہیں کیا کرتا تھا۔ اور نہ ہی وہ ہدایت پر تھا کہ جدال کی وجہ سے ہدایت سے نکل کر گمراہ ہو جائے۔ بلکہ پہلے سے ہی وہ راہ ہدایت پر نہیں تھا؟۔

جواب "لِيُضِلَّ" میں "لام" لامِ عاقبت ہے۔ کئی مرتبہ پہلے بھی اس کا تذکرہ آچکا ہے۔ جب

اُس ہدایت اور راہِ راست کی طرف آنے سے انکار کیا۔ اور راہِ راست کی طرف آنے کو چھوڑا اور اس سے اعراض کیا اور باطل کے حق میں مناظرہ وجدال پر اتر آیا تو گویا وہ راہِ حق سے نکل گیا۔ اس لئے اس طرح تعبیر کی گئی۔

سوال ''یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَضُرُّہٗ وَمَا لَا یَنْفَعُہٗ ذٰلِکَ ھُوَالضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ یَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّہٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِہٖ'' (خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرنے لگا جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے نہ نفع پہنچا سکتی ہے یہ انتہا درجہ کی گمراہی ہے) وہ ایسے کی عبادت کر رہا ہے کہ اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے)۔

پہلی آیت میں بتوں سے نفع وضرر کی نفی اور دوسری آیت میں ان کے لئے نفع وضرر کو ثابت کیا گیا ہے۔ دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے کہ اگر اس کی عبادت نہ کرے تو وہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اور اگر عبادت کرے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی ہے۔ پھر فرمایا۔ اس چیز کی عبادت کرتا ہے جس کی عبادت کی وجہ سے اللہ اس کو ضرر پہنچا دے گا۔ مگر آیت میں ضرر کو بت کی طرف منسوب اس لئے کیا کہ وہ ضرر پہنچنے کا سبب بنا۔

سوال ''ضَرُّہٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِہٖ'' (اس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے)۔ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ بتوں کے اندر نفع ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے؟۔

جواب یعنی ان کے اعتقاد کے مطابق جو نفع ہے (حالانکہ نفع کوئی نہیں ہے) اس نفع کے مقابلے میں اس کا ضرر ونقصان زیادہ ہے۔

سوال ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا'' (ان کو اجازت دیدی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا)۔ ان کو کس چیز کی اجازت دی گئی اس کا تذکرہ آیت میں نہیں ہے کیوں؟۔

جواب آیت میں اس کا تذکرہ موجود ہے مگر مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ فِی الْقِتَالِ'' مگر لفظ ''یُقٰتلون'' کے اس پر دلالت کی وجہ سے اسے حذف کیا گیا اور دلالت حال کی وجہ سے بھی' کیوں کہ کفار مکہ مسلمانوں کو طرح طرح کی تکالیف سے دوچار کرتے تھے۔ اور مسلمان نبی کریم ﷺ سے کفار سے لڑنے کی اجازت طلب کرتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے۔ ابھی اس کی اجازت نہیں ملی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا' یہاں تک کہ آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے آئے۔ قتال کے متعلق نازل ہونے والی یہ پہلی آیت ہے۔ لہٰذا

ماذون فیہ (جس کی اجازت دیدی گئی) ظاہر ہے اس لئے اس کو حذف کیا گیا۔

سوال "اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ " (وہ لوگ جن کو نکالا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے) میں استثناء کس طرح صحیح ہوگا۔

جواب یہ استثناء منقطع ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے "لٰکِنْ اُخرجُوْا بقولھم رَبُّنَا اللّٰهُ " یعنی ان کو اپنے گھروں سے اللہ ہمارا رب ہے کہنے کی بناء پر لایا گیا۔

سوال یہود کے عبادت خانوں اور نصاریٰ کے عبادت خانوں کی حفاظت میں مسلمانوں پر کیا احسان ہے۔ حتیٰ کہ آیت میں یہ کہہ کر احسان جتلایا جارہا ہے: "وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَّبِيَعٌ " (اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکئے اور مدرسے)

جواب صرف مسلمانوں کے ساتھ احسان کا ذکر نہیں بلکہ اہل ادیان ثلثہ پر احسان جتلایا جا رہا ہے۔

سوال "وَكُذِّبَ مُوْسٰی " (اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا) اس کے ماقبل بتایا کہ قوم نوحؑ نے نوح کو اور ثمود نے صالحؑ کو اور قوم ابراہیمؑ نے ابراہیمؑ اور قوم لوطؑ نے لوطؑ کو جھٹلایا قوم موسیٰؑ نہیں فرمایا؟۔

جواب اس لئے کہ موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی تکذیب نہیں کی۔ بلکہ ان کو جھٹلانے والی قوم قوم قبط ہے۔

سوال "وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ " (پر اندھے ہوجاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں) قلب (دل) ہوتا ہی سینے میں ہے "فِی الصُّدُوْرِ " لانے کا کیا فائدہ؟

جواب اول تاکید میں مبالغہ کرنے کے لئے اس لفظ کو بڑھایا گیا۔ جیسا کہ آیت "وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ " ہے پرندہ اڑتا ہی پروں سے ہے اس کے باوجود تاکید کے لئے "بِجَنَاحَیْهِ " کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت " وَيَقُوْلُ بِاَلْسِنَتِهِمْ " اپنی زبانوں سے کہتے ہیں) میں "بِاَلْسِنَتِهِمْ " مزید تاکید کے لئے ہے۔

جواب ثانی یہاں "قلب" عقل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مقصود یہ بتانا ہے۔ کہ عقل کا مستقر سر نہیں بلکہ دل ہے۔

سوال مغفرت (گناہوں کی معافی) ہوتی ہے گناہ کے ارتکاب سے نہ کہ نیک اعمال کرنے پر

جبکہ اللہ پاک فرماتے ہیں ”فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ “ (جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے کام کرنے لگے ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے)؟۔

جواب یہاں عمل صالح سے اخلاص فی الایمان مراد ہے امام کلبیؒ فرماتے ہیں: قرآن کریم میں جہاں بھی ”اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ“ آیا ہے اس سے اخلاص فی الایمان مراد ہے۔ تو آیت کا معنی یہ ہوا: جو لوگ اخلاص کے ساتھ ایمان لائیں گے۔ یعنی اپنے ایمان کو شرک سے پاک کریں گے، ان کے سابقہ گناہ معاف کئے جائیں گے۔

سوال ”وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ“ (اور کوئی نبی اور رسول ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے نبی اور رسول دونوں مرسل ہیں۔ کیا ان کے درمیان کوئی فرق بھی ہے؟۔

جواب ان کے درمیان فرق یہ ہے۔ کہ رسول اس پیغامبر کو کہتے ہیں کہ جن کو معجزہ اور کتاب دونوں دیئے گئے ہوں۔ اور نبی اس پیغمبر کو کہتے ہیں جنہیں کوئی نئی کتاب وشریعت نہ دی گئی ہو بلکہ اپنے سے پہلے پیغمبر کی شریعت کی طرف لوگوں کو بلانے کا کام سونپ دیا گیا ہو بعض علماء کے نزدیک رسول انہیں کہتے ہیں جن کو معجزہ دیا گیا۔ اور جن کو معجزہ سے نہ نوازا گیا ہو ان کو نبی کہتے ہیں۔

سوال ”یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ؕ وَاِنۡ یَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَیۡئًا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ“ (اے لوگو! ایک عجیب مثال بیان کی جاتی ہے۔ اس کو کان لگا کر سنو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جن کی تم لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ مکھی کو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب جمع ہو جائیں۔ اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ ایسا عابد بھی لچر ایسا معبود بھی لچر)۔

مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ایک مثال بیان کی گئی اس کو غور سے سنو۔ وہ مثال کہاں ہے؟ یہ تو مستقل علیحدہ کلام ہے، مثل نہیں ہے۔

جواب عجیب وغریب قصہ یا اچھی صفت واچھا واقعہ کو ”مَثَل“ کہتے ہیں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ”مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا“ تو یہاں اس واقعے سے ایک بات سامنے آتی ہے وہ ہے ان کے معبودوں کی انتہائی بے بسی وبے کسی کہ ایک ادنیٰ مخلوق مکھی تو کیا پیدا کر سکتے؟ اگر مکھی ان کی کوئی چیز چھین کر لئے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ ایسی عاجز ومجبور چیز کو

خالق ارض و سماء کے برابر ٹھہرا کر عبادت کرنا انتہائی عجیب ہی نہیں عجیب ترین بھی ہے۔

سوال کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" (اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی) حالانکہ تھوڑے سی رقم چوری کرنے سے قیمتی ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ شادی شدہ مرد عورت کے لئے صرف ایک مرتبہ زنا سرزد ہونے پر سنگ باری کر کے مار ڈالنے کا امر ہے رمضان کے ایک دن کا روزہ بلا عذر افطار کرنے پر دو مہینے روزے رکھنے کا مشکل حکم ہے۔ اسی طرح حج و عمرہ کے لئے مال کثیر خرچ کرنے کا حکم ہے؟۔

جواب اول آیت میں "دین" سے مراد کلمہ توحید ہے۔ کلمہ توحید وہ عظیم کلمہ ہے کہ ستر سال کا کافر اخلاص کے ساتھ اس کو پڑھیگا' تو شرک سے پاک ہوگا۔ ستر سال کے شرک کے لئے کفارہ ہوگا۔ ستر سال کے شرک کو دھونے کے لئے ستر سال اعمال کرنے پر موقوف نہیں ہوتا' اور نہ ہی کسی خاص جگہ اور خاص زمانے کے ساتھ مختص ہے۔ بلکہ جس جگہ اور جس وقت بھی اقرار کریگا۔ کلمہ اپنی تاثیر دکھائے گا۔

جواب ثانی اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان سے جس طرح کا گناہ سرزد ہو جائے اور جس گناہ میں مبتلا ہو جائے اس گناہ سے نکلنے اور اس سے پاک ہونے کا طریقہ بھی کفارہ یا توبہ کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ گناہگاروں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اور معذوروں کے لئے رخصت کی سہولت موجود ہے۔ اور جرم کے ارتکاب کرنے والوں کے لئے کفارہ کی رعایت ہے۔

جواب ثالث نفی حرج کا مطلب ہے کہ بنی اسرائیل پر لاگو مشکل ترین احکامات کی طرح تم پر کوئی مشکل حکم فرض نہیں کیا گیا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے: "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ" (تمہارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے) کیسے فرمایا جبکہ ابراہیم علیہ السلام تمام امتوں کے جد نہیں ہیں؟۔

جواب ابراہیم علیہ السلام حضور ﷺ کے جد امجد ہیں اور آپ ﷺ کے واسطے سے آپ ﷺ کی امت کے جد ہوئے اس لئے کہ رسول کی امت رسول کے لئے اولاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مذکورہ سوال جب پیدا ہوگا اگر "ابیکم" کا خطاب تمام مسلمانوں کو ہے۔ اگر اس کے مخاطب صرف اہل عرب ہوں۔ تو کوئی سوال نہیں ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عرب کے جد ہیں۔

سوال "هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ" اسی نے نام رکھا تمہارا اسلام لانے والے) سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کس وقت ہمیں مسلمان کے نام سے موسوم کیا۔

جواب کعبہ کی تعمیر کے موقع پر ان الفاظ سے دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا: "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا

مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ "

چنانچہ اس امت میں جو بھی اسلام کی دولت سے مشرف ہوا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر ہے اور اسی کی برکت ہے۔ (علامہ رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سوال خواب میں مجھ سے پوچھا گیا تھا۔ اور میں نے خواب ہی میں اس کا جواب دیا تھا)۔

سورۃ المؤمنون

سوال "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ" حفظ فرج کے صلے میں "عن" آتا ہے نہ کہ "علیٰ" اہل عرب کہتے ہیں: "فلان یحفظ فرجه عن الحرام" "علی الحرام" نہیں کہتے؟۔

جواب اول یہاں "علیٰ" "عن" کے معنی میں ہے جیسا کہ شاعر کے اس شعر کے اندر "علیٰ" "عن" کے معنی میں ہے۔

اِذَا رَضِيَتْ عَلَيَّ بَنُوْ قُشَيْرٍ ☆ لَعَمْرُ اللّٰهِ اَعْجَبَنِيْ رِضَاهَا

ترجمہ: جب بنو قشیر مجھ سے خوش ہوتا ہے تو بخدا مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے

جواب ثانی "علی" "حٰفِظُوْنَ" کا صلہ نہیں ہے' بلکہ اس کا متعلق محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے۔ "فلا یرسلونها الا علی ازواجهم"

سوال "اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ" (یا اپنی باندیوں پر) لفظ "ما" غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے باندیوں کے لئے کیسے استعمال ہوا۔ جبکہ باندیاں عاقل ہیں؟۔

جواب ان عقلاء کو غیر عقلاء کے درجے میں رکھا گیا من جملہ ان میں مؤنث ہونے کی وجہ سے کم عقلی ہے۔

سوال "وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ" (اور وہ درخت جو نکلتا ہے سینا پہاڑ سے) اس درخت سے مراد درختِ زیتون ہے۔ یہ صرف طور سینا سے ہی نہیں نکلتا بلکہ دوسری جگہوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

جواب اصل اس کا مقام اور اُگنے کی جگہ طور سینا تھا۔ اس کے بعد وہاں سے دوسری جگہوں میں پھیل گیا۔

سوال "اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ" (یہ لوگ آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں؟ بلکہ یہ رسول ان کے پاس حق بات لیکر آئے ہیں ان میں سے

اکثر لوگ حق بات سے نفرت کرتے ہیں)۔
"اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ" کفار کا قول نقل فرمایا پھر فرمایا ان میں اکثر حق بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ تمام کفار ناپسند کرتے تھے "فهذا كُلُّهم للحق كارهون" ہونا چاہیے؟۔

جواب کفار میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام کو صحیح مذہب سمجھتے تھے مگر برادری قوم، قبیلے کے طعن وتشنیع کے ڈر سے ایمان نہیں لاتے تھے۔ کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر اجنبی دین اختیار کر لیا' جیسا کہ ابوطالب وغیرہ کے بارے میں منقول ہے۔

سوال "فَقَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنَ" (کہے گا اے رب! مجھ پھر بھیج دو) اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہا اور اللہ تعالیٰ واحد ہے اس کے لئے جمع کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا؟۔

جواب یہ جمع، جمع تفخیم وتعظیم ہے۔ جیسا کہ آیت "اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى" میں جمع تعظیم کے لئے ہے۔

سوال "فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ" (اس روز نہ ہی رہیں گے اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَسَآءَلُوْنَ" ایک جگہ فرماتے ہیں "لا يتساء لون" اور دوسری جگہ ارشاد ہے "يتساء لون" دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب قیامت کا دن پچاس ہزار سالوں کے برابر ہے۔ چنانچہ مختلف مقامات اور مختلف احوال سے گذرنا ہوگا۔ بعض احوال میں آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے' بات چیت کر سکیں گے۔ اور بعض احوال ایسے درپیش ہوں گے کہ جن میں شدت خوف وڈر کی وجہ کچھ بول نہیں سکیں گے۔

سورۃ النور

سوال "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا" میں عورت کو اور "اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا" میں مرد کو پہلے لایا گیا' وجہ؟۔

جواب زنا کا سبب شہوت ہے۔ عورت میں مرد کے مقابلے میں شہوت زیادہ ہے اس وجہ سے زنا کی سزا میں عورت کو پہلے ذکر کیا۔ چوری میں چونکہ جرأت اور جسارت درکار ہوتی ہے۔ وہ مرد میں عورت کی نسبت زیادہ ہے' تو سرقہ کی سزا میں مرد کو پہلے ذکر کیا گیا۔

سوال "اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ" (زانی نہیں نکاح کر سکتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ نہیں نکاح کر سکتی مگر زانی یا مشرک سے)

اس آیت میں مرد کو پہلے بیان کیا گیا جبکہ پہلی آیت میں عورت کا ذکر مقدم ہے؟۔

جواب پہلی آیت دونوں کی جنایت کی سزا کے متعلق ہے جسمیں عورت اصل ہے اور دوسری آیت نکاح کے متعلق ہے جس میں مرد اصل ہے' کیوں کہ پیغام نکاح مرد دیتا ہے۔ نکاح کا اظہار بھی مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ بخلاف زنا کے۔

سوال "اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ" (بدکار مرد نہیں نکاح کرتا مگر عورت بدکار سے یا شرک والی سے اور بدکار عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر بدکار مرد یا مشرک)۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کبھی زانی مرد کسی عفیفہ اور مسلمہ سے۔ جبکہ زانیہ کے ساتھ عفیف مرد اور مسلمان مرد نکاح کرتا ہے؟۔

جواب حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں: یہ آیت مکہ کی اُن زانیہ عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی جو خاص جگہوں میں ہوتی تھیں۔ ان جگہوں کو زمانہ جاہلیت میں "المرضیہ" کہا جاتا تھا' تو وہاں ان کے پاس زانی لوگ ہی جایا کرتے تھے۔ کچھ مہاجرین فقراء نے ان عورتوں سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ تو یہ آیت ان لوگوں پر زجر کے لئے اُتری۔

سوال "قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِہِمۡ وَ یَحۡفَظُوۡا فُرُوۡجَہُمۡ" (آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں) ابصار پر "من" داخل ہے۔ "فروجھم" پر نہیں۔ کیوں؟۔

جواب شرمگاہ کے مقابلے میں نظر کا معاملہ زیادہ وسیع ہے۔ کیوں کہ اپنی محارم کے چہروں کی طرف اور ہاتھ پیروں کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ جبکہ ان میں سے کسی کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس لئے "ابصار" پر "من" تبعیضیہ داخل کیا گیا۔

سوال جن لوگوں کے سامنے اپنی زینت کے مواقع کو ظاہر کرنا عورت کے لئے جائز ہے' ان میں ماموں اور چچا بھی شامل ہیں۔ مگر آیت میں ان دونوں کا ذکر نہیں ہے کیا وجہ ہے؟۔

جواب ستر میں نہایت احتیاط سے کام لینے کی طرف اشارہ کرنے سے ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ تاکہ ماموں اور چچا اس کی صفت اپنے بیٹے کے سامنے نہ کریں۔ اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ اس لئے کہ چچازاد اور ماموں زاد محرم نہیں ہوتے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَ لَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا" (اپنی لونڈیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو جب وہ پاکدامن رہنا چاہیں) جبکہ زنا پر مجبور کرنا ہر حال میں حرام وممنوع ہے؟۔

جواب اول اصل میں کفار اپنی لونڈیوں کو ان کے پاکدامن رہنے کی خواہش کے باجود زنا پر مجبور کرتے تھے آیت ان کے متعلق اتری ہے۔ تو یہ شرط نہیں ہے۔

جواب ثانی اللہ تعالیٰ نے ''اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا'' کی شرط اس لئے لگائی کہ ''اکراہ'' (مجبور کرنا) جب ہوتا ہے کہ جب کے زنا نہ کرنے کا قصد ہو۔ اگر پاکدامن نہ رہنا چاہتی ہو۔ تو وہ طبعًا زنا کرے گی۔ اس لئے کہ طبعا ہر وقت زنا کی خواہش میں رہتی ہے۔

جواب ثالث یہاں لفظ ''ان'' ''اذ'' کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ آیت ''وَذَرُوْا مَابَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' میں لفظ ''ان'' اور ارشادِ باری: ''وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' میں ''ان'' ''اذ'' کے معنی میں ہے۔

سوال ''مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ'' (اس کے نور کی مثال ایک طاق کی طرح ہے (اور) اس میں ایک چراغ ہے) اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے دل میں اپنے نور (معرفت وہدایت) کی مثال چراغ سے دی ہے۔ چاند سورج سے نہیں دی ہے۔ حالانکہ چاند سورج کی روشنی چراغ کی روشنی سے بڑھ کر ہے؟

جواب اول مقصود مومن کے دل کے نور کی مثال دینا ہے۔ چونکہ نور دل میں اور دل سینے میں اور سینہ بدن میں ہے۔ اسی طرح چراغ شیشہ میں اور شیشہ طاق میں ہوتا ہے اور نور کی یہ تمثیل صرف چراغ ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔ جبکہ چاند و سورج اس طرح نہیں ہوتے۔

جواب ثانی نور معرفت کے کچھ ذرائع ہیں جن کا پایا جانا ضروری ہے' جیسے ذہن' فہم' عقل' بیدار مغزی اور انشراح قلب وغیرہ' اسی طرح چراغ کے لئے بھی قندیل' تیل' فتیلہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو تمثیل چراغ ہی کے ساتھ دینا مناسب ہوا۔

جواب ثالث سورج کی روشنی عالم سفلی کی طرف متوجہ ہے عالم علوی کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ جبکہ نورِ معرفت نور چراغ کی طرح عالم علوی کی طرف متوجہ ہے۔

جواب رابع سورج کی روشنی تمام مخلوق کو عام ہے۔ جبکہ نور معرفت سب کو عام نہیں چراغ کی روشنی بھی ایسی ہی ہے۔

سوال مذکورہ وجوہ کی بنا پر سورج کی روشنی کے ساتھ تو تشبیہ نہ دی گئی۔ مگر شمع کی روشنی کے ساتھ بھی تمثیل نہیں دی حالانکہ مصباح کے مقابلے میں شمع کی روشنی زیادہ ہوتی ہے؟

جواب شمع کی روشنی کے ساتھ اس لئے تشبیہ نہ دی کہ یہ اغنیاء کے ساتھ مخصوص ہے بخلاف نورِ معرفت کے۔ وہ اغنیا کے مقابلے میں فقراء میں زیادہ ہے۔

سوال "رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" (وہ مرد کہ جو غافل نہیں ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کے ذکر سے) تجارت بیع وشراء دونوں کو شامل ہے۔تجارت کے بعد بیع لانے کا کیا فائدہ؟۔

جواب اول تجارت جو خرید وفروخت کو شامل ہے وہ انسان کا پیشہ ہے جس سے مقصود منافع کمانا ہے۔بیع اس سے عام ہے۔

جواب ثانی بعض علماء نے کہا: یہاں بیع سے مراد آخرت کے بدلے دنیا لینا ہے یعنی دین کے بدلے دنیا کو ترجیح دینا ہے۔جیسا کہ آیت: "فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ"

سوال کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ" (اللہ تعالیٰ نے ہر دابہ کو پانی سے پیدا فرمایا) حالانکہ بعض دابہ (چلنے والی مخلوق) پانی سے پیدا نہیں ہوئی ہیں۔جیسا کہ آدم علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی وغیرہ؟

جواب یہاں آیت میں "ماء" (پانی) سے مراد وہ پانی ہے جو تمام مخلوق کا اصل ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے سے پہلے ایک جوہر پیدا فرمایا۔پھر اس کی طرف بنظر ہیبت دیکھا۔تو وہ پانی میں تبدیل ہوا اس پانی سے تمام مخلوقات کی تخلیق فرمائی۔یہ سوال مع جواب فرمان باری تعالیٰ: "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" کے تحت گذرا ہے۔

سوال اگر یہ بات ہے تو خاص کر دابہ یا حی ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب دابہ کو بطور خاص ذکر اس لئے کیا کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کمال جمادات کے مقابلے میں زیادہ ظاہر ہے۔

سوال فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ج وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ" (ان میں بعضے تو وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعضے ان میں وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں۔اور بعض ان میں وہ ہیں جو چار پر چلتے ہیں)۔عربی قاعدے کے رو سے لفظ "من" عاقل کے لئے اور "ما" غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ آیت میں: "مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ" اور "مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ" میں "من" غیر عاقل کے لئے استعمال ہوا ہے؟

جواب لفظ "دابہ" چونکہ عاقل اور غیر عاقل دونوں کو شامل ہے تو عاقل کو غیر عاقل پر غلبہ دیکر غیر عاقل کے لئے "من" استعمال کیا گیا۔

سوال "مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ" (جو پیٹ کے بل چلتے ہیں) پیٹ کے چلنے کو مشی کے

ساتھ تعبیر کیا۔ حالانکہ پیٹ کے چلنے کو زحف کہتے ہیں؟ مشی پیروں کے چلنے کو کہا جاتا ہے۔

جواب مجازاً مشی فرمایا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے نابالغ لڑکوں کو اس آیت میں اجازت لینے کا کیسے حکم دیا؟ کیسے فرمایا ''وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْکُمْ'' (اور وہ لوگ جو کہ نہیں پہنچتے تم میں عقل کی حد کو) حالانکہ وہ غیر مکلّف ہیں؟۔

جواب یہ والدین کو حکم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ادب وتہذیب سکھادیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے ''وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ'' (اور جو بیٹھ رہی ہیں گھروں میں تمہاری عورتیں) فرما کر بوڑھی عورتوں کو گھر کے مردوں کے سامنے کپڑے اتارنے کا حکم کیسے دیدیا؟۔

جواب یہاں آیت میں ''ثیاب'' سے مراد دوپٹے کے اوپر پہننے والی بڑی چادر ہے۔ تمام کپڑے مراد نہیں ہیں۔

سوال ''وَلَا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْ ، بُیُوْتِکُمْ'' (اور نہیں ہے کوئی حرج تم لوگوں پر کہ کھاؤ اپنے گھروں سے) اپنے گھر میں کھانے میں حرج نہ ہونا ظاہر وواضح ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ پھر ایسا کیوں فرمایا؟

جواب ''مِنْ ، بُیُوْتِکُمْ'' سے ''من بیوت اولادکم'' مراد ہے یعنی اپنی اولاد کے گھروں میں کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لئے کہ انسان کا بچہ اس کا جز اور اس کا بعض ہے۔ اور بعض شئی پر شئی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں اس پر اسکا اطلاق فرمایا۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے: ''ان اطیب ما یأکل الرجل من کسبہ وان ولدہ من کسبہ'' (انسان کی پاکیزہ غذا اُس کی کمائی کی غذا ہے۔ اور اس کا بچہ اس کی کمائی ہے)۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ آیت میں تمام اقرباء کے گھروں کا تذکرہ کیا گیا۔ مگر اولاد کے گھروں کا تذکرہ نہیں ہوا۔ تو ''من بیوتکم'' سے مراد ''مِنْ بُیُوْتِ اَوْلَادِکُمْ'' ہے بعض نے کہا: ''اَنْ تَاْکُلُوْا مِنْ بُیُوْتِکُمْ'' سے مراد ''من مال اولادکم وازواجکم الذین ھم فی بیوتکم'' ہے۔

سوال السلام کا معنی سلامتی اور امن ہے۔ جب انسان دوسرے کو السلام علیکم کہتا ہے تو اس کا مطلب ہے تم مجھ سے امن وسلامتی میں ہو۔ تو آیت: ''فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ'' (جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے اوپر سلام کرو)۔ کا کیا معنی ہوگا۔ اپنے آپ کو امن وسلامتی دینے کا کیا مطب ہے؟

جواب آیت کا مطلب یہ ہے کہ ''جب اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ تو اہل خانہ کو سلام کرو۔

بعض علماء نے کہا ہے: کہ اس کا معنی ہے کہ جب تم مسجد یا کسی گھر میں داخل ہو اور وہاں کوئی موجود نہ ہو تو یوں کہو: "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ" **سوال** "فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ" یہاں خالف کے صلے میں "عن" لایا گیا حالانکہ یہ بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے "خالف امرہ" خالف عن امرہ نہیں کہا جاتا۔

جواب اول لفظ "عن" زائدہ ہے۔ امام اخفشؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔

جواب ثانی یہاں فعل محذوف ہے۔ عن اس کے صلے میں آیا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے۔ "فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ اللّٰہَ تَعَالٰی وَیُعْرِضُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ" یا یہ کہا جائے کہ اس میں تضمین ہے۔ یعنی یخالفون کے ضمن میں معنی اعراض ہے تو اس کے صلے میں عن اس وجہ سے لایا گیا۔

سورۃ الفرقان

سوال جنت کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "وَالْمُتَّقِیْنَ کَانَتْ لَھُمْ جَزَآءً وَّمَصِیْرًا" جب لفظ "کَانَ" گزشتہ (ماضی) کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ متقین ابھی تک جنت میں نہیں گئے ہیں۔ یہ جزاء وانعام بعد میں ہوگا۔ آیت میں کانت کیسے لایا گیا؟۔

جواب اس کو ماضی کے صیغے کے ساتھ اس لئے استعمال کیا گیا کہ اس کا ہونا یقینی ہے۔ چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدے کا وقوع ایسا یقینی ہے جیسا وقوع میں آیا ہوا ہے' اس لئے ماضی کا صیغہ استعمال ہوا' یا اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے۔ ان کو جنت کی صورت میں یہ اجر عظیم ملنا اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہے۔

سوال کیسے فرمایا اللہ پاک نے: "اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَکْثَرَھُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ" کیا آپ خیال کرتے ہیں! کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟۔

جواب یہ سوال مع الجواب آیت: "بَلْ جَآءَھُمْ بِالْحَقِّ وَاَکْثَرُھُمْ لِلْحَقِّ کٰرِھُوْنَ" کے تحت گذر چکا ہے' وہاں دیکھ لیا جائے۔

سوال "اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ" یہ (کفار) چوپایوں کی طرح ہیں) اللہ تعالیٰ نے اپنے نہ ماننے والوں کی تشبیہ چوپایوں کے ساتھ کیسے دی حالانکہ آیت سے ثابت ہے کہ چوپائے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمان باری ہے: "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ" (اور ہر چیز اللہ ہی کی حمد بیان کرتی ہے اور لیکن تم سمجھتے نہیں ہو ان کی تسبیح کو) دوسری جگہ ارشاد ہے: "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ"؟ (تسبیح

بیان کرتی ہے اللہ کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمینوں میں)

جواب اول انعام (چوپایوں) کے ساتھ ان کی تشبیہ رسول کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عدم معرفت میں ہے۔

جواب ثانی دین کے معاملے میں کورے پن اور اندھاپن میں جانوروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

سوال ''اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا'' (اور کچھ نہیں وہ برابر ہیں چوپایوں کے بلکہ وہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں راہ سے)۔

سوال یہ ہے کہ پہلے جملے میں کفار گمراہی میں چوپایوں کے برابر جبکہ دوسرے جملے میں چوپایوں سے بھی گئے گذرے قرار دئے جا رہے ہیں۔ دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟۔

جواب اول پہلے جملے ''اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ'' میں چوپایوں کے ساتھ کفار کی تشبیہ اصل گمراہی میں تشبیہ ہے۔ مقدار گمراہی میں نہیں' جبکہ جملہ ثانیہ ''بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا'' میں مقدار گمراہی بیان کرنا مقصود ہے۔

جواب ثانی بعض علماء نے کہا ہے: کہ پہلے جملے میں بھی جانوروں کے ساتھ تشبیہ مقدار گمراہی میں ہے۔ مگر پہلے جملہ سے ایک طائفہ اور دوسرے جملے سے اس کے علاوہ دوسرا گروہ مراد ہے۔ کفار کے گمراہی میں جانوروں سے بھی بدتر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جانور اپنے مالک کے فرماں بردار ہوتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ بھلائی کرنے والوں کو جانتے ہیں اور ایذاء پہنچانے والوں کو بھی۔ اپنے فائدے کی چیز کو طلب کرتے ہیں اور نقصان دہ چیز سے خود کو بچاتے ہیں۔ جبکہ یہ کفار اپنے مالک حقیقی کے تابعدار نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کو نہیں پہچانتے۔ اور اپنے عظیم فائدے کی چیز عظیم ثواب کے طالب نہیں ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب شدید سے خود کو نہیں بچاتے۔

سوال ''وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا لِنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا'' (اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی پاکی حاصل کرنے کے لئے تاکہ ہم زندہ کر دیں مرے ہوئے دیس کو) میں بلدۃ موصوف' میتا اس کی صفت ہے' مگر موصوف صفت میں تذکیر و تانیث میں مطابقت نہیں ہے' موصوف مؤنث جبکہ صفت مذکر ہے۔

جواب بلدۃ کو مکان اور بلد کے معنی میں لیکر صفت مذکر ہے لفظ کا اعتبار نہیں۔

سوال مذکورہ آیت میں ''ماء'' کو ''طهورا'' کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ اور ''لنحيى به'' سے اس کی علت بیان کی گئی۔ تو مطلب یہ ہوگا۔ بے آباد زمین کو آباد کرنے کے لئے ''ماء

طہور" (پاک پانی) کا ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے؟۔

جواب "وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَا اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا" (اور پلائیں اس کو اپنے پیدا کئے ہوئے چوپایوں اور آدمیوں کو) انسان چونکہ اس پانی سے پیتا ہے اس لئے انسان کے اکرام کے طور پر "ماء" کو طہوریت کے وصف کے ساتھ متصف کیا گیا' ورنہ آبادیٔ زمین کے لئے پانی کا صاف وشفاف اور طاہر ہونا ضروری نہیں۔

سوال "وَنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَا اَنْعَامًا" (ہم اس سے چوپایوں کو پلاتے ہیں)۔ "انعام" کو بطور خاص ذکر فرمایا۔ حالانکہ پانی سے چوپایوں کے علاوہ دوسری مخلوقات بھی بہرہ ور ہوتی ہیں' ان کو بطور خاص ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟۔

جواب اول اس لئے کہ پرندے اور وحشی جانور' عام چوپایوں کے مقابلے میں پانی سے دور رہتے ہیں۔ دوسری وجہ ذکر کی یہ ہے کہ چوپائے انسانوں کے استعمال اور منافع میں آتے ہیں۔ تو انسانوں پر مزید احسان جتلانے کے لئے فرمایا کہ تم اور تمہارے جانور ہمارے اتارے ہوئے پانی سے مسلسل مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔

سوال اس آیت میں پانی سے زمین کی آبادی اور جانوروں کے پینے کو انسانوں سے پہلے بیان فرمایا گیا ہے۔ کیا اس میں کوئی خاص حکمت ہے؟۔

جواب اس لئے کہ انسان کا زندہ رہنا زمین کی آبادی اور چوپاؤں کی زندگی سے مشروط ہے' ذکر کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بارش کا پانی انسانی استعمال سے پہلے زمین پر پڑتا ہے' اس لئے اس کا تذکرہ پہلے کر دیا۔

سوال آیت "قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا" (آپ کہہ دیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری مگر جو کوئی چاہے وہ پکڑ لے اپنے رب کی طرف راستہ) میں من شاء کا ماقبل سے استثنٰی کیسے صحیح ہے؟۔

جواب یہ مستثنٰی متصل نہیں ہے' بلکہ مستثنٰی منقطع ہے' تقدیر عبارت یوں ہے: "لٰكِنْ مَّنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا فانا ادله على ذلك واهديه اليه"

سوال یہاں آیت میں فرمایا جا رہا ہے: "قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ" (آپ کہہ دیجئے میں تم سے (تبلیغ دین کے بدلے) کوئی بدلہ نہیں لیتا) دوسری جگہ ارشاد ہے: "قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" (کہہ دیجئے میں تم سے سوائے رشتے کی محبت کے اور کوئی

اجر طلب نہیں کرتا) پہلی آیت میں ہر قسم کے بدل کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت میں "مودت فی القربیٰ" کو بطور اجر لینے کو کہا ہے دونوں میں تطبیق کیسے "قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ الخ" کا جواب مذکور نہیں ہو گی؟۔

سوال "وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا" (اے اللہ ہمیں متقیوں کا پیشوا بنادے) قاعدے کی رو سے "اماما" کے بجائے "ائمة" ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ "اجعلنا" جمع ہے تو "اماما" "ائمة" جمع آنا چاہیے؟۔

جواب فواصلِ آیات کی رعایت کے لئے مفرد لایا گیا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ تقدیر آیت اس طرح ہے: "وَاجعل کل واحد منّا اماما"

سوال "وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا" (اور وہ لینے آئیں ان کو دعا اور سلام کہتے ہوئے) تحیہ پر سلام کا عطف ہے جو تغایر پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ قرآن وحدیث کے رو سے تحیہ اور سلام مراد ف اور ہم معنی ہیں؟

جواب امام مقاتلؒ فرماتے ہیں: کہ تحیہ سے مراد اہل جنت کا ایک دوسرے کو سلام کرنا یا فرشتوں کا سلام کرنا ہے اور "سلام" سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سلام ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا۔ "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" بعض اہل علم کا کہنا ہے "التحیہ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفے اور ہدایا ہیں اور "سلاما" سے مراد قولاً سلام کہہ دینا ہے۔

سورة الشعراء

سوال ایک جگہ: "فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (پس آپ کہہ دیجئے کہ بیشک میں رب العالمین کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں) میں لفظ رسول کو مفرد اور "انا رسولا ربك" میں لفظِ رسول کو تثنیہ لے آئے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟

جواب اول رسول مرسل کے معنی میں بھی بھی استعمال ہوتا ہے اور بمعنی مصدر بھی استعمال ہوتا ہے دوسری آیت میں بمعنی مرسل ہے جو تثنیہ استعمال کیا گیا ہے اور پہلی آیت میں رسول بمعنی مصدر ہے جو واحد، تثنیہ، جمع، سبھی کے لئے بولا جاتا ہے۔ شاعر کا یہ شعر بھی اس پر دال ہے کہ رسول مصدر کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔ شعر:

لقد کذب الواشون ما بحتُ عندهم ☆ بسرٍّ ولا ارسلتهم برسول

اس شعر میں ''برسول'' برسالۃ (جو مصدر ہے) کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی چونکہ موسیٰ وہارون علیہما السلام۔ دونوں بھائی ہونے میں اور شریعت ورسالت میں متحد ہیں تو گویا وہ نفس واحد کے حکم میں ہیں۔ اس لئے رسول کو مفرد ذکر کیا گیا۔

جواب ثالث اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''ان کل واحد منا رسول رب العالمین''

جواب رابع حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اصل تھے اور ہارون علیہ السلام تابع۔ تو اس نکتے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد رسول کو مفرد ذکر کیا گیا۔

سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کے قتل کے متعلق عذر کرتے ہوئے: ''فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ'' (اس وقت میں کر بیٹھا تھا اور مجھ سے غلطی ہو گئی تھی) فرمایا۔ حالانکہ نبی ضال نہیں ہوتا؟

جواب یہاں ''من الضالین'' سے مراد ''من الجاہلین'' ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت بھی انا من الضالین کے بجائے ''من الجاہلین'' ہے۔ بعض نے کہا ''انا من المخطئين'' ہے اس لئے کہ حضرت موسیٰ نے قبطی کو قتل کے ارادے سے نہیں مارا۔ ''ضل'' خطا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے' اور بعض علماء نے کہا ہے: ضلّ نسیان (بھولنے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ''نسی'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے' فرمانِ باری ہے: ''اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی'' میں ''ان تضل'' ''ان تنسی'' کے معنی میں ہے۔

سوال کیسے کہا فرعون نے ''وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' (رب العالمین کیا ہوتا ہے) لفظ ''ما'' تو غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے؟

جواب اول وہ تو دل کا کورا اور اندھا تھا۔ اللہ کی معرفت سے عاری اور اس کے وجود کا منکر تھا۔ تو وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے' لہٰذا اس سے درست بولنے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

جواب ثانی لفظ ''ما'' غیر عاقل کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ عاقل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں عاقل کے لئے جگہ جگہ لفظ ما استعمال ہوا ہے' فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ'' میں لفظ ''ما'' عاقل کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت ''وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ'' میں لفظ ''ما'' سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔

سوال ''رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ'' (آسمانوں اور زمینوں اور جو زمین وآسمان کے درمیان ہے اس کا رب (اللہ) ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو)۔

اللہ تعالیٰ کے زمین وآسمان کے رب ہونے کو ان کے یقین کرنے سے معلق کیا گیا؟ اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ یقین نہیں کریں گے تو وہ زمین وآسمان کا رب نہیں ہوگا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے؟۔

جواب ''ان کنتم ''میں ''ان'' نافیہ ہے شرطیہ نہیں۔

سوال اوپر والی آیت میں زمین وآسمان کا رب اور جو کچھ زمین وآسمان کے درمیان ہے یعنی تمام مخلوقات کا رب فرمایا۔ اس میں تمام لوگ آگئے پھر آگے ''رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ'' (تمہارا پروردگار اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا پروردگار) اور ''رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا'' (مشرق کا رب اور مغرب کا رب اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے) لانے کا کیا فائدہ؟

جواب امتیازی خصوصیت کی بنا پر ان کو دوبارہ ذکر کیا۔ تاکہ اس سے مزید استدلال کر سکیں۔ چونکہ انسان جو سب سے قریب تر چیز دیکھتا ہے وہ اس کا اپنا نفس ہے۔ اور پھر اس کی اولاد۔ ان کے احوال کی تبدیلی۔ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا یہ سب کچھ انسان کو اس کے صانع کی معرفت کی طرف دعوت فکر دیتے ہیں۔ پھر مشرق ومغرب کو بطور خاص ذکر کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوق ہے آفتاب کے طلوع وغروب کے مقامات میں مختلف موسموں کے اعتبار سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اللہ کے وجود پر واضح اور ٹھوس دلیل دی۔ جس پر کافر (فرعون) کی بولتی بند ہوگئی۔

سوال ''لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ''(تم کو قیدیوں میں سے بنادوں گا) کی بجائے ''لا سجننك ''(میں تمہیں قید کرڈالوں گا) زیادہ مختصر تھا۔ مختصر کو چھوڑ کر طویل کلام کیوں اختیار کیا؟۔

جواب یہ الفاظ مزید ڈرانے کے لئے کہے۔ گویا اس نے کہا میرے جو قیدی ہیں ان کی حالت تمہارے سامنے ہے۔ تم کو بھی انہیں کی طرح سزا دوں گا اس کے قید کرنے کا طریقہ یہ تھا۔ کہ قیدی کو انتہائی گہری اور اندھیری کھائی میں ڈال دیتا کہ جس میں انسانی صورت دیکھنا تو درکنار کچھ سنا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ سزا قتل اور مار ڈالنے سے زیادہ باعث تکلیف تھی۔ اس لئے کہا کہ تمہیں اپنے خاص قیدیوں کے ساتھ رکھوں گا۔

سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون اور ساحروں کے ساتھ ہونے والے واقعے کو سورۃ ''اعراف'' میں پھر سورۃ ''طٰہٰ'' میں اور پھر یہاں ذکر فرمایا ہے تو ان قصوں کو مکرر ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس تکرار کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کافروں کو چیلنج اور ان کے عجز کا بار بار اظہار ہے۔ جیسا کہ برسرِ میدان لڑنے والا میدانِ کارزار میں آکر اپنے مدِ مقابل کو ''نزال نزال هل من مبارز

هل من مبارز" (آؤ میرے مقابلے میں، آؤ میرے مقابلے میں، ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟ ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟)۔ کے الفاظ مکرر کہہ کر دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں چونکہ اس قسم کے قصے بار بار ذکر کیے گئے ہیں اسی وجہ سے قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے "مثانی" (مکرر) نام دیا۔

جواب ثانی حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بعض آپ کے پاس حاضر رہتے، اور بعض غزوات وغیرہ کی غرض سے مدینہ سے غائب رہتے۔ چنانچہ ان غائبین کی آمد پر ان کے اکرام کے طور پر سابقہ آیات جو ان کی غیر موجودگی میں نازل ہوئی تھیں دوبارہ نازل ہوتیں۔ کیوں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نزول وحی کے وقت آپؐ کے پاس حاضری کو پسند فرماتے تھے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو دوسرے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے قصوں کے مقابلے میں زیادہ تکرار کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ کیوں؟۔

جواب اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال حضرت نبی کریم ﷺ کے احوال کے زیادہ مشابہ ہیں۔ بنسبت دوسرے انبیاءِ کرام علیہم السلام کے یعنی دلائل قائم کرنے معجزات کو ظاہر کرنے، اور اہل مکہ کی طرح اہل مصر کے بار بار انکار کرنے میں۔

سوال "فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ" (اور پھر جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں) "تراءی" رؤیت سے تفاعل کا صیغہ ہے جو ایک دوسرے کو دیکھنے کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، حالانکہ منقول یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے تھے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سفید بادل ان کے درمیان حائل کیا تھا جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے؟۔

جواب "الترائی" جس طرح ایک دوسرے کو دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح سامنے اور قریب ہونے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: "المؤمن والکافر لا یتراء یان" یعنی مومن اور کافر ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتے۔ اہلِ عرب کہتے ہیں "دورنا تتراءی" ہمارے گھر آمنے سامنے ہیں۔

سوال "وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ" (جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے تندرستی دیتے ہیں)۔ مرض دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں تو "مَرِضْتُ" کے بجائے "اَمْرَضَنِیْ" (جب وہ مجھے بیمار کرتے) ہونا چاہئے تھا؟۔

جواب ''اَمْرَضَنِیْ'' اس لئے نہیں فرمایا کہ یہ مقام اللہ تعالیٰ کی تعریف کا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے تذکرے کا ہے۔ تو ادب کا لحاظ کرتے ہوئے خیر محض کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی طرف کی اور مرض کی نسبت اپنی طرف۔ اگرچہ تمام امور کے خالق اللہ تعالیٰ ہی ہیں' جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو عیب دار بنانے کی نسبت ''فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَھَا'' کہہ کر اپنی طرف کی۔

سوال مگر ''وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ'' (اور وہ مجھے مار دیتا ہے) میں موت بیمار سے بھی سخت ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اس میں ادب کا لحاظ نہیں رکھا؟۔

جواب موت کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ موت اللہ تعالیٰ سے ملنے اور دار مشقت سے کوچ کر کے دارِ کرامت میں جانے کا ذریعہ ہے۔ گویا ایک نعمت ہوئی۔

سوال کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ''یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ'' (جس روز مال فائدہ دیگا نہ اولاد) حالانکہ وہ مال جو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں اور اللہ کی راہ میں خرچ ہو اور وہ اولاد جو صالح ہوں نفع ہی نفع ہے اور وہ بچہ جو بلوغ سے قبل مر گیا ہو قیامت کے دن اس کی سفارش کریگا۔ قرآن و حدیث میں اس کے شواہد موجود ہیں خصوصاً ''اذا مات ابن آدم ینقطع عملہ الا من ثلاث'' والی حدیث بطورِ خاص اس پر دال ہے کہ مال و اولاد نفع دیں گے؟۔

جواب آیت کا مطلب یہ ہے غیر مؤمن کو فائدہ نہیں دیں گے۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ مال سے مراد وہ ہے جو راہِ الٰہی اور طاعت خداوندی میں خرچ نہ ہو' اور ولد سے مراد ولدِ بالغ غیر صالح ہے۔

سوال کیسے فرمایا اللہ پاک نے: ''وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ'' (جنت قریب کر دی گئی مؤمنین کے) جبکہ جنت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والی چیز نہیں ہے؟۔

جواب یہاں قلب ہے۔ یعنی عبارت یوں ہے: ''وَاُزْلِفَتِ الْمُتَّقُوْنَ اِلَی الْجَنَّۃِ'' (پرہیزگاروں کو جنت کے قریب کر دیا گیا) جیسا کہ حجاج کرام مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ کر کہتے ہیں) ''قرب مکۃ منا'' (مکہ ہمارے قریب آ گیا) یا عام مسافر کسی شہر جاتے وقت اس کے قریب آنے سے اس کا نام لیکر کہتا ہے مثلاً کراچی آ گیا۔ اور بعض علماء نے کہا ہے: کہ جنت محجوب ہے۔ جب ان کے اور جنت کے درمیان حجابات رفع ہو گئے تو گویا وہ قریب ہو گئی۔

سوال ''فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ'' (نہیں ہے ہمارے لئے کوئی سفارش کرنے والا اور نہ ہی کوئی گہرا دوست) شافعین کو جمع اور صدیق کو مفرد کیوں ذکر کیا گیا؟۔

جواب عام طور پر سفارش کرنے والے زیادہ اور دوست کم ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ

لفظ صدیق جمع کے معنی میں ہو جیسا کہ لفظ عدو جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

سوال "اَمَدَّكُم بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ" (اس نے پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے) آیت مذکور میں "انعام" (چوپایوں) کو "بنین" (بیٹوں) کے مقارن کر کے کیوں بیان کیا گیا؟۔

جواب چونکہ اہلِ عرب کے ہاں "انعام" قیمتی ترین اموال میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان کے بیٹے ان چوپایوں کی حفاظت کیا کرتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ اس لئے دونوں کو ملا کر بیان کیا گیا۔

سوال "فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نَادِمِيْنَ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ" (اس (اونٹنی) کو ذبح کیا۔ پس اس سے نادم ہوئے تو عذاب نے ان کو پکڑ لیا)

نادم اور پشیمان ہونے کے باوجود عذاب کیسے آیا۔ جبکہ فرمانِ رسولؐ ہے "الندم توبة" (پشیمان ہونا ہی توبہ ہے) توبہ کے بعد تو عذاب نہیں آتا بلکہ گناہ معاف ہو جاتا ہے؟

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: کہ یہ لوگ عذاب دیکھ کر نادم ہوئے اور وہ توبہ کا وقت نہیں ہے یعنی وہ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: "وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ"

سوال حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان سے گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہوتا جب ایسا ہے تو حضرت لوط علیہ السلام نے یہ دعا کیوں کی: "رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ" (اے میرے رب مجھ کو اور میرے اہل کو قوم کے عمل (بدکاری) سے نجات دیجئے)۔

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اور میرے اہل کو قوم کے عمل کی سزاء سے بچائیے۔

سوال یہاں "اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ" فرمایا "اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ شُعَيْبٌ" نہیں فرمایا۔ جیسا کہ دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے تذکرے میں "اخوہم" فرمایا۔ خود حضرت شعیبؑ کے متعلق دوسری آیت میں "اخوہم" فرمایا ہے۔ یہاں "اخوہم" کیوں نہیں فرمایا؟

جواب چونکہ یہاں اصحاب مدین کے ساتھ اصحاب الایکۃ کا بھی ذکر ہے ان کی طرف بھی آپؑ مبعوث تھے مگر وہ لوگ آپؑ کی قوم کے نہیں تھے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اہل مدین میں سے تھے۔ اور اہل مدین اور اصحاب الایکۃ کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن ابن جریر طبریؒ نے کہا: اصحاب مدین ہی اصحاب ایکۃ ہیں۔ اگر یہ قول درست ہو تو "اخوہم" کو چھوڑنا تخفیف کے لئے ہوگا۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کاہنوں اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کے لئے: "اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ" (جھوٹے

گنہگار) کہا۔ پھر ان کے متعلق فرمایا: "وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ" (اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں) حالانکہ "افاک" بھی جھوٹے کو کہتے ہیں۔ دونوں جملوں میں بظاہر تعارض ہے۔ تطبیق کی کیا صورت ہے؟

جواب "وَاَكْثَرُهُمْ" میں "ہم" ضمیر شیاطین کی طرف لوٹ رہی ہے "کل افاک" کی طرف نہیں۔

سورۃ النمل

سوال "وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ" (اور واضح کتاب) میں "کتاب" کو نکرہ لانے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب اس کا فائدہ تفخیم و تعظیم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول "فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ" میں۔

سوال "تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ" (یہ آیتیں ہیں قرآن کی اور واضح کتاب کی) "کتاب" کا عطف "القرآن" پر ہے۔ اور عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے حالانکہ کتاب سے مراد بھی قرآن ہے؟

جواب بقول بعض علماء کے اگر "کتاب مبین" سے مراد قرآن ہی ہو تو یہ کہا جائے گا کہ مغایرت کی دو قسمیں، لفظی اور معنوی، یہاں معنوی مغایرت تو نہیں ہے البتہ لفظ قرآن اور لفظ کتاب میں بہر حال مغایرت ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر کا شعر ہے۔ "فالفی قولها کذبا و مینا" "کذب" پر "مینا" کا عطف ہے۔ حالانکہ معنوی لحاظ سے کذب اور مینا ہم معنی ہیں کوئی مغایرت نہیں۔ البتہ لفظی مغایرت ہے۔

سوال ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ" (جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کرتے ہیں)۔ جبکہ دوسری آیت میں فرماتے ہیں: "وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ" (شیطان ان کے اعمال کو ان کے لئے مزین کرتا ہے) دونوں میں کیا تطبیق ہوگی؟

جواب اللہ تعالیٰ کا ان کے اعمال کو مزین کر دینا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر خواہشات اور شہوت کو پیدا کیا۔ شیطان کی تزیین وسوسہ ڈالنا، برائی کی طرف لیے جانا ہے۔ لہٰذا تزیین کی نسبت دونوں کی طرف درست ہے۔

سوال "اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ" (کہا موسیٰ نے

اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر) یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں نے آگ دیکھی ہے۔ وہاں سے کوئی خبر یا روشنی لیکر آؤں گا۔ سورۃ طٰہٰ میں شک کے ساتھ فرمایا: ''لَعَلِّیٓ اٰتِیۡکُمۡ'' شاید (کہ میں تمہارے پاس لے آؤں)۔ ایک جگہ قطعی اور ایک جگہ امید کے ساتھ بیان کیا' حالانکہ واقعہ ایک ہے؟۔

جواب کبھی کسی کام کی امید رکھنے والا اپنی امید کے پوری ہونے کی قوی امید کرتا ہے اسی طرح یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ''سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡهَا بِخَبَرٍ'' فرمایا۔

سوال ''فلمّا جَآءَ هَا نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِكَ مَنۡ فِی النَّارِ وَمَنۡ حَوۡلَهَا'' (سو جب اس آگ کے پاس پہنچے تو ان کو آواز دی گئی کہ جو اس آگ کے اندر ہے اس پر بھی برکت ہو اور جو اس کے پاس (یعنی موسیٰ) ہے اس پر بھی)۔

سوال یہ ہے کہ اس آگ کے اندر کوئی نہیں تھا۔ بقول جمہور وہ ایک نور تھا۔ بقول بعض وہ پہلے آگ تھی بعد میں نور میں تبدیل ہوئی پھر ''اَنۡۢ بُوۡرِكَ مَنۡ فِی النَّارِ'' کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب اول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے' مقدس ہے وہ ذات جو اس آگ سے آواز دے رہی ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شئی میں حلول کر جاتے ہیں بلکہ حضرت موسیٰ کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آواز اس آگ سے آ رہی ہے۔

جواب ثانی لفظ ''مَنۡ'' زائد ہے۔ تقدیر عبارت ''بُوۡرِكَ فِی النَّارِ'' ہے۔

جواب ثالث اس کا مطلب ہے ''اَنۡۢ بُوۡرِكَ مَنۡ فِیۡ طَلَبِ النَّار'' یعنی مضاف محذوف ہے۔

سوال ''اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ اِلَّا مَنۡ ظَلَمَ'' (بیشک ہمارے حضور میں پیغمبر ڈرا نہیں کرتے مگر وہ جس سے کوئی قصور ہو جائے) میں ''من ظلم'' کا استثناء ''المرسلون'' سے کیسے درست ہوگا؟۔

جواب اس میں کئی توجیہات ہیں۔

پہلی توجیہ: یہ ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہے یعنی ''الا'' لکن کے معنی میں ہے۔

دوسری توجیہ: یہ ہے کہ '' الّا من ظلم منهم بارتکاب الصغیرة'' ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام' حضرت یونس علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ کہ یہ لوگ اپنے کئے پر خوف زدہ ہیں۔ باوجود اس یقین کے اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہیں تو تقدیر کلام یوں ہوگی۔ ''اِلَّا مَنۡ ظَلِمَ مِنۡهُمۡ فَاِنَّهٗ یَخَافُ' فَمَنۡ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسۡنًاۢ بَعۡدَ سُوۡٓءٍ فَاِنِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡم'' یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے کہا ''الا من ظلم'' پر وقف ہے۔ کلام ثانی جہاں وقف کے بعد

ابتداء ہوگی محذوف ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

تیسری توجیہ: لفظ "الا" "لا" کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ آیت: "لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ" میں "الا" "لا" کے معنی میں ہے۔

چوتھی توجیہ: تقدیر عبارت یوں ہے: "اِنِّىْ لَا يَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ ولا غير المرسلين الا من ظلم"۔

سوال "عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا" (ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی) حضرت سلیمان علیہ السلام نے خود کو تعظیماً "نا" ضمیر جمع سے ذکر کیا۔ یہ طریقہ متکبرین کا ہے۔ ایسا کیوں کیا؟۔

جواب اول یہ نون نونِ عظمت نہیں ہے۔ یعنی اس سے صرف خود کو مراد نہیں لیا بلکہ اپنے نفس اور اپنے والد کو مراد لیا۔

جواب ثانی حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ بھی تھے اس لئے بادشاہ کی سیاست کی رعایت کرتے ہوئے شاہانہ کلام کیا۔

سوال "لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا" (میں اس (ہدہد) کو سخت سزا دوں گا)

ہدہد کو عذاب دینا آپ کے لئے کیسے حلال ہوگیا؟۔

جواب ان کی بادشاہت سب پر تھی' اس لئے بادشاہ کے لئے سزا دینا جائز ہے۔

سوال "وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ" (اور اس کے لئے عرش عظیم ہے) ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظیم مملکت اور عظیم قوت دیکھنے اور جاننے کے باوجود بلقیس کے تخت کو عظیم کیوں کہا؟۔

جواب اول ممکن ہے ہدہد نے بلقیس کے حال کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حال سے کم تر سمجھ کر اس تخت کو اس کی حیثیت سے بڑا سمجھا ہو۔

جواب ثانی یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مملکت کے عظیم الشان ہونے کے باوجود ان کا تخت بلقیس کے تخت کے برابر نہ ہو۔ بعض دفع ایسا ہوتا ہے ایک مملکت کی ایک چیز ہوتی ہے دوسری میں نہیں ہوتی۔

سوال سلیمان علیہ السلام کے اس قول: "وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَىْءٍ" (ہمیں ہر چیز دی گئی ہے) کے باوجود ہدہد نے بلقیس کے بارے میں "وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ" (بلقیس کو ہر چیز دی گئی ہے) کیسے کہا؟۔

جواب دونوں میں فرق ہے۔ ہدہد نے "وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" سے اسباب دنیا مراد لیئے ہیں۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے فرمان "وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ" سے اسباب دین و دنیا دونوں مراد ہیں۔ "منطق الطیر" پر عطف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سوال ہدہد نے بلقیس کے تخت کی صفت "لَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ" کہہ کر اس کو اللہ کے عرش کے برابر ٹھہرایا' اس لئے کہ عرش الٰہی کی صفت بھی عظیم آتی ہے؟۔

جواب دونوں وصفوں میں فرق عظیم ہے۔ بلقیس کے تخت کی عظمت دنیاوی بادشاہوں کے تختوں کے مقابلے میں ہے۔ جبکہ اللہ کے عرش کی صفت عظیم سے کرنا اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات اور زمین و آسمان کے مقابلے میں۔

سوال "فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ" (میرا خط لے جا اور اس کو ان کے پاس ڈال دینا پھر ہٹ جانا' پھر دیکھنا کہ آپس میں کیا سوال و جواب کرتے ہیں)۔

سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہدہد سے فرما رہے ہیں کہ خط دیکر ایک طرف کو ہو جانا پھر خط کے متعلق ان کی گفت و شنید کے بارے مطلع کرنا۔ ھدھد ایک طرف کو ہو کر ان کی گفتگو کو کیسے سن سکے گا؟۔

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ خط دیکر ایک طرف چھپ جا اور پھر ان کی باتیں سن۔

جواب ثانی آیت میں تقدیم و تاخیر ہے: اصل میں "فَانْظُرْ مَا ذَا يَرْجِعُوْنَ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ" ہے۔

سوال حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو خط لکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نام سے پہلے اپنے نام کا ذکر کرنا کیسے جائز سمجھا چنانچہ فرمایا: "اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" ؟ (وہ خط ہے سلیمان کی طرف سے اور وہ یہ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے)

جواب حضرت سلیمان علیہ السلام جانتے تھے کہ بلقیس اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتی۔ اور سلیمان علیہ السلام کے نام سے واقف ہے۔ تو اندیشہ کیا کہ پہلی نظر پڑتے ہی اللہ تعالیٰ کے نام کی بے حرمتی نہ کر بیٹھے۔ تو اپنے نام کو نام الٰہی کے لئے وقایہ بنایا۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اوپر عنوان سلیمان علیہ السلام کے نام کا تھا۔ اور مضمون کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے نام سے تھی۔

سوال "آصف" سلیمان علیہ السلام کا کاتب اور ان کا وزیر تھا۔ نبی نہیں تھا کیا وجہ ہے کہ غیر نبی تو تخت بلقیس کو چشم زدن میں حاضر کرنے پر قادر ہے اور نبی نہیں ہے؟

جواب یہ ممکن ہے۔ کہ غیر نبی کو بعض دفع کوئی ایسی کرامت دی جائے۔ جس میں نبی شریک نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت مریم علیہ السلام کو جنت کے پھل بے موسم دئے جاتے تھے اور حضرت زکریاؑ کو نہیں دیے جاتے تھے اور جس طرح حضرت سلیمانؑ جب اپنی قوم کے ساتھ پانی کی تلاش میں باہر نکلے تو ایک چیونٹی کو چت لیٹے پانی مانگتے ہوئے دیکھا تو اپنی قوم سے فرمایا: کہ واپس لوٹ جاؤ۔ تمہارے غیر کی دعا سے تمہیں پانی ملیگا۔ تو دیکھئے اس سے حضرت سلیمان علیہ اسلام پر چیونٹی کی فضیلت لازم نہیں آتی۔ حدیث میں آتا ہے آپ ﷺ جب کسی غزوے کے لئے جانے کا ارادہ فرماتے۔ تو فقراء مہاجرین وانصار سے فرماتے۔ ہمارے لئے نصرت الٰہی کی دعا کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری دعاء سے ہماری مدد فرمائیں گے۔ تو اس سے فقراء کا آپ ﷺ سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ تابع کی کرامت دراصل متبوع کی کرامت ہے۔ حضرات علماء کرام نے فرمایا: وزیر سلیمان علیہ السلام "آصف" کے پاس اسم اعظم تھا۔ اس کے ذریعے دعا فورا قبول ہوئی۔ اسم اعظم کیا ہے۔ (البند نجمی فرماتے ہیں لفظ "اللہ" ہی اسم اعظم ہے۔ بعض نے کہا: "یاحیّ یا قیوم" ہے بقول بعض "یاذاالجلال والاکرام" ہے بعض نے کہا: "یا اللہ یا رحمٰن" ہے بعض کا کہنا ہے کہ: "یاالھنا الہ کل شیء الھا واحدا لاالہ الا انت" ہے خلاصہ یہ کہ جو شخص نیت کو خالص کر کے شرائط دعا کی پابندی کرتے ہوئے ان اسماءِ گرامی کے توسط سے دعا کرے گا ضرور قبول ہوگی۔

سوال بلقیس نے کیسے کہا کہ "وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" (میں سلیمان کے ساتھ اللہ جورب العالمین ہے کے لئے مسلمان ہوئی) حالانکہ بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں مسلمان ہوئی ان کے ساتھ مسلمان نہیں ہوئی تھی؟۔

جواب وہ چونکہ بادشاہ تھی۔ اس لئے اسنے ایسی تعبیر اختیار نہیں کی جس سے اسلام لانے کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی غلامی میں آنے کی طرف اشارہ دیتی۔ اگرچہ حقیقت ایسی ہی ہے۔

سوال کیسے فرمایا اللہ پاک نے: "قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ" (آپ کہہ دیجئے نہیں جانتے وہ جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں غیب کو مگر اللہ تعالیٰ) حالانکہ ہم بھی جنت، جہنم، قیامت کے احوال کو جانتے ہیں؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر سمجھانے والے (معلم) کے خود کوئی نہیں جانتا۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ یا مطلب یہ ہے کہ علم غیب کلی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ: زمین وآسمان کے پوشیدہ راز سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو معلوم نہیں۔

سوال ''بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وقف بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ'' (بلکہ تھک گیا ان کا فکر آخرت کے بارے میں۔ بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں۔ بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں)۔ سوال یہ ہے کیا ''علمھم'' میں ''ھم'' ضمیر اور ماقبل ''یشعرون'' اور ''یبعثون'' کی ضمیروں کا مرجع ایک ہی ہے۔ یا علیحدہ علیحدہ؟ اس کی ماقبل اور مابعد کے ساتھ کیا مطابقت ہے؟ پہلے ان سے شعور کی نفی کی پھر کمال علم کی پھر بتایا وہ شک میں ہیں پھر ان کو نابینا کہا؟۔

جواب ''بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ'' کی ضمیر کا مرجع صرف کفار ہیں۔ اور ماقبل کی ضمیروں کا مرجع ''جَمِيْعُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' ہیں اور بل ادّارک کے معنی ''تلاحق واجتمع'' کے ہیں۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی: ''حَتّٰى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا'' میں ہے ''ادّارک'' کی اصل ''تدارک'' ہے تاء کو دال میں مدغم کر دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ''جس کے متعلق دنیا میں جاہل تھے آخرت میں یہ جہالت دور ہوگی' سب کچھ جان لیں گے۔ اسعدی فرماتے ہیں: اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے (کہ قیامت کے دن ان کے علم مجتمع ہوں گے' نہ شک رہے گا نہ اختلاف میں پڑیں گے)۔

مقاتلؒ فرماتے ہیں: جس کے متعلق دنیا میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں آخرت میں وہ سب کچھ جان لیں گے۔ تو فرمانِ تعالیٰ: ''بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا الخ'' بلکہ وہ آخرت سے آنکھ بند کئے ہوئے ہیں۔

پہلے ان کو نفی شعور کے ساتھ پھر کمالِ علم پھر شک پھر اندھا پن کی صفت کے ساتھ متصف کرنے میں اختلاف زمانہ کی وجہ سے کوئی تناقض نہیں ہے۔ یا ان امورِ مذکورہ (شعور' علم' شک' عمی) کے متعلقات کے مختلف ہونے کی وجہ سے بھی تناقض کا امکان نہیں ہے۔

سوال ''اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ'' (تیرا رب ان میں فیصلہ کریگا اپنے حکم سے)۔ سوال یہ ہے۔ قضا اور حکم کا معنی ایک ہے ان میں کوئی فرق نہیں یہ گویا ایسا فرمایا گیا: ''اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بقضائه یا'' ان ربك یحکم بینهم بحکمه ''یعنی قضا کے ساتھ حکم کا کیا فائدہ۔

جواب بحکمہ کا معنی ہے بعدلہ۔ محکوم بہ کو حکم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور علماء نے کہا: ''بحکمه'' کا معنی ہے ''بحکمته'' ''بِحِكَمِهٖ'' کی قراءت سے اس معنی کی تائید ہو رہی ہے' جو حکمت کی جمع ہے۔

سوال کیسے فرمایا اللہ پاک نے: ''اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'' (ایمان والوں کے

لئے اس میں بہت ساری نشانیاں ہیں) حالانکہ اس میں تمام عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ صرف مؤمنین کے لئے تو خاص نہیں ہیں؟۔

جواب اصل میں ان عبرتوں اور نشانیوں سے مؤمنین ہی منتفع ہوتے ہیں اس لئے بطورِ خاص ان نام لیکر تذکرہ کیا گیا۔

سوال ''وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ'' (جس دن پھونکا جائیگا صور تو گھبرا جائیں گے) ''فزع'' کے بجائے ''یفزع'' ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کا اب تک وقوع نہیں ہوا ہے۔ ماضی کا صیغہ نہیں بلکہ مضارع کا صیغہ استعمال ہونا چاہئے۔

جواب اصل میں اس کا وقوع یقینی ہے۔ لامحالہ ہوکر رہیگا۔ اس لئے ماضی سے تعبیر فرمایا یعنی اس کا وقوع گویا ہو چکا ہے۔

سوال ''وَكُلٌّ اَتَوْهُ دَاخِرِيْنَ'' (اور سب چلے آئیں گے اس کے آگے عاجزی سے) اس میں حضرات انبیاء کرام' صدیقین' شہداء بھی داخل ہیں۔ حالانکہ وہ معزز ومکرم ہوکر داخل ہوں گے؟۔

جواب اس عاجزی سے عبودیت کی عاجزی مراد ہے۔ گناہوں اور معاصی کی وجہ سے عاجز ہونا مراد نہیں ہے عبودیت کی عاجزی عام ہے۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: ''اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا''

سورۃ القصص

سوال ''وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ'' (ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ) والدہ چونکہ خود بخود دودھ پلاتی ہے۔ کوئی کہے یا نہ کہے۔ تو دودھ پلانے کا حکم دینے کا کیا فائدہ؟۔

جواب دودھ پلانے کا حکم اس لئے دیا تا کہ موسیٰ علیہ السلام ان کے دودھ کے ساتھ مالوف اور مانوس ہو جائیں۔ اور فرعون کے ہاتھ میں جانے کے بعد دوسری دودھ پلانے والیوں کے دودھ کو قبول نہ کریں۔ اگر دودھ پلانے کا حکم نہ ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ وہ جلدی دودھ نہ پلاتیں۔ بعد میں کسی دوسری مرضعہ کے دودھ کو قبول کر لیتے۔

سوال کیسے فرمایا گیا: ''فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ'' (پھر جب تم کو ان کی نسبت اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا نہ تو اندیشہ کرنا نہ غم کرنا) ''اِذَا خِفْتِ''

"وَلَا تَخَافِي" میں بظاہر تناقض معلوم ہو رہا ہے؟۔

جواب تناقض کوئی نہیں ہے۔اس لئے کہ آیت کا مطلب ہے۔اگر فرعونیوں سے ان کے قتل کیے جانے کا اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈالنا۔اور دریا میں ڈالکر ان کے ضائع ہونے کا خوف نہ کرنا۔

سوال کیا خوف اور حزن میں فرق ہے کہ ان کو عطف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو مغایرت پر دلالت کرتا ہے؟۔

جواب ہاں ان کے درمیان فرق ہے' خوف کہتے ہیں مستقبل میں پہنچنے والی مصیبت پر غم کو۔اور حزن کہتے ہیں گذشتہ مصیبت پر لاحق ہونے والے غم کو۔

سوال حضرت موسیٰ نے کافر قبطی کے قتل کو عمل شیطان اور خود کو ظالم کیسے قرار دیا اور اس پر استغفار کیوں کیا؟۔

جواب کافر کے قتل کو عمل شیطان اس لئے قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتل کی اجازت ملنے سے پہلے قتل کر دیا۔یہ ایک خطاء ہے جس پر استغفار کیا جا سکتا ہے۔ابن جریج فرماتے ہیں کہ کسی نبی کو اجازت ملنے سے قبل کسی کو مارنا مناسب نہیں ہے۔

سوال "اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا" (میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلہ میں دے تجھ کو حق اس کا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو)

حضرت موسیٰ نے ان کی دعوت کو کیسے قبول کیا جبکہ انہوں نے کسی اجرت لینے کے لئے پانی نہیں پلایا تھا؟۔

جواب ہوسکتا ہے حضرت موسی علیہ السلام نے اس لڑکی اور ان کے والد کی دعوت کو محض بوجہ اللہ سمجھ کر قبول کیا ہو۔اگر چہ وہ لڑکی اس کو اجرت کے عنوانات سے تعبیر کر رہی تھی۔اس جواب کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں یہ فرمایا گیا کہ جب موسی علیہ السلام کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔میرا تعلق ایسے گھرانے سے ہے کہ ہم دنیا کے بدلے دین کو نہیں بیچتے۔اگر چہ زمین بھر سونا کیوں نہ دیا جائے۔اور نہ ہی کسی نیکی پر کوئی دنیاوی اجرت لیتے ہیں تو حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: ہم صرف آپ کو نہیں کھلا رہے ہے بلکہ یہ ہماری عادت ہے ہمارے ہاں جو بھی مہمان آتا ہے اس کے ساتھ ہمارا یہی معاملہ ہوتا ہے۔

سوال "وَاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ" (اور ملا لے اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے)

یہاں "جناح" کو مضموم بنایا گیا اور سورۃ "طٰہٰ" میں "جناح" کو مضموم الیہ بنایا گیا۔جبکہ قصہ و واقعہ

ایک ہی ہے؟

جواب یہاں ''جناح المضموم'' سے داہنا ہاتھ مراد ہے اور سورۃ طہٰ میں ''جناح المضموم الیہ'' سے مراد بائیں طرف کا پہلو یعنی کہنی سے بغل تک کی جگہ مراد ہے۔

سوال ''وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ'' کا کیا معنی ہے؟

جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب سانپ سے ڈر محسوس کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے ساتھ لگالیں تا کہ خوف جاتا رہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جسم کے ساتھ بازو چمٹ لینے کو ڈر ختم ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ اس لئے امام مجاہدؒ فرماتے ہیں: جو شخص کسی سے خوف زدہ ہو اور وہ اپنے بازوؤں کو اپنے سے چمٹا لے تو اس کا خوف جاتا رہے گا۔ جبکہ ابوعلی کہتے ہیں ضم جناح سے مراد بازوؤں کو ملانا نہیں ہے بلکہ عزم اور مطلوب میں خوب کوشش کرنا ہے اور بعض نے کہا اس میں تقدیم وتاخیر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''ولّی مدبرا من الرھب'' ہے۔

سوال ''فَاَرْسِلْهُ مَعِىَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِىْٓ'' (سو اس (ہارون) کو بھیج میرے ساتھ مدد کو کہ میری تصدیق کر) حضرت ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰؑ کی تصدیق کا کیا فائدہ؟ جب کہ بڑے بڑے معجزوں سے فرعون کو کوئی فائدہ نہیں ہوا؟

جواب ''رِدْاً يُّصَدِّقُنِىْٓ'' کا معنی یہ نہیں ہے کہ فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دے ''صدقت'' (تو سچ کہہ رہا ہے) بلکہ اس سے مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کو واضح طور پر بیان کرے۔ یہ ان کی تصدیق کا سبب بنے گا اور پچھلا جملہ ''هُوَ اَفْصَحُ مِنِّىْ لِسَانًا'' بھی یہی بتا رہا ہے۔

سوال ''وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِىِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ'' (اور تو نہ تھا غرب کی جانب جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم) فرمانے کے بعد ''وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ'' لانے کی ضرورت نہ تھی؟

جواب اس کا مطلب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت شعیب کے ساتھ واقعہ میں آپ حاضر نہ تھے۔ دونوں قضیے جدا جدا ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ'' (بیشک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا) جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سارے ظالم جو کفر و شرک اور عصیان میں مبتلا ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام اور ہدایت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں؟

جواب یہ سوال مع جواب سورۃ مائدۃ میں گذر چکا ہے۔

سوال اللہ پاک نے کیسے فرمایا: ''وَرَاَوُا الْعَذَابَ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ'' عذاب کو تو گمراہ دیکھتا ہے نہ کہ ہدایت یافتہ؟۔

جواب ''لو'' کا جواب محذوف ہے مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے تو ان کی اتباع نہ کرتے اور عذاب نہ دیکھتے۔

سورۃ العنکبوت

سوال ایک جگہ قرآنِ مقدس میں فرمان باری تعالیٰ ہے: ''وَمَاهُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ'' (حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی نہیں لے سکتے) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ'' (اور یہ لوگ اپنے گناہ اوپر لادے ہوں گے ساتھ کچھ گناہ اور ہیں)۔

جواب مطلب یہ ہے کہ کافر مسلمانوں کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے بلکہ اپنے گناہوں کا وزن مسلمانوں کو خود اٹھانا پڑے گا۔ تاہم کافر اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ ساتھ ان دیگر کافروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جو ان کے سبب گمراہ ہوئے۔ یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کی غلطیوں کا بوجھ بھی کافروں پر لاد دیا جائیگا۔ جیسے کہ سورۃ انعام اور سورۃ بنی اسرائیل میں ارشادِ خداوندی ہے: ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى'' (اور کوئی شخص کسی کا بوجھ نہ اٹھادے گا)۔

سوال قرآن مقدس میں نوسو پچاس کے عدد کو ''اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا'' (رہے پچاس سال کم ایک ہزار برس) سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ اہل حساب کی عادت یہی ہے کہ وہ اس عدد کے لئے نوسو پچاس کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔؟

جواب اول حضرت نوحؑ کا یہ قصہ جس میں آپؑ کے امت کی جانب سے پیش آمدہ آزمائشوں پر صبر کا تذکرہ ہے آنحضرتﷺ کی تسلی کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یقیناً سب سے بڑا عدد ذکر کرنا جس سے بڑا کوئی عدد نہ ہو حصولِ مقصد کے لئے سب سے بہتر ہے۔ سامع جب ہزار کا لفظ سنتا ہے تو اسے مدتِ صبر بڑی طویل معلوم ہوتی ہے۔

جواب ثانی اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر نوسو پچاس کا عدد استعمال کرتے تو ہوسکتا تھا کہ لوگ اس عدد کو مجازی طور پر کثرت کے لئے مستعمل سمجھتے۔ البتہ ''ہزار مگر پچاس'' کے استعمال سے یہ وہم ختم ہوجاتا ہے یا کم از کم عقلی طور پر بعید ہی معلوم ہوتا ہے۔

سوال ایک ہی آیت میں ایک بار لفظ سَنَة کو بطور تمیز ذکر کیا گیا جبکہ دوسری بار لفظ عام کو بطور تمیز ذکر کیا گیا۔؟

جواب اس لئے کہ اگر تکرارِ لفظ سے تعظیم شان یا ڈرانا وغیرہ مقصود نہ ہو تو فصحاء بلغاء کے نزدیک اس سے اجتناب ضروری ہے۔

سوال ”اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَايَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ“ (تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو) اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک بار لفظ رزق کو نکرہ اور دوبارہ معرفہ کیوں ذکر کیا؟۔

جواب اس لئے کہ معبودانِ باطلہ تمہیں کسی قسم کے رزق کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، پس ہر قسم کا رزق اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس تلاش کرو۔ کیونکہ وہی اکیلا رزّاق ہے۔ جس کے علاوہ کوئی رزق نہیں دے سکتا۔

سوال ”قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ“ (آپ کہیئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور اول پیدا کیا) اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان میں اسم باری تعالیٰ کو بطور ضمیر ذکر کیا اور پھر ”ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ“ (پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کریگا) میں بطور اسمِ ظاہر کے۔ حالانکہ قیاس کا تقاضہ یہ تھا کہ یوں ارشاد ہوتا ”كيف بدا الله الخلق ثم يُنشِىء النشاة الآخرة“؟۔

جواب اس لئے کہ ضمیر سے اسم ظاہر کی طرف اعادہ خبر کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ پھر لفظ اللہ کو مبتداء بنانا اہتمام شان کی وجہ سے ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے تعریف واحسان کے موقع پر یوں کیوں ارشاد فرمایا کہ ”وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا“ (اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں دیں تھیں) حالانکہ دنیا کا اجر فانی ہے جبکہ آخرت کی نعمتیں دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ پس آخرت کی نعمتوں کا ذکر زیادہ مناسب تھا؟۔

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں دنیا کا وہ اجر دیا جائیگا جو آخرت کے اجر سے ملا ہوا ہوگا اور دنیاوی اجر کے سبب اخروی اجر میں کسی قسم کا نقص بھی وارد نہیں ہوگا۔ علامہ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ ”وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ“ (اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے) میں اسی طرف اشارہ ہے کہ انہیں آخرت میں کامل جزاء دی جائیگی۔ اور دنیاوی اجر بعض لوگوں

کے نزدیک لوگوں کی تعریفیں اور دینداروں کی محبت ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ برکت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی آل اولاد میں رکھ دیتے ہیں۔

سوال حضرت لوطؑ کی بستی کے بارہ میں فرشتوں نے یہ کیسے کہا "اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ" (ہم اس بستی والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں) حالانکہ چاہیے تھا کہ وہ تلك القرية (اس بستی کو) کہتے کیونکہ جب حضرت ابراہیمؑ سے یہ بات ہو رہی تھی اس وقت حضرت لوطؑ کی بستی حضرت ابراہیمؑ سے دور تھی؟۔

جواب اس لئے کہ وہ بستی فرشتوں کی نسبت سے قریب تھی اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کی نسبت سے دور تھی۔

سوال فرشتوں نے یہ کیسے کہا کہ "اس بستی والوں کو" حالانکہ کہنا چاہیے تھا "ان بستیوں والوں کو" کیونکہ حضرت لوطؑ کی قوم کی پانچ بستیاں تھیں جن میں چار ہلاک ہوئیں؟۔

جواب فرشتوں نے سب سے بڑی اور سب سے قریب ایک ہی بستی کا ذکر کیا جو "سدوم" کے نام سے موسوم تھی جبکہ باقیوں کو اسی کے تابع سمجھ لیا گیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا: "وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ" (اور وہ لوگ ہوشیار رہتے) فلاں مستبصر اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ شخص عقلمند اور صحیح النظر ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح النظر اور عاقل ہوتے تو راہِ ہدایت سے بھٹک کر گمراہی کا شکار نہ ہوتے؟۔

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیاوی امور میں صاحب نظر تھے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وہ حق کو دلائل کی روشنی میں پہچانتے تو تھے لیکن خواہشاتِ نفسانی کے اتباع میں اس کا انکار کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا" (اور ظلم اور تکبر کی راہ سے ان کے منکر ہو گئے حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ تدبر اور تفکر سے کام لیتے تو صاحب بصیرت ہوتے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا: "وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ ......لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" (اور کوئی شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے اگر وہ جانتے ایسا نہ کرتے) حالانکہ یہ تو ایسی بدیہی بات ہے جسے ہر شخص بہ خوبی جانتا ہے؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہیں علم ہوتا کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور معبود بنانا مکڑی کے گھر بنانے کی طرح ہے تو وہ ایسا نہ کرتے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیسے ارشاد فرمایا: "وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ

اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ" (اور تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقہ کے مباحثہ مت کرو ہاں جو ان میں زیادتی کریں)۔ حالانکہ ہر اہل کتاب کافر ہے اور کفر سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَالْكَافِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں)؟

جواب اول یہاں "ظلم" سے مراد ذمی بننے اور اداءِ جزیہ سے انکار ہے یا اس سے مراد معاہدہ کرنے کے بعد اسے توڑنا ہے۔

جواب ثانی یہ آیت اس آیت کے سبب منسوخ ہے: "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" (جو لوگ جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر ان سے قتال کرو)

سوال "وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ" (اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے) میں یمین (۲) (ہاتھ) کے اضافہ کا کیا فائدہ ہے؟

جواب اس سے نفی کی تاکید مقصود ہے جیسے کہ اثبات کی تاکید کے لئے کہا جاتا ہے' یہ وہ کتاب ہے جسے فلاں نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا ہے۔ میں نے فلاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' یہ بات میں نے خود اپنے کانوں سے سنی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے تلاوت کو تاکیداً کیوں ذکر نہیں فرمایا کہ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ بِلِسَانِكَ" (آپ اس سے پہلے کتاب کی اپنی زبان سے تلاوت نہیں کیا کرتے تھے)

جواب کلام میں اصل بات یہی ہے کہ اس میں زیادتی نہ ہو۔ جو کلام بھی مطابقِ اصل ہو اس میں دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ جو خلافِ اصل ہو اس میں دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا: "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھائیں گے) حالانکہ سبھی کو معلوم ہے کہ مجاہدہ دین خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے لئے یا نفسِ امارہ یا شیطان یا دشمنانِ دین کے خلاف خدا تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ہوتا ہے اور یہ سب کام خدا تعالیٰ کی ہدایت کے بعد ہوتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہدایت کو مجاہدہ کا ثمرہ کیسے بتایا؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حصولِ علم کی کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنے ان راستوں کی ہدایت عطا فرماتے ہیں جن پر چل کر احکام اور ان کے حقائق کا علم ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے ہم اسے جنت کے راستہ پر چلاتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ایک درجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ہم اسکی رہنمائی اس کے اعلیٰ درجہ کی طرف کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی ہدایت اور نیکیوں کی توفیق

میں اضافہ کرتے رہتے ہیں جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى" (اور جولوگ راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے) نیز "وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى" (اور اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کی ہدایت بڑھاتا ہے)

امام ابوسلیمان دارانیؒ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے علم میں کوشش کرتا ہے ہم اس چیز کی اسے ہدایت دیتے ہیں جس کا اسے علم نہیں۔ جبکہ بعض حکماء فرماتے ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اسے اس چیز کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے، جس کا اسے علم نہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں ہمیں جو لاعلمی کی جہالت نظر آ رہی ہے وہ اپنے علم پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہے۔

سورة الروم

سوال ارشادِ باری تعالیٰ "وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ" میں ضمیر مذکر کیوں ذکر کی حالانکہ اس کا مرجع اعادہ ہے جیسا کہ ماقبل "وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ" (اور وہی ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ پیدا کریگا) سے ظاہر ہے۔

جواب اس کا معنی ہے کہ رجوع اور رد زیادہ آسان ہے تو ضمیر باعتبار معنی ذکر فرمائی نہ کہ باعتبار لفظ کے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ: لنحيي به بلدة ميتا' میں بلدة سے مراد بلد اور مکان ہے۔

سوال "وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ" میں صلہ کو مؤخر کیوں کیا حالانکہ هو عليّ هيّن میں اسے مقدم کیا گیا ہے؟

جواب وہاں اختصاص مراد ہے کہ اگرچہ ایک بانجھ عورت کے ہاں بچے کی پیدائش تمہارے نزدیک مشکل کام ہے لیکن میرے لئے آسان ہے لیکن یہاں چونکہ اختصاص کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر انسان کو معلوم ہے کہ اعادہ ابتداء سے آسان ہوتا ہے اس لئے عام حالت کے مطابق صلہ کو مؤخر ذکر کیا۔ اگر اسے مقدم کر دیتے تو معنی یکسر تبدیل ہو جاتا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ" (اور یہ اس کے نزدیک زیادہ آسان) کیوں فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کریں تو تمام افعال سہولت میں برابر ہیں کیونکہ کسی کام کا آسان یا مشکل ہونا ہمارے اعتبار سے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے؟

جواب اول کبھی افعل کا وزن کلام عرب میں اسم فاعل بغیر تفضیل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کا ترجمہ بعض حضرات اللہ کبیر والا کرتے ہیں۔

فرزدق کہتا ہے۔

ان الذی سمك السماء بنی لنا　　بیتا دعائمه اعز واطول

یعنی جس ہستی نے آسمان کو رفعت بخشی اس نے ہمارے لئے ایسا گھر بنایا جس کے ستون باعزت اور لمبے ہیں۔ مذکورہ شعر میں اعزو اطول عزیزہ اور طویلہ کے معنی میں ہیں۔ اسی طرح معن بن اوس المزنی کا شعر ہے۔

لعمرك ما ادری وانی لاوجل　　علی اینا تعدو المنیة اول

یعنی تیری زندگی کی قسم مجھے معلوم نہیں ہے اور میں اس بات سے خوفزدہ بھی ہوں کہ ہم میں سے کس پر موت پہلے حملہ آور ہوتی ہے۔ اس شعر میں اوجل وجل کے معنی میں ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے:

تمنی رجال ان اموت وان امت　　فتلك سبیل لست فیها باوحد

لوگ میری موت کی تمنا کرتے ہیں۔ اگر میں مر بھی جاؤں تو میں اس راستہ میں تنہا نہیں ہوں۔ اس شعر میں بھی اوحد واحد کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی اس کا مطلب ہے کہ تمہارے حکم کے اعتبار سے آسان ہے۔ کیونکہ تم یہی سمجھتے ہو کہ اعادۂ ابتداء سے آسان ہے کیونکہ ابتداء پانی سے ہے اور اعادہ مٹی سے ہے اور مٹی سے کوئی صورت بنانا تمہارے نزدیک زیادہ آسان ہے۔

جواب ثالث ''وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ'' میں ضمیر مخلوق کی طرف راجع ہے نہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اعادہ میں مخلوق کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک امر کن فیکون سے مخلوق کو دوبارہ پیدا فرمادیں گے۔ ابتداء پیدائش میں تو انسان پہلے نطفہ تھا، پھر لوتھڑا بنا۔ پھر ہڈیاں معرض وجود میں آئیں اور پھر آخر ان پر گوشت چڑھایا گیا۔

جواب رابع تخلیقِ انسانی تو محض فضل خداوندی ہے لیکن اس کا اعادہ واجب ہے کیونکہ جزاء سزا بغیر اعادہ کے ممکن نہیں تو جب جزاء سزا ضروری ہے تو اعادۂ تخلیق بھی ضروری ہے۔

سوال ''وما اتیتم'' بالمدو والقصر اختلاف قراء تین سے معنی میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے؟

جواب حضرت حسن کا قول ہے کہ اس سے مراد سود ہے اور مخاطب سود دینے والے ہیں نہ کہ سود لینے والے۔ اس کا معنی ہوگا کہ جو تم سود دیتے ہو تو سود لینے والوں کا مال تمہارے سود دینے سے نہیں بڑھتا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ برکت پیدا نہیں ہوتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ'' (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو

بڑھاتے ہیں)۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ اور جمہور مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی کو اس نیت سے ہدیہ دے کہ وہ اس سے زیادہ اسے واپس کرے گا۔ تو اس عمل میں نہ تو انسان کو ثواب ہوتا ہے اور نہ ہی عقاب۔ باقی اسے ربا اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ربا یعنی زیادتی پائی جاتی ہے۔ یہ تو تھا قراءت بالمد کا معنیٰ اور قراءت بالقصر کا معنیٰ یہ ہے کہ جو سودی لین دین تم کرتے ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ" میں خطاب سے غیبت کی طرف انتقال ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نیکیوں کو کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔

سوال مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ "(اس سے قبل کہ ان پر نازل ہو) کہنے کے بعد من قبلہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب اول اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے تاکید کے لئے ذکر فرمایا۔

جواب ثانی اگر ضمیر کا مرجع ارسالِ ریاح یا ارسالِ سحاب مابین تو اس سے تکرار لازم نہیں آتا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوں کیوں ارشاد فرمایا "اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ" (اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا)۔ حالانکہ ضعف ضعیف چیز کی صفت ہے' انسان اس صفت سے کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ حالانکہ سبھی کو معلوم ہے کہ انسان پانی یا مٹی سے پیدا ہوا ہے نہ کہ کسی صفت سے۔

جواب اول مذکورہ آیت میں ضعف سے مراد اسم فاعل ہے' جیسے کہ عرب حضرات کا مقولہ ہے رجل عدل۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ رجل عادل۔ اس آیت میں بھی ضعف سے مراد ضعیف ہے یعنی نطفہ۔

جواب ثانی من ضعف میں من علی کے معنیٰ میں ہے جیسے کہ "وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا" (اور ہم نے اپنے لوگوں سے ان کا بدلہ لیا جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھوٹا بتایا ہے) میں من علی کے معنیٰ میں ہے۔ تب اس کا معنیٰ ہوگا کہ بچپن میں بچے کا کمزور جسم۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ" (کہ تم تو نوشتۂ خداوندی کے موافق قیامت کے دن تک رہے) حالانکہ وہ تو زمین میں اپنی قبروں میں موجود رہیں گے؟

جواب اول یعنی کتاب اللہ کے علم اور اس کی خبر کے مطابق تم اپنی قبروں میں رہو گے۔

جواب ثانی کتاب اللہ سے مراد قضاء اللہ ہے۔

جواب ثالث اس آیت ...

اوتوا العلم فی کتاب اللہ الذین عملوہ وفھموہ" جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَمِنْ وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" (اوران لوگوں کے آگے ایک آڑ ہے قیامت کے دن تک)

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا: "وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ" (اوران سے خدا کی خفگی کا تدارک نہیں چاہا جاوے گا) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ" (اوراگر وہ عذر کرنا چاہیں گے تو بھی مقبول نہ ہوگا) ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟

جواب وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ کا مطلب ہے کہ ان کی لغزشوں کو معاف کر کے انہیں دنیا میں نہیں بھیجا جائیگا۔ اور "وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ" کا مطلب ہے کہ اگر وہ معذرت کریں گے تو ان کی معذرت قبول نہیں کی جائیگی۔

سورۃ لقمان

سوال ارشاد باری تعالیٰ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ" (اور بعض آدمی ایسا ہو جو ان باتوں کا خریدار بنتا ہو) کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانے ہیں۔ آنحضرتؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے جب بھی کوئی شخص اپنے گانے کی آواز بلند کرتا ہے تو اس پر دو شیطان مسلط ہو جاتے ہیں جو اپنی ٹانگیں اس کی پیٹھ اور سینے پر مارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش نہ ہو جائے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت مجاہدؒ اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ لھوالحدیث سے گانے اور گویوں کو مال کے ذریعے خریدنا مراد ہے۔ آنحضرتؐ سے ایک اور حدیث بھی سند کے ساتھ مروی ہے کہ آپؐ نے اس آیۂ مبارکہ کے متعلق ارشاد فرمایا: اس سے مراد ہر وہ کھیل اور باطل کام ہے جس میں انسان کثیر مال خرچ کر دے حالانکہ اس کا دل ایک درہم صدقہ کے لئے بھی نہیں چاہتا۔ آپؐ سے ایک اور روایت سند کے ساتھ مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو اپنے کانوں کو گانوں کی آواز سے بھرتا رہا وہ قیامت کے دن روحانیوں کی آواز نہیں سنے گا' آپؐ سے پوچھا گیا کہ روحانی کون لوگ ہیں؟۔ آپؐ نے فرمایا قراءِ اہل جنت۔ اہل معانی حضرات فرماتے ہیں کہ اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کھیل کود اور گانوں کے آلات کو قرآن پر ترجیح دیتا ہے اگرچہ قرآن کریم میں اشتراء (خریدنا) کا لفظ مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ اختیار اور ترجیح کے معنی کے لئے بہ کثرت مستعمل ہوتا ہے۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں "انسان کی گمراہی کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ باطل بات کو حق بات کے مقابلہ میں اختیار کرے" یہ تمام تفصیل امام واحدیؒ کی

نقل فرمودہ ہے جو علم وعمل دونوں اعتبار سے سلف اکابرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ ابن مسعودؓ ' مجاہد' سعید بن جبیر' عکرمہ اور حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ لھوالحدیث سے مراد گانے ہیں' حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جو خدا تعالیٰ سے غافل کردے' یشتری کے معنی میں دو قول ہیں (۱) مال کے ساتھ خریدنا (۲) اختیار کرنا' کسی کا قول ہے کہ گانا مال کو ضائع دل کو فاسد اور رب کو ناراض کر دیتا ہے۔

جواب اس قسم کی آیات واحادیث کی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ اگر یہ کام میلان شہوات اور اتباع خواہشات کا سبب ہو تو بیشک اس کا یہی حکم ہے' اگر عقل کی آنکھ سے دیکھا جائے تو ہمارے زمانہ کے مروجہ سماع میں چونکہ یہ مفاسد موجود ہیں لہٰذا ان کے حرام ہونے میں مسلمانوں کا کچھ اختلاف نہیں۔ کتب مشائخ میں ارباب تصوف نے جن شروط کے ساتھ سماع کے مباح ہونے کا ذکر کیا ہے وہ شروط ہمارے زمانہ میں موجود نہیں ہیں۔ اگر ہم اس مسئلہ کی تفصیل شروع کر دیں تو ہم کتاب کے مقصد کو چھوڑ بیٹھیں گے لہٰذا اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

سوال حضرت لقمانؑ کی وصیت کے درمیان میں " وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ " دو آیات کیوں ذکر فرمائیں؟

جواب یہ حضرت لقمانؑ کی نہی عن الشرک کی تاکید کے لئے جملہ معترضہ ہے۔

سوال " وصینا " کے مفعول "اَنِ اشْكُرْ الخ " کے درمیان "حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ " (اس کی ماں نے ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے) کیوں ذکر فرمایا۔؟

جواب جب والدین کے ساتھ احسان کی وصیت فرمائی تو وصیت کی تاکید کے لئے والدہ کی مشقتوں کا تذکرہ کیا اور صرف والدہ کا ذکر فرما کر اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ ان کا حق سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے جب آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ کس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے تو آپؐ نے فرمایا اپنی والدہ کے ساتھ' پھر اپنی والدہ کے ساتھ پھر اپنی والدہ کے ساتھ۔ اس کے بعد فرمایا پھر اپنے والد کے ساتھ۔

سوال " اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ " (بے شک آوازوں میں سے سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے) میں اصوات کو جمع اور حمیر کو واحد کیوں ذکر کیا؟۔

جواب اس سے اس جنس کے ہر ہر فرد کی آواز کا ذکر مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ حیوان ناطق وغیرہ ہر جنس کی ایک آواز ہے اور ان اجناس میں سے سب سے بری آواز گدھے کی جنس کی ہے'

لہٰذا اسے مفرد ذکر کرنا ضروری تھا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ اس میں گدھوں کا اجتماع شرط ہے۔

سوال ارشاد باری تعالیٰ "وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ م بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ" (اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات سمندر اور اس میں شامل ہو جاویں) کیوں ذکر فرمایا؟۔

جواب یمدہ کے ذکر کے بعد لفظ مداد (سیاہی) کے ذکر کی ضرورت ہی نہ رہی اس لئے کہ مدالدواۃ اور امدالدواۃ کا ترجمہ ہوتا ہے سیاہی کا زیادہ کر دینا۔ یعنی بحر محیط کو دواۃ کے قائم مقام بنایا پھر سات سمندروں کی سیاہی کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ بھی کلمات خداوندی کے لکھنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے "قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ"

سوال "مِنْ شَجَرَةٍ" (جتنے درخت ہیں) کا لفظ کیوں استعمال فرمایا من شجر کا لفظ کیوں استعمال نہیں فرمایا؟۔

جواب تاکہ اس پر دلالت ہو سکے کہ جنس شجر میں سے کوئی بھی شجرہ باقی نہ رہے جس کی اقلام نہ بنائی گئی ہوں۔

سوال الکلمات جمع قلت ہے جب اس سے مراد تعظیم ہے تو پھر جمع کثرت یعنی الکلم کا استعمال زیادہ مناسب تھا۔؟

جواب جمع قلت کا استعمال مقصود کے زیادہ قریب ہے کہ جب لفظ جمع قلت بھی ان اقلام اور سیاہی سے ختم نہیں ہو سکتے تو جمع کثرت کیسے ختم ہو سکتے ہیں۔

سوال "إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ" (بے شک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پانچ غیب کی باتوں میں سے پہلی تین کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے جبکہ دو آخری باتوں کے متعلق فرمایا کہ انسانوں کو ان کا علم نہیں حالانکہ پانچ کی پانچ چیزیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم کے ساتھ خاص ہونے اور انسانوں کے عدمِ علم میں برابر ہیں۔؟

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلی تین چیزوں کی نسبت اپنی طرف اس لئے فرمائی کہ ان میں عظمت وتفخیم زیادہ ہے اور آخری دو کی نفی بندوں کے علم سے اس لئے فرمائی کہ وہ بندوں کی صفات اور ان کے احوال سے متعلق ہیں تو جب انسان کو ان چیزوں کا علم نہیں تو ان کے علاوہ اور چیزوں کا علم تو بطریق اولیٰ نہیں ہوگا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ م بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ" (اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا) کیوں فرمایا اور یہ کیوں نہیں فرمایا کہ بای وقت تموت یعنی کس وقت مرے گا حالانکہ یہ دونوں چیزیں نامعلوم ہیں بلکہ علمِ وقت کی نفی زیادہ مناسب تھی

کیونکہ بعض نجومی حضرات وقت کے علم کا دعویٰ کرتے ہیں بخلاف جگہ کے کہ اس کا دعویٰ کوئی بھی نہیں کرتا۔؟

جواب جگہ کے علم کی نفی کی دو وجہیں ہیں (۱) ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا یہ انسان کی وسعت اور اس کے اختیار میں ہے' اسی لئے موت کی جگہ کے علم کا اعتقاد انسان کو موت کے وقت کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ (۲) مقام اور جگہ کی تاثیر صحت اور بیماری میں مسلم ہے بخلاف زمانہ کے اور اگر زمانہ میں تاثیر کو درست مان بھی لیا جائے تو بھی مقام اور جگہ کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔

سورۃ السجدہ

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا: ''يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ'' (وہ آسمان سے لیکر زمین تک ہر امر کی تدبیر کرتا ہے پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہنچ جاوے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری شمار کے موافق ایک ہزار برس کی ہوگی)۔

حالانکہ سورۃ المعارج میں موجود ہے: ''تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ'' (فرشتے اور روحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں ایسے دن میں ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے)؟۔

جواب اول پہلی آیت سے مراد فرشتوں کے عروج کی وہ مسافت ہے جو زمین سے لے کر آسمان دنیا کی سطح اعلیٰ تک ہے' پانچ سو سال زمین وآسمان دنیا کے مابین مسافت ہے اور پانچ سو سال آسمان دنیا کی دبیز تہہ کی مسافت ہے۔ اور دوسری آیت سے فرشتوں کا زمین سے عرش تک عروج مراد ہے۔

جواب ثانی ان دونوں آیات سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس کی مقدار اہل دنیا کے حساب کے مطابق تو ایک ہزار سال ہے اور اگر مخلوق کا حساب اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے سپرد ہوتا تو یہ مقدار پچاس ہزار سال ہوتی۔

جواب ثالث عام مؤمنین کے حق میں تو یہ ایک ہزار سال کے برابر ہوگا جبکہ کفار چونکہ رنج وتکلیف کی حالت میں ہونگے لہذا انہیں یہ پچاس ہزار سال کا معلوم ہوگا اور خواص مؤمنین کے حق میں دنیا کے ایک حصہ کی مانند ہوگا' اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا' قیامت کا دن جو پچاس ہزار سال کا ہے کس قدر طویل ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم

جس کی قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ وہ مؤمن پر فرض نماز سے بھی زیادہ ہلکا ہوگا جسے وہ دنیا میں پڑھتا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے ان دونوں آیات کے متعلق پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا یہ دو دن جن کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ میں پسند نہیں کرتا کہ کتاب اللہ کے بارہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیسے ارشاد فرمایا: "اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ" (جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی) علی اختلاف القراءتین۔ اس آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کوئی بھی مخلوق قبیح نہیں ہے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ شرور و معاصی جو اہل سنت والجماعت کے نزدیک مخلوق ہیں یقیناً قبیح ہیں؟

جواب اول احسن' احکم اور اتقن (مضبوط کرنا) کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی اس میں عبارت مقدر ہے مطلب ہے کہ ہر چیز کو پیدا فرما کر اس پر احسان کیا۔

جواب ثالث احسن عَلِمَ کے معنی میں ہے جیسے کہ عرب حضرات کا مقولہ ہے "فلان لا یحسن شیئًا" فلان کچھ نہیں جانتا۔ حضرت علیؓ کا ارشاد گرامی ہے " قیمة کل امری مایحسنه" ہر انسان اپنی قیمت کو جانتا ہے۔ تو آیت کا ترجمہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہر چیز پیدا کرنے کا بخود علم ہے کسی سے سیکھ کر علم حاصل نہیں ہوا۔ لیکن یہ مذکورہ بالا آخری دو جواب صرف قراءتِ بفتح اللام کے ساتھ خاص ہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ ارشاد فرمایا: "مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ" (یعنی ایک بے قدر پانی سے بنایا) جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ" (مٹی کے خلاصہ سے بنایا)؟۔

جواب یہاں اولاد آدم کے متعلق بتایا جا رہا ہے جبکہ دوسری جگہ حضرت آدمؑ کے بارہ میں ارشاد ہے۔ لہٰذا دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ" (اور اس میں اپنی روح پھونکی)۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ روح سے پاک ہیں۔؟

جواب اس سے مراد وہ روح ہے جس کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا اور ایجاد فرمایا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ ارشاد فرمایا: "قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ" (آپ فرما دیجئے تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے)۔

جبکہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: "تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" (اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں) نیز ایک اور جگہ ارشاد گرامی ہے: "اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا" (اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت) ان تمام آیات میں تعارض ہے؟

جواب اصل موت دینے والی ذات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے کیونکہ موت اسی کی پیدا کردہ ہے' باقی اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبض روح کے لئے اپنے کارندے مقرر فرمائے ہوئے ہیں لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف بھی توفی کی نسبت درست ہے' اور فرشتوں کی طرف اس لئے درست ہے کہ وہ ملک الموت کے معاون ہیں جو روح کو ناخنوں سے کھینچ کر حلقوم تک لاتے ہیں اور حضرت ملک الموت حلقوم سے روح قبض فرما لیتے ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف بھی توفی کی نسبت درست ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا" (پس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو سجدہ میں گر پڑتے ہیں) حالانکہ مومن صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس صفت سے متصف ہیں اور نہ ہی یہ صفت تحقق ایمان کے لئے شرط ہے؟

جواب ارشادِ باری تعالیٰ ذُكِّرُوْا بِهَا کا مطلب ہے کہ جب انہیں نصیحت کی جائے اور "سجد" کا مطلب ہے خشوع وخضوع اور تواضع کے ساتھ نصیحت قبول کرنا۔ اور یہ صفت یقیناً تحقق ایمان کے لئے شرط ہے۔ اس کی نظیر میں خداوند عزوجل کا یہ فرمان پیش کیا جا سکتا ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا" (جن لوگوں کو قرآن سے پہلے علم دیا گیا تھا یہ قرآن میں ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو تھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں)۔

جواب یعنی جو ہماری آیات پر ایمان کامل رکھتے ہیں وہ اس صفت سے متصف ہیں۔

جواب بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آیات سے مراد پانچ فرض نمازیں ہیں اور تذکیر سے مراد اذان واقامت ہے۔

سوال "اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا" (تو جو شخص مومن ہو گیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم ہو) سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فاسق مؤمن نہیں ہوتا؟

جواب مذکورہ آیت میں 'فاسق' کافر کے معنی میں ہے' اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد مذکور ہے: "وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ" (اور ان کو کہا جائے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو جھٹلایا کرتے تھے) تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ فاسق مذکور تو کافر ہے لیکن یہ

ثابت نہیں ہوتا کہ ہر فاسق کافر ہو۔
جیسے کہ: ''اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ'' (کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کے برابر کر دیں گے) اور ''اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' (یہ لوگ جو برے برے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عملِ صالح اختیار کیا) سے ثابت نہیں ہوتا کہ ہر مجرم یا ہر خطاء کار کافر ہے۔

سوال ''وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ'' (اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جاویں) کے مناسب تو یہ تھا کہ فرماتے ''اِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُوْنَ'' کہ ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں لیکن ارشاد فرمایا: ''اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ'' (ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے)۔

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے تو سب سے بڑے ظالم کا تذکرہ کیا اور پھر ہر مجرم کو انتقام سے ڈرایا تاکہ سب سے بڑے ظالم کو علم ہو جائے کہ اس سے شدید انتقام لیا جائیگا۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ضمیر ذکر فرما دیتے تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

سوال ''وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ'' (اور یہ لوگ کہتے ہیں فیصلہ کب ہوگا) سوال و جواب میں مطابقت نہیں ہے؟

جواب چونکہ کفار کا سوال تکذیب واستہزاء پر مبنی تھا نہ کہ استفہام پر لہٰذا انہیں جواب بھی تہدید کے طور پر دیا گیا اور حقیقت وقت نہیں بتائی گئی۔

سوال جن حضرات کے نزدیک الفتح سے مراد فتح مکہ یا فتح بدر ہے وہ: ''قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِيْمَانُهُمْ'' (آپ فرمادیجئے کہ اس فیصلے کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا نافع نہ ہوگا) کا کیا مطلب بیان فرماتے ہیں۔ کیونکہ بعض کفار کو تو ان کے ایمان نے ان دونوں دنوں میں فائدہ پہنچایا تھا' اور وہ وہ لوگ تھے جنہیں آزاد کر دیا گیا تھا اور وہ ایمان لے آئے تھے؟

جواب مطلب یہ ہے کہ مقتولین کو قتل کے وقت ان کا ایمان فائدہ نہیں پہنچاتا' جیسے کہ فرعون کو اس کے ایمان نے غرق کے وقت کچھ فائدہ نہیں پہنچایا۔

سورۃ الاحزاب

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ'' فرمایا نہ کہ یا محمد جبکہ دیگر انبیاءِ کرامؑ کو ان کے اسماء

کے ساتھ مخاطب کیا جیسے کہ "یا موسیٰ' یا عیسیٰ' یا داؤد"؟

جواب آنحضرت ﷺ کو آپ ﷺ کی جلالتِ شان کے سبب نام کی بجائے النبی اور الرسول کے الفاظ سے مخاطب بنایا گیا' دوسری جگہ ارشادِ گرامی ہے: "یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ"۔

سوال تو پھر خبریہ جملوں میں بھی آنحضرت ﷺ کا نام مبارک ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا' حالانکہ آپ کا اسمِ گرامی موجود ہے' جیسے کہ "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" (محمد اللہ کے رسول ہیں) "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ" (اور محمد رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں)؟۔

جواب ان دونوں جگہوں میں آنحضرت ﷺ کے نام مبارک کو اس لئے ذکر فرمایا تا کہ لوگوں کو آپ ﷺ کا رسول ہونا معلوم ہو جائے اور انہیں اس بات کا بھی علم ہو جائے کہ آپ ﷺ کو اسی نام سے پکارا جائے' اسی لئے ان دو جگہوں کے علاوہ جملہ خبریہ میں بھی آپ ﷺ کے لئے رسول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسے کہ "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ یَارَبِّ۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ۔ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ وَلَوْ كَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِیِّ" وغیرہ

سوال ارشادِ باری تعالیٰ: "مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِهٖ" (اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے) میں لفظ جوف ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس قسم کا سوال جواب' سورۃ الحج میں: "وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ" (بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں) کے تحت گذر چکا ہے۔

سوال "انت علیّ کظهر امی" (تو مجھ پر والدہ کی پیٹھ کی طرح حرام ہے) کا کیا مطلب ہے؟

جواب اصل میں یہ کہنا چاہتے تھے: "انت علی حرام کبطن امی" (تو مجھ پر ماں کے پیٹ کی طرح حرام ہے) لیکن پھر پیٹ کی بجائے پیٹھ کو ذکر کر دیا تا کہ اس چیز کا ذکر نہ ہو جو شرمگاہ کے قریب ہے باقی پیٹھ کو دو وجہوں سے پیٹ کا کنایہ بنایا ہے۔

(۱) کیونکہ پیٹھ' پیٹ کا ستون ہے' اس کی تائید حضرت عمرؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "یجیء احدهم علی عمود بطنه"

(۲) عرب حضرات پشت کی طرف سے بیوی پر آنے کو حرام سمجھتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ اس طرح اولاد بھینگی پیدا ہوتی ہے' اسی لئے زمانہ جاہلیت میں سخت طلاق کے لئے یہ لفظ استعمال کیا

گیا "انت علی کظھر امی"

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو حکماً مؤمنین کی مائیں بنادیا ہے' ارشادِ گرامی ہے: "وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ" (اور آپ کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں) لیکن آنحضرتؐ کو مومنین کا باپ نہیں بنایا بلکہ ارشاد فرمایا: "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ" (محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں) اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اول چونکہ عورت کے لئے سب سے مبارک اور اشرف نام "ماں" ہے' اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کے لئے امہات المؤمنین ارشاد فرمایا جبکہ مرد یعنی آنحضرتؐ کے لئے سب سے مبارک نام باپ نہیں بلکہ رسول اللہ ہے' اس لئے آپؐ کے لئے رسول اللہ ارشاد فرمایا۔

جواب ثانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو مومنین کی مائیں بنادیا تاکہ ان سے نکاح حرام ہو اور کوئی بھی آنحضرتؐ کے بعد ان کے ساتھ نکاح کی طمع نہ رکھ سکے اور یقیناً اس میں آنحضرتؐ کی تعظیم کا نمایاں پہلو موجود ہے' اور اگر آنحضرتؐ کو مومنین کا باپ بنادیتے تو آپؐ کے لئے مومنات سے نکاح ناجائز ہوجاتا جو آپؐ کی تعظیم کے منافی تھا' اسی لئے آپ کو باپ نہیں بنایا بلکہ قرب اور حرمت میں باپ سے بڑا رتبہ عطاء فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ" (نبی مؤمنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ اولیٰ قرار دیا ہے' بہت سے آباء اپنی اولاد سے اور بہت سی اولاد اپنے آباء سے تو بے پرواہ ہوسکتی ہے لیکن کوئی بھی شخص خود اپنی ذات سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ: "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ" (اور جبکہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا اور آپ سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی) میں آنحضرتؐ کو حضرت نوحؑ اور مابعد مذکور انبیاء کرامؑ پر مقدم کیوں فرمایا؟

جواب یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے کہ پہلے تمام انبیاء کرام کا ذکر فرمایا اور پھر چند مشہور اور افضل ترین انبیاء کرام کا ذکر فرمایا اور چونکہ آنحضرتؐ ان تمام انبیاء کرام میں سب سے افضل ہیں لہٰذا آپ کو تمام انبیاء کرام پر مقدم فرمایا' باقی میثاق کے بارہ میں دو قول ہیں۔

(۱) اس بات کا عہد تھا کہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں گے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کریں گے اور اس کی دعوت دیں گے نیز ایک دوسرے کی تصدیق

کریں گے۔

سوال آیت مذکورہ کے برخلاف: ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ'' (اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا.....) میں حضرت نوح علیہ السلام کو آپؐ پر کیوں مقدم کیا؟

جواب اس آیت کا سیاقِ کلام حضرت نوحؑ کے مقدم ہونے کا مقتضی ہے کیونکہ اس آیت میں دین اسلام کی اصل بنیاد کا تذکرہ ہے' ارشادِ باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے وہ دین اصلی مشروع کیا ہے جسے لے کر قدیم زمانہ میں حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے اور موجودہ زمانہ میں آپؐ مبعوث ہوئے جبکہ درمیان میں دیگر چند مشاہیر انبیاءِ کرام کا تذکرہ بھی فرمادیا' تو اس آیت میں سیاقِ کلام کی وجہ سے حضرت نوحؑ کو مقدم فرمایا۔

سوال جب پہلے اخذِ میثاق کا ذکر ہو چکا تو پھر: ''وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا'' (اور ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا) کے تکرار کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب تاکید کیلئے اسے ذکر فرمایا' بعض حضرات فرماتے ہیں کہ میثاقِ غلیظ سے مراد اللہ کی قسم ہے لہٰذا تکرار بھی نہیں پایا گیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنین پر احسان جتاتے ہوئے ان کے حالات کا نقشہ کھینچا': ''وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ'' (اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے) اگر دل حلقوم تک پہنچ جاتے تو ان کی موت واقع ہو جاتی اور اس احسان کی کوئی وجہ باقی نہ رہتی؟

جواب ابن قتیبہؒ نے اس کا مطلب یہ ارشاد فرمایا ہے کہ قلبی اضطراب اور خوف کی وجہ سے دل حلقوم تک پہنچنے کے قریب ہو گئے تھے لیکن ابن الانباریؒ نے ان پر رد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ عرب بغیر کوئی لفظ استعمال کئے ''قریب'' کا معنی مراد نہیں لیتے' امام فراءؒ سے اس کا معنی یہ منقول ہے کہ انہیں شدید گھبراہٹ نے گھیرا' جب انسان بہت زیادہ گھبراہٹ کا شکار ہوتا ہے تو اس کے پھیپھڑے پھول جاتے ہیں اور اس کا دل بلند ہو کر اقصائے حلق (ابتداء حلق) تک پہنچ جاتا ہے' اور غم وغصہ کے وقت بھی انسان کی یہی حالت ہوتی ہے۔ یہی مطلب حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے' اسی کے پیشِ نظر بزدل کے بارہ میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس کا حلقوم پھول گیا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے منافقین کے عذاب کو اپنی مشیت کے ساتھ کیوں معلق فرمایا: ''وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ'' انہیں عذاب دینا تو قطعی اور یقینی ہے جیسا کہ: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' (بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں جاویں

گے)؟

جواب مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں گے تو اسی نفاق پر ان کی موت واقع ہو جائیگی اور انہیں عذاب بھگتنا ہوگا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چاہیں گے تو عذاب میں مبتلاء کردیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا ہی چاہا ہے۔

سوال "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (تم لوگوں کے لئے یعنی رسول اللہ کی ہستی مبارک میں عملی نمونہ ہے) کا کیا مطلب ہے؟

جواب اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

(۱) آپ کی ذات گرامی ایک ایسا عمدہ نمونہ ہے جس کی ہر شخص کو پیروی کرنی چاہیئے۔

(۲) آپؐ میں ایسی ایسی عمدہ صفات موجود ہیں جنکے سبب آپ کی پیروی کرنی چاہئے' مثلاً خود پر صحابہ کرامؓ کو ترجیح دینا' جہاد میں ثابت قدمی دکھانا اور احد کی لڑائی میں جبکہ آپؐ کے دندان مبارک بھی شہید ہو گئے ثابت قدم رہنا۔

سوال "وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" (اور جب ایمانداروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی ہے جس کی ہم کو اللہ اور رسول نے خبر دی تھی اور اللہ ورسول نے سچ فرمایا تھا) میں اللہ ورسول کو مکرر ذکر فرمایا' چاہیئے تو یہ تھا کہ دوبارہ اسم ظاہر کی بجائے اسم ضمیر ذکر فرما دیتے؟

جواب تا کہ ایک ہی ضمیر اللہ تبارک وتعالیٰ اور غیر کی طرف نہ لوٹے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی قریظہ کے بارہ میں یہ کیوں ارشاد فرمایا: "وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا" (اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا) حالانکہ صحابہ کرامؓ کو اس سرزمین کی فتح کے بعد اس کا مالک بنایا۔

جواب جب کسی چیز کا پختہ وعدہ ہو تو اسے ماضی کے صیغہ سے ادا کر دیتے ہیں' یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا۔

جواب اس میں عبارت مقدر ہے "وارضا لم تطوها سیورثکم ایاها" جس سرزمین پر تم نے چڑھائی نہیں کی اللہ تمہیں اس کا بھی مالک بنا دیں گے' یعنی سرزمین مکہ کا' بعض حضرات نے فارس وروم اور بعض نے خیبر کی سرزمین بھی مراد لی ہے' جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے ہر وہ سرزمین مراد ہے جس پر مسلمان تا قیامت قبضہ کریں گے۔

جواب ثالث اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس سرزمین کا ازل سے لوح محفوظ میں لکھ کر مالک بنایا ہوا ہے۔

سوال "یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنۡ یَّاۡتِ مِنۡکُنَّ الخ" میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو دوگنے عذاب وثواب کے لئے کیوں خاص فرمایا؟

جواب اول انہیں اس لئے دگنا عذاب کے لئے خاص کیا کہ جس طرح وہ گناہ پر زواجر کا مشاہدہ کرسکتی ہیں کوئی اور نہیں کرسکتا۔

جواب ثانی ان کے گناہوں سے آنحضرت کو تکلیف ہوگی اور جس گناہ سے آنحضرت کو صدمہ پہنچے وہ گناہ یقیناً دوسرے گناہوں سے بڑھ کر ہے' اور فاحشہ سے مراد جیسے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں' نافرمانی اور برے اخلاق ہیں' باقی ازواج مطہرات کو نیکیوں کا دگنا ثواب اس لئے دیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کے قرب کے سبب جیسے ان کا گناہ بہت برا ہے اسی طرح ان سے نیکی کا ظہور بھی بہت ہی مستحسن ہے۔

سوال "یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسۡتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ" (اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں) میں کواحدۃ من النساء کیوں نہیں فرمایا؟۔

جواب اسی قسم کا سوال وجواب سورۃ البقرۃ میں "لا نفرق بین احد من رسلہ" کے تحت گذر چکا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازواج مطہرات کو ادائیگی زکوٰۃ کا کیوں حکم فرمایا: "وَاَقِمۡنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیۡنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ" (اور تم نماز کی پابندی رکھو اور زکوۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانو) حالانکہ آپ کبھی بھی سال بھر نصاب کی مالکہ نہیں رہیں؟

جواب یہاں زکوٰۃ سے مراد صدقہ نافلہ ہے اور امر استحباب کے لئے ہے۔

سوال "مسلم" اور "مومن" میں کیا فرق ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ" (بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں) میں ایک کا عطف دوسرے پر کیا ہے حالانکہ شرعاً دونوں کا ایک ہی معنی ہے؟

جواب "مسلم" سے مراد زبان سے اقرار کرنے والا اور "مؤمن" سے مراد دل سے تصدیق کرنے والا ہے۔

سوال "مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ" (محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے

باپ نہیں) کیوں فرمایا حالانکہ آپؐ حضرت طاہرؓ، طیبؓ، قاسمؓ اور حضرت ابراہیمؓ کے والد گرامی تھے؟

جواب "من رجالکم" میں یہ حضرات داخل نہیں کیونکہ (۱) یہ حضرات بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے حدِ رجولیت میں قدم نہیں رکھا (۲) رجال کی اضافت صحابہؓ کی طرف ہے اور یہ حضرات تو رجال نبیؐ ہیں نہ کہ رجال صحابہؓ۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو: "وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ" (اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں) کیوں فرمایا حالانکہ آپؐ کے بعد حضرت عیسیٰؑ نازل ہونگے وہ بھی تو نبی اللہ ہیں؟

جواب خاتم النبیین کا مطلب ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں بنے گا جبکہ حضرت عیسیٰ تو آپؐ سے پہلے تاج نبوت سے سرفراز ہوئے' حضرت عیسیٰ جب نازل ہونگے تو آپ کی شریعت پر عمل پیرا ہونگے اور آپؐ کے ایک امتی کی مانند آپؐ کے قبلہ کی طرف نمازیں پڑھیں گے۔

سوال "هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ" (وہ ایسا ہے کہ وہ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں) رحمت ومغفرت میں فرشتوں کو کیسے شامل فرمایا حالانکہ ان سے رحمت ومغفرت محال ہے؟

جواب یعنی ان کی دعاؤں سے اللہ تبارک وتعالیٰ مغفرت ورحمت کا معاملہ فرمائیں گے جیسا کہ ہم کہتے ہیں حیا زید عمروا (زید نے عمرو کو زندگی بخشی) مطلب ہے کہ عمرو زید کی دعاؤں کی بدولت حیات نو سے مشرف ہوا۔

سوال "اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ" (ہم نے بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا کہ آپ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہیں........) سے بہ خوبی معلوم ہو رہا ہے کہ دعوت الی اللہ میں آنحضرتؐ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی جناب سے پروانہ اجازت حاصل ہے پھر باذنہ (اس کے حکم) فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب "بِاِذْنِهٖ" کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تسہیل وآسانی کے ساتھ۔

بعض حضرات نے اذن کا معنی حکم بتایا ہے کہ آنحضرتؐ لوگوں کو از خود نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے دعوت دیتے ہیں۔

سوال "وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" (اور آپ ایک روشن چراغ ہیں) میں آنحضرتؐ کو چراغ کے ساتھ تشبیہ دی گئی حالانکہ سورج کے ساتھ تشبیہ دینا زیادہ مناسب تھا کیونکہ سورج کی چراغ پر فوقیت بدیہی بات ہے؟

جواب بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں چراغ سے مراد سورج ہی ہے بدلیل: ''وَجَعَلْنَا الشَّمْسَ سِرَاجًا'' جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو چراغ کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی گئی کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوسکتا ہے لیکن ایک سورج سے دوسرا سورج روشن نہیں ہوسکتا۔ آنحضرتؐ کی امت کے علماء کرام وہ چراغ ہیں جو آنحضرتؐ کی تعلیمات کے روشن کردہ ہیں اور یہ چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ تا قیامِ قیامت جاری و ساری رہے گا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ چراغ کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی کیونکہ وہ زمانہ' کفر و ضلالت کی تاریکیوں کے سبب رات کی مانند تھا اور رات کے مناسب چراغ ہوتا ہے نہ کہ سورج۔

سوال چراغ ہی کے ساتھ کیوں تشبیہ دی' موم بتی کے ساتھ کیوں تشبیہ نہیں دی حالانکہ اس کی روشنی چراغ کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے؟

جواب اس کا جواب: ''مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ'' (اس کے نور کی حالت عجیبہ ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے) کے تحت گذر چکا ہے۔

سوال ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ'' (اے ایمان والوتم جب مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو طلاق دیدو) میں مرد کے چھونے سے پہلے طلاق دینے میں عدت واجب نہ ہونے کو مومن خواتین کے ساتھ کیوں مختص کیا ہے حالانکہ اہل کتاب خواتین کا بھی یہی حکم ہے؟

جواب یہاں مؤمن خواتین کے ذکر سے ان کی تخصیص مراد نہیں بلکہ اکثر اور غالب ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر فرمایا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ'' (اور آپ کے چچا کے بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کی ماموں کی بیٹیاں اور آپ کے خالاؤں کی بیٹیاں) میں عم اور خال کو مفرد ذکر فرمایا جبکہ عمات اور خالات کو جمع ذکر فرمایا حالانکہ عرب کا قاعدہ ہے کہ جمع کے مقابل جمع کو ذکر کرتے ہیں؟

جواب ''عم'' خم کی طرح وزن مصدر ہے' اسی طرح خال بھی قال کے وزن پر ہے جو کہ مصدر ہے اور مصدر میں افراد تثنیہ اور جمع برابر ہوتا ہے بخلاف عمة اور خالة کے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ'' (بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے)

سوال ''اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ'' کو پیش نظر رکھیں تو یہ جواب غلط معلوم

ہوتا ہے؟

جواب غم اور خال حقیقی مصدر نہیں ہیں بلکہ مصدر کے وزن پر ہیں۔ یہاں مصدر کے ساتھ مشابہت کا اعتبار ہے جبکہ وہاں اس کی حقیقت کے مطابق عمل کیا۔ اسی لئے دونوں طرح اس کا استعمال جائز ہے۔ بخلاف "سمع" کے کہ وہ حقیقی مصدر ہے اسی لئے قرآن کریم میں ہر جگہ مفرد ہی استعمال ہوا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِي اٰبَآئِهِنَّ" (پیغمبروں کی بیبیوں پر اپنے باپوں کے بارہ میں کوئی گناہ نہیں) میں اقارب کا ذکر کیا لیکن چچا اور ماموں کا تذکرہ نہیں فرمایا حالانکہ وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں؟

جواب اسی قسم کا سوال وجواب سورۃ النور میں: "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ" کے تحت گذر چکا ہے' بہتر یہی ہے کہ عورت اپنے چچا اور ماموں کے سامنے بھی نہ آئے کہ وہ اپنے بیٹے کے سامنے اس کے محاسن بیان کرے اور فتنہ کا سبب بنے۔

سوال "اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا" (ہم نے اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تھا) میں جب سادت اور کبراء کا ایک ہی معنی ہے تو ایک کا دوسرے پر عطف کیوں کیا گیا؟۔

جواب بعض اوقات ایک ہی معنی کے دو الفاظ میں سے ایک کا عطف دوسرے پر کر دیتے ہیں جیسے کہ فلان عاقل لبیب' ھذا حسن جمیل وغیرہ۔

اور جیسے کہ ایک شاعر کہتا ہے:

"معاذاللہ من کذب ومین" کذب اور جھوٹ سے اللہ کی پناہ

سوال "وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ" (اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا) میں اگر انسان سے مراد حضرت آدمؑ ہیں تو پھر ان کے بارہ میں: "اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" (وہ ظالم ہے جاہل ہے) کیوں کہا گیا؟ حالانکہ فعول کا وزن مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ معاذاللہ آپؑ سے بار بار ظلم وجہل سرزد ہوا حالانکہ ایسا قطعاً نہیں؟

جواب آپؑ کی رفعتِ شان کو دیکھتے ہوئے ادنیٰ سی خطاء بھی بہت بڑی تصور کی جاتی ہے' لہٰذا اسے کثرت اور مبالغہ کے ساتھ ذکر فرما دیا' نیز یہی بات سورۃ ال عمران میں: "وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" کے تحت بھی گذری ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کے لئے ظلوم اور جہول کا لفظ اس لئے ارشاد فرمایا کیونکہ آپؑ کی خطاء کی پاداش تمام انسانوں کو بھگتنی پڑی کہ حضرت آدمؑ ہی کے سبب انہیں جنت سے نکالا

گیا اور ان پر ابلیس کا لشکر مسلط کیا گیا۔

سورۃ سبا

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ '' (تو کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی طرف نظر نہیں کی جو ان کے آگے اور پیچھے موجود ہے) ما فوقھم و ما تحتھم (اوپر نیچے) کے الفاظ کیوں ارشاد نہیں فرمائے؟۔

جواب آگے کے لفظ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو بغیر چہرہ پھیرے نظر آ سکے اور پیچھے کے لفظ سے ہر وہ چیز مراد ہوتی ہے جو انسان کو چہرہ پھیرنے سے نظر آ سکے لہٰذا مذکورہ الفاظ کا ذکر بالکل کافی ہے۔

سوال تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمْ مِّنْ ؍ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِھِمْ '' (پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور ان کی بائیں جانب سے بھی) میں دائیں بائیں کو کیوں ذکر فرمایا؟

جواب یہاں تو آسمان وزمین کے ذکر سے الفاظ میں عموم آ گیا ہے جبکہ وہاں ایسا نہیں ہے۔

سوال حضرت سلیمانؑ تماثیل یعنی تصاویر کیسے بناتے تھے؟۔

جواب بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ان کی شریعت میں تصویر بنانے کا عمل ناجائز نہیں تھا' اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ تصاویر کسی غیر ذی روح مثلاً درخت وغیرہ کی ہوں جو ہماری شریعت میں بھی ناجائز نہیں ہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''لَقَدْ کَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْکَنِھِمْ اٰیَۃٌ'' (سبا کیلئے ان کے وطن میں نشانیاں موجود تھیں) میں دو باغوں کو اپنی توحید کی ایک نشانی کیوں کہا' حالانکہ وہ تو دو نشانیاں تھیں نہ کہ ایک؟

جواب جب دونوں اپنے مدلول کے اعتبار سے ایک جیسی ہیں اور ان دونوں کی جہت بھی ایک ہی ہے تو ان دونوں کو ایک ہی ذکر کر دیا جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّہٗ اٰیَۃً'' (اور ہم نے مریم کے بیٹے اور ان کی ماں کو بڑی نشانی بنایا)

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ '' (آپ فرمایئے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو) کیوں فرمایا؟ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کے سوا

جنہیں تم خدا گمان کرتے ہو حالانکہ مشرکین اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ساتھ انہیں معبود مانتے تھے؟

جواب اول تو اس عبارت سے آپ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا اگر ہو بھی جائے تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ اس عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے' اصل عبارت ہے: "ادعوا الذین من دون اللہ زعمتم انھم شرکاء للہ" (اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا انہیں پکار لو جنہیں تم اس کا شریک سمجھتے ہو)۔

سوال "وَاِنَّآ اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی ھُدًی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" (اور بے شک ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں ہیں) اس آیت میں موجود تشکیک کا کیا حاصل ہے؟

جواب بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "او" دونوں جگہ "واؤ" کے معنی میں ہے تو معنی ہوگا کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی پر ہو۔ اور بعض حضرات اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم اور تم ہدایت یافتہ ہیں یا گمراہ ہیں یہ ان کی گمراہی پر تعریض ہے جیسے کہ انسان جب کسی کو جھٹلانے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے واللہ ہم میں سے کوئی ایک تو جھوٹا ہے ہی۔ اس سے مراد دوسرے کی تکذیب ہوتی ہے۔

سوال ملائکہ علیہم السلام نے مشرکین کے متعلق یہ کیسے فرمادیا: "بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ" (بلکہ یہ لوگ شیطان کی پوجا کرتے تھے) حالانکہ کسی نے بھی مشرکین کے متعلق یہ نقل نہیں کیا کہ وہ جنات کی عبادت کرتے تھے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ شیطان جن کی عبادت کا حکم دیتا تھا یہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے یعنی شیطان کی اطاعت کیا کرتے تھے' جن سے مراد شیطان ہے' نیز اکثر مشرکین شیاطین کی خبروں کی تصدیق کیا کرتے تھے مثلاً ملائکہ کو شیاطین کے کہنے ہی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی بیٹیاں تصور کرتے تھے۔

سورۃ فاطر

سوال "وَاللّٰہُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا" (اور اللہ ایسا ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر ہم اس بادل کو خشک قطعہ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر اس کے ذریعے زمین کو زندہ کرتے ہیں) میں فتثیر کو مضارع کیوں ذکر کیا جبکہ اس کا ماقبل اور مابعد ماضی ہے؟

جواب یہاں مضارع کو ماضی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے' جیسا کہ: ''وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ'' میں تقول کو قلت کی جگہ استعمال کیا گیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ'' (اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ ہو) کیسے ارشاد فرمایا حالانکہ آنحضرتؐ اور حضرت عیسیٰؑ کے مابین ایک طویل عرصہ گذرا ہے جس میں کوئی نذیر نہیں آیا؟

جواب چونکہ انذار وترہیب کے آثار باقی تھے لہٰذا حکماً نذیر موجود تھا البتہ جب یہ آثار ختم ہو گئے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرتؐ کو مبعوث فرمادیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے آیت کے آخر میں صرف نذیر ذکر فرمایا بشیر ذکر نہیں فرمایا' حالانکہ ابتداء میں بشیر نذیر دونوں ذکر کئے گئے؟

جواب چونکہ ابتداء میں دونوں ذکر ہو چکے تھے اس لئے آخر میں صرف ایک کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا کہ دوسرا اس سے خود بخود سمجھ آ سکتا ہے۔

سوال نصب اور لغوب میں کیا فرق ہے کہ ایک کا دوسرے پر عطف کیا گیا؟

جواب نصب' مشقت وکلفت کو کہا جاتا ہے' اور اس مشقت کے بعد جو حالت ہوتی ہے اسے لغوب کہا جاتا ہے۔ یہ فرق امام زمخشری کا ذکر کردہ ہے' لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ پھر دوسرے کی نفی سے پہلے کی نفی خود بخود سمجھ آ سکتی تھی۔ لہٰذا پہلے کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سوال ''رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ'' (اے ہمارے پروردگار ہم کو نکال لیجئے ہم اچھے کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے) کا کیا مطلب ہے' اس کا مطلب تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جو نیک عمل پہلے کرتے تھے۔ اب اس کے علاوہ اور نیک عمل کریں گے حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی نیک عمل نہیں کیا؟

جواب کفار یہی گمان کرتے ہیں کہ وہ نیک کام کرتے ہیں جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا'' (اور وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں) یعنی جسے ہم نیکی سمجھتے تھے اس کے علاوہ اور نیکیاں کریں گے۔

سورۃ یٰس

سوال پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''اِنَّآ اِلَیْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ'' (بے شک ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں) فرمایا اور پھر فرمایا: ''اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ'' (بے شک ہم تمہاری طرف بھیجے گئے

ہیں) بعد میں تاکید ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب چونکہ پہلے جملہ سے صرف خبر دینا مقصود تھا اس لئے لام تاکید کی ضرورت نہیں تھی جبکہ دوسرا جملہ انکار اور تکذیب کے بعد آرہا ہے لہٰذا تاکید کی ضرورت تھی اس لئے لام تاکید ذکر فرمادیا۔

سوال فطرنی میں فطر کی نسبت اپنی طرف جبکہ والیہ ترجعون میں بعث کی نسبت کفار مکہ کی طرف کی، چاہئے تو یہ تھا کہ یا تو دونوں کی نسبت اپنی طرف کرتے یا دونوں کی کفار کی طرف؟

جواب فطر کی نسبت اپنی طرف اس لئے کی کہ پیدائش تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے اور نعمت کی نسبت اپنی طرف کرنا زیادتی شکر کا موجب ہے' جبکہ بعث میں زجر وتوبیخ پائی جاتی ہے لہٰذا کفار کی طرف اس کی نسبت زیادتی توبیخ کا باعث ہوگی۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ کیوں فرمایا حالانکہ تحسر علی اللہ محال ہے؟

جواب اس آیت سے مخلوق پر تحسر مراد ہے' مطلب یہ ہے کہ لوگو! کہو کہ ہم پر حسرت ہو۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورج کے متعلق فرمایا کہ وہ چاند کو نہیں پاسکتا' چاند کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ وہ سورج کو نہیں پاسکتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اس لئے کہ چاند کی رفتار تیز ہے' وہ اپنا ایک چکر مہینہ میں مکمل کرلیتا ہے جبکہ سورج اپنا ایک چکر سال میں مکمل کرتا ہے۔ لہٰذا سورج کی نفی کردی گئی کیونکہ اس کی چال سست ہے' لہٰذا اس کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ چاند کو نہیں پاسکتا' یہ جواب امام زمخشریؒ نے دیا ہے' لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ چاند کی رفتار چونکہ تیز ہے اس لئے مناسب یہی تھا کہ اس کی نفی کی جاتی' سورج کی رفتار تو چاند سے کم ہے لہٰذا اس کا چاند کو پالینا تو ممکن ہی نہیں ہے احتمال یہی تھا کہ چاند' سورج کو پالیتا لہٰذا مناسب یہی تھا کہ چاند کے پانے کی نفی کی جاتی۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل مکہ کے متعلق کیسے ارشاد فرمایا: ''وَاٰيَةٌ لَّهُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّيَّتَهُمۡ فِى الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِ'' (اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا) حالانکہ کشتی میں تو ان کے آباء کو بٹھایا گیا تھا نہ کہ اولاد کو؟

جواب ذریۃ اسماء اضداد میں سے ہے یعنی جیسے اس کا معنی اولاد ہے اسی طرح اس کا معنی آباء بھی ہے۔ جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ

عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ذُرِّيَّةً ۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ''(بے شک اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو تمام جہانوں پر بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں) میں ہر ایک کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کی ذریّة تھے حالانکہ ان میں سے کچھ آباء تھے اور کچھ اولاد۔ یا پھر اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ ذریّة سے مراد اگر اہلِ مکہ کی اولاد ہے تو چونکہ یہ اس وقت اپنے آباء کی پیٹھ میں تھے لہٰذا ان پر بھی حکماً احسان جتایا جاسکتا ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ''وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ''(اور یہ لوگ کہتے ہیں یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو) میں جب وعدے سے مراد بعث اور جزاء ہے تو یہ تو رونما ہو چکے ہونگے پھر ان کے انتظار کا کیا مطلب؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وعدہ پورا کب ہوا گا، دراصل یہاں مضاف محذوف ہے یا وعد بول کر موعود مراد ہے۔

سوال ''مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا''(ہم کو قبروں سے کس نے اٹھا دیا) میں سوال یہ ہے کہ ہمیں کون اٹھائے گا لیکن اس کا جواب اس کے مطابق نہیں ہے؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں وہ رحمٰن اٹھائے گا جس نے تمہارے بعث کا وعدہ کیا تھا' باقی جواب کے لئے یہ طریقہ زیادتیِ توبیخ کے لئے اختیار کیا گیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت اور ان کی ازواج کے متعلق یہ کیوں فرمایا: ''هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ ''(وہ اور ان کی بیبیاں سایوں میں ہونگی) سایہ کا حصول تو سورج سے بچنے کے لئے ہوتا ہے' اسی لئے رات کے وقت کسی چیز کے نیچے بیٹھنے کو سایہ سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔ اور جنت میں سورج ہوگا ہی نہیں' ارشاد باری تعالیٰ ہے:''لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا''(نہ وہاں تپش پاویں گے اور نہ جاڑا)

جواب جنت کے درختوں کا سایہ نور عرش سے ہوگا تا کہ اہل جنت کی نگاہیں اس سے خیرہ نہ ہوں کیونکہ اس کی روشنی سورج کی روشنی سے بدرجہا زیادہ ہوگی۔

بعض حضرات نے نور قنادیل عرش سے سایہ مراد لیا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے:''وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ ''(اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے) میں ہاتھوں کے کلام اور پاؤں کی گواہی کا

ذکر فرمایا ہے اس کی وجہ؟۔

جواب اس لئے کہ ہاتھ تو انسان کے ساتھ گناہ میں شریک ہوتے ہیں جبکہ پاؤں شریک نہیں ہوتے بلکہ صرف موجود ہوتے ہیں اور جو موجود ہو وہ غیر کے خلاف گواہی دے سکتا ہے لیکن جو خود اپنے خلاف کوئی بھی گواہی نہیں دے سکتا ہاں اقرار کر سکتا ہے البتہ اس جواب پر ایک اعتراض وارد کیا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرتؐ کی شان مبارک میں ارشاد فرمایا: ''وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ'' حالانکہ آپؐ سے اشعار بھی منقول ہیں جیسے کہ

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب

میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں

یا: هل انت الا اصبع دمیت وفی سبیل الله ما لقیت

جواب اول یہ شطور بحر رجز ہے شعر نہیں ہے اور امام خلیل کے نزدیک مشطور بحر رجز شعر نہیں ہوتا کیونکہ آپؐ نے دمیت اور لقیت کو بفتح یاء اور بسکونِ تاء ارشاد فرمایا لہٰذا یہ شعر نہیں ہے لیکن راوی نے اسمیں تحریف کر کے اسے شعر بنا دیا۔

جواب ثانی شعر کی تعریف یہ ہے جو مقفّٰی اور موزون کلام ہو اور اس سے شعر گوئی کا قصد بھی ہو۔ اگر آنحضرتؐ کے ان فرامین کو اشعار کے وزن مان بھی لیا جائے تو بھی ان میں قصد شعر گوئی مفقود ہونے کے سبب انہیں شعر نہیں کہا جائیگا جیسے کہ اگر بعض اوقات خطبات اور رسائل ومحاورات میں کوئی مقفّٰی کلام آجائے تو اسے شعر نہیں کہا جاتا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا اَنْعَامًا'' (اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مواشی پیدا کیا) کیوں فرمایا حالانکہ سبحانہ جل وعلیٰ اس سے پاک ہیں؟

جواب یہ الفاظ بغیر شرکت کام کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں جیسے کہ محبت اور افعال قلب میں کہا جاتا ہے کہ یہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کیا ہے۔ یا جس شخص کے ہاتھ بھی نہ ہوں اسے بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے یہ کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ: ''لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ'' (جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا) بھی اسی قبیل سے ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ'' (کہ ہڈیوں کو جب بوسیدہ ہو جائیں گی کون زندہ کرے گا) کو مثال کیسے کہا حالانکہ یہ مثال نہیں بلکہ استفہام انکاری ہے؟

جواب اسے مثال اس لئے کہا کہ یہ ایک عجیب قصہ پر دلالت کرتی ہے جو مثال جیسا ہی ہے' وہ یہ کہ انسان مردہ کو زندہ کرنے کی قدرت خداوندی کا انکار کرتا ہے باوجود یکہ عقل اور نقل دونوں خدا عزوجل کی قدرت کے شاہد ہیں۔

سورة الصّٰفّٰت

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشارق کو جمع ذکر فرمایا جبکہ سورۃ رحمٰن میں اسے تثنیہ ذکر فرمایا اور اس جگہ صرف مشارق کا ذکر فرمایا جبکہ وہاں مغربین بھی مذکور ہے۔ نیز اس جگہ مشارق و مغارب دونوں کو جمع کے طور سے بھی ذکر فرمایا ہے جیسے کہ "فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ" (پھر میں قسم کھاتا ہوں شرقوں اور غربوں کے مالک کی) جبکہ ایک جگہ ان دونوں کو مفرد بھی ذکر فرمایا ہے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ" (موسیٰ نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کا بھی اگر تم کو عقل ہو)؟

جواب قرآنِ کریم' عرب کے اسالیب میں نازل ہوا ہے اور عرب کے اسالیب میں اجمال و تفصیل اور بسط و ایجاز بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کبھی اسے اجمالاً ذکر فرمایا رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ اس سے مراد سردی اور گرمی کے الگ الگ مشرق و مغرب ہیں' کبھی اسے تفصیل سے ذکر فرمایا کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اس سے مراد سال بھر کے روزانہ کے الگ الگ مشرق و مغرب مراد ہیں جو سات سو سے زائد ہیں' کبھی انہیں الفاظ کو بسط کے ساتھ ذکر فرمایا فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اور کبھی اسے اختصار کے ساتھ بیان فرمادیا ورب المشارق لیکن اس سے مراد مشارق و مغارب دونوں ہوتے ہیں باقی رہا یہ کہ مغارب کو چھوڑ کر مشارق کو کیوں ذکر فرمایا؟

وہ یا تو اس لئے کہ طلوع' غروب سے پہلے ہوتا ہے اور یا پھر اس لئے کہ مشارق منبع نور اور سرچشمۂ روشنی ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ: "اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ نِ الْكَوَاكِبِ" (بیشک ہم نے رونق دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے زینت کواکب کے ساتھ آسمان دنیا کو کیوں مختص فرمایا حالانکہ سماء دنیا کے علاوہ دیگر

آسمان بھی کواکب سے مزین ہیں؟

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان دنیا کو اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ہم اسے دیکھ سکتے ہیں؟

سوال ''بل عجبت'' میں اگر تاء پر ضمہ پڑھیں جیسے کہ حضرت علیؓ 'اور حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جسے امام فراء نے اختیار کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تعجب فرمارہے ہیں حالانکہ تعجب اس مرعوبیت کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو بڑا سمجھ کر انسان پر طاری ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً ایسی چیزوں سے مبراء اور پاک ہیں؟

جواب اول یہاں تعجب سے مراد کسی چیز کو عظیم جاننا ہے اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے بھی جائز ہے جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورتوں کے مکروفریب اور کفار کے انکار معجزات انبیاءِ کرامؑ کو 'عظیم' کہا۔

جواب ثانی یا پھر اس سے یہ مراد ہے کہ اے محمدؐ آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تعجب ہے۔ حضرت شریح عجبت کو فتح تاء کے ساتھ پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی چیز پر تعجب نہیں فرماتے' تعجب وہ کیا کرتا ہے جو نہ جانتا ہو' حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ شریح کو اپنے علم پر ناز ہے حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو عجبت کو ضمِ تاء کے ساتھ پڑھتے تھے اور وہ ان سے بڑے عالم تھے۔ حضرت زجاجؒ فرماتے ہیں کہ ضم تاء والی قراءت کا انکار غلط ہے اس لئے کہ باری تعالیٰ کے تعجب اور انسانوں کے تعجب میں بہت فرق ہے اس کی نظیر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ'' (اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے خفیہ تدبیر فرمائی) ''سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وغیرہ'' باقی یہ کہ تعجب کس چیز پر ہے اس میں دو قول ہیں (۱) انکارِ قرآن پر (۲) انکارِ قیامت پر۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی مدح میں یہ کیوں ارشاد فرمایا: ''اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ'' (بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے) حالانکہ رسولوں کا مرتبہ مؤمنین کے مرتبہ سے زیادہ ہوتا ہے؟

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ میں اس لئے مدح فرمائی تاکہ ہمیں ایمان کی رفعت شان کا اندازہ ہو سکے اور ہمیں اس کی تحصیل اور اس پر ثابت قدمی کی ترغیب بھی ہو سکے جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی مدح میں ارشاد فرمایا: '' وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ '' (اور وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں ہونگے)۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ'' میں ''فی'' کیوں ذکر کیا حالانکہ

نظر کا صلہ توالیٰ آتا ہے جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ ' فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ"

جواب اول اس آیۃ مبارکہ میں فی الی کے معنی میں ہے جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ: "فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ" (سوان قوموں نے اپنے ہاتھ ان پیغمبروں کے منہ میں دے دئے)۔

جواب ثانی اس نظر سے مراد آنکھ کی نظر نہیں بلکہ نظر تفکر مراد ہے جیسے کہ: "اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں) میں ہے۔ تو اس کا معنی ہوگا کہ انہوں نے علم نجوم کے متعلق سوچا۔

سوال حضرت ابراہیمؑ نے "اِنِّيْ سَقِيْمٌ" (میں بیمار ہونے کو ہوں) کیوں فرمایا حالانکہ آپؑ بیمار نہیں تھے۔

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ میں بیمار ہو جاؤں گا' جیسے کہ "اِنَّكَ مَيِّتٌ" (آپ کو بھی مرنا ہے) میں مستقبل کا معنی مراد ہے' حضرت ابراہیمؑ نے ایسا لفظ جس کے دونوں معنی محتمل ہیں اس لئے ذکر فرمایا تاکہ قوم دوسرا معنی مراد لے اور انہیں تنہا چھوڑ کر چلی جائے اور آپؑ ان کے بتوں کا تیا پانچا کر سکیں۔ امام ابن الانباریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بتا دیا تھا کہ جب یہ ستارہ طلوع ہوگا تو آپ بیمار ہو جائیں گے۔ جب آپؑ نے وہ ستارہ دیکھا تو آپؑ کو معلوم ہو گیا کہ میں بیمار ہوا ہی چاہتا ہوں۔ بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ مراد لیا ہے کہ تمہاری عبادت اصنام اور کہانت نجوم سے میرا دل رنجیدہ اور بیمار ہے جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ اس وقت واقعتاً بیمار تھے۔ امام زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات' لڑائی میں' ضرر عظیم سے بچنے کے لئے بیوی کو راضی کرنے کے لئے اور صلح کرانے کے لئے جھوٹ بولنے کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ جھوٹ حرام ہے مگر یہ کہ ایسے لفظ کے ساتھ بولا جائے جس کے دو معنی محتمل ہوں متکلم اس سے ایک معنی مراد لے جبکہ مخاطب دوسرا معنی سمجھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی اسی لئے ایسا لفظ استعمال کیا کہ مخاطب کچھ اور سمجھے جبکہ آپؑ کی مراد یہ تھی کہ میرے سر پر موت لٹک رہی ہے جو کسی بھی وقت آسکتی ہے جیسے کہ مشہور مقولہ ہے "كفى بالسلامة داء"

لبید کہتا ہے

دعوت ربی بالسلامة جاهدا ليصحني فاذا السلامة داء

ایک شخص کی اچانک موت واقع ہوئی' لوگ جمع ہوئے اور کہنے لگے یہ کیسے مر گیا یہ تو چنگا بھلا اور تندرست تھا۔ ایک اعرابی وہاں سے گذرا اور کہنے لگا کہ کیا یہ اس موت سے بھی تندرست

تھا جو ہر وقت اس کے سر پر لٹک رہی تھی۔

سوال ستاروں میں نظر تفکر جب جائز نہیں ہے تو حضرت ابراہیمؑ نے یہ نظر کیوں کی؟

جواب اگر دیکھنے والا حضرت ابراہیمؑ جیسا ہو تو اسے نظر فی الکواکب کی اجازت ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ: "فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا ۢ بِالْيَمِيْنِ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ" (پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے........) سے تو ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ ان بتوں کو توڑنے والے حضرت ابراہیمؑ ہیں جبکہ سورۃ الانبیاء کی آیات مبارکہ: "قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ" (یہ کس نے کیا ہمارے بتوں کے ساتھ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے بڑا ہی غضب کیا الخ) سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ بتوں کا تیا پانچا کرنے والا کون ہے؟۔ ان آیات میں تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

جواب ہوسکتا ہے کہ جن لوگوں کو علم ہو اور جو جلدی سے حضرت ابراہیمؑ کی طرف لپکے وہ اور لوگ ہوں جبکہ سوال کرنے والے اور ناواقف رہنے والے دوسرے لوگ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے کسی کو بھی علم نہ ہو اور ہر ایک دوسرے سے پوچھتا رہا ہو اور پھر جب معلوم ہوا ہو کہ ان بتوں کو حضرت ابراہیمؑ ہی نے پاش پاش کیا ہے تو تیزی سے ان کی طرف لپکے ہوں۔

سوال "اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ" (میں تو اپنے رب کی طرف چلا جاتا ہوں) کا کیا مفہوم ہے؟۔

جواب اس کا مطلب ہے کہ جس طرف ہجرت کرنے کا مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے یعنی شام کی طرف جا رہا ہوں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ الی ربی سے مراد الی ارض ربی ہے۔ زمین کی نسبت رب کی طرف اس ارض مقدسہ کی شرافت وعظمت کے لئے کی جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ" اور "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" (اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں)

سوال "سَيَهْدِيْنِ" (وہ پہنچا دے گا مجھکو) کہنے کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ آپؑ تو ہدایت یافتہ تھے۔

جواب یعنی مجھے ہدایت پر ثابت قدمی اور رسوخ عطاء فرمائیں گے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جنت کی طرف میری رہنمائی فرمائیں گے جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ ہر قسم کے حالات میں درست امور کی طرف میری رہنمائی فرمائیں گے۔ اس کی نظیر حضرت موسیٰؑ کا ارشادِ گرامی ہے "كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ"

سوال حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ سے ذبح کا مشورہ کیوں کیا؟ "فَانْظُرْ مَا

ذَا تَرٰی ’’(سوتم بھی سوچو تمہاری کیا رائے ہے) حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو بیٹے کے ذبح کا حکم فرمایا تھا کیونکہ ’’اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ ‘‘(میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کرر ہا ہوں) اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حکم تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کردو کیونکہ انبیاءِ کرام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے وہ جو خواب میں دیکھتے ہیں وہ دراصل بیداری میں اسے سرانجام دینے کا حکم ہوتا ہے وحی جیسے کہ حضرت اسماعیلؑ کے جواب سے واضح ہے: ’’یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ‘‘(ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجئے)؟

جواب آپؑ نے ان سے رائے طلب کرنے کے لئے مشورہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو آزمائش خداوندی پر بیٹے کا صبر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ بیٹے میں اگر کوئی بات خلاف صبر معلوم ہو تو اسے صبر کی تلقین کر سکیں نیز اس لئے بھی تا کہ بیٹے کو آئندہ پیش آمدہ حالات کا علم ہو جائے تا کہ وہ بھی ذبح کے لئے تیار ہو سکے اور خود کو ذہنی طور پر آمادہ کر سکے اور امر خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر کے ثواب حاصل کر سکے‘ نیز اس لئے بھی تا کہ مشورہ کی سنت پر عمل ہو جائے‘ یہ بھی ایک قول ہے کہ اگر حضرت آدمؑ درخت سے کھانے کے متعلق فرشتوں سے مشورہ کر لیتے تو اس آزمائش میں مبتلاء نہ ہوتے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ’’قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ‘‘(تم نے خواب کو خوب سچ کر کے دکھایا) کیوں ارشاد فرمایا کیونکہ خواب کی تصدیق تو تب ہوتی اگر حضرت اسماعیلؑ ذبح ہو جاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے اختیار میں تھا اور جو کچھ آپ کر سکتے تھے آپ نے کر دیا کہ اپنے بیٹے کو لٹا کر اس کے حلقوم پر چھری چلادی باقی یہ تو امر خداوندی تھا کہ چھری گلہ کاٹنے سے عاجز رہی۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپؑ نے خواب میں یہی دیکھا تھا کہ آپ ذبح کر رہے ہیں حضرت اسماعیلؑ کا ذبح ہونا نہیں دیکھا تھا‘ اور یہی کچھ آپؑ نے بیداری میں کر دیا تو آپؑ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔

سوال ’’فَلَمَّا اَسْلَمَا ‘‘(غرض جب دونوں نے تسلیم کر لیا) میں لَمَّا کا جواب کیا ہے؟

جواب بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے انہیں خوشخبری مل گئی کہ حضرت اسماعیلؑ کی جگہ یہ فدیہ قبول کر لیا جائے گا تو وہ اللہ کی اس نعمت پر سراپا شکر بن گئے‘ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا جواب و نادیناہ ہے جس میں واؤ زائدہ ہے۔ جیسا کہ مرؤ القیس کے اس شعر میں واؤ زائد ہے۔

فلما اجزنا ساحة الحی وانتحی بنا بطن خبت ذی خفاف عقنقل

ابن الانباریؒ نے انتحی کو فلما اجزنا کا جواب قرار دیا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق ارشاد فرمایا: "كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ" (ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) جبکہ اس سے پہلے اور بعد کے سبھی قصوں میں ارشاد فرمایا: "اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ" (وہ وقت عجیب تھا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں ایک بار گذر چکا تھا: "اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ" اس لئے دوبارہ اختصار کے ساتھ ارشاد فرمادیا۔

سوال ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ نَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ اَجْمَعِیْنَ" حالانکہ حضرت نوحؑ زمانہ نجات سے قبل بھی رسول تھے؟

جواب "اِذْ نَجَّیْنٰهُ" ماقبل سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا متعلق محذوف ہے اور وہ یہ ہے کہ "واذكر لهم يا محمد اذ نجيناه" یعنی اے محمدؐ انہیں بتادیجئے جب ہم نے اپنی نعمت سے اسے نجات دی۔ اس قسم کا سوال: "وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ" (اور بے شک یونس بھی پیغمبروں میں سے ہیں جبکہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے) میں بھی وارد ہوتا ہے۔

سوال "وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ" (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا) میں لفظ او شک کے لئے ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا شک میں مبتلاء ہونا محال ہے۔

جواب اس آیۂ مبارکہ میں "او" "بل" کے معنی میں ہے بعض فرماتے ہیں کہ واؤ کے معنی میں ہے جیسے کہ "اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ" اور عُذْرًا اور نُذْرًا میں جبکہ بعض حضرات اس کا یہ معنی بیان کرتے ہیں کہ لفظ او مخاطب کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی انہیں دیکھتا تو کہتا کہ وہ ایک لاکھ یا زیادہ تھے۔ اسی طرح "فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی" (پس اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رکھے گا بلکہ اور بھی کم) میں او کی تفصیل ہے۔

سوال "فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰی حِیْنٍ" (تو آپ تھوڑے زمانے تک ان کا خیال نہ کیجئے) اور "اَبْصِرْهُمْ" کے تکرار کی کیا ضرورت تھی؟

جواب تاکہ وعید اور تخویف میں مزید تاکید پیدا ہوسکے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے پہلے ارشاد فرمایا: "وَاَبۡصِرۡهُمۡ" پھر فرمایا "وَاَبۡصِرۡ" (اور دیکھتے رہیے) اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب چونکہ پہلے کلمہ میں مفعول کی ضمیر گذر چکی تھی اس لئے دوبارہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ پہلے کا مطلب ہے کہ جب ان پر عذاب اترے تو انہیں دیکھنا اور دوسرے کا مطلب ہے کہ جب ان پر عذاب اترے تو عذاب کو دیکھنا لیکن معنوی اعتبار سے دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

سورۃ صٓ

سوال "صٓ وَالۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ" (صٓ، قسم ہے قرآن کی جو نصیحت سے پر ہے) کا جواب قسم کہاں ہے؟

جواب اول اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتداء سورۃ میں ایک ایسا لفظ 'صٓ' بیان فرمایا جو قرآن کریم کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے بعد ازاں قسم کو ذکر فرمایا جس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ نصیحت والے قرآن کی قسم ہے کہ یہ کلام معجزہ ہے۔

جواب ثانی صٓ الخ خبر ہے جس کا مبتداء محذوف ہے یعنی اس قرآن نے اہل عرب کو عاجز کر دیا قرآن ذی الذکر کی قسم، جیسے کہ مقولہ ہے هذا حاتم والله یعنی قسم کو مؤخر بھی کر دیتے ہیں۔

جواب ثالث قسم کا جواب کم اهلکنا ہے، کلام طویل ہونے کے سبب جواب قسم سے لام حذف کر دیا گیا، جیسے کہ "وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا" "قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی" میں جواب قسم سے لام محذوف ہے۔

جواب رابع امام کسائی فرماتے ہیں "اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهۡلِ النَّارِ" اس کا جواب ہے لیکن امام فراءؒ فرماتے ہیں کہ کلام عرب میں جواب قسم کو قسم سے اتنا مؤخر ذکر نہیں کیا جاتا۔

سوال "اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ" (یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو) اور "وَاذۡکُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَیُّوۡبَ" (اور آپ ہمارے بندے ایوب کو یاد کیجئے) میں کیا ربط ہے؟

جواب اول مطلب یہ ہے کہ عبادت وریاضت میں حضرت یعقوبؑ کے صبر سے قوت حاصل کرو۔

جواب ثانی ان کفار مکہ کو عبادت وریاضت اور مجاہدات میں حضرت داؤد کی شہرت کا علم ہے کہ وہ ایک دن چھوڑ کر ضرور روزہ رکھتے تھے اور روزانہ آدھی رات عبادت کرتے تھے۔ بایں ہمہ جب

حضرت داوٗدؑ رورو کر استغفار فرماتے تھے تو ان کفار مکہ کو کیا ہوا کہ گناہ کرنے کے باوجود ہماری طرف رجوع نہیں کرتے۔

سوال فرشتوں نے حضرت داوٗدؑ کے پاس آ کر کہا: ’’خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ‘‘ (ہم دو اہل معاملہ ہیں کہ ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے) حالانکہ فرشتوں سے بغاوت اور ظلم متصور نہیں۔ نیز انہوں نے یہ بھی جھوٹ بولا کہ: ’’اِنَّ هٰذَاۤ اَخِیْ لَهٗ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ‘‘ (یہ شخص میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے)؟

جواب انہوں نے یہ بات فرضی طور پر صورت مسئلہ بیان کرنے کے لئے کہی' اس لئے اسے جھوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے کہ ہم صورت مسئلہ میں کہہ دیتے ہیں کہ زید کی چالیس بکریاں ہیں اور عمرو کی بھی چالیس بکریاں ہیں' انہوں نے اپنی بکریاں خلط ملط کر لیں۔ اب سال گذرنے کے بعد ان پر زکوٰۃ واجب ہو گی یا نہیں؟۔

سوال حضرت داوٗدؑ نے مدعٰی علیہ کی بات سننے سے پہلے ہی اس کے ظالم ہونے کا فیصلہ کیسے سنا دیا؟

جواب آپؑ نے اس کے اعتراف کے بعد یہ حکم صادر فرمایا تھا اگرچہ یہ اعتراف قرآن کریم میں موجود نہیں ہے لیکن امام سدی سے اسی طرح منقول ہے۔ اور قصص میں دلالت حال کی وجہ سے اختصاراً ایسے الفاظ حذف بھی کر دیئے جاتے ہیں جیسے کہ عرب حضرات کہتے ہیں۔ میں نے اسے تجارت کا حکم دیا پس اس نے خوب مال کمایا مطلب ہے کہ تجارت کی اور خوب مال کمایا۔

سوال ’’اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ‘‘ (میں اس مال کی محبت میں) میں تکرار حُبّ کا کیا مطلب ہے؟ بظاہر اس کا مطلب یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مجھے اس کے ساتھ مال جتنی محبت ہے' جیسے کہ عرب کا مقولہ ہے ’’احببت حب زید‘‘ یعنی مجھے زید جتنی محبت ہے۔ نیز اس کا صلہ عن ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اول آیت میں احببت کا معنی ترجیح دینا ہے۔ جیسے اگر انسان کو دو چیزوں میں اختیار ہو تو وہ ایک کے بارہ میں کہہ دیتا ہے احببت هذا یعنی میں اسے ترجیح دیتا ہوں استحب بھی ترجیح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ’’وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى‘‘ (اور وہ جو ثمود تھے تو ہم نے ان کو رستہ بتلایا سو انہوں نے گمراہی کو بمقابلہ ہدایت کے پسند کیا) ویسے جو شخص کسی سے محبت رکھتا ہے اسے دوسروں پر ترجیح دیتا ہے۔ باقی اس

آیت میں مذکور صلہ عن علیٰ کے معنی میں ہے جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ: "وَمَنْ يَّبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ" (اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے) اب آیت کا معنی بن جائیگا کہ میں نے مال کی محبت کو اپنے رب کے ذکر پر ترجیح دی۔

جواب ثانی صاحب معانی القرآن امام جرجانیؒ فرماتے ہیں کہ احببت بیٹھنے اور تاخیر کرنے کے معنی میں ہے جیسے کہ احب الجمل کا معنی ہے اونٹ بیٹھا۔

ایک شاعر کہتا ہے:

دعتك اليها سقلتاها وجيدها فملت كما مال المحب على قمد

جو شخص بھی کسی چیز کو چھوڑ کر اس سے پہلو تہی برتے تو وہ اسے چھوڑ بیٹھتا ہے۔ پس آیت کا ترجمہ ہوگا کہ میں نے مال کی محبت کے سبب اپنے رب سے پہلو تہی کی۔ اس صورت میں لفظ حب مفعول لہ ہونے کے سبب منصوب ہوگا۔

سوال حضرت سلیمانؑ نے: "وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ" (اور مجھ کو ایسی سلطنت دے کر کہ میرے سوا کسی کو میسر نہ ہو) کیوں فرمایا؟ اس سے تو معاذ اللہ بخل اور حسد کا اظہار ہو رہا ہے، جبکہ حضرت سلیمانؑ یقیناً ان بیماریوں سے محفوظ تھے؟

جواب اول امام حسن وقتادہؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی میری زندگی میں مجھ سے یہ سلطنت چھین نہ سکے جیسے کہ شیطان آپؑ کی انگوٹھی پہن کر آپؑ کی کرسی مبارک پر جا بیٹھا تھا۔

جواب ثانی چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو معلوم تھا کہ آپؑ کے علاوہ کوئی بھی اس کی صلاحیت نہیں رکھتا لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؑ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ آپؑ اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ دعاء کریں تاکہ یہ سلطنت آپؑ کے ساتھ خاص کر دی جائے۔

جواب ثالث آپؑ کی مراد اس جملہ سے عظیم سلطنت تھی البتہ اس کی تعبیر کے لئے عبارت یہی اختیار کی گئی جیسے کہ اگر کسی کے متعلق کہا جائے کہ کسی کے پاس اس جیسا فضل یا اس جیسا مال نہیں ہے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اس کو فضل عظیم یا مال عظیم حاصل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فی الحقیقت کسی کے پاس بھی اس جتنا مال وفضل نہیں ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی تعریف میں: "اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا" (بے شک ہم نے ان کو صابر پایا) کیوں فرمایا حالانکہ صبر تو ترک شکوہ وشکایت اور ترک جزع وفزع کو کہا جاتا ہے) اور حضرت ایوبؑ نے تو جزع فزع کی تھی؟

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے جزع فزع صبر کے منافی نہیں ہے کیونکہ اس سے اظہار

خضوع وعبودیت اور احتیاج الی اللہ مراد ہوتی ہے حضرت ایوبؑ نے بھی فرمایا تھا: "اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" (میں تو اپنے رنج وغم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں) لیکن اس کے باوجود اسے صبر سے تعبیر فرمایا: "فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ" (سو صبر ہی کروں گا)۔ باقی رہی صبر کی یہ تعریف کہ جس میں شکوہ شکایت نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کے سامنے شکوہ شکایت نہ کیا جائے۔

جواب ثانی آپؑ نے تو اس وقت شفاء کی درخواست کی تھی جب آپؑ کا صرف قلب مبارک اور زبان مبارک بیماری سے محفوظ رہ گئے تھے اور وہ بھی اس لئے تاکہ شیطان قوم کے دل میں یہ وسوسہ نہ ڈال سکے کہ اگر ایوبؑ اللہ کے نبیؑ ہوتے تو یہ اللہ سے دعاء کر لیتے اور شفاء پا لیتے یا اگر یہ حقیقی نبی ہوتے تو وہ اس بیماری میں مبتلا ہی کیوں ہوتے۔

بعض روایات میں ہے کہ آپؑ نے ان الفاظ کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور دعاء کی جو قبول ہوئی "اے اللہ آپ جانتے ہیں کہ میری زبان نے کبھی میرے دل کی مخالفت نہیں کی، میرے دل نے کبھی میری آنکھوں کی پیروی نہیں کی، مجھے میری مملوکہ چیزیں (باندیاں وغیرہ) کبھی غافل نہ کر سکیں، میں نے یتیموں کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہیں کھایا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں کپڑے پہن کر اور سیر ہو کر سویا ہوں اور میرے قریب میں کوئی بھوکا یا عریاں ہو"۔ اس دعاء کے سبب اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپؑ کی تکلیف کو دور فرما دیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابلیس کو فرمایا: "وَاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ" (اور بے شک تجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک) اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ قیامت تک ابلیس پر لعنت رہے گی اور پھر ختم ہو جائیگی؟

جواب ابلیس سے لعنت کیسے ختم ہو سکتی ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن کے بارہ میں فرماتے ہیں: "فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ" (ہاں پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکاریگا کہ اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے اعراض کرتے ہیں) البتہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دنیا باقی ہے اس پر لعنتیں برستی رہیں گی اور اختتام دنیا کے بعد اسے ایسا دردناک عذاب چکھنا پڑے گا جس کے سبب وہ اس تمام لعنت کو بھی بھول جائے گا۔

سورۃ الزمر

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ" (اللہ تعالیٰ ایسے

شخص کوراہ پر نہیں لاتا جو جھوٹا اور کافر ہو) کیوں فرمایا حالانکہ بہت سے کاذب اور کفار ایسے بھی ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہدایت دیتے ہیں کہ وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے کفر اور تکذیب اسلام پر ڈٹے رہتے ہیں انہیں ہدایت سے سرفراز نہیں کیا جاتا جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی بات کی طرف ان کی رہنمائی نہیں فرماتے جو مسلمانوں کے خلاف حجت بن سکے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کے رد میں جو اس کے لئے اولاد ثابت کرتے ہیں ارشاد فرمایا: ''لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ '' (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اولاد بنانے کا ارادہ کرتا تو ضرور اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا منتخب فرماتا) باوجودیکہ جو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے اپنی اولاد کے طور پر منتخب فرمالیا ہے۔ مثلاً یہودی حضرت عزیرؑ اور عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بیٹا ہونے کے متعلق جبکہ بعض مشرکین عرب ملائکہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی بیٹیاں بنالیا ہے۔ تو آیت میں مذکور: ''لَاصْطَفٰى مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب اگر اس سے یہود ونصاریٰ پر رد مقصود ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں کو اولاد بناتے نہ کہ انسانوں کو کیونکہ یہود ونصاریٰ دونوں کے نزدیک ملائکہ انسانوں سے افضل ہیں اور اگر اس سے مشرکین عرب پر رد کیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے لئے اولاد کا انتخاب فرماتے تو کسی ایسی جنس میں سے انتخاب کیا جاتا جس میں صفت تخلیق موجود ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد اللہ تعالیٰ کی صفت سے متصف تو ہو۔ اور ملائکہ تو تمام مل کر ایک مچھر کا پر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ کیسے خدا تعالیٰ کی بیٹیاں ہو سکتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰؑ میں تو مادہ تخلیق موجود تھا کہ آپؑ پرندوں کو پیدا فرمادیا کرتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ آپؑ تو مٹی سے پرندوں کی صورت بنایا کرتے تھے پھر اس میں پھونکا کرتے تھے باقی اس پرندے کا معجزۃً جاندار بن جانا یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے ہوتا تھا۔

سوال ہر ایک کو معلوم ہے کہ حضرت حواؑ ہم سے صدیوں سال پہلے پیدا ہوئیں تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا'' (اس نے تم لوگوں کو تنِ واحد سے پیدا کیا پھر اسی نے اس کا جوڑا بنایا) میں لفظ ثُمَّ سے عطف کیوں کیا حالانکہ ثُمَّ تو تراخی اور ترتیب کے لئے ہوتا ہے؟

جواب اوّل ایک آیت مبارکہ میں ثُمَّ خبر میں ترتیب کے لئے آیا ہے نہ کہ ایجاد میں ترتیب کے لئے جیسے کہ ہم اپنے محاورہ میں کہتے ہیں میں نے آج تمہیں یہ دیا اور پھر کل یہ دیا تھا۔ایک شاعر کہتا ہے:

ان من سادثم ساد ابوه ثم قد ساد قبل ذلك جده

جواب ثانی ثُمَّ کا عطف واحدۃ پر ہے نہ کہ خلقکم پر' اس کا مطلب ہوگا کہ میں نے تمہیں جس نفس سے پیدا کیا پہلے میں نے اسے پیدا کیا پھر اس کی راحت کے لئے اس کی بیوی پیدا کی۔

جواب ثالث ثُمَّ کو اپنے ظاہری معنی پر بھی لیا جاسکتا ہے' کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اوّلاً حضرت آدمؑ کو پیدا فرمایا پھر ان کی پیٹھ میں سے تمام انسانوں کو پیدا فرما کر ان سے عہد اَلَسْتُ لیا پھر دوبارہ ان تمام انسانوں کو حضرت آدمؑ کی پیٹھ مبارک میں داخل فرمایا بعد ازاں حضرت حواءؑ کو پیدا فرمایا۔تو ارشاد باری تعالیٰ خَلَقَکُمْ سے عہد الست کے دن کی تخلیق مراد ہے نہ کہ موجودہ تخلیق کیونکہ یہ تو توالد و تناسل کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ'' (اور تمہارے آٹھ نر و مادہ چار پایوں کے پیدا کئے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ چوپائے تو زمین میں پیدا ہوتے ہیں نہ کہ آسمان سے اترتے ہیں؟

جواب اوّل اللہ تبارک وتعالیٰ نے آٹھوں جوڑوں کو جنت میں پیدا فرمایا اور پھر حضرت آدمؑ کے زمین پر اترنے کے بعد ان چوپاؤں کو ان کے لئے جنت سے نازل فرمایا۔

جواب ثانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا' چونکہ چوپائے بغیر نباتات کے اور نباتات بغیر پانی کے نہیں پائی جاتیں اس لئے گویا کہ چوپائے بھی آسمان سے منزل ہیں۔جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ'' (اے اولاد آدم کی ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو کہ تمہارے پردہ دار بدن کو بھی چھپاتا ہے) اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا جو روئی اور صوف وغیرہ کا سبب ہے جس سے کپڑے تیار ہوتے ہیں تو گویا کہ کپڑے بھی منزل من السماء ہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: ''قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا'' (آپ کہہ دیجئے سفارش تو تمام خدا ہی کے اختیار میں ہے) کیوں فرمایا؟ باوجودیکہ انبیاء' علماء' شہداء اور بچوں کی شفاعت احادیث سے ثابت ہے؟

جواب مطلب یہ ہے کہ کوئی اللہ تبارک وتعالیٰ کے مالک بنائے بغیر شفاعت کا مالک نہیں ہوگا

: ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ'' (ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدون اس کی اجازت کے) اور: ''وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی'' (اور وہ بجز اس کے جس کے لئے خدا تعالیٰ کی مرضی ہو) اور کسی کی سفارش نہیں کر سکتے)۔

سوال ''ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰہُ نِعْمَۃً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ'' (پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت عطاء فرما دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ مجھ کو تدبیر سے ملی ہے) میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اوتیتہ میں مذکر ضمیر ذکر کی حالانکہ اس کا مرجع نعمة ہے اور وہ مؤنث ہے؟

جواب اس کا مرجع نعمة نہیں بلکہ قسم من النعمة یا شیء من النعمة ہے اور یا پھر اس کا مرجع نعمة نہیں بلکہ انعام ہے۔

سوال اللہ تبارک و تعالیٰ: ''وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ'' (اور تم اپنے رب کے پاس سے آئے ہوئے اچھے اچھے حکموں پر چلو) کیوں فرمایا حالانکہ قرآن تو سارے کا سارا ہی احسن ہے؟

جواب اس کا مطلب ہے کہ اس بہترین وحی اور اس بہترین کتاب کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہے اور وہ مکمل قرآن ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ احسن قرآن سے آیات محکمات مراد ہیں جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اس سے ہر وہ آیت مراد ہے جس میں اطاعت واحسان کا حکم ہو۔ اس اعتراض کے مزید جوابات سورۃ الاعراف میں ''وَاْمُرْ قَوْمَکَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِہَا'' کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ: ''وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ اَشْرَکْتَ'' (اور آپ کی طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کی طرف بھی یہ وحی بھیجی جا چکی ہے) سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے گذشتہ امتوں کی طرف جو وحی کی گئی اس میں بھی آپؐ کو خطاب کیا گیا کہ ''لئن اشرکت'' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ امتوں میں ہر ایک کو اور آپ کی امت میں سے بھی سب کو وحی کے ذریعے بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ شرک کریگا..... یعنی اشرکت سے مراد ہر مخاطب ہے۔

جواب ثانی اس میں کچھ عبارت مقدر ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف اور تم سے پہلے لوگوں کی طرف توحید پر عمل پیرا ہونے کی وحی کی گئی ہے پھر ''لئن اشرکت'' سے نیا کلام شروع کیا جا رہا ہے۔

جواب ثالث عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی طرف وحی کی گئی کہ "لئن اشرکت" اور اسی طرح آپ سے پہلے لوگوں کی طرف بھی وحی کی گئی۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت اور اہل نار دونوں کے لئے لفظ سیق استعمال کیا ہے' جس کا معنی ہے ہانکا جائیگا' اس لفظ سے تو ذلت عیاں ہے یہ دونوں پر کیسے صادق آ سکتا ہے؟۔

جواب اہل نار کے ھانکے جانے سے مراد یہ ہے کہ جیسے قیدیوں کو ھانکا جاتا ہے اسی طرح اہل نار کو بھی قیامت کے دن ھانکا جائیگا۔ جبکہ اہل جنت کے لئے لفظ سیق کا مطلب ہے کہ انہیں اعزاز واکرام کے ساتھ لے جایا جائیگا جس طرح کہ بادشاہ کے دربار میں مختلف وفود کو لے جایا جاتا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کے لئے بغیر واؤ کے: "فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا" (اس کے دروازے کھول دیئے جاویں گے) فرمایا اور جنت کے لئے واؤ کے ساتھ "وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا" (اور اس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے) فرمایا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب اول امام فراء فرماتے ہیں کہ واؤ زائد ہے۔

جواب ثانی واؤ حالیہ ہے' اس کا مطلب ہے کہ جنت لائی جائیگی تو اس کے دروازے کھلے ہوں گے جبکہ جہنم کے دروازے اس کے لانے کے بعد کھولے جائیں گے' اس کی بھی بہت سی وجوہات ہیں (۱) اہل جنت جب جنت کے دروازے کھلے دیکھیں گے تو انہیں مزید فرحت و خوشی ہوگی جبکہ جہنم کے دروازے بند رکھے جائیں گے تاکہ اس کی تپش میں مزید اضافہ ہو سکے۔ (۲) بند دروازے پر کھڑے ہونے سے ذلت ٹپکتی ہے' اللہ تبارک وتعالیٰ اہل جنت کو اس سے محفوظ رکھیں گے (۳) سخی اجر جلدی دیتا ہے اور سزا میں تاخیر کرتا ہے۔ اگر جنت کے دروازے بند ہوتے تو اہل جنت کو انتظار کرنا پڑتا جو کمال کرم کے خلاف ہے۔

سورۃ المؤمن

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "مَا يُجَادِلُ فِىْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" (اور اللہ تعالیٰ کی ان آیتوں میں وہی لوگ جھگڑے نکالتے ہیں جو منکر ہیں) کیوں ارشاد فرمایا حالانکہ اہل ایمان بھی آیات کے متعلق جھگڑتے ہیں کہ یہ منسوخہ ہیں یا محکمہ؟ یہ اپنے حقیقی معنی پر دلالت کر رہی ہیں یا مجازی معنی پر؟ یہ قدیم ہیں یا حادث؟ وغیرہ وغیرہ؟

جواب "جدال" سے مراد آیات کی تکذیب کرکے نورِ خداوندی بجھانے کی مذموم سعی کرنا ہے'

اس کے فوراً بعد ''وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ'' (اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اس ناحق سے حق کو باطل کر دیں) سے یہ بات بہ خوبی سمجھ آ رہی ہے۔

سوال حاملینِ عرش کے متعلق ''وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ'' (اور اس پر ایمان رکھتے ہیں) فرمانے کا کیا فائدہ؟ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ حاملینِ عرش اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں؟

جواب اس سے ایمان کی شرافت وعظمت اور ترغیب مقصود ہے جیسے کہ انبیاء کرامؑ کو قرآن مقدس میں کئی جگہ ایمان اور عمل صالح سے متصف کیا گیا اس سے بھی یہی مقصود ہے۔ نیز ایک اور جگہ اعمالِ خیر کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' بھی اسی لئے ارشاد فرمایا ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک میں: ''قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ'' اموات کو موت دینے سے کیا مراد ہے حالانکہ یہ امرِ محال ہے؟

جواب یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے ''پاک ہے وہ ذات جس نے مچھر کو چھوٹے اور ہاتھی کو بڑے جسم سے نوازا یا جیسے کہ کنواں کھودنے والے سے کہا جاتا ہے کہ کنویں کے منہ کو تنگ رکھو اور پیٹ کو وسیع کر دو۔ ان مثالوں میں کبر سے صغر اور صغر سے کبر یا وسعت سے تنگی اور تنگی سے وسعت کی طرف منتقل ہونا مقصود نہیں بلکہ صرف ان حالتوں کا وجود بیان کرنا مقصود ہے۔ جب ایک چیز میں صغر و کبر اور تنگی و کشادگی دونوں ممکن ہوں تو پھر ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنا ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا ہی ہے۔

سوال ''يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ'' (جس دن سب لوگ سامنے آ موجود ہوں گے ان کی کوئی بات خدا سے مخفی نہ رہے گی) کیوں فرمایا حالانکہ وہ ظاہر ہو یا ظاہر نہ ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ سے تو مخفی نہیں ہو سکتے؟

جواب مطلب یہ ہے کہ اعتقاد کے مطابق بھی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے چھپ نہیں سکیں گے۔ کیونکہ ان کے اعتقاد کے مطابق جب وہ دیواروں یا پردوں کے پیچھے ہوتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے مخفی ہوتے ہیں ارشادِ باری تعالیٰ: ''وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ'' (اور لیکن تم اس گمان میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر ہی نہیں) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سوال حضرت موسیٰؑ پر ایمان رکھنے والے نے حضرت موسیٰؑ کے متعلق یہ کیسے فرمایا: ''وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ'' (اور اگر وہ سچا ہو تو وہ جو کچھ پیش گوئی کر رہا ہے اس میں

سے کچھ تو تم پر پڑے گا) حالانکہ قائل کے زعم میں نیز حقیقت میں بھی انہیں حضرت موسیٰ کے تمام وعدوں کا سامنا کرنا تھا نہ کہ بعض کا؟

جواب اول لفظ بعض صلہ ہے۔

جواب ثانی بعض کل کے معنی میں ہے جیسے کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

ان الامور اذا الاحداث دبرها دون الشيوخ ترى فى بعضها خللا

لبید کہتا ہے:

اولم تكن تدرى نوار باننى وصال عقد حبائل جذامها

تراك امكنة اذالم ارضها او يرتبط بعض النفوس حمامها

ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ اعتراض کردے کہ لفظ بعض دونوں اشعار میں اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہے۔لبید نے بعض النفوس سے خود اپنی ذات مراد لی ہے۔امام ابن الانباری نے حضرت ابوعبیدہ سے اسی طرح اس کی تفسیر نقل کی ہے کہ بعض کل کے معنی میں ہے اور لبید کے انہیں دو اشعار سے انہوں نے استدلال کیا ہے۔البتہ امام زمخشریؒ نے حضرت ابوعبیدہ کی اس تفسیر کا تو انکار کیا ہے تاہم انہوں نے: "وَلِأُبَيِّنَ لَكُم بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ" (اور تا کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کررہے ہو تم سے بیان کردوں) میں لفظ بعض کو کل کے معنی میں لیا ہے۔

جواب ثالث بعض اپنی اصل حالت پر ہے اس صورت میں لفظ بعض ذکر کرنے کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) ان سے دو وعدے کئے گئے تھے کہ اگر ایمان لائیں گے تو نجات ملے گی اور اگر گمراہی اختیار کریں گے عذاب چکھنا ہوگا۔ یقیناً وہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت پر ہی ہونگے تو انہیں بعض وعدوں ہی کا سامنا ہوگا۔

(۲) یا پھر ان سے یہ دو وعدے کئے گئے تھے کہ وہ دنیا میں کفر پر مریں گے اور آخرت میں انہیں عذاب بھگتنا پڑے گا تو دنیا میں کفر پر ہلاکت یقیناً بعض ہے نہ کہ کل۔

جواب رابع انہیں نصیحت کرنے کے لئے لفظ بعض استعمال کیا گیا کہ ہوسکتا ہے وہ بات مان لیں اور نصیحت پر کچھ کان دھرلیں۔مطلب یہ ہے کہ کم از کم تمہیں ان کے کچھ نہ کچھ وعدوں کا تو سامنا کرنا ہی ہوگا۔جیسے کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

قد يدرك المتأنى بعض حاجته وقد يكون من المستعجل الزلل

تاخیر کرنے والا اپنی بعض حاجات تو حاصل کر ہی لیتا ہے جلد باز لغزش کا شکار ہو ہی جاتا ہے امام زمخشریؒ نے اسی جوابِ رابع کو پسند فرمایا ہے۔

سوال تولی اور ادبار جب دونوں کا معنیٰ ایک ہے تو پھر: " يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ " (جس روز پشت پھیر کر لوٹو گے) کہنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب اول تاکید مقصود ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ: " فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ " (پھر اوپر سے ان پر چھت آ پڑی)۔

جواب ثانی ان کی غیرت کو ابھارنا مقصود ہے کیونکہ مدبرین میں دبر کا لفظ آتا ہے جو غیرت کے منافی ہے۔اس کی نظیر: " وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ " (اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے) ہے۔

سوال " لَعَلِّيْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ " (شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں) میں لفظ اسباب کے تکرار کی کیا ضرورت تھی؟ یہی کافی تھا کہ ابلغ اسباب السموات ؟

جواب جب کسی چیز کو مبہم ذکر کر کے اس کی وضاحت کی جائے تو اس سے اس چیز کی جلالت شان ظاہر ہوتی ہے۔یہاں بھی یہی مراد ہے۔

سوال بری چیز جیسی چیز بھی بری ہوتی ہے تو پھر: " مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا " (جو شخص گناہ کرتا ہے اس کو تو برابر سرابر ہی بدلہ ملتا ہے) کا کیا مطلب ہے؟

جواب مطلب یہ ہے کہ برائی کا بدلہ حساب کے مطابق دیا جائیگا۔اس مقدار سے زیادہ سزا نہیں دی جائیگی تاہم نیک کام کی جزاء بغیر حساب دی جائیگی جیسے کہ ایک اور جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

سوال تو پھر: " مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا " (جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس حصے ملیں گے) کا کیا مطلب ہے؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ جزاء دس گنا سے کم نہیں ہوگی اس آیت میں زیادہ کی نفی نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: " لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ " (جن لوگوں نے نیکی کی ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآں بھی)۔

سوال " وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ " (اور جتنے لوگ دوزخ میں ہوں گے جہنم کے موکل فرشتوں سے کہیں گے) میں لخزنتھا کیوں نہیں فرمایا حالانکہ لخزنتھا بہ نسبت لخزنتہ جھنم کے زیادہ مختصر ہے؟

جواب چونکہ جہنم کے ذکر میں ایک قسم کی ہولناکی ہے لہٰذا مناسب یہی تھا کہ اسے ذکر کیا جاتا ' جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جہنم دوزخ کے ایک گڑھے کا نام ہے۔جو اس کا داروغہ ہے' وہ

جہنم کے منتظم تمام ملائکہ کا سردار ہے اسی لئے جہنمی لوگ اسے پکاریں گے۔

سوال کبھی تو مشرک کہیں گے: "بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا" (بلکہ ہم اس کے قبل کسی کو نہیں پوجتے تھے) کبھی کہیں گے "هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ" (وہ ہمارے شریک بھی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کو پوجا کرتے تھے) یہ تو کھلا تعارض ہے؟

جواب اول یعنی جن بتوں کی ہم پرستش کرتے رہے ان کی تو حقیقت کچھ بھی نہیں ہے یہ نہ تو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔

جواب ثانی اہل جہنم جھوٹ بولیں گے جیسے کہ: "وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ" (کہ قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی کہ ہم مشرک نہ تھے)؟

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ" (اور کشتی پر لدے لدے پھرتے ہیں) یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ "وَفِي الْفُلْكِ" (کشتی میں) جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: "قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ" (ہم نے فرمایا کہ ہر قسم میں سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو عدد اس میں سوار ہو جائے)۔

جواب کشتی کے لئے میں اور اوپر دونوں ہی صحیح ہیں اور کلام عرب میں مستعمل ہیں لہٰذا کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے میں اور کبھی اوپر کا لفظ استعمال فرمایا۔

سورۃ حم السجدۃ

سوال "وَمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ" (اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے) میں اگر لفظ من استعمال نہ کیا جاتا تو بھی معنی درست تھا؟

جواب اگر لفظ من استعمال نہ کیا جاتا تو اس کا معنی ہوتا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ ہے لیکن من کا لفظ استعمال کرنے کے بعد اب اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو مسافت ہے اس میں ہم سے لے کر تم تک مسلسل پردہ ہے درمیان میں کوئی جگہ ہی نہیں جو پردہ سے خالی ہو۔

سوال "اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ........." (آپ فرمایئے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز میں پیدا کر دیا) سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان آٹھ دنوں میں پیدا فرمائے جبکہ سورۃ الفرقان کی آیت مبارکہ: "اَلَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ" (کہ اس نے آسمانوں

اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا) سے پتہ چلتا ہے کہ زمین و آسمان چھ دنوں میں پیدا فرمائے۔ ان دونوں میں تطبیق کیسے دی جاسکتی ہے؟

جواب فی اربعہ ایام میں وہ دو دن بھی شامل ہیں جسمیں زمین کو بنایا گیا یعنی ان چار دنوں میں زمین اور دیگر چیزیں بنائی گئیں اور دو دنوں میں آسمان وغیرہ بنائے گئے تو اس طرح کل چھ دن ہوئے نہ کہ آٹھ' اس تفسیر میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ کسی بھی مفسر نے اس سے اختلاف نہیں فرمایا۔

سوال آسمان اور ان میں موجود عالم زمین و مافیہا سے کئی گنا بڑھ کر ہیں پھر اسمیں کیا حکمت ہے کہ زمین و مافیہا کو تو چار دنوں میں بنایا جبکہ آسمان وغیرہ کو صرف دو دنوں میں پیدا فرمایا؟

جواب اول اس لئے کہ آسمان اور ان میں موجود عالم' عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے انہیں صرف دو دنوں میں پیدا فرمادیا بخلاف زمین وغیرہ کے کیونکہ یہ عالم موجودات سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا انہیں چار دنوں میں پیدا فرمایا گیا۔

جواب ثانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین و مافیہا کو اس لئے چار دنوں میں پیدا فرمایا تا کہ اہل زمین کو پتہ چل جائے کہ ہر کام بہ تدریج کرنا چاہیے' وگرنہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے تو اس تمام کو ایک آن میں پیدا فرمادیتے۔ نیز اس کام میں بھی یہی حکمت مضمر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عالم اکبر کو تو چھ دنوں میں پیدا فرمادیا جبکہ عالم اصغر یعنی انسان کو چھ مہینوں میں پیدا فرمایا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جہنم کے بارہ میں فرمایا: '' فَإِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ '' (سو اگر یہ لوگ صبر کریں تب ہی دوزخ انکا ٹھکانا ہے) حالانکہ وہ صبر کریں یا نہ کریں بہر صورت ان کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے؟

جواب اول اس میں عبارت مقدر ہے مطلب ہے کہ وہ صبر کریں یا نہ کریں بہر صورت ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ آخرت میں صبر انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ صبر صرف دنیا ہی میں مفید ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ صبر آسانیوں کی چابی ہے' جس نے صبر کیا وہ کامیاب ہوا۔

جواب ثانی یہ اصل میں مشرکین کے اس قول کا جواب ہے: '' اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ '' (کہ چلو اور اپنے معبودوں پر قائم رہو) مطلب یہ ہوا کہ اگر تم دنیا میں عبادت اصنام پر جمے رہے تو آخرت میں تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کے متعلق یہ کیوں فرمایا کہ انہیں بدترین اعمال کا بدلہ دیا جائیگا: '' وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ '' (اور ان کو ان کے برے کاموں کی سزا دیں

گے) حالانکہ کفار کو صرف بدترین کا نہیں بلکہ برے اعمال کا بھی بدلہ دیا جائیگا؟

جواب اس قسم کا سوال سورۃ توبہ کے آخر میں گذر چکا ہے۔

سوال "لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ" (تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو) کے بعد "ولا للقمر" کی کیا ضرورت تھی حالانکہ یہ "لا تسجد وا للشمس" ہی سے سمجھ میں آ رہا تھا۔

جواب تاکہ نهي عن عبادة القمر بھی نص سے ثابت ہو سکے۔ اس لئے اسے وضاحۃً ارشاد فرما دیا۔

سورۃ الشوریٰ

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "كَذٰلِكَ يُوْحِىْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ" (اسی طرح آپ اور جو آپ سے پہلے گذر چکے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ وحی بھیجتا رہا۔ میں مضارع کا لفظ کیوں استعمال کیا' حالانکہ آپ سے پہلے لوگوں کی طرف وحی تو زمانہ ماضی میں تھی؟

جواب امام زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ مضارع میں چونکہ عادت اور سنت کا معنی پایا جاتا ہے جو ماضی میں نہیں پایا جاتا اس لئے یہاں مضارع کا انتخاب فرمایا۔ جبکہ میری رائے یہ ہے کہ یہ مضارع' ماضی کے معنی میں ہے جیسا کہ: "قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ" (آپ یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو زندہ رکھتا ہے) میں۔ یا پھر اس میں عبارت مقدر مانی جائے کہ "اوحی الی الذین من قبلك"

سوال "يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ" (اس کے ذریعے سے تمہاری نسل چلاتا رہتا ہے) میں ضمیر کا مرجع کیا ہے؟

جواب اس کا مرجع هذا التدبير يا الجعل المذكور ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مرجع ارحام ہے جن پر ازواج کا مذکر ہونا دلالت کر رہا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (کوئی چیز اس کی مثل نہیں) فرمایا۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ کی مثل تو موجود ہے لیکن مثل کی مثل موجود نہیں۔ جیسے کہ اگر کہا جائے کہ زید کے گھر جیسا کوئی گھر نہیں ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ زید کا گھر موجود ہے لیکن اس کی مثل موجود نہیں؟

جواب اول مثل ذات سے کنایہ ہے' مطلب ہے کہ اس کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں۔

جواب ثانی کاف زائد ہے تاکید کے لئے ذکر کیا گیا مطلب ہے کہ "ليس مثله شيء"

جواب ثالث لفظ مثل زائد ہے' پہلے اور تیسرے جواب میں یہ فرق ہوگا کہ پہلے میں مثل سے مراد ذات جبکہ تیسرے میں بالکل زائد ہے گویا کہ مذکور ہی نہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" (بجز رشتہ داری کی محبت کے) کیوں فرمایا "مودة القربی" یعنی رشتہ داری یامودة للقربی کیوں نہیں فرمایا؟

جواب قربی کو مبالغہ کے لئے مودت کا محل بنادیا یعنی "المودة الثابتة المستقرة فی القربی" جیسے کہ کہتے ہیں "فی ال فلان مودة" آل فلاں میں بڑی مودت ومحبت ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ" (اور منجملہ اس کی نشانیوں میں پیدا کرنا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان جانداروں کا جو اس نے زمین وآسمان میں پھیلا رکھے ہیں) کیوں ارشاد فرمایا حالانکہ چوپائے تو صرف زمین میں پائے جاتے ہیں؟

جواب اول فیھما کا مطلب فیھا ہے کیونکہ کبھی تثنیہ واحد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ" (ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے) حالانکہ یہ صرف ایک یعنی نمکین سمندر میں پیدا ہوتے ہیں۔

جواب ثانی بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جس طرح زمین میں چوپائے وغیرہ ہیں اسی طرح آسمانوں میں بھی ملائکہ کے چوپائے اور پرندے ہوتے ہیں۔ اس کی تائید: "وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ" اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں) سے بھی ہوتی ہے کہ اگر زمین کے علاوہ کہیں چوپائے موجود نہ ہوتے تو "فی الارض" کی قید کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ" (جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اناث کو مقدم اور ذکور کو مؤخر کیوں فرمایا؟ اور اس کے فوراً بعد پھر ذکور کو اناث پر کیوں مقدم فرمایا نیز پہلے جملہ میں اناث کو نکرہ اور ذکور کو معرفہ کیوں ذکر فرمایا؟۔

جواب چونکہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت اور اس کی مشیت کا بیان اور مخلوق کی مشیت کی نفی ہے اس لئے اناث کو ابتداءً مقدم فرمایا کیونکہ انہیں مخلوق پسند نہیں کرتی' اور جب انہیں مقدم کرکے ذکور کو مؤخر کیا تو اس کے تدارک کے لے ذکور کو معرفہ ذکر فرمادیا بعد ازاں ہر ایک کو اپنے حق کے مطابق ذکر فرمایا۔ اب چونکہ تقدیم وتاخیر حسبِ ضابطہ تھی لہٰذا کسی کو معرفہ ذکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ارشاد فرمایا ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا۔ جیسا کہ ارشادِ گرامی

ہے: "اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى" اور "فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى"

سوال ارشادِ الٰہی ہے: "وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ" (اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمادے یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے) پھر آنحضرتؐ کے بارہ میں یہ کیسے کہدیا جاتا ہے کہ آپؐ نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے بغیر حجاب اور بغیر واسطہ کے گفتگو فرمائی۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ یا تو الہام کے ذریعے کلام فرماتے ہیں جیسا کہ ام موسیٰؑ سے کلام فرمایا یا پھر پردے کے پیچھے سے گفتگو فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا اور یا پھر کسی واسطے کے ذریعے کلام فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت جبرائیلؑ کے واسطہ سے انبیاءِ کرامؑ کے ساتھ اور انبیاء کرامؑ کے واسطہ سے امت کے ساتھ کلام فرماتے ہیں۔

جواب یہاں وحی سے مراد اشارہ ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے" وحی العین اور وحی الحاجب" یعنی آنکھ اور ابرو کا اشارہ: "فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا" (اور ان کو اشارہ سے فرمایا تم لوگ خدا کی پاکی بیان کرو) میں بھی یہی معنی مراد ہے۔ شب معراج میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو بھی۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ" (آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے) کیوں فرمایا حالانکہ انبیاء کرامؑ تو وحی سے پہلے بھی عقلی دلائل کے ساتھ وجود باری تعالیٰ اور اس کی توحید پر ایمان رکھتے ہیں؟

جواب یہاں ایمان سے مراد ایمان کے شرائع واحکام ہیں مثلاً نماز روزہ وغیرہ۔

بعض حضرات اس سے کلمہ توحید" لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ "پر ایمان مراد لیتے ہیں اور اس کی تعلیم یقیناً آپ کو وحی کے ذریعے دی گئی نہ کہ آپؐ نے اسے عقل کے ذریعے جانا۔

سورۃ الزخرف

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے: "اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا" (کہ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے) میں جعلنا کا لفظ کیوں استعمال فرمایا حالانکہ" قلنا یا انزلنا وغیرہ" الفاظ زیادہ مناسب تھے۔ کیونکہ جعل کا معنی تو پیدا کرنا ہوتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ" (اور تاریکیوں کو اور نور کو بنایا)"فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى" (پھر اس کی دو قسمیں کر دیں مرد اور عورت)۔

جواب "جعل" کبھی قول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ" وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ

الْبَنَاتِ'' (اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں) اور'' جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا'' (اور ان لوگوں نے اللہ کے ساجھی قرار دیئے) میں کیونکہ کفار کہتے تھے نہ کہ پیدا کرتے تھے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا'' (اور آپ ان سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے) کیوں فرمایا حالانکہ آپؐ کی ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی کہ آپؐ ان سے استفسار فرماتے؟

جواب اوّل اس میں عبارت مقدر ہے مطلب ہے کہ انؑ کے پیروکاروں سے پوچھیں۔

جواب ثانی شب معراج میں آنحضرتؐ کی تمام انبیاء کرامؑ سے ملاقات ہوئی۔ یہ آیۃ مبارکہ اس وقت نازل ہوئی جبکہ تمام انبیاء کرامؑ موجود تھے۔ آپؐ نے آیۃ مبارکہ کے نزول کے بعد فرمایا میں نہیں پوچھتا مجھے یہ آیت ہی کافی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات کے متعلق ارشاد فرمایا:'' وَمَا نُرِيْهِمْ مِنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا'' (اور ہم ان کو جو نشانی دکھاتے ہیں وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی ہے)۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ جب ہر ایک دوسرے سے بڑی ہے تو ان میں سے ہر ایک فاضل اور ہر ایک مفضول ہے حالانکہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اور اگر اس سے مراد یہ لیں کہ بعض بعض سے بڑی ہیں تو پھر بڑی چھوٹی کا تعین کیسے ہوگا؟۔

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ حماسہ کا شعر ہے:

من تلق منهم تقل لا قيت سيدهم　　مثل النجوم التي يسری بها الساری

تو جن سے بھی ملے گا تو کہے گا کہ میں ان کے سردار سے ملا ہوں۔ وہ تمام ان ستاروں کی مانند ہیں جن سے چلنے والے ہدایت پاتے ہیں۔

سوال حضرت عیسیٰؑ نے اپنی امت سے:'' وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ'' (اور تاکہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم سے بیان کردوں) کیوں فرمایا؟

جواب اوّل وہ آپؑ سے دو قسم کے معاملات میں اختلاف رکھتے تھے دینی اور دیگر فضول معاملات تو آپؑ نے تو صرف انہیں شریعت کے احکام ہی بتانے تھے۔

جواب بعض کل کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ سورۃ المومن میں'' وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ'' کے تحت تفصیل سے گذرا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' بغتة (اچانک) کے بعد'' وهم لا يشعرون'' کیوں فرمایا؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان پر عذاب آئیگا تو وہ اپنے دنیاوی امور میں مشغول

ہونگے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:" مَا يَنظُرُونَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ " (پس یہ لوگ ایک آواز سخت کے منتظر ہیں جو ان کو آ پکڑے گی اور وہ سب باہم لڑ جھگڑ رہے ہوں گے) اگر" وھم لا یشعرون "مذکور نہ ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ بعض لوگ یہ مطلب سمجھتے کہ جب ان پر اچانک عذاب آئیگا تو وہ اس کے لئے تیار ہونگے۔

سوال جہنمی لوگوں کے بارہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ رحمت خداوندی سے مایوس ہونگے پھر ارشاد فرمایا کہ وہ کہیں گے:" وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ "(اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار ہمارا کام ہی تمام کردے) یعنی موت کے ذریعے اپنی پریشانیوں کا خاتمہ چاہیں گے؟

جواب جہنمیوں کو جہنم میں ایک طویل عرصہ تک رہنا ہوگا لہٰذا کبھی تو ان پر مایوسی طاری ہوگی او رکبھی استغاثہ وفریاد میں مشغول ہوں گے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے:" وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ "(اور وہ وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے) کیوں فرمایا؟ اس سے تعدد الہ لازم آتا ہے۔ کیونکہ نکرہ کو جب مکرر ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد تعدد ہوتا ہے۔ جیسا کہ الہ علی درھم و درھم وانت طالق و طالق وغیرہ میں تعدد مراد ہے؟

جواب یہاں الہ معبود کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ جو آسمان میں معبود ہے وہی زمین میں معبود ہے۔ معبود تو زمین وآسمان میں ایک ہی ہے لیکن عابدین الگ الگ ہیں لہٰذا عابدین کے اعتبار سے تو مغایرت ممکن ہے لیکن معبود میں مغایرت ممکن نہیں۔

سورۃ الدخان

سوال آنخضرتؐ اور منکرین بعث کے درمیان اختلاف تو حیات بعد الممات میں تھا نہ کہ صرف موت میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا:" اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى "(یہ لوگ کہتے ہیں کہ اخیر حالت بس یہی ہمارا دنیا کا مرنا ہے) الا حیاتنا نہیں کہا جیسا کہ دوسری جگہ منقول ہے" اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا "اور پہلی موت سے کیا مراد ہے؟ کیا ان سے دوسری موت کا بھی وعدہ کیا گیا تھا جس کا انہوں نے انکار کیا؟

جواب جب ان سے اس موت کا وعدہ کیا گیا جس کے بعد حیات ہے تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ یعنی وہ اس کے قائل تھے کہ ان پر اب کوئی ایسی موت طاری نہیں ہوگی جس کے بعد حیات

ہو۔ ایسی موت صرف ایک ہی تھی یعنی موت عدم اور وہ گذر چکی ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے اس موت کی نفی مراد ہے جو منکر نکیر کے سوال کے بعد قبر میں واقع ہوگی۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَأْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ" (پھر اس کے سر کے اوپر سے تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑ دو) کیوں ارشاد فرمایا حالانکہ عذاب تو انڈیلا نہیں جاسکتا صرف پانی انڈیلا جاسکتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: "يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ" (ان کے سر کے اوپر تیز گرم پانی چھوڑا جاوے گا)؟

جواب یہ استعارہ ہے بات کو ہیبت ناک اور ہولناک بنانے کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے اس کی نظیر ہے: "فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ" (سو آپ کے رب نے اُن پر عذاب کا کوڑا برسایا) اور "اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا" (اے ہمارے پروردگار ہم پر استقلال نازل فرمایئے)

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت سے استبرق پہننے کا وعدہ کیوں فرمایا؟: "يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ" (وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا) حالانکہ استبرق گاڑھے ریشم کو کہا جاتا ہے جسے اہل دنیا پسند نہیں کرتے؟

جواب اول جیسا کہ جنت کا باریک ریشم دنیا کے باریک ریشم جیسا نہیں ہوگا اسی طرح جنت کا گاڑھا ریشم بھی دنیا کے گاڑھے ریشم جیسا نہیں ہوگا۔

جواب ثانی پتلا ریشم جنت میں سرداروں کا لباس ہوگا اور گاڑھا ریشم ان کے خدام اور غلاموں کا لباس ہوگا تاکہ فرق مراتب ظاہر ہوسکے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت کے بارہ میں کیوں فرمایا: "لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى" (اور وہاں بجز اس موت کے جو دنیا میں آچکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے) حالانکہ انہیں پہلی موت جنت میں نہیں آئیگی۔

جواب اول امام زجاج اور فراء فرماتے ہیں کہ الا سوی کے معنی میں ہے جیسے کہ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اور اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ میں۔

جواب ثانی " الا بعد " کے معنی میں ہے، جیسا کہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ الا ما قد سلف میں بھی الا بعد کے معنی میں ہے۔

جواب ثالث جنتی لوگوں کی جب موت آتی ہے تو پردے اٹھائے دئے جاتے ہیں اور عالم نزع ہی میں ان کو جنت میں اپنا ٹھکانا اور جنتی نعمتیں دکھادی جاتی ہیں تو گویا ان کی موت بھی جنت ہی میں واقع ہوتی ہے۔ یہ حضرت ابن قتیبہؒ کا قول ہے۔

سورۃ جاثیہ

سوال " وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ " (اور جس وقت ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کا بجز اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا کہ کہتے ہیں ہمارے باپ دادوں کو سامنے اور اگر تم سچے ہو) میں سوال وجواب میں مطابقت ہے؟

جواب جب وہ اس بات کو مان لیں گے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں موت دے کر انہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے تو پھر وہ ان کے اباء کو موت دے کر انہیں بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے " كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓی اِلٰی كِتٰبِهَا " (ہر فرقہ اپنے نامہ اعمال کی طرف بلایا جاوے گا........) میں کتاب کی اضافت امت کی طرف اور " هٰذَا كِتٰبُنَا " (یہ ہمارا دفتر ہے) میں اپنی طرف کیوں فرمائی؟۔

جواب اضافت ادنی تعلق سے بھی صحیح ہو جاتی ہے۔ امت کی طرف اس کی اضافت اس لئے صحیح ہے کہ اس میں ان لوگوں کے اعمال مذکور ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اس کی اضافت اس لئے صحیح ہے کہ اس کے اصل مالک وہی ہیں اور انہی کے حکم سے فرشتوں نے اس میں اعمال تحریر کئے ہیں۔

سورۃ الاحقاف

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے " اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا " (یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کے نیک کاموں کو قبول کر لیں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ ان کے عمدہ ترین اعمال کے ساتھ ساتھ صرف عمدہ اعمال بھی قبول کئے جائیں گے؟

جواب احسن اس آیۃ مبارکہ میں حسن کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس کی نظیر سورۃ روم میں گذر چکی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے گناہ گاروں اور نیکو کاروں دونوں کے متعلق " وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا " (اور ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے ملیں گے) کیوں فرمایا حالانکہ گناہ گاروں کے لئے درجات (بلندیاں) نہیں بلکہ درکات (پستیاں) ہیں؟

جواب درجات سے مراد طبقات اور مراتب ہیں بغیر کسی اختصاص کے۔

جواب ثانی اس میں عبارت مقدر ہے۔ مطلب ہے کہ ہر فریق کے لئے یا تو درجات ہیں یا درکات۔ اس عبارت کو مقدر لانے کی وجہ یہ ہے کہ مذکور اس پر دلالت کر رہی ہے۔

سوال " فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّدِقِيْنَ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ " (اگر تم سچے ہو تو جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو اس کو ہم پر واقع کر دو انہوں نے فرمایا پورا علم تو خدا ہی کو ہے) سوال و جواب میں کیا مطابقت ہے؟

جواب اس میں یہ مطابقت ہے کہ وہ عذاب کو وقت سے پہلے طلب کر رہے تھے "بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ " (بلکہ یہ وہی ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے) تو آپؑ نے فرمایا کہ مجھے عذاب کے وقت کا علم نہیں ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہوا کے متعلق " تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا " (وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دے گی) کیوں فرمایا حالانکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں ہوا نہیں اکھاڑ سکتی؟

جواب مطلب یہ ہے کہ جب یہ ہوا قوم عاد کی املاک پر گذری تو اس نے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے " يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ " (اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا) کیوں فرمایا یغفر لکم ذنوبکم (تمہارے تمام گناہ معاف کر دے گا) کیوں نہیں فرمایا؟۔

جواب اس لئے کہ کچھ گناہ ایسے بھی ہیں جو صرف ایمان سے معاف نہیں کئے جاتے جیسے ظلم وغیرہ۔ ان کے حالات بیان فرماتا ہے۔

سورۃ محمد

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے " كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ أَمْثَالَهُمْ " (اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کے لئے) کیوں فرمایا حالانکہ اس سے پہلے کوئی مثال نہیں گذری۔

جواب اول اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کی اچھائیوں اور کفار کی برائیوں کو یونہی بیان فرماتے ہیں۔

جواب ثانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کی مثال باطل کے پیروکاروں سے اور مؤمنین کی مثال حق کے پیروکاروں سے دی۔

جواب ثالث گمراہی کو کفار کی رسوائی کی مثال بنایا اور گناہوں کی بخشش کو مؤمنین کی کامیابی کی مثال بنایا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے شہداء کے حق میں ان کی شہادت کے بعد "سَيَهْدِيهِمْ" (اور اللہ تعالیٰ ان کو مقصود تک پہنچائیں) کیوں فرمایا؟ حالانکہ ہدایت تو موت سے پہلے ہوتی ہے نہ کہ بعد میں۔

جواب اس کا مطلب ہے کہ منکر نکیر کے سوال جواب کے وقت ان کی رہنمائی فرمائیں گے۔ بعض حضرات یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جنت کی طرف رہنمائی فرمائیں گے۔

سوال "مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ـــــ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ" کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب امام فراء فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ جو شخص ان نعمتوں میں ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہے جو ہمیشہ آگ میں رہے۔ جبکہ دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ تقدیری عبارت یوں ہے کیا یہ جنت اس شخص کی فراء جیسی ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے' اقتصار کی وجہ سے اس عبارت کو مقدر ذکر فرمایا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت ﷺ سے "فَاعْلَمْ اَنَّهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" (تو اب اس کا یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں کیوں فرمایا حالانکہ آنحضرت کو تو پہلے ہی حتی کہ نزول وحی سے پہلے بھی اس کا علم تھا۔

جواب مطلب ہے کہ اپنے علم پر ثابت رہیں۔ امام زجاج فرماتے ہیں کہ خطاب آپ کو ہے لیکن اس سے مراد اُمت ہے۔ جیسے کہ سورۃ احزاب کی ابتداء میں گذرا ہے۔

سورۃ الفتح

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے فتح مکہ کو مغفرت کی علت کیوں قرار دیا؟ "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ" (بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی تا کہ اللہ معاف فرمادے)۔

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے مغفرت کی علت قرار نہیں دیا بلکہ چار وعدوں کے اجتماع کی علت قرار دیا ہے وہ چار وعدے یہ ہیں۔ (۱) مغفرت (۲) اتمام نعمت (۳) ہدایت صراط مستقیم (۴) نصر عزیز۔ چونکہ فتح مکہ سے پہلے اتمام نعمت اور نصر عزیز حاصل نہیں تھے لہٰذا فتح مکہ ان چار وعدوں کے اجتماع کی علت قرار دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فتح مکہ ہی کو مغفرت کی علت قرار دیا ہو اس حقیقت سے کہ وہ دشمن کے ساتھ جہاد ہے۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ "مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ" (اگلے پچھلے خطائیں معاف

فرمادے اور آپ اپنے احسانات کی تکمیل کریں اگر ماتأخر سے وہ ذنوب مراد لئے جائیں جو خطاب سے متاثر ہیں تو وقت خطاب وہ گناہ معدوم تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے معدوم گناہوں کی کیسی مغفرت فرمائی اور اگر ماتأخر سے خطاب سے پہلے کے گناہ مراد ہوں تو وہ ماتأخر نہیں ہیں۔ تو اس ارشادِ باری تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب ماتقدم سے مراد حضرت ماریہؓ کا قصہ ہے اور ماتأخر سے مراد حضرت زینبؓ کا قصہ ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ماتقدم سے موجود ذنوب اور ماتأخر سے وہ ذنوب جو آئندہ سرزد ہو سکتے ہیں مراد ہیں۔ ان کی مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سرزد ہونگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں معاف فرمادیں گے۔ یا پھر علی الطریق المبالغہ ارشاد فرمایا جیسا کہ عرب کا محاورہ ہے فلان یضرب من یلقاہ ومن لم یلقاہ۔ فلاں کے کوئی ہاتھ لگے یا نہ لگے وہ ہر ایک کو مارتا ہے۔ مطلب ہے کہ ہر ایک کو مارتا ہے تو آیۃ مذکورہ میں بھی ماتقدم وماتأخر سے ہر گناہ مراد ہوگا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا" (اور آپ کو سیدھے رستے پر لے چلے) کیوں فرمایا حالانکہ آپؐ تو کیا آپؐ کی امت بھی راہ راست پر گامزن تھی۔

جواب مطلب ہے کہ زیادتی ہدایت عطا فرمائیں گے' بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہدایت پر ثابت رکھیں گے جبکہ بعض حضرات اس کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں کہ ہر پیش آمدہ معاملہ میں آپؐ کو راہ راست کی ہدایت عطا فرمائیں گے۔

سوال یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ایمان کمی وزیادتی کو قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں "لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ" (تاکہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو)۔

جواب اگر ایمان سے اقرار وجود خداوندی مراد لیا جائے تو وہ کمی زیادتی کو قبول نہیں کرتا۔ اگر ایمان سے مراد یقین وتصدیق ہو تو پھر اس میں کمی زیادتی کا احتمال ہے۔ آیت مذکورہ میں یا من سے مراد یہی تصدیق ہے کیونکہ یہی تصدیق اطمینان وسکون کا باعث ہے۔ یعنی جب بھی کوئی شرعی حکم سامنے آتا ہے وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یوں ان کی تصدیق میں زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا" (وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں) کے بعد واھلھا کیوں فرمایا؟

جواب بھا میں ضمیر کا مرجع کلمۂ توحید اور اہلہا کی ضمیر کا مرجع تقویٰ ہے۔ لہٰذا تکرار نہیں پایا گیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ میں ان شاء اللہ کی قید کیوں لگائی۔

جواب اول ان اذ کے معنی میں ہے جیسے کہ وَذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ہیں

جواب ثانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس لئے ان شاء اللہ فرمایا تا کہ لوگوں کو ترغیب ہو کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ سب کچھ جاننے کے باوجود ان شاء اللہ فرما رہے ہیں تو مخلوق کو تو نامعلوم چیزوں میں ضرور انشاء اللہ کہنا چاہئے۔

جواب ثالث نبی کریمؐ نے کسی کو خواب میں دیکھا وہ کہہ رہا تھا" لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ" (انہیں الفاظ کو قرآن کریم میں نازل فرمادیا گیا۔

جواب رابع استثناء امنین کے متعلق ہے نہ کہ لتدخلن کے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ امنین کے بعد لاتخافون کیوں فرمایا؟۔

جواب یعنی تم امن کے ساتھ داخل ہو گے اور اس بات سے بھی نہ ڈرو کہ تمہارے دشمن تمہیں مستقبل میں اس سے نکال دیں گے۔

سوال " لِيَغِيۡظَ بِهِمُ الۡكُفَّارَ " (تا کہ ان سے کافروں کو جلا دے) کس چیز کی علت ہے؟۔

جواب اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی تعداد کو زیادہ فرمادیا اور انہیں قوت بخشی لیغیظ بهم الکفار۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِيۡمًا" (اللہ تعالیٰ نے ان صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ نبیؐ کا ہر صحابیؓ آیت میں مذکور صفات سے متصف ہے۔ پھر بعض صحابہ کے لئے مغفرت کا وعدہ چہ معنی؟

جواب آیت مذکورہ میں من تبعیض کے لئے نہیں بلکہ جنس کے لئے ہے۔ جیسا کہ " فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ "(تو تم لوگ گندگی سے یعنی بتوں سے کنارہ کش رہیں)۔

سورة الحجرات

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے" يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ" (اے ایمان والو اللہ اور رسول سے پہلے تم سبقت مت کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو) فرمایا اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کسی غیر کو آپ پر مقدم نہ کرو حالانکہ مقصود یہ تھا کہ صحابہؓ اپنے

کسی قول وفعل میں آپؐ پر مقدم نہ ہوں؟

جواب آیۂ مذکورہ میں قدم بمعنی تقدم یعنی لازم ہے نہ کہ متعدی جیسے کہ بعض اوقات فکر تفکر کے معنوں میں اور وقف توقف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ایک شاعر کہتا ہے:

اذا نحن سرناسارت الناس خلفنا

وان نحن اومأ نا الی الناس وقفوا

جب ہم چلتے ہیں تو لوگ ہمارے پیچھے چلتے ہیں اور اگر ہم لوگوں کو اشارہ کر دیں تو وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ اس شعر میں بھی وقفوا توقفوا کے معنی میں ہے۔

سوال جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ'' (اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے مت بلند کرو) فرمادیا تھا تو ''وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ'' (اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو) کہنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب اس سے آپ کو نام لے کر پکارنے کی حرمت مقصود ہے۔ جیسے یا محمد یا احمد کہنا۔ کیونکہ یہ آپؐ کی توقیر اور عظمت کے خلاف ہے۔ بلکہ اگر آپ کو پکارنا ہو تو یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ کہہ کر پکاریں۔

اس کی نظیر ہے'' لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا'' (تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے)

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ '' (کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جاویں) کیوں فرمایا؟ حالانکہ حبطِ اعمال تو صرف کفر سے ہوتا ہے نہ کہ دیگر گناہوں سے اور آنحضرتؐ کی مجلس مبارک میں آواز بلند کرنا معصیت ہے نہ کہ کفر۔ بعض حضرات تو یہ روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت' حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارہ میں نازل ہوئی کہ ایک بار ان کی آواز آپؐ کی مجلس مبارک میں بلند ہوگئی تھی اور بعض حضرات کے نزدیک یہ آیت' ثابت بن قیس بن شماس انصاریؓ کے بارہ میں نازل ہوئی۔ کیونکہ آپؓ کی آواز بہت بلند تھی اس لئے کبھی کبھی آپؓ کی آواز سے آنحضرتؐ کو تکلیف ہوتی تھی۔

جواب مطلب یہ ہے کہ اس کام کو ہلکا نہ سمجھو۔ اگر ہلکا سمجھو گے تو کسی دن دانستہ یہ کر بیٹھو گے اور دانستہ ایسا کرنا تمہیں کفر تک لے جائیگا جو حبطِ اعمال کا سبب ہے۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حبط اعمال مرتبہ کم ہونے سے مجاز ہے۔

سوال "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ" کا ماقبل سے کیا تعلق ہے؟

جواب یعنی جاہلیت کی عبادت کو ترک کر دو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں اس پر عامل نہیں رکھا "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ" (اور لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی)۔

سوال اگر ہم فسوق اور عصیان کا ایک ہی معنی مراد لیں تو پھر ایک آیت میں ان دونوں کو جمع کرنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر ہم عصیان کو فسوق سے عام مانیں تو پھر اس کے ذکر کے بعد فسوق کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ فسوق اس میں داخل ہے؟

جواب حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں فسوق سے مراد کذب ہے اور عصیان سے مراد دیگر معاصی ہیں۔ باقی کذب کو اس لئے الگ سے بیان فرمایا کہ یہ نزول آیت کا سبب ہے۔

سوال یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ایمان اور اسلام کا ایک معنی ہے حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں "قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا" (آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے اور لیکن یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے)؟

جواب یہاں ایمان بالقلب کی نفی مراد ہے۔ اس کی دلیل اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے "وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" (اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا) یعنی اپنے دل سے تصدیق نہ کرو" وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا" (اور لیکن یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے) یعنی ہم تسلیم ہوتے ہیں اور تلوار کے خوف سے تابعداری اختیار کرتے ہیں۔ اگر اسلام اور ایمان کو ان معانی میں لیں تو یقیناً ان میں فرق ہے۔

سوال یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

جواب یہاں ایمان سے ایمان کامل مراد ہے جیسے کہ "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" (خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں) اور المسلم من سلم المسلون من لسانه ویده (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے سارے مسلمان محفوظ رہیں) ہیں۔ جیسا کہ عرب کا مقولہ ہے" الرجل من يصبر على الشدائد" (مرد تو وہ ہے جو مصیبتوں پر صبر کرے) وغیرہ وغیرہ۔ اس جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اول آیت میں اعراب سے ایمان کامل کی نفی کی گئی تھی۔ اب یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کے بعد ایمان کامل کو ثابت کیا جائے بلکہ نفس ایمان کا ثبوت ہی کافی ہے۔

سورۃ ق

سوال " قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ " (ق قسم ہے قرآن مجید کی) کا جوابِ قسم کہاں ہے؟

جواب اول جوابِ قسم مقدر ہے وہ یہ ہے کہ انہیں موت کے بعد اٹھایا جائیگا۔

جواب ثانی اس کا جواب " قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ " (ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی کم کرتی ہے) جوابِ قسم سے لام کو تطویل کلام کی وجہ سے حذف کر دیا۔ جیسا کہ " قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا " (یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کر لیا) میں لام حذف کیا گیا

جواب ثالث " مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ " (وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا) جواب قسم ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحب الحصید کیوں فرمایا حالانکہ اس سے مراد الحب الحصید ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چیز کی اضافت اسی چیز کی طرف فرما دی حالانکہ اضافت تو مضاف اور مضاف الیہ میں تغایر کو چاہتی ہے۔

جواب اول اس کا مطلب ہے کہ حب الزرع الحصید یا النبات الحصید۔

جواب ثانی ایک چیز کی اضافت اپنی طرف اس وقت جائز ہوتی ہے جب الفاظ مختلف ہوں۔ جیسے کہ حق الیقین حبل الورید دار الاخرۃ اور وعد الصدق۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے " عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ " (داہنی اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں) کیوں فرمایا۔ قعید ان کیوں نہیں فرمایا۔ حالانکہ دو فرشتوں کے متعلق خبر دی جا رہی ہے جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ۔

جواب اس کا مطلب ہے کہ دائیں طرف بھی بیٹھا ہے اور بائیں طرف بھی ایک قعید کو حذف کر دیا کیونکہ مذکور اس پر دلالت کر رہا ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

نحن بما عندنا وانت بما عندك راض والرأى مختلف

(جو کچھ ہمارے پاس ہے اس سے ہم اور جو کچھ آپ کے پاس ہے اس سے آپ راضی ہیں اور رائے مختلف ہے)

یا رمانی بامر کنت منه ووالدی بریئا ومن اجل الطوی رمانی

جواب ثانی جو لفظ فعیل کے وزن پر ہو اس میں واحد تثنیہ اور جمع برابر ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے " وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ " (اور ان کے علاوہ فرشتے مددگار ہیں)

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے داروغۂ جہنم کے لئے تثنیہ کا صیغہ استعمال فرمایا اَلْقِيَا۔ (پس ایسے

شخص کوڈال دو)۔ حالانکہ وہ واحد ہیں؟

جواب اول امام مبرد فرماتے ہیں کہ فاعل کا تثنیہ فعل کے تثنیہ ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اَلْقِیَا کا مطلب ہے الق الق۔ جیسا کہ امرأ القیس کہتا ہے قفانبك ۔ یعنی قف قف۔

جواب ثانی عرب حضرات اکثر واحد کے لئے تثنیہ کا صیغہ استعمال کرتے ہیں' مثلاً کہا جاتا ہے' خليلي وصاحبي وقفا واسمداو عوجا۔ امام فراء فرماتے ہیں کہ میں نے عرب کو بہت مرتبہ ایسا کرتے سنا ہے' مجھے بعض حضرات نے یہ شعر بھی سنایا ہے۔

فقالت لصاحبي لا تحبسانا بنزع اصوليه واجترشيحا

مخاطب ایک ہونے کے باوجود لا تحبسانا کہا گیا۔ مجھے ابوثور نے یہ شعر سنایا

فان تزجراني يابن عفان انزجر وان تدعاني رجم عرضا ممنعا

امرؤالقیس کہتا ہے:

خليلي مرابي على ام جندب نقضي لبانات الفواد المعذب

پھر کہتا ہے:

الم تراني كلما جئت طارقا وجدت بها طيبا وان لم تطيب

جب بھی میں رات کو اس کے پاس آتا ہوں مجھے اس کے پاس ایک خوشبو محسوس ہوتی ہے اگرچہ وہ خوشبو نہ لگائے۔

جواب ثالث یہ اصل میں ان دو فرشتوں کو حکم دیا جارہا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا "وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ" (اور ہر شخص اس طرح آوے گا کہ اس کے ساتھ ایک اس کو اپنے ہمراہ لاوے گا اور ایک گواہ ہوگا)۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنۃ کی صفت بیان فرمائی غير بعيد' حالانکہ غير بعيدة بیان فرمانی چاہئے تھی؟۔

جواب بعيد مصدر کے وزن پر ہے جیسے کہ زبیر اور صلیل۔ اور مصادر کو جب صفت بنایا جائے تو ان کے لئے تذکیر وتانیث برابر ہوتی ہے۔ یا پھر غير بعيد کے موصوف کو محذوف مان لیا جائے یعنی مکانا غير بعيد۔ یہ دونوں جواب امام زمخشریؒ کے بیان فرمودہ ہیں۔

سوال "وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ" (اور جنت قریب لائی جائے گی) کے بعد غير بعيد کہنے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب تاکید کے لئے ایسا کیا گیا جیسا کہا جاتا ہے ہو قريب غير بعيد' عزيز غير ذليل

وغیرہ۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے" اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ "(اس شخص کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو) کیوں فرمایا حالانکہ ہر انسان تو کیا ہر حیوان کا بھی دل ہوتا ہے؟

جواب اول حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں قلب سے مراد عقل ہے۔ حضرت ابن قتیبہؒ فرماتے ہیں کیونکہ عقل دل سے متعلق ہے لہٰذا کنایۃً اسے ذکر فرمادیا۔

جواب ثانی لمن کان له قلب کا مطلب یہ ہے کہ جس کا دل غور کرنے والا ہو۔ اور جس کا دل غور نہیں کرتا گویا کہ اس کا دل ہی نہیں ہے۔ اس کی تائید" وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ "(اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے) سے بھی ہوتی ہے۔

سورۃ الذّاریات

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ کیوں فرمایا؟ حالانکہ صادق قائل کی صفت بن سکتا ہے نہ کہ وعدکی؟

جواب صادق مصدوق کے معنی میں ہے جیسا کہ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ اور مَآءٍ دَافِقٍ میں۔ جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اسم فاعل صادق مصدر صدق کے معنی میں ہے کیونکہ کبھی مصدر اسم فاعل کے وزن پر بھی آتا ہے جیسا کہ قمت قائماً بمعنی قیاماً اور لحفت بھم الائمۃ بمعنی اللوم۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ (بیشک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ متقی لوگ باغوں کے اندر یا چشموں کے اندر نہیں رہیں گے؟

جواب مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہر طرف باغات پھیلے ہوئے ہونگے اور ہر طرف چشمے جاری ہونگے تو وہ مجموعہ باغات یا مجموعہ چشمہ جات میں ہونگے نہ کہ ایک باغ یا ایک چشمہ میں۔ اسی کی نظیر" اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ "(پرہیزگار لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے) ہے کیونکہ نہر انہار کے معنی میں ہے۔ رعایتِ فواصل کی وجہ سے انہار کی جگہ نہر ذکر کیا گیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے" وَتَرَکْنَا فِیْهَآ اٰیَةً لِّلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ "(اور ہم نے اس واقعہ میں ایسے لوگوں کے لئے عبرت رہنے دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں)۔ یعنی قوم لوطؑ کی بستیوں میں۔ کیوں فرمایا؟ حالانکہ قوم لوطؑ کی بستیاں تو موجود ہی نہیں ہیں

ان میں نشانیوں کا کیا تذکرہ؟۔

جواب اول فیھا من ضمیر کا مرجع وہ سرزمین ہے نہ کہ قوم لوطؑ کی بستیاں۔

جواب ثانی اگر مرجع قوم لوط کی بستیاں مانا جائے تو پھر فی من کے معنی میں ہے جیسا کہ ویوم نبعث فی کل امۃ شھیدا اوروارزقوھم فیھاوغیرہ میں۔اس کی تائید سورۃ عنکبوت کی اس آیۃ مبارکہ سے بھی ہوتی ہے جسمیں لفظ من صراحۃً مذکور ہے" وَلَقَد تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةً م بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ " (اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان رہنے دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں)۔پھر وہ نشانیاں کیا ہیں اس کے متعلق بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وہ نشانیاں برباد گھروں کے اثار ہیں جبکہ بعض حضرات کے نودیک وہ پتھر ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے باقی رکھاہوا تھا حتی کہ اس امت کے اول لوگوں نے ان کا مشاہدہ فرمایا۔بعض حضرات کے نزدیک اس سے مرادسیاہ چشمے کا پانی ہے جوزمین سے نکلے گا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے" وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ " (اور ہم نے ہر چیز کو دودو قسم کا بنایا) کیوں فرمایا حالانکہ عرش وکرسی' اورلوح وقلم وغیرہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنکا جوڑا نہیں پیدا کیا گیا؟

جواب اس کا مطلب ہے کہ ہر حیوان میں مذکر ومؤنث پیدا کیا گیا' جبکہ بعض حضرات نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جو چیزیں انسانی مشاہدات میں ہیں اس کی دوصنفیں پیدا کی گئی ہیں مثلاً' دن رات' سردی گرمی' روشنی تاریکی' خیروشر' زندگی موت' بر، بحر' زمین وآسمان اور چاندسورج وغیرہ۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہیں ارشاد فرمایا"فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ " (توتم اللہ ہی کی طرف دوڑو) اور کہیں فرمایا" وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ " (اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے) یہ تو صریح تعارض ہے؟

جواب فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ کا مطلب ہے کہ توبہ کے ذریعے اسی کی پناہ میں آجاؤ' اور بعض حضرات کے نزدیک اللہ کی پکڑ سے اس کی رحمت کی طرف بھاگو' اور وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عذاب اور اپنی پکڑ سے ڈراتے ہیں۔

امام زجاجؒ کے نزدیک نفسہ کا مطلب ایاہ ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ خود ہی سے ڈراتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ بمعنی ایاہ۔اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ دونوں آیتوں میں کچھ تناقض نہیں۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے" وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ " (اور میں نے جن

اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا کہ میری عبادت کیا کریں) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن وانس کو اس ارادہ سے پیدا فرمایا کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ کیسا ارادہ ہے جسے جن وانس پورا نہیں کرتے؟

جواب اول آیۃ مبارکہ میں اگرچہ جن وانس کو عام ذکر کیا گیا لیکن اس سے مراد خاص ہے یعنی مؤمنین اس آیۃ مبارکہ کے عموم میں سے بعض اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے نکل جائیں گے۔ "وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ" (اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں) جس مخلوق کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا فرمایا ہو اسے عبادت کے لئے پیدا نہیں فرمایا۔

جواب ثانی یہ آیتِ مبارکہ اپنے عموم پر ہے اور عبادت سے مراد توحید ہے اور یوم میثاق میں ہر ایک نے توحید کا اقرار کیا تھا لیکن یہ جواب صرف انسانوں کے ساتھ مختص ہے کیونکہ میثاق بھی صرف انسانوں سے لیا گیا تھا۔

جواب ثالث الا لیعبدون کا مطلب ہے کہ وہ میرے فرمانبردار بن جائیں۔

جواب رابع مطلب ہے کہ وہ میرے احکامات مانیں اور جو حکم دوں اس سے سرتابی نہ کریں۔

جواب خامس مطلب ہے کہ اگر وہ عبادت کو اختیار کریں تو لِيَعْبُدُونَ۔

جواب سادس اس عبادت سے مراد وہ عبادت ہے جو "وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا" (اور اللہ ہی کے سامنے سب سرخم کئے ہیں اور جتنے زمین میں خوشی سے اور مجبوری سے) میں مراد ہے۔

سوال "مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ" (میں ان سے رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا) کے بعد "وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ" (اور یہ کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں) کے ذکر کی ضرورت تھی؟

جواب مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ یعنی اپنے لئے اور مَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونَ یعنی اپنے غلاموں کے لئے۔ اطعام کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات مقدس کی طرف فرمائی' کیونکہ مخلوق اللہ تعالیٰ کے عیال ہیں۔ جو کسی کے عیال کو کھلاتا ہے وہ گویا خود اسی کو کھلاتا ہے' اس کی تائید اس حدیث مبارک سے بھی ہوتی ہے کہ "اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ارشاد فرمائیں گے' اے انسان! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا" یعنی میرے بندوں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے انہیں کھانا نہیں کھلایا۔

سورۃ الطّور

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' وَزَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِيۡنٍ ''(اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کر دیں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ وہ تو جنّت میں ہماری باندیاں ہونگی نہ کہ بیویاں؟

جواب مطلب ہے کہ ہم اہل جنت کو ان کے ساتھ ملا دیں گے یعنی آیت میں لفظ زوج ملانے کے معنی میں ہے نہ کہ نکاح کے معنی میں۔ کیونکہ اگر یہ عقد نکاح کے معنی میں ہوتا تو پھر اس کا صلہ باء استعمال نہ ہوتا جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ زوجنکھا میں بغیر باء کے لفظ زوج کو استعمال کیا گیا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل جنت کے متعلق'' كُلُّ امۡرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيۡنٌ ''(ہر شخص اپنے اعمال میں محبوس رہے گا) یعنی اپنے عمل کے بدلے میں جہنم میں رہن رکھا ہوا ہے کیسے فرمایا؟۔

جواب امام زمخشریؒ فرماتے ہیں جیسے کہ انسان اپنے قرض کے بدلے میں اپنے غلام وغیرہ کو رہن رکھ دیتا ہے اس طرح گویا کہ ہر نفس عمل صالح کے بدلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں رہن رکھا ہوا ہے کہ اگر نیک عمل کرے گا تو اس کی خلاصی ہو جائیگی وگرنہ نہیں۔ جبکہ دیگر حضرات اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ جہنمیوں کے بارہ میں ہے جو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا۔ اس کی تائید حضرت مقاتلؒ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ ہر کافر اپنے کفریہ اعمال کے سبب جہنم میں رہن رکھا ہوا ہو اور مؤمن رہن نہیں ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے'' كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِيۡنَةٌ اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ الۡيَمِيۡنِ فِىۡ جَنّٰتٍ ''(ہر شخص اپنے اعمال کے بدلہ محبوس ہوگا مگر داہنے والے بہشتوں میں ہوں گے)۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرتؐ کے متعلق یہ کیسے ارشاد فرمایا'' فَمَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجۡنُوۡنٍ ''(کیوں کہ آپ بفضلہٖ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں) حالانکہ دیگر افراد بھی اللہ کی نعمت کے سبب ہی جنون اور کہانت سے محفوظ ہیں؟

جواب مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتِ نبوت کے سبب آپ کاہن یا مجنون نہیں ہیں جیسے کہ کفار کہتے ہیں۔ جبکہ بعض حضرات اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس آیہ مبارکہ میں باء مع کے معنی میں ہے جیسے کہ تَنۡۢبُتُ بِالدُّهۡنِ اور'' فَتَسۡتَجِيۡبُوۡنَ بِحَمۡدِهٖ '' وغیرہ ہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا ''(کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں) میں جمع کی

ضمیر کیوں استعمال فرمائی؟۔

جواب تعظیم شان کے لئے جمع کی ضمیر استعمال فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں تو آپ کی حفاظت بھی فرمائیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے واحد کی ضمیر بھی استعمال فرمائی ہے جیسے کہ ارشاد ہے" وَلِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ "(اور تا کہ تو میری نگرانی میں پرورش پاؤ) اور تفخیم شان اور عظمت کے لئے جمع کی ضمیر بھی استعمال فرمائی ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔" تَجۡرِیۡ بِاَعۡیُنِنَا" (ہماری نگرانی میں رواں تھی) اور" اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا "(کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے اپنے ہاتھوں کی ساختہ چیزوں میں سے مواشی پیدا کیے)۔

سورة النجم

سوال جب ضلال اور غوایت کا ایک ہی معنی ہے تو پھر" مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَمَا غَوٰی "(یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ راہ سے بھٹکے)؟ میں ان دونوں الفاظ کو جمع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب ان میں خفیف سا فرق ہے ضلالت ہدایت کی ضد اور غیٌ رشد کی ضد ہے۔ اور ان دونوں کے معنی قریب قریب ہونے کے باوجود الگ الگ ہیں۔ جبکہ بعض حضرات کے نزدیک ضلالت قول میں اور غیٌ فعل میں ہوتی ہے۔ اور اگر ان دونوں کا معنی ایک بھی مان لیا جائے تو بھی الفاظ مختلف ہونے کے سبب تاکید مراد لی جاسکتی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے" فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی "(پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم) میں کلمۂ شک (اَوۡ) کیوں استعمال فرمایا حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے شک کا احتمال ممکن ہی نہیں؟

جواب اَوۡ تاخیر کے لئے ہے نہ کہ شک کے لئے یعنی یا تو تم قاب قوسین کا قرب حاصل کرلو یا اس سے بھی زیادہ قریب ہوجاؤ۔ بعض حضرات نے اَوۡ کا معنی بل بیان فرمایا ہے جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ جملہ کفار کو شک میں ڈالنے کے لئے بیان فرمایا تا کہ انہیں اس قرب کے متعلق معلوم نہ ہوسکے۔ یہی سوال جواب" وَاَرۡسَلۡنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلۡفٍ اَوۡ یَزِیۡدُوۡنَ "(اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تھا) میں بھی وارد ہوتے ہیں۔

سوال " اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الۡاُخۡرٰی "(بھلا تم نے لات اور عزیٰ اور

ایک تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے) میں مستعمل فعل رؤیۃ افعال قلوب میں سے ہے نہ کہ رویت بصر میں سے لہٰذا اس کا مفعول ثانی کدھر ہے؟

جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ کیا تم ملائکہ اور بتوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے ہو؟ کیونکہ مشرکین ایسے ہی سمجھتے تھے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے الثالثة الاخرى میں اخری کو ثالثہ کی صفت بنایا ہے۔ اخری ثانیہ کی تو صفت ہوسکتا ہے ثالثہ کی صفت نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم اسے ثالثہ کی صفت مانیں تو اس کا مطلب ہے کہ ثالثہ اولی بھی موجود ہے جسکے بعد ثالثہ اخری آیا ہے۔ تو ثالثہ اولی کہاں ہے؟ کیا اس جگہ دو ثالثہ موجود ہیں؟۔

جواب الاخری العزة کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہے " اَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى " باقی اخری کو رعایتِ فواصل کی وجہ سے مؤخر کیا گیا۔ جیسے کہ ولی فیھا مارب اخری میں رعایتِ فواصل کے سبب اخری کہا گیا ہے ورنہ اخر کہا جاتا۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے " وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا " (اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے) یعنی ظن علم کے قائم مقام نہیں ہوسکتا کیوں فرمایا؟ حالانکہ صورت قیاس میں یہ علم کے قائم مقام ہو جاتا ہے؟

جواب یہاں وہ ظن مراد ہے جو خواہشات کی اتباع کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ وہ ظن جو نظر واستدلال سے حاصل ہوتا ہے۔ " اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ " (اور یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر چلتے ہیں) سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے " وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى " (اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی) کیوں فرمایا؟ حالانکہ صدقہ، حج اور قراءت قرآن وغیرہ کا ایصال ثواب صحیح احادیث میں وارد ہے؟

جواب اول حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ اس آیت کی وجہ سے منسوخ الحکم ہے " وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ " (اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ شامل کر دیں گے) کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ بیٹے باپ کی نیکی کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ یہ قول صحیح نہیں کیونکہ دونوں آیتیں خبر ہیں اور خبر منسوخ نہیں ہوسکتی۔

جواب ثانی یہ حکم قوم ابراہیم وموسیٰ کے ساتھ خاص تھا جو ان کے صحف میں مذکور تھا لیکن اس

امت کو اپنی نیکی کا اور جو نیکی اس کے لئے کی جاتی ہے دونوں کا ثواب ملتا ہے۔

جواب ثالث اگر دونوں آیات کو اپنے ظاہر پر مانیں تو بھی صحیح ہے کیونکہ اولاد اور دوستوں وغیرہ کی نیکیوں کا ثواب جو ملتا ہے اس میں بھی تو اس کی سعی کو دخل ہے کیونکہ اس نے رشتہ داری، دوستی اور حب فی اللہ کو قائم رکھا جس نے انہیں ایصالِ ثواب پر ابھارا۔

سوال اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے عذاب کے تذکرے کے بعد ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰی'' (سو تو اپنے رب کو نظر کی کون کونسی نعمت میں شک کرتا رہے گا) کیوں فرمایا؟۔

جواب چونکہ عذاب سے ڈرانا بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا کہ اے والید بن مغیرہ تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں جھٹلاؤ گے۔

سورۃ القمر

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا'' (ان لوگوں سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی یعنی ہمارے بندے کی تکذیب کی) میں تکذیب کا اعادہ کیوں فرمایا؟ صرف اتنا ہی فرمادیتے کذبت قبلھم قوم نوح عبدنا۔

جواب اس کا معنی ہے کہ انہوں نے تکذیب پر تکذیب کی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پہلی تکذیب سے تکذیب توحید اور دوسری سے تکذیب رسالت مراد ہے۔ جبکہ بعض حضرات کے نزدیک پہلی تکذیب سے تکذیب اللہ اور ثانی سے تکذیب الرسول مراد ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین وآسمان دونوں کے پانیوں کے لئے واحد کا لفظ استعمال فرمایا'' فَالْتَقَى الْمَآءُ'' (پھر پانی اس کام کے لئے مل گیا)

جواب اس سے جنسِ ماء مراد ہے۔

سوال جزاء تو کافر کے لئے ہوتی ہے نہ کہ مکفور کے لئے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے'' جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ'' (یہ سب کچھ اس شخص کا بدلہ لینے کے لئے کیا) کیوں ارشاد فرمایا؟

جواب اول جزاء ا مفعول لہ ہے۔ مطلب ہے کہ ہم نے آسمان کے دروازے کھول کر انہیں عذاب میں مبتلاء کردیا تا کہ انہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جزاء مل سکے کیونکہ انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی تکفیر کی ہے۔ مفعول سے حرف جار کو حذف کردیا گیا جیسے کہ واختار موسیٰ قومہ میں جزاء بھی دیگر تمام مصادر کی طرف اپنے فاعل یا مفعول دونوں کی طرف مضاف

ہوسکتا ہے۔

جواب ثانی مکفور حضرت نوحؑ ہیں یا تو اس لئے کہ انکی حقیقی تکفیر کی گئی یعنی ان پر ایمان نہیں لایا گیا اور یا پھر اس لئے کہ آپؑ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہیں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" (اور ہم نے آپ کو اس طرح نہیں بھیجا مگر دنیا جہاں کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لئے) ایک بار ایک آدمی نے خلیفہ ہارون الرشید سے کہا الحمد للہ علیک (میں تجھ جیسی نعمت پر اللہ کی تعریف کرتا ہوں) ہارون الرشید کہنے لگے کہ کیا مطلب؟ وہ کہنے لگا کہ آپ ایک نعمت خداوندی ہیں اور میں اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ یا پھر حضرت نوحؑ کی تکفیر سے یہ مراد لیا جائے کہ آپؑ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہیں اور کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ کفران نعمت کو اپنی تکفیر پر بھی محمول فرماتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ولا تکفرون ( )۔

جواب ثالث "من" "ما" کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جن عمومی نعمتوں کی تم نے تکفیر کی ہے یہ اس کی جزاء ہے۔ حضرت قتادہؒ نے کفر بالفتح پڑھا ہے جس کا ترجمہ ہے کہ یہ کافروں کی جزاء ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ" (وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں) کیوں فرمایا منقعرہ کیوں نہیں فرمایا؟۔

جواب اول لفظ نخل لفظی اعتبار سے منکر ہے کیونکہ اس میں کوئی علامت تانیث نہیں ہے۔ اسی لئے لفظی اعتبار سے اس کی صفت مذکر استعمال کی گئی۔ البتہ یہ معنوی طور پر مؤنث ہے اسی لئے قرآن مقدس میں ایک اور جگہ معنوی اعتبار سے اس کی صفت مؤنث ذکر کی گئی ہے "اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ" (گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں) ان دونوں کی اجتماعی نظیر اس آیہ مبارکہ میں موجود ہے۔ "لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ فَشَارِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ" (پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا) حضرت ابو عبیدہؒ فرماتے ہیں کہ لفظ نخل کبھی مذکر استعمال ہوتا ہے اور کبھی مؤنث۔ قرآن کریم نے دونوں لغات کو جمع فرما دیا۔

جواب ثانی صفت کو رعایت فواصل کے سبب مذکر استعمال کیا گیا۔

سورۃ الرحمٰن

سوال رفع السماء اور وضع میزان میں کیا مناسبت ہے؟ کہ ان دونوں کو اکٹھا ذکر فرمایا؟

جواب اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ بندوں پر اپنی نعمتیں بیان فرمارہے ہیں۔ انہیں نعمتوں میں سے ایک نعمت وضع میزان ہے جس کے ذریعے نظام عالم قائم ہے۔ بالخصوص اگر میزان سے میزان عدل مراد لیا جائے جیسا کہ اکثر مفسرین کی رائے ہے جبکہ ایک قول میں اس سے قرآن کریم اور ایک قول میں ہر وہ چیز مراد ہے جس کے ذریعے پیائش کی جاسکے۔ مثلاً ترازو اور گز وغیرہ۔

سوال "اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ" (تا کہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو) سے معلوم ہو گیا کہ عدل سے تجاوز نہیں کرنا تو پھر اس کے بعد "وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ" (اور انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت) ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

جواب طغیان سے مراد ہوتا ہے زیادہ چیز یا زیادہ دام لینا اور اخسار کا مطلب ہوتا ہے کم چیز دینا۔ ان دونوں سے بچنے کے لئے درمیانی راہ اختیار کی جائیگی اور وہ ہے اقامۃ الوزن بالقسط۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں ارشاد فرمایا "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ" (اسی نے انسان کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی پیدا کیا) اور ایک جگہ فرمایا "من طین لازب" نیز ایک اور جگہ ارشاد ہے من تراب یہ تعارض کیسے رفع ہوگا؟

جواب ان آیات میں کوئی تعارض نہیں کہ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں مٹی سے پیدا فرمایا پھر ان مٹی کو گارا بنایا پھر اسے سڑا ہوا اور کھنکھناتا ہوا بنایا۔ ہر آیت سے ایک الگ تدریجی مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ میں لفظ رب کو مکرر کیوں ارشاد فرمایا جبکہ سورۃ المعارج "فَلَا اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ" اور سورۃ المزمل "رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ" میں لفظ رب کو صرف ایک بار ذکر فرمایا۔

جواب یہاں لفظ رب کو تاکید کے لئے مکرر ذکر فرمایا گیا کیونکہ اس جگہ تاکید کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہاں نعمتوں اور احسانات کا تذکرہ ہو رہا ہے اور یا پھر اس لئے کہ یہاں دو جنسوں یعنی انسان و جنات کو خطاب ہے لہٰذا لفظ رب کو بھی دوبارہ ذکر فرمایا گیا۔

سوال اس سورۃ میں بعض ایسے جملے بھی ہیں جن میں نعمت کا تذکرہ نہیں جیسے "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" (جیسے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جاویں گے) اور "يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ" (تم دونوں پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جاوے گا پھر تم ہٹا نہ سکو گے) ایسے جملوں کے بعد احسان جتانے کا کیا مطلب ہے؟ کہ ایسے جملوں کے بعد بھی فرمایا

گیا "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ" (سوائے جن وانس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

جواب دفع بلاء اور تاخیر عذاب بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک نعمت ہے' جسے فناء کے لئے پیدا کیا گیا ہو اسے باقی رکھنا نعمت ہی تو ہے۔ لہٰذا ایسے جملوں کے بعد احسان جتانا یقیناً صحیح ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَا الثَّقَلٰنِ" (اے جن وانس ہم عنقریب تمہارے لئے خالی ہو جائے جاتے ہیں) کیسے فرمایا: حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو کوئی بھی شغل مصروف نہیں رکھ سکتا۔

جواب امام زجاج فرماتے ہیں لفظ فراغ کے "معنی ہیں (۱) مصروفیت سے فارغ ہونا (۲) کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا۔ یہ دوسرا معنی تہدید وتخویف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے ساتفرغ لفلان۔ تو آیت کا بھی یہی معنی ہے کہ ہم تمہارے حساب و عذاب کی طرف متوجہ ہونگے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود سے ڈرنے والے کے لئے صرف دو باغات کا ارادہ کیوں فرمایا؟۔

جواب چونکہ خطاب جن وانس دو کو تھا تو مطلب یہ ہے کہ ایک باغ انسان خائف کو اور ایک باغ جن خائف کو دیا جائیگا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہر خائف کو دو باغ دیۓ جائیں گے۔ ایک باغ نیکیوں پر عمل پیرا ہونے کے سبب اور ایک باغ گناہوں سے رکنے کے سبب' جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک باغ تو ثواب کے طور پر عطاء اور دوسرا تفضیلاً اور عنایۃً عطاء فرمایا جائیگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ" (جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآں بھی)۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ" (ان میں نیچی نگاہ والیاں ہوں گی) میں جمع کی ضمیر ارشاد فرمائی حالانکہ اس کا مرجع جنتان ہے۔

جواب ضمیر کا مرجع اللہ تبارک وتعالیٰ کی تمام نعمتیں' باغات' چشمے اور فواکہ وغیرہ جو ماقبل میں مذکور ہو چکی ہیں۔ جبکہ بعض حضرات کے نزدیک اس کا مرجع جنتان ہی ہے باقی جمع کی ضمیر اس لئے ذکر کی گئی کیونکہ ان جنتان میں بہت سے محل اور مکانات ہیں ان کی رعایت کے سبب جمع کی ضمیر لائی گئی۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جمیع باغات ہیں جن پر جنتان کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ضمیر کا مرجع فرش ہے کیونکہ وہی قریب ہے لیکن اس

قول پر نی علی کے ترجمہ ہیں۔ جیسا کہ "اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ" (کیاان کے پاس کوئی سیڑھی ہے اس پر باتیں سن لیا کرتے ہیں)۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے حور کی تعریف میں "لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ" (ان لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ جو دنیاوی خواتین ہیں انہیں بھی جنات نے ہاتھ نہیں لگایا۔

جواب یعنی وہ قصرات الطرف انسانوں کے لئے انسان اور جنات کے لئے جنات ہونگی۔ کسی انسان کو کسی انسان نے اور کسی جنی کو کسی جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جن بھی انسانوں کی طرح مشغول ہوتے ہیں۔

سورۃ الواقعہ

سوال "وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ" میں تکرار کا کیا فائدہ؟۔

جواب اول چونکہ ماقبل میں تاکید مذکور تھی "فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ" (سو جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور جو بائیں والے ہیں اور وہ بائیں والے کیسے برے ہیں) لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے بھی تاکید کے لئے مکرر ارشاد فرمادیا۔ مطلب یہ ہے کہ سابقون تو وہ لوگ ہیں جس کے حالات اور جنکی صفات مشہور ومعروف ہیں۔ جیسا کہ ابوالنجم کہتا ہے انا ابوالنجم وشعری شعری۔

جواب ثانی اس کا معنی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی طرف سبقت کرنے والے جنت کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک سابقین سے ہر امت میں کے ایمان کی طرف سبقت کرنے والے مراد ہیں اور بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنہوں نے دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ بعض کے نزدیک اہل قرآن' بعض کے نزدیک مساجد کی طرف سبقت کرنے والے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے جانے والے مراد ہیں' جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وہ اس سے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ" (اوران کے پاس ایسے لڑکے آمد ورفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے) کیوں فرمایا؟ حالانکہ مخلدون صرف ولدان نہیں ہونگے بلکہ جتنے بھی جنتی ہیں سبھی مخلدون ہونگے۔ نہ کبھی بڑھاپا آئیگا اور نہ ہی کوئی غم ہوگا بلکہ ہر ایک اپنی اسی حالت پر باقی رہے گا جس پر وہ جنت میں داخل ہوا تھا۔

جواب مطلب یہ ہے کہ ان کا بچپنا کبھی تبدیل نہیں ہوگا۔

سوال اللہ تبارک و تعالیٰ نے "لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ فَشَارِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ" میں پہلے شجر کے لئے مؤنث ضمیر ذکر فرمائی اور پھر مذکر اس کی کیا وجہ ہے؟۔

جواب اس کا جواب سورۃ القمر میں گذر چکا ہے۔

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے "نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ" کیوں فرمایا؟ حالانکہ کفار تو اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ان کا خالق اللہ ہے بدلیل قولہ تعالیٰ "وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ"

جواب اول زبان سے تو اقرار کرتے تھے لیکن ان کا عمل اس کے خلاف تھا۔ یعنی عملاً تصدیق نہیں کرتے تھے۔

جواب ثانی بعث بعد الموت کی تصدیق مراد ہے۔ یعنی جس اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں پہلے پیدا فرمایا وہی تمہیں دوبارہ پیدا فرمائے گا تم اس کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟

سوال اللہ تبارک وتعالیٰ نے زراعت کے متعلق "لَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا" اور پانی کے متعلق "لَوْ نَشَاۗءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا" بغیر اللام ارشاد فرمایا۔ اسکی وجہ؟۔

جواب اول اصل تو یہی ہے کہ دونوں جگہ لام ذکر کیا جائے۔ اس لئے کہ "لَوْ" کے جواب پر لام ضرور داخل ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے کلمہ سے اختصارًا لام حذف کر دیا گیا کیونکہ پہلا کلمہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔

جواب ثانی یہ لام تاکید ہے جو مطعوم کے ساتھ تو مذکور ہے لیکن مشروب کے ساتھ مذکور نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مطعوم ہر اعتبار سے وجوداً اور رتبۃً مقدم ہوتا ہے کیونکہ پانی کی ضرورت کھانے کے تابع ہو کر ہی ہوتی ہے اسی لئے مطعوم کو مشروب پر مقدم کیا گیا اور فقد مطعوم کو بڑی شدت کے ساتھ ذکر کیا گیا بایں طور کہ اس کے شروع میں لام تاکید کو ذکر فرمایا۔

سوال تسبیح کا مطلب ہے کہ کسی کے متعلق یہ بیان کرنا کہ وہ فلاں برائی ونقص سے پاک ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو) لفظ اسم کو کیوں ذکر فرمایا؟

جواب اول باء زائد ہے اور اسم ذات کے معنی میں ہے۔

جواب ثانی اسم ذکر کے معنی میں ہے معنی ہے کہ اپنے رب کے ذکر کی تسبیح کیجئے۔

جواب ثالث اسم سے پہلے لفظ ذکر مضمر ہے مطلب ہے کہ اپنے رب کے نام کے ذکر کی تسبیح کیجئے۔

جواب رابع امام ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ فسبح کا معنی ہے فصل یعنی نماز اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھئے اور تکبیر تحریمہ سے افتتاح کیجئے۔

سوال جب قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت قدیم اور قائم بذاتہ المقدسہ ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیسے فرمایا ''اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ'' یعنی وہ لوح محفوظ یا مصحف میں ہے۔

جواب اول مطلب یہ ہے کہ کتاب مکنون میں لکھی ہوئی ہے۔ کسی کتاب میں قرآن کریم کو لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم اس کتاب میں حلول شدہ ہے۔ جیسے اگر کسی انسان کے ہاتھ پر لفظ ہزار دینار لکھ دیا جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے ہاتھ میں واقعۃً ہزار دینار آ جائیں۔ جیسے کہ آنحضرتؐ کی تعریف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ''

جواب ثانی اگر قرآن کریم مصحف میں حلول شدہ ہوتا تو پھر یا تو سارے کا سارا ایک ہی مصحف میں ہوتا یا پھر تمام مصاحف میں ہوتا اور یا پھر بعض مصاحف میں ہوتا۔ پہلی بات بھی صحیح نہیں کیونکہ تمام مصاحف کتابت اور حکم میں ایک جیسے ہیں اور اس لئے کہ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ دوسری بات بھی صحیح نہیں ورنہ اسے تسلیم کرنے سے تعدد قرآن لازم آئیگا۔ حالانکہ وہ ایک ہی ہے۔ تیسری بات بھی صحیح نہیں اس لئے کہ وہ سارے کا سارا ہر مصحف میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن کریم کسی بھی مصحف میں حلول شدہ نہیں بلکہ قرآن کریم تو کلام اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی صفت قدیم ہے جو اس سے جدا نہیں ہوسکتی۔

سوال جب قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ سے جدا نہیں ہوسکتا تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی تنزیل کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ'' وغیرہ کیونکہ تنزیل کا معنی ہے کہ یہ اللہ تبارک سے جدا ہوسکتا ہے اور جو چیز جدا ہو جائے وہ عین نہیں غیر ہوتی ہے اور جو غیر اللہ ہے وہ مخلوق ہے۔

جواب انزال اور تنزیل کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ کو تعلیم دی اور انہیں حکم دیا کہ وہ آنحضرتؐ تک پہنچا دیں اور انہیں کہہ دیں کہ وہ اپنی امت کو اس کی تعلیم دیدیں۔ لہٰذا تنزیل سے اس کے صفت خداوندی ہونے کی نفی نہیں کی جاسکتی۔

سورۃ الحدید

سوال اس آیتِ کریمہ کا کیا معنی ہے پہلے تو فرمایا "وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" (اور تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے) پھر فرمایا: "اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (اگر تم مومن ہو)؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھتے ہو۔ کیونکہ ان دونوں پیغمبروں کی شریعت ایمانِ محمدیؐ کی متقاضی ہے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم اس عہد کو ماننے والے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم سے اس دن لیا تھا جب اس نے آدمؑ کی پشت سے تمہیں نکالا تھا۔

جواب ثالث اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر ایمان نہ لانے کا تمہارے پاس کونسا عذر ہے حالانکہ رسولِ کریم ﷺ تمہیں اللہ کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور تمہارے سامنے ایسی کتاب کی تلاوت بھی کر رہے ہیں جو براہین و دلائل کی ناطق ہے۔ نیز اس اللہ نے تمہارے اندر غور وفکر کے لئے عقل بھی رکھی ہے اور تمہاری تمام علتوں کو دور کر دیا ہے۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود اب کونسا عذر باقی ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے؟

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ" (جو لوگ فتح مکہ سے پہلے خرچ کر چکے اور لڑ چکے برابر نہیں) اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ وہ کن لوگوں کے برابر نہیں؟ حالانکہ "استواء" کا معنی اس وقت تام ہوتا ہے جب دو آدمیوں کا ذکر ہو جیسے یہ ارشاد ہے "قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ" نیز جیسے یہ فرمان ہے "لَا يَسْتَوِىْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ"

جواب عبارت محذوف ہے اصل میں ہے "وَمن انفق وقاتل من بعدالفتح" یعنی ان کے برابر نہیں جو فتح مکہ کے بعد خرچ کر چکے اور لڑ چکے اور یہ عبارت اس لئے حذف کر دی گئی کہ مابعد کلام اس پر دال ہے۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰۤئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ صلے وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ" (اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں) کیا وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ صدیقین کا درجہ ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں ہر مومن کے لئے اس کے

صدیق ہونے کا حکم لگایا ہے؟

جواب اول ابن مسعودؓ اور مجاہدؒ فرماتے ہیں' ہر مومن صدیق ہے۔

جواب ثانی صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ سچا ہو' جو اپنے تمام اقوال' افعال اور احوال میں سچا ہو' پس بناء بریں اس سے مراد بعض مومنین ہوں گے نہ کہ تمام مومنین۔ ضحاکؒ سے مروی ہے کہ یہ آیت ان آٹھ آدمیوں کی جماعت کے متعلق نازل ہوئی ہے جو اپنے زمانہ میں سابقین الی الاسلام تھے اور وہ یہ ہیں' ابوبکرؓ عثمانؓ 'علیؓ ' حمزہؓ بن عبدالمطلب' طلحہؓ ' زبیرؓ ' سعدؓ اور زیدؓ ' حضرت عمرؓ کو بھی ان میں شامل کیا گیا' یوں تعداد نو ہو جاتی ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں مذکورہ افراد کے شہید ہونے کا تذکرہ کیا ہے' حالانکہ ان افراد میں بعض شہید نہیں ہوئے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے شہداء کا سا اجر و ثواب ہے۔

جواب ثانی شہداء' شہید کی جمع ہے بمعنی شاہد' چنانچہ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے رب کے پاس اپنے ایمان کا مشاہدہ کیا ہے۔

جواب ثالث یہ شہداء مبتداء ہے اور ماقبل سے منقطع ہے یعنی ماقبل پر معطوف نہیں ہے' معنی یہ ہوگا کہ اور شہداء کے لئے ان کے رب کے پاس اجر اور نور ہے۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے "سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" (تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو) "مسابقہ" بابِ مفاعلہ سے ہے' اس باب میں شرکت جانبین سے ضروری ہے۔ جیسے کہتے ہیں زید نے عمرو سے مسابقت کی؟

جواب اول اس کا معنی ہے تم ایسی جلدی کرو جیسے مقابلہ کے میدان میں دوڑ لگانے والے جلدی کرتے ہیں' اس کی تائید لفظِ مسارعت سے ہوتی ہے جو سورۃ آل عمران میں آیا ہے۔

جواب ثانی مطلب یہ ہے کہ تم موت کے فرشتہ سے مسابقت کرو اس سے قبل کہ وہ موت کے ذریعہ تمہارا ان اعمال سے تعلق قطع کر دے جو حصولِ جنت کا سبب ہیں۔

جواب ثالث تم ابلیسِ لعین سے مسابقت کرو اس سے قبل کہ وہ اپنے مکر و فریب کے ذریعہ تمہیں ان اعمال کے بجالانے سے روک دے۔

سوال یہاں فرمایا: "وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" (ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے) اور آل عمران میں فرمایا "وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" (ایسی جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے) دونوں میں

بظاہر تعارض ہے، جنت کی وسعت ایک آسمان کی وسعت کے برابر ہے یا سات آسمانوں کی وسعت کے برابر؟

جواب "اَلسَّمَآء" سے جنسِ سماوات مراد ہے نہ کہ ایک آسمان۔ جس طرح دونوں آیتوں میں "ارض" سے مراد جنس ارضین ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں تشبیہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی وسعت کے ساتھ ہے۔

سوال اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: "لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ" (تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہی تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تمکو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں) حالانکہ ایسا کوئی بھی انسان نہیں ہے جو نقصان کے وقت رنج وغم سے دوچار نہ ہوتا ہو اور نفع کے وقت خوش نہ ہوتا ہو؟

جواب اس سے مراد وہ طبعی رنج وخوشی نہیں ہے جو انسان سے جدا نہیں ہوتی، بلکہ اس سے مراد ایسا حزن ہے جو اس شخص کو صبر وضبط اور حکمِ خداوندی کے انقیاد وتسلیم سے نکال کر ذہول میں مبتلا کردے اور فرح سے مراد ایسی خوشی ہے جو سرکش بنا دینے والی اور شکرِ خداوندی سے غافل کر دینے والی ہو۔ نعوذ باللہ منہما۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے "وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ" (اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور ترازو کو نازل کیا) ترازو تو آسمان سے نازل نہیں ہوئی؟۔

جواب اول یہاں میزان سے مراد عدل ہے۔

جواب ثانی میزان سے مراد عقل ہے۔

جواب ثالث وہ زنجیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر نازل فرمائی۔

جواب رابع معروف میزان ہی مراد ہے جو جبریلؑ لے کر نازل ہوئے اور حضرت نوح علیہ السلام کو وہ میزان دے کر فرمایا، اپنی قوم کو حکم دیں کہ اس کے ذریعہ وزن کیا کریں۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ" (اے ایمان رکھنے والو تم اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ) حالانکہ مسلمان اپنے پیغمبر علیہ السلام پر ایمان تو رکھتے ہیں؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے، اے موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھنے والو تم محمد ﷺ پر بھی ایمان لاؤ، اس لحاظ سے خطاب صرف یہود ونصاریٰ کو ہوگا۔ اور یہ اکثر اہلِ علم کا قول ہے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے: اے میثاق کے دن پر ایمان رکھنے والو تم اللہ سے ڈرو اور آج اس کے

رسول پر ایمان لاؤ۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے: اے زبان سے علانیہ اللہ پر ایمان لانے والو تم اللہ سے ڈرو اور دل کی تصدیق کے ساتھ سراً اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔

سورۃ المجادلۃ

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ“ (کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو اور نہ پانچ کی مگر وہ ان کا چھٹا ہے) کیا وجہ ہے کہ اعداد میں سے تین اور پانچ کے عدد کو خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین کی ایک جماعت مسلمانوں کے خلاف غم وغصہ کے اظہار کے لئے انہی دو عدد کے مطابق سرگوشی کے لئے پیچھے رہ گئی تھی چنانچہ ان کی حالت کو بیان کرنے، ان کو سنانے اور ان پر تعریض کے لئے یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور پھر: ”وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ“ فرما کر ان کے علاوہ ہر سرگوشیاں کرنے والے دو آدمیوں کو بھی شامل کر دیا۔

سوال اس فرمانِ الٰہی کا فائدہ کیا ہے؟ ”وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ“ (اور قسم کھاجاتے ہیں جھوٹ اور وہ جانتے ہیں)؟

جواب منافقین کے بارے میں خبر دی جارہی ہے کہ وہ اس بات پر جھوٹی جان بوجھ کر قسم کھاجاتے ہیں کہ انہوں نے یہودیوں کے ساتھ مل کر رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہؓ کو برا بھلا نہیں کہا ہے۔ یہ یمینِ غموس ہے لہٰذا یہ ان کی مذمت کو بدرجہ اتم بیان کرنا ہے۔

سورۃ الحشر

سوال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے: ”وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ“ (اور ان لوگوں کا جو دارالاسلام میں ان کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں) ایمان تو قرار پکڑنے کی جگہ نہیں ہے، کیوں کہ ”التبوء“ کا معنی ہوتا ہے کسی جگہ کو منزل بنانا؟

جواب اول عبارت مقدر ہے: ”واخلصوا الایمان“ یعنی اور انہوں نے ایمان کو خالص کیا۔ جیسے کسی شاعر کا قول ہے:

علفتها تبناً وماءً بارداً یعنی وَسَقَيْتُهَا کہ میں نے اس کو ٹھنڈا پانی پلایا۔

جواب ثانی یہ کلام اپنے ظاہری مفہوم پر ہے' اس میں کوئی عبارت محذوف نہیں ہے' لیکن یہ مجاز اہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے استقامت علی الایمان کی وجہ سے ایمان کو اپنا مستقر بنایا' جیسے انہوں نے دارالہجرت یعنی مدینہ منورہ کو جائے استقرار بنایا۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ'' (اور اگر ان کی مدد بھی کی) جبکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ''لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ'' (یہ ان کی مدد نہیں کریں گے) تو اس آیت کا مطلب کیا ہے۔ کیونکہ کلمہ ''ان'' ایسی چیز پر داخل ہوتا ہے جس کا وجود اور عدم دونوں محتمل ہو؟۔

جواب معنی یہ ہے کہ اگر بالفرض والمحال یہ ان کی مدد کریں۔ جیسے حضور نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا: ''لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ'' یعنی اگر بالفرض والتقدیر آپ بھی شریک ٹھہرائیں تو آپ کے بھی عمل ضائع ہو جاتے۔ نیز جیسے یہ فرمایا ہے: ''لَوْ كَانَ فِیْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا'' جیسے اللہ تعالیٰ کو کسی بھی چیز کا علم اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہوتا ہے اسی طرح ان کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ جو چیز موجود نہیں ہے اگر موجود ہوتی تو اس کی کیفیت کیا ہوتی؟

سوال اللہ تعالیٰ مومنین سے فرماتے ہیں: ''لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ'' (بے شک تم لوگوں کا خوف ان کے دلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے) اس کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ صدور سے مراد یا صدور المنافقین (منافقوں کے دل) ہے یا صدور الیہود (یہود کے دل) اگر ''من'' متعلق ہے ''اَشَدُّ'' کے ساتھ تو خوفِ خدا کا ثبوت لازم آتا ہے' جیسے تم کہتے ہو: زید اشد خوفًا فی الدار من عمرو'' اور یہ محال ہے اور اگر ''من اللہ'' متعلق ہے خوف کے ساتھ تو پھر مفضل علیہ کہاں ہے جس پر مخاطبین کو فضیلت دی گئی ہے' نیز آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مومنین کے لئے خوف کی زیادتی ثابت ہو' حالانکہ باتفاقِ مفسرین یہ مراد نہیں ہے؟۔

جواب ''رَهْبَةً'' مصدر ہے رَهَبَ کا اور مبنی للمفعول ہے۔ گویا یوں فرمایا: ''اَشَدُّ مرهوبیة'' یعنی تم ان کے دلوں میں اللہ کی بہ نسبت زیادہ خوف والے ہو: ''کذا فسرہ ابن عباسؓ'' اس کی نظیر تمہارا یہ کہنا ہے: ''زید اشد ضربًا فی الدار من عمرو'' یعنی مضروبیت میں زیادہ ہے۔

سوال ''اَشَدُّ رَهْبَةً'' (زیادہ خوف) فرما کر یہ تفضیل کیسے درست ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو اللہ سے مطلق نہیں ڈرتے تھے' اگر انہیں اللہ کا کچھ بھی خوف ہوتا تو وہ کفر و نفاق سے باز آ جاتے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ ان کا سراً تم سے خوف اللہ کی بہ نسبت زیادہ ہے جس کو وہ تمہارے سامنے ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وہ منافقین مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ سے زیادہ خوف ظاہر کرتے تھے۔

سوال ابلیس نے یہ کیسے کہا: ''اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ'' (تحقیق میں اللہ سے ڈرتا ہوں) حالانکہ وہ

اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا' اگر ڈرتا ہوتا تو اللہ کے حکم کی مخالفت نہ کرتا اور اللہ کے بندوں کو گمراہ نہ کرتا؟

جواب یہ سوال مع جواب سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس ارشادِ مبارک میں: "وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" (اور چاہیے کہ دیکھے ہر جی جو کچھ آگے بھیجا واسطے آنے والی کل کے) "نفس" اور "غد" کو نکرہ لائے ہیں؟

جواب "نفس" کو نکرہ اس کے استقلال کے لئے لائے ہیں' مطلب یہ ہے کہ ہر نفس جو اعمال آخرت میں بھیج رہا ہے مستقل طور پر غور کرے' گویا یوں فرمایا: ہر ہر نفس اس بارے غور کرے اور "غد" کو نکرہ اس کی عظمت کے لئے اور اس کے امر کو مبہم رکھنے کے لئے ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: "لِغَدٍ" اور اس سے قیامت کا دن مراد لیا' حالانکہ "غد" نام ہے ایسے دن کا کہ اس کے درمیان اور ہمارے درمیان ایک رات ہو؟

جواب اول "غد" کے دو مفہوم ہیں' ایک تو وہی جو مذکور ہوا اور دوسرا معنی مطلق زمانہ مستقبل ہے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

واعلم ما فی الیوم والامس قبله ☆ ولكنني عن علم ما في غدٍ عَمِي

اس شعر میں جیسے "امس" سے مطلق زمانہ ماضی مراد ہے اسی طرح "غد" سے مطلق زمانہ مستقبل مراد ہے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے: "كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ"

جواب ثانی قیامت کے دن پر "غد" کے لفظ کا اطلاق اس کو قریب بتانے کے لئے ہے۔ جیسے "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ" نیز جیسے "وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ" گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: بے شک قیامت کا دن اپنے قریب ہونے کی وجہ سے اس چیز کی مانند ہے کہ اس کے اور تمہارے درمیان صرف ایک رات کا فاصلہ ہو۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "رات کو عمل کرلو جس کی صبح کو قیامت کا دن ہے" اس رات سے مراد موت کی رات ہے۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: "لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ"؟

جواب اس کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ پہاڑوں کے اندر ان کی سختی کے باوجود قوتِ تمیز رکھ دیتے جیسے انسان میں رکھی ہے پھر اس پر قرآن نازل کرتے تو وہ اللہ کے خوف سے پھٹ جاتے اور تعظیمِ قرآن کا حق ادا نہ کرنے کی بناء پر ریزہ ریزہ ہو جاتے' اصل مقصد انسان کو اس کی قساوتِ قلبی اور تلاوت کے وقت خشیت اور تدبر کی کمی اور اعراض پر تنبیہ اور توبیخ کرنا ہے۔

سوال خالق اور باری میں کیا فرق ہے' جس کی وجہ سے ایک کا دوسرے پر عطف کیا گیا ہے؟

جواب خالق کہتے ہیں جو اس چیز کی تقدیر بنانے والا ہو جس کو وہ بنائے۔ اور باریٔ کہتے ہیں کہ جو مختلف شکلیں بنا کر بعض کو بعض سے ممتاز کرنے والا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ خالق کا معنی ہے پہلی بار پیدا کرنے والا اور باریٔ کہتے ہیں پھر دوبارہ پیدا کرنے والا۔

سورة الممتحنة

سوال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِلَّا قَوْلَ اِبْرَاهِیْمَ لِاَبِیْهِ'' اس کا مستثنیٰ منہ کیا ہے؟۔

جواب اس کا مستثنیٰ منہ یہ ہے''قعدم کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرَاهِیْمَ'' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ''اسوۃٌ حسنہ'' سے مراد وہ قول ہے جس کو اس نے اس سے اس کے متبعین اور پیروکاروں سے نقل کیا ہے تاکہ وہ اس کی اقتداء اور پیروی کریں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے استغفار کو جو انہوں نے اپنے والد کے لئے کیا مستثنیٰ کر دیا' کیونکہ ابراہیمؑ اس کا اپنے والد سے وعدہ کر چکے تھے۔

سوال اگر حضرت ابراہیمؑ کا اپنے والد کے لئے استغفار یا ان سے استغفار کا وعدہ اس اسوۃٌ حسنہ سے مستثنیٰ ہے تو پھر اس پر اس قول ''وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ'' کا عطف کیسے کیا گیا' اس کا استثناء درست نہیں ہے؟۔

جواب استثناء سے مقصود صرف پہلا جملہ ہے' اور مابعد جملہ کو اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ کلامِ ابراہیمی کی تمامیت میں سے ہے' نہ کہ استثناء مقصود ہے۔ گویا یوں فرمایا: میں آپ کے لئے استغفار کروں گا اور مجھ میں استغفار کے سوا کوئی طاقت نہیں ہے۔

سوال اس ارشادِ الٰہی کو ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے''وَلَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ'' (اور مشروع باتوں میں آپ کی نافرمانی نہیں کرینگی) جبکہ یہ بات واضح ہے کہ حضور ﷺ معروف کا ہی حکم دیں گے لہٰذا ''ولا یعصینك'' پر اکتفاء کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذہن فوراً بلا توقف معصیت کی قباحت کی طرف جائیں گے۔

سورة الصّف

سوال اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ مبارک ''وَقَدْ تَعْلَمُوْنَ'' میں لفظ ''قَدْ'' کا کیا فائدہ ہے؟

جواب اول اس کا فائدہ تاکید ہے۔ گویا یوں فرمایا' اورتم یقینی طور پر جانتے ہو' تمہیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ یہ زمخشری کا جواب ہے۔

جواب ثانی اس کا فائدہ تکثیر ہے' اس لئے کہ "قَدْ" فعل مضارع پر آئے تو کبھی تقلیل کا فائدہ دیتا ہے جیسے کہتے ہیں۔ "ان الکذوب قد یصدق" یعنی جھوٹا شخص کبھی سچ بول دیتا ہے۔ اور کبھی تکثیر کا فائدہ دیتا ہے جیسے شاعر کا قول ہے:

قد اعسف النازح المجهود معسفة ☆ في ظلّ اخضر يدعو هامة البوم

شاعر کثیر الوجود چیز کی مدح سرائی کرنا چاہتا ہے نہ کہ اس چیز کی جو قلیل الوجود ہو۔

سوال حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کیسے فرمایا "وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ" (اور خوشخبری دینے والے ساتھ اس پیغمبر کے کہ آئے گا پیچھے مجھ سے نام اس کا احمد ہے) "محمدؐ" نہیں کہا' حالانکہ "محمدؐ" حضور ﷺ کا زیادہ مشہور نام ہے؟

جواب اول "احمد" اس لئے فرمایا کہ انجیل میں یہی ایسی عبارت کے ساتھ مذکور ہے جس کا معنی "احمدؐ" ہے نہ کہ محمدؐ۔ حضورؐ کا آسمانوں میں نام احمد ہے اور زمین میں محمدؐ۔ چنانچہ آسمانی نام کتاب انجیل میں نازل ہوا۔

جواب ثانی "احمد" کا لفظ حمد کے معنی میں ابلغ ہے بہ نسبت محمدؐ کے' کیونکہ احمد صیغہ تفضیل کا ہے۔ جبکہ بعض یہ کہتے ہیں کہ "محمدؐ" اس جہت سے ابلغ ہے کہ یہ صیغہ تفضیل ہے جو تکثیر کا معنی دیتا ہے۔

سوال ارشاد ہے "فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ" (پس جب آیا ان کے پاس وہ پیغمبر ساتھ ظاہر دلیلوں کے انہوں نے کہا یہ جادو ہے ظاہر) یہاں بظاہر "ہٰذہٖ" ہونا چاہئے' کیونکہ مشار الیہ یعنی "بینٰت" مؤنث ہے؟

جواب اس کا معنی ہے "هذا الذی جئت به" یعنی یہ جو تو لے کر آیا ہے' پس اشارہ اس چیز کی طرف ہے جو لائی گئی ہے۔

سوال "مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ" اس آیتِ کریمہ میں وجہ تشبیہ کیا ہے' بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انصار اللہ ہونے کو حضرت عیسیٰؑ کے اس قولِ مذکور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے؟

جواب تشبیہ اس معنی پر محمول ہے جو مقدر ہے: تم اللہ کے دین کے مددگار ہو جاؤ جیسے حواری عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار ہوئے تھے جب عیسیٰؑ نے ان سے کہا تھا' مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ۔

سورۃ الجمعۃ

سوال اس سے کیا مراد ہے: "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ" (پس جلدی کرو اللہ کی طرف) "سَعْی" کا معنی تو دوڑنا ہے' نمازِ جمعہ کے لئے بلکہ ہر نماز کے لئے دوڑنا تو مکروہ ہے؟

جواب "سعی" سے مراد قصد ہے۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد قدموں سے دوڑنا نہیں بلکہ نیتوں اور دلوں کی سعی ہے۔ قولِ حسنؒ کی تائید اس ارشادِ الٰہی سے ہوتی ہے: "وان لیس للانسان الا ماسعی" نیز دعائے قنوت سے ہوتی ہے۔ "والیك نسعی ونحفد" اس "سعی" سے مراد دوڑنا یا تیز تیز قدم اٹھانا نہیں ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ "اِنْفَضُّوْآ اِلَیْھَا" (دوڑے جاتے ہیں اس کی طرف) فرمایا ہے۔ حالانکہ پیچھے دو چیزیں مذکور ہیں ایک لہو اور دوسری تجارت؟۔

جواب اس کا جواب سورۃ التوبۃ میں "وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کے تحت گزر گیا ہے۔ نیز اس کی تائید زجاج کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جب "تجارت" کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب "لہو" دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ ایک کو حذف کر دیا کیونکہ مذکور امر اس پر دال ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ سے "الیھما" تثنیہ کے ساتھ پڑھا ہے' بناء بریں عبارت حذف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سورۃ المنافقون

سوال "وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُہٗ" (اور اللہ جانتا ہے تحقیق آپ اللہ کے رسول ہیں) کے ارشاد کو ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب اگر اللہ تعالیٰ صرف یہ فرماتے: "قَالُوْا نَشْھَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ وَاللّٰہِ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ" تو یہ وہم ہوتا کہ ان کا یہ قول کاذب ہے' حالانکہ یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی یہ شہادت کاذب ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس شہادت کے علاوہ میں کاذب ہیں۔

اکثر مفسرین فرماتے ہیں: منافقین کی تکذیب ان کی شہادت میں ہے' اس لئے کہ منافقین کا اظہار ان کے مافی الضمیر کے خلاف تھا' کیونکہ وہ اپنے دلوں سے حضورؐ کو اللہ کا رسولؐ

نہیں مانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کاذب کہا گیا۔ بنا بریں یہ قول: ''وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الخ'' تاکید کے لئے ہوگا۔

سوال اس کا کیا معنی ہے؟ ''ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا'' (یہ بسبب اس کے ہے کہ وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے) حالانکہ منافقین ہمیشہ کفر پر ہی قائم رہے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کذب جس کا ان پر حکم لگایا گیا یا ان کے متعلق جو یہ خبر دی گئی کہ ان کے اعمال بہت بُرے ہیں یہ اس سبب سے ہے کہ وہ اپنی زبانوں سے ایمان لائے پھر ''کفروا'' یعنی اپنے دلوں سے کفر کیا' پھر ''فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ'' یعنی ان کے دلوں پر مہر کردی گئی۔ جیسے ان منافقین کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے''وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ''الآية

جواب ثانی اس سے مراد منافقین میں سے اہلِ ارتداد ہیں۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ ''يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ'' (ہر غل پکار کو اپنے اوپر خیال کرنے لگتے ہیں یہی لوگ دشمن ہیں) فرمایا ہے ''هِيَ الْعَدُوُّ'' نہیں فرمایا؟

جواب ''عَلَيْهِمْ'' يحسبون کا دوسرا مفعول ہے۔ تقدیرِ عبارت یہ ہے ''يحسبون كل صيحة واقعة عليهم'' یعنی اپنی بزدلی کی وجہ سے۔ لہذا ''عليهم'' پر وقف ہے' اور ''هم العدو'' نیا کلام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مفعول ثانی ''هم العدو'' پہلا مفعول ہے' لیکن عبارت یوں مقدر ہوگی: ''يحسبون اهل كل صيحة عليهم هم العدوّ'' واضح ہے جس کی دلیل' ''عدوّ'' پر نصب کا نہ ہونا ہے۔

سورة التغابن

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں ''فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ'' (پس بعضے تم میں سے کافر ہیں اور بعضے تم میں سے مسلمان ہیں) کافر کو مومن پر مقدم کیا گیا ہے؟

جواب واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا ہے اور نہ ترتیب کا تقاضا کرتا ہے۔ جیسے ان آیاتِ کریمہ میں: ''فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ'' ۔ ''لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ''فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَاتِ''يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ'' آخری آیت کے متعلق ایک اور مطلب ہم نے اس کے مقام پر ذکر کیا ہے۔

سوال ''وَتَوَلَّوْا وَاسْتَغْنَى اللّٰهُ'' (اورانہوں نے منہ پھر لیا اور خدا نے بھی پروانہ کی) اس سے وہم ہوتا ہے کہ ان کے پاس پیغمبر کے آنے کے بعد تولی (اعراض) اور استغناء (خدا کی بے پرواہی) دونوں ایک ساتھ پائے گئے' حالانکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے غنی (بے نیاز) ہے؟۔

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان کے ایمان اور عبادت سے استغناء کا ظہور ہوا کہ ان کو قدرت کے باوجود ایمان کی طرف مجبور نہیں کیا۔

سوال اس سے کیا مراد ہے ''وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ'' (اور جو کوئی ایمان لائے ساتھ اللہ کے ہدایت کرتا ہے اس کے دل کو) حالانکہ ہدایت' ایمان سے پہلے ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر پہلے ہدایت نہ ہو تو ایمان نہیں پایا جائیگا؟

جواب اول اس سے یہ مراد نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ نزولِ مصائب کے وقت اس کے قلب کو یقین کی ہدایت کرتے ہیں۔

جواب ثانی مراد یہ ہے کہ اس کے قلب کو نزولِ آفات کے وقت رضا و تسلیم کی ہدایت دیتے ہیں۔

جواب ثالث یعنی نزولِ مصائب کے وقت استرجاع (انا للہ پڑھنے) کی ہدایت دیتے ہیں۔

جواب رابع ''يَهْدِ قَلْبَهٗ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ان لوگوں میں سے بنا دیتے جو مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد اس پر صبر کرتے ہیں' اور جب کسی نعمت سے نوازے جاتے ہیں تو شکر کرتے ہیں' جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

جواب خامس مراد یہ ہے کہ اس کے قلب کو اتباعِ سنت کی ہدایت کرتے ہیں جب اس کا ایمان صحیح ہو۔ اور ''يَهْدَأْ'' کو دال کے فتح اور ہمزہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ جو ''ہدوٌ'' بمعنی سکون سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا معنی ہوگا کہ جو شخص اللہ پر خالص ایمان لاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو نزولِ مصائب کے موقع پر مطمئن اور پر سکون بنا تے ہیں کہ پھر وہ جزع فزع نہیں کرتا۔

سورۃ الطّلاق

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ'' (اے نبی جس وقت تم طلاق دو عورتوں کو) کیا وجہ ہے کہ پہلے خطاب کو مفرد لائے پھر اس کو جمع لائے؟۔

جواب اول اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پہلے خطاب کو مفرد اس لئے لائے کہ حضور ﷺ اپنی امت کے امام اور پیشوا ہیں اس لئے آپ کے تقدم اور ریاست کو ظاہر کیا گیا۔ آپؐ اکیلے ساری امت کے حکم میں ہیں اور سب کے قائم مقام ہیں۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اے پیغمبرؐ! اپنی امت کو کہہ دیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دو۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا" (اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتے ہیں) جب کہ ہم بہت سے متقی لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ رزق کے معاملہ میں تنگی کا شکار ہوتے ہیں؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے لئے دنیا و آخرت کی فکرات سے نکلنے کی راہ نکال دیتے ہیں۔ نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "وہ دنیا کے شبہات' موت کی سختی اور قیامت کے دن کی مشکلات سے خلاصی پاتا ہے" حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت کے ہر کرب سے نجات دیتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے' بلاشبہ اللہ تعالیٰ متقی انسان کے لئے مضرات سے نکلنے کی جو راہ پیدا فرماتے ہیں وہ غیر متقی کے لئے پیدا نہیں فرماتے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: "میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو وہ آیت ان کے لئے کافی ہو جائے اور وہ ہے: "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰه" الآیۃ حضورؐ اس کو بار بار پڑھتے رہے"۔

رہی بات متقی لوگوں کے رزق کی تنگی کی' تو ان کے پاس باوجود تنگی رزق کے ایسی جگہوں سے رزق آتا ہے جہاں سے انہیں امید تک نہیں ہوتی۔ رزق کی قلت اصل میں ان پر لطف و رحمت ہے۔ کیونکہ اس سے مقصد آخرت میں ان کو وافر حصہ عطا کرنا ہوتا ہے اور حساب و کتاب میں تخفیف کرنی ہوتی ہے۔ نیز اس قلتِ رزق سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایسے تعلقات کم سے کم ہوں جو ان کو ان کے مولیٰ حقیقی سے دور کرنے والے ہیں' کہیں رزق کی وسعت اور فراوانی ان کو اللہ کی عبادت و طاعت سے غافل نہ کر دے' یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرامؑ' اولیاءِ عظام اور صدیقین حضرات فقر کو غنیٰ پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔

سوال اس سے کیا مراد ہے: "وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ" (اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے) جب کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جو اللہ پر اپنے بعض امور و حاجات میں توکل کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کی مہمات کے لئے کافی نہیں ہوتے؟۔

جواب یہ محال ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرے جیسے توکل کا حق ہے اور اللہ اس کی مہمات کے لئے کافی نہ ہو۔ بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص قلق و اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے دل یا زبان سے بھی حاجت روائی میں تاخیر کی شکایت کرتا ہے جس سے اس کا توکل علی اللہ فاسد ہو جاتا ہے' اس فرمانِ باری میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے: "اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ" یعنی

اللہ تعالیٰ اپنا کام جس طرح چاہتا ہے پورا کر کے رہتا ہے' کوئی مراد اس سے فوت نہیں ہوتی اور کوئی مطلوب اس کو عاجز نہیں کرتا' آگے فرمایا' "قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا" یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک اندازہ اپنے علم میں مقرر کر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا خواہ وہ فقر و غنٰی ہو یا مرض وصحت یا آسودہ حالی و تنگ حالی ہو سب کا ایک اندازہ' ایک انتہاء اور مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں نہ تقدم ہو سکتا ہے اور نہ تاخر۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ" (اور جو عورتیں حیض آنے سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تم کو شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے) اس آیت میں عورتوں کی عدت کو ہمارے شک کے ساتھ معلق کیا گیا ہے' حالانکہ ان کی عدت یہی ہے' خواہ ہمارا شک پایا جائے یا نہ پایا جائے؟

جواب شک سے مراد حیض سے مایوس اور صغیرہ (کم عمر لڑکی) کی عدت کی مقدار سے جہالت ہے' اور معلق اس لئے کیا کہ جب سورۃ البقرۃ میں حیض والیوں کی عدت کا بیان نازل ہوا تو بعض صحابہؓ کہنے لگے' بڑی عمر والی اور کم عمر والی عورتوں کی عدت باقی رہ گئی۔ ہم نہیں جانتے کہ کبیرہ و صغیرہ کی عدت کتنی ہے؟ چنانچہ اس وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی اور اسی لئے اس میں شک اور جہالت کی قید لگائی گئی۔

سوال جب بعض علماء کے نزدیک مطلقہ بطلاقِ بائن کا نفقہ واجب ہے تو ان کے نزدیک اس ارشادِ مبارک: "وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ" (اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو ان کو خرچ دو) کا کیا فائدہ ہو گا؟۔

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ یہ وہم نہ کرے کہ جب طلاق کے بعد مدتِ حمل طویل ہو جائے حتی کہ عدتِ حامل کی مدت سے بھی گزر جائے تو نفقہ ساقط ہو جائے گا' چنانچہ اس وہم کا ازالہ اس ارشادِ عالی: "حَتّٰی یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ" (یہاں تک کہ رکھیں اپنا حمل) سے کر دیا۔

سوال یہاں فرمایا ہے: "سَیَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا" (خدا تعالیٰ تنگی کے بعد جلدی فراغت بھی دے گا) جبکہ ایک دوسرے مقام پر یوں فرمایا ہے: "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" (تحقیق سختی کے ساتھ آسانی ہے) دونوں میں تطبیق کس طرح ہو گی؟

جواب اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں "مع" کا مطلب "بعد" ہے' اس لئے کہ دو ضدیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

سوال اس آیت کا کیا معنی ہے: "وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا

حِسَابًا شَدِیْدًا وَّ عَذَّبْنٰھَا عَذَابًا نُّکْرًا'' (بہت سی بستیاں تھیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم سے اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی سو ہم نے ان (کے اعمال) کا سخت حساب کیا اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دی) اس آیت میں سرکشی کو ان بستیوں کی طرف منسوب کیا ہے' اور ''فحاسبنٰھا'' اور ''عذّبنٰھا'' کو لفظِ ماضی کے ساتھ بیان کیا ہے' حالانکہ حساب اور عذاب دونوں آخرت میں ہوں گے نہ کہ دنیا میں؟

جواب اس کا معنی ہے کہ ان بستی والوں نے سرکشی کی۔ اور ماضی کے الفاظ اس لئے لائے تاکہ اس امر کی تحقیق وتقریر ہو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ یا وعید آئندہ واقع ہوگی وہ ایسی ہی ہے جیسے واقع ہو چکی ہے' اس کی نظیر یہ ارشاد ہے: ''وَنَادٰی اَصْحٰبُ النَّارِ'' وغیرہ۔

سورۃ التحریم

سوال اگر ''صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ'' سے مراد فرد ہے تو وہ کونسا فرد ہے' نیز یہ ملائکہ جو جمع ہے اس کے مناسب بھی نہیں ہے' اور اگر اس سے مراد جمع ہے تو پھر مصحف شریف میں واؤ کے ساتھ مکتوب کیوں نہیں ہے؟۔

جواب اوّل یہ فرد ہے جس سے مراد جمع ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں: ''لا یفعل ھذا الفعل الصالح من الناس'' مراد آپ کی جنس ہوتی ہے۔ نیز جیسے آپ کہتے ہیں: ''لا یفعله من صلح منھم'' نیز یہ آیات اس کی نظیر ہیں: ''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ'' ''اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا'' ''وَالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِھَا'' ''ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا'' ایسے نظائر بہت زیادہ ہیں۔

جواب ثانی جمع بھی مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن مصحف میں بغیر واؤ کے لفظ کی بناء پر لکھا گیا ہے' ایسے الفاظ قرآنِ پاک میں بہت زیادہ ہیں جو لفظ کی بناء پر ہیں نہ کہ خط کی اصطلاح کے مطابق۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ ''وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَھِیْرٌ'' میں ''ظھیر'' فرمایا ہے' ''ظھراء'' نہیں فرمایا' حالانکہ یہ ملائکہ جو جمع ہے اس کی خبر ہے؟

جواب اوّل یہ فرد ہے جمع کے قائم مقام ہے جیسے گزر چکا ہے۔

جواب ثانی ''ظھیر'' اسم ہے' مصدر کے وزن پر جیسے زمیل' دبیب' ضلیل وغیرہ۔ اور مصدر میں واحد' تثنیہ و جمع برابر ہوتے ہیں۔

جواب ثالث فعیل کے وزن میں واحد' تثنیہ اور جمع برابر ہوتے ہیں' دلیل یہ ہے ''عَنِ الیمین وعن الشمال قعید''

سوال یہ جملہ "بَعْدَ ذٰلِكَ" ملائکہ کی اور ان کی نصرت کی عظمت بتانے کے لئے ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت زیادہ عظیم ہے؟

جواب ملائکہ کی نصرت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہی نصرت میں سے ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کے ذریعہ اپنی نصرت کو ان کے فضل وشرف کی وجہ سے باقی تمام وجوہِ نصرت پر ترجیح دی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام فرشتوں کے ذریعہ نصرت فرمانا اکیلے جبریل یا صرف نیک مومنین کے ذریعہ نصرت فرمانے سے زیادہ عظیم ہے۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: "عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ" الآیۃ (اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلہ ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں۔۔۔) اس آیت میں عورتوں کو ان صفات مذکورہ کے ساتھ موصوف کر کے ان کے لئے خیریت (اچھی ہونا) ثابت کی گئی ہے' اگر ان کی خیریت ان صفات کے ساتھ متصف ہونے کی بناء پر ہے تو یہ اس وقت ممکن ہے جب ازواج مطہراتؓ میں یہ صفات موجود نہ ہوں حالانکہ یہ صفات ازواجِ مطہرات میں بھی موجود تھیں؟

جواب اس سے مراد ہے حضورؐ کی رضا کی اتباع اور آپؐ کے قلب مبارک کے خیال رکھنے میں تم سے اچھی ہوں بایں ہمہ وہ ان صفات کے ساتھ بھی متصف ہوں جو دونوں میں مشترک ہیں۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ تمام صفات کو واؤ کے بغیر ذکر کیا گیا مگر "ثیبات" اور "ابکار" کے درمیان واؤ لایا گیا ہے؟

جواب کیوں کہ یہ دونوں متضاد صفات ہیں جو باقی صفات کے اجتماع کی طرح عورتوں میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ان میں واؤ لانا ضروری ہوا' اور اس کو واؤ ثمانیہ قرار دینا غلطی ہے کیونکہ واؤ ثمانیہ اگر کلام میں حذف کر دی جائے تو کلام فاسد نہیں ہوتا' جبکہ یہ ایسا نہیں ہے۔

سوال یہ صفات مقامِ مدح میں ذکر کی گئیں ہیں' لہٰذا ان کے ثیبہ ہونے میں کونسی مدح ہے؟۔

جواب ثیبہ (بیوہ) ہونا بھی ایک لحاظ سے قابلِ مدح ہے' کیونکہ ثیبہ بھی بعض مصالح کی وجہ سے قابلِ رغبت ہوتی ہے اور تجربہ و عقل میں بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور بکارت (کنواری ہونا) بھی ایک اعتبار سے قابلِ مدح ہے کیونکہ وہ بہت پاک و پاکیزہ ہوتی ہے۔ اور اس کی طرف رغبت اور ملاعبت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

سوال جب یہ فرمادیا کہ: "لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ" (نہیں نافرمانی کرتے اللہ کی جو حکم کرے ان کو) تو پھر آگے یہ کہنے کا کیا فائدہ ہے: "وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" (اور کرتے ہیں جو حکم

کیے جاتے ہیں)؟

جواب بعض کہتے ہیں کہ پہلے امر سے مراد عبادت وطاعات کا امر ہے اور دوسرے امر سے مراد اہلِ دوزخ کو عذاب دینے کا امر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دوسرا امر تاکید کے لئے ہے۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ: ''تَوْبَةً نَّصُوْحًا'' (توبہ خالص) فرمایا ہے' یوں کیوں نہیں فرمایا: ''تَوْبَةً نَصُوْحَةً''؟

جواب اس لئے کہ فعول' مبالغہ کے اوزان میں سے ہے جس میں مذکر ومؤنث دونوں برابر ہیں' جیسے کہتے ہیں: ''امرأة صبور وشکور'' وغیرہ۔

سوال جب یہ فرمادیا کہ: ''كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ'' (وہ دونوں دو بندوں کے نکاح میں تھیں) تو پھر آگے یہ فرمانے کی ضرورت کیا ہے: ''مِنْ عِبَادِنَا'' (ہمارے بندوں میں سے)؟

جواب اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان دونوں کی اپنی طرف تشریف وتخصیص کی نسبت سے مدح وثناء ثابت ہوئی۔ جیسے: ''وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' ہے۔ نیز جیسے: ''فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ'' ہے۔ یہ معنی مقصود میں مبالغہ ہے' اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خود اس کا نیک ہونا کام آئیگا' دوسرے کا نیک ہونا کام نہیں آئے گا' اگرچہ وہ دوسرا نیکی اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے اعلیٰ درجہ پر ہو۔

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ یوں ارشاد فرمایا: ''وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ'' (اور تھی فرمانبرداروں میں سے) یوں نہیں فرمایا: ''مِنَ الْقَانِتَاتِ'' (فرمانبردار عورتوں میں سے)؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ وہ فرمان بردار قوم میں سے تھیں یعنی اہلِ اطاعت میں سے تھیں۔ گویا یوں فرمایا: ''وكانت من بنات الصالحين'' یعنی نیک لوگوں کی بیٹیوں میں سے تھیں۔

جواب ثانی جب اللہ تعالیٰ نے ان کی نذر کو قبول فرمایا اور ان کو مردوں والا مرتبہ عطا فرمایا جو نذر کے قابل ہوا کرتے تھے تو ان کے ساتھ بعض موقعوں پر مذکر والا معاملہ کیا' جیسے فرمایا: ''وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ'' نیز فرمایا: ''وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ'' یا پھر فواصل کی رعایت رکھنے کے لئے ایسا فرمایا ہے۔

سورۃ الملک

سوال ارشادِ عالی ہے: ''الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ'' (جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو) موت کو حیات پر مقدم کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب موت کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مقدم کیا کہ موت اوّلاً پیدا کی گئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں: اس سے مراد دنیا میں موت کو اور آخرت میں حیات کو پیدا کرنا ہے' اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس سے مراد حیات فی الدنیا ہے تو موت اس پر مقدم ہے کیونکہ ارشادِ ربانی ہے: "وَكُنتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ"

سوال اس آیتِ کریمہ سے کیا مراد ہے: "مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ" (نہ دیکھے گا تو بیچ پیدائش رحمٰن کے کوئی خلل) جب کہ ہم اس کی صنعت میں عظیم تفاوت دیکھتے ہیں' کیونکہ تمام اضداد بھی اس کے پیدا کردہ ہیں اور ان میں بھی تفاوت ہے۔ تمام آسمانوں میں بھی چھوٹے بڑے ہونے اور بلند و پست ہونے کے اعتبار سے تفاوت ہے؟۔

جواب یہاں تفاوت سے مراد آسمانوں کی پیدائش میں کوئی خلل عیب و نقص ہے' جس کی تائید اس سے ہوتی ہے: "فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُورٍ" یعنی سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔

سوال ارشادِ باری ہے: "ءَاَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ" (یا نڈر ہو گئے تم اس سے جو کہ آسمان میں ہے) اللہ تعالیٰ نہ آسمان میں ہے اور نہ غیرِ آسمان میں' اللہ کی ذات تو ہر مکان سے منزہ ہے؟۔

جواب اول اس کا مطلب ہے: "من ملكوته في السماء" یعنی اس ذات سے بے خوف ہو گئے ہو جس کی بادشاہت آسمانوں میں ہے' اس لئے کہ آسمان اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا مسکن' اس کے عرش و کرسی اور لوحِ محفوظ کا محل ہے۔ آسمان سے ہی خدائی فیصلے' کتابیں اور اوامر و نواہی اترتے ہیں۔

جواب ثانی لوگ تشبیہ کے معتقد تھے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ آسمان میں ہیں اس لئے ان کے اعتقاد کے مطابق ان سے خطاب کیا گیا ہے۔

سورۃ القلم

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "وَلَا يَسْتَثْنُونَ" (انشاء اللہ بھی نہ کہتے تھے) کیا وجہ ہے کہ شرط کو استثناء کا نام دیا ہے؟

جواب اس لئے کہ وہ اس کے معنی میں ہے' اس لئے کہ "لا خرجن ان شاء الله" اور "لا اخرج الا ان يشاء الله" دونوں کا معنی ایک ہے' حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں: اس سے حقیقۃً استثناء مراد ہے' یعنی وہ مساکین کے حق کو مستثنیٰ کرتے تھے' لیکن جمہور علماء پہلی بات کے قائل ہیں۔

سوال ارشادِ الٰہی ہے: ”قَالَ اَوۡسَطُهُمۡ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ لَوۡلَا تُسَبِّحُوۡنَ“ (ان میں جو اچھا آدمی تھا وہ کہنے لگا کہ کیوں میں نے تم کو کہا نہ تھا اب تسبیح کیوں نہیں کرتے) اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کے اوسط (کسی قدر اچھا آدمی) نے استثنا کو تسبیح کا نام دیا ہے؟ کیونکہ اس کا معنی ہے کہ تم استثناء کیوں نہیں کرتے ہو؟

جواب اوّل استثناء کو تسبیح کے ساتھ موسوم اس لئے کیا کہ یہ دونوں معنی تعظیم میں شریک ہیں۔ اس لئے کہ استثناء کہتے ہیں کہ اس کے سپرد کرنا اور اس بات کا اقرار کرنا کہ کوئی شخص اس کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ اور تسبیح کا معنی ہوتا ہے اس کو ہر برائی سے منزّہ قرار دینا۔

جواب ثانی ان کا استثناء سبحان اللہ کہنا تھا۔

جواب ثالث اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنی جانوں اور مالوں کو فقراء کے حق سے پاک کیوں نہیں کرتے؟

سوال اس کا کیا مطلب ہے: ”وَقَدۡ كَانُوۡا يُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ“ (یہ لوگ سجدہ کی طرف بلائے جایا کرتے تھے) حالانکہ آخرت میں مکلّف بنانا تو نہیں ہوگا؟

جواب ان کو مکلّف کے طور پر نہیں بلایا جائے گا' البتہ دنیا میں ترکِ سجود پر توبیخ وتشدید ہوگی۔

سوال یہ کیسے فرمایا کہ یہ لوگ سجدہ کی طرف بلائے جاتے تھے حالانکہ وہ نماز کی طرف بلائے جاتے تھے' کیونکہ آیت سے مراد یہ ہے کہ جب مؤذن ”حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ“ کہتا تھا تو اس کی اذان سے وہ جماعت کے لئے بلائے جاتے تھے؟۔

جواب اللہ تعالیٰ نے نماز کو سجدہ سے تعبیر کیا ہے' اس لئے کہ سجدہ بھی نماز کا ایک رکن ہے' بلکہ نماز کا رکنِ اعظم اور نماز کی اصل غایت ہے۔ جیسا کہ نماز کو رکوع اور قرآن سے بھی (بعض جگہوں پر) تعبیر کیا گیا ہے۔

سوال یہ کیسے فرمایا: ”وَهُمۡ سٰلِمُوۡنَ“ (اور وہ صحیح سالم تھے) حالانکہ نماز کے واجب ہونے کے لئے صحت شرط نہیں ہے؟۔

جواب نماز باجماعت کے لئے نکلنے کا وجوب صحت کے ساتھ مشروط ہے' یہی مراد ہے۔

سورۃ الحاقۃ

سوال کیا وجہ ہے کہ ”بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ“ فرمایا ہے: یوں نہیں فرمایا: ”بِرِيۡحٍ صَرۡصَرَةٍ“ جیسے یہ فرمایا ہے: ”عَاتِيَةٍ“ حالانکہ یہ مؤنث کی صفت ہے؟۔

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ ”صرصر“ ایسا وصف ہے جو ”ریح“ کے ساتھ مخصوص ہے کسی اور

کے ساتھ یہ موصوف نہیں ہوتا ہے' لہٰذا یہ حائض' طامث اور حامل جیسے الفاظ کے مشابہ ہوا۔ بخلاف "عاتیۃ" کے کیوں کہ یہ "ریح" کے علاوہ دوسرے اسماء مؤنثہ کے ساتھ موصوف ہوتا ہے۔

سوال ارشاد فرمایا: "فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ" (سوتو اس قوم کو گرا ہوا دیکھتا ہے) حالانکہ نبی ﷺ نے نہ ان کو دیکھا اور نہ وہ ان کو اس میں دیکھتے تھے؟۔

جواب "فِیْھَا" ظرف ہے "صَرْعٰی" کا' نہ کہ "فَتَرٰی" کا۔ اور رؤیت سے مراد علم اور اعتبار کی رؤیت ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہو جائے گا کہ پس تو ان کو ان راتوں اور دنوں میں ہمارے باخبر کرنے سے گرا ہوا جان لینا کہ گویا تو ان کو دیکھ رہا ہے۔

سوال اس آیت سے کیا مراد ہے: "فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ........ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ" (پھر جب صور میں یکبارگی پھونک ماردی جائیگی۔۔۔۔اس دن حساب کے واسطے تم پیش کیے جاؤ گے) یہاں نفخۂ اولیٰ مراد ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد عالمِ علوی و سفلی کے فساد کا ذکر ہے۔ حالانکہ "عرض" (دربارِ الٰہی میں پیشی) تو نفخۂ ثانیہ کے بعد ہوگا' اور ان دو نفخوں کے مابین اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق طویل زمانہ بھی ہوگا' لہٰذا یہ کیسے فرمایا: "يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ" یعنی اس دن تم پیش کیے جاؤ گے؟۔

جواب "یوم" کو اس وسیع وقت کی جگہ میں رکھا گیا ہے جس میں دونوں نفخے وقوع پذیر ہوں گے اور ان کے مابعد کے امور واقع ہوں گے۔

سوال اس کا کیا معنی ہے: "إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ" (تحقیق میں جانتا تھا کہ میں ملوں گا اپنے حساب سے)؟

جواب "ظننت" "تیقنت" کے معنی میں ہے' ظن کا لفظ یقین کے معنی میں بھی آتا ہے' جیسے "الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ"۔

سوال اس جگہ ارشاد فرمایا: "فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ وَّلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ" (سو آج اس شخص کا نہ کوئی دوست دار ہے اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے بجز زخموں کے دھوون کے) ایک دوسری جگہ پر فرمایا: "إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَثِيمِ" (بے شک زقوم کا درخت بڑے مجرم کا کھانا ہوگا) اور دوسری جگہ میں یوں فرمایا ہے: "ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ لَآكِلُونَ مِن شَجَرٍ مِّن زَقُّومٍ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ" (پھر اے گمراہو تکذیب کرنے والو تم زقوم کے درخت سے کھاؤ گے پس اس سے اپنے پیٹوں کو بھرو گے) اور ایک دوسرے مقام پر یہ فرمایا ہے: "أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ" (یہ لوگ نہیں کھاتے

اپنے پیٹوں میں مگر آگ) ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟

جواب اول اس کا معنی ہے: "الا من غسلین وما اشبهه" یعنی زخموں کے دھوؤں سے اور اس کے مشابہ چیزوں سے۔ یا غسلین کو ہر تکلیف دہ اور برے کھانے کی جگہ رکھا گیا ہے۔

جواب ثانی عذاب مختلف انواع کا ہوگا۔ اور اہلِ عذاب کے مختلف طبقات ہوں گے، بعض معذّبین زقوم کھانے والے ہوں گے، بعض غِسلِیْن اور بعض ضَرِیع کھائیں گے۔

سوال اس کا کیا معنی؟ "اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ" یعنی یہ قرآن جبریل علیہ السلام کا قول ہے، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے نہ کہ جبریلؑ کا؟

جواب اس کا معنی اکثر علماء کے نزدیک یہ ہے کہ اس سے مراد نبی ﷺ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ یہ قرآن بوجہ رسالت منجانب اللہ کہتے ہیں نہ کہ اپنی جانب سے جیسے تم خیال کرتے ہو۔

سوال ارشاد ہوتا ہے: "فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ" (پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا) یہاں مفرد کو جمع کے ساتھ موصوف کیا ہے؟

جواب اس طرح کا سوال و جواب سورۃ البقرۃ میں گزر چکا ہے۔

سورۃ المعارج

سوال ارشادِ خداوندی ہے: "اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا" (تحقیق آدمی پیدا کیا گیا ہے بے صبر) حالانکہ پیدا ہونے کی حالت میں وہ ان صفات کے ساتھ موصوف نہ تھا جو ذکر کی گئیں ہیں؟۔

جواب "هَلُوْعًا" حالِ مقدرہ ہے، معنی یہ ہے کہ اس میں بے صبری مقدر کی گئی ہے۔ جیسے "محلقین رؤسکم" حالانکہ وہ دخولِ مکہ کے وقت سر منڈے ہوئے نہیں تھے۔

سوال ان دو آیتوں میں کیا فرق ہے: (۱) "اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ" (وہ جو اوپر نماز اپنی کے ہمیشہ رہنے والے ہیں)۔

(۲) "وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ" (اور وہ لوگ کہ وہ اوپر نماز اپنی کے محافظت کرنے والے ہیں)۔

جواب دوام سے مراد مواظبت اور ہمیشہ کے لئے ملازمت (پابندی) ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ان کا نماز میں اس طرح سکون سے کھڑا ہونا ہے کہ دائیں بائیں التفات نہ کریں۔ واختاره الزجاج۔ اور زجاج کہتا ہے کہ دائم بمعنی ساکن ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے، حضور ﷺ نے ماءِ دائم (ٹھہرے ہوئے پانی) میں پیشاب کرنے سے منع

فرمایا ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ کلمہ "علی" اس معنی کی نفی کرتا ہے کیونکہ یوں نہیں کہا جاتا ہے:"هوفی صلاته ساکن" بلکہ یوں کہتے ہیں:"هوصلاته ساکن"اور محافظت سے مراد نماز کو اس کے جملہ آداب وسنن کا خیال رکھتے ہوئے اکمل طریقہ سے ادا کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ دوام کا تعلق نفسِ صلوٰۃ سے ہے اور محافظت کا تعلق احوالِ صلوٰۃ سے ہے۔

سورۃ نوح

سوال اس سے کیا مراد ہے:"وَيُؤَخِّرُكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى" (اور تم کو وقت مقرر تک مہلت دے گا) اگر اس تاخیر سے مراد ان کو اس مدت میں مہلت دینا ہے جو ازل میں ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے تو یہ محال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا" نیز ارشاد ہے:"اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ" اور اگر اس سے مراد ان کو اس مدت کے آنے تک مہلت دینا ہے جو ان کے لئے ازل میں مقدر ہوئی ہے تو پھر ان کی وجہ تخصیص میں کیا فائدہ ہے؟ وہ اور دوسرے سب اس میں برابر ہیں کہ ان سے وجودِ ایمان مقدر ہو یا عدمِ ایمان؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بتقدیر ایمان تمہاری مدتوں کی انتہاء تک تم سے عذاب مؤخر رکھیں گے۔ چنانچہ وہ دنیا میں عذاب نہیں دیں گے جیسے تمہارے علاوہ دوسری قوموں کو دنیا میں عذاب دیا۔

جواب ثانی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ اگر یہ لوگ ایمان لے آئے تو ان کو ہزار برس کی عمر دیں گے اور اگر ایمان نہ لائے تو پانچ سو برس کے پورا ہونے پر ہی عذاب دے کر ہلاک کر دیں گے چنانچہ ان سے کہا گیا کہ تم ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ اس مدت تک عذاب مؤخر کر دیں گے۔

سوال ان کو استغفار کا حکم کیسے دیا گیا، استغفار تو مومن کی طرف سے درست ہوتا ہے نہ کہ کافر کی طرف سے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے رب سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے سے استغفار کرو۔

سوال اس ارشاد کا کیا مطلب ہے:"وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا" (اور اللہ نے اُگایا تم کو زمین سے ایک طرح کا اگانا) حیوان تو نبات کی ضد ہے اس پر نبات ہونے کا اطلاق کیسے کیا گیا؟

جواب یہ اصل میں بواسطۂ آدمؑ زمین سے نکالنے اور پیدا کرنے سے استعارہ ہے۔

سوال حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس قول سے اپنی قوم کے خلاف کیسے بد دعا فرمائی: "وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا" (اور مت زیادہ کر الٰہی ظالموں کو مگر گمراہی میں) حالانکہ حضرت نوحؑ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ہی مبعوث فرمائے گئے تھے؟

جواب حضرت نوح علیہ السلام نے بد دعا اس وقت فرمائی جب اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بتا دیا کہ یہ لوگ اب ایمان لانے کے نہیں۔

سوال اس سے کیا مراد ہے: "وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا" (اور نہ جنیں گے مگر بدکار کفر کرنے والا) حضرت نوحؑ نے ان کو بحالتِ ولادت ہی کفر و فجور کے ساتھ موصوف کیا' یہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی؟۔

جواب ان کے جو اولاد بھی پیدا ہوگی وہ بالغ ہونے کے بعد کفر و فجور ہی کرے گی یہ بات حضرت نوحؑ کو باطلاعِ خداوندی معلوم ہوئی تھی یا حضرت نوحؑ نے ان کو مآل کے اعتبار سے کفر و فجور کے ساتھ موصوف کیا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بتانے پر کیا۔

سورۃ الجن

سوال اس کا کیا سبب ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں: "وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰہِ" (اور یہ کہ جس وقت کھڑا ہوا بندہ خدا کا) "عبداللہ" فرمایا' رسول اللہ یا نبی اللہ نہیں فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد حضور ﷺ ہی ہیں؟۔

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ اس مقام میں ان کی طرف بھیجے نہیں گئے تھے' بلکہ وہ لوگ اتفاق سے حضورؐ کے پاس سے گزرے تھے' اگر اللہ تعالیٰ رسول اللہ یا نبی اللہ کہتے تو اس سے یہ وہم ہوتا کہ ان لوگوں کی طرف رسالت کی ادائیگی کا قصد کیا گیا ہے۔

سوال اس سے کیا مراد ہے: "قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَہٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا" (آپ کہئے کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ نزدیک ہے یا میرے پروردگار نے اس کے لئے کوئی مدت دراز مقرر کر رکھی ہے) جب کہ "اَمَد" غایت کا نام ہے اور غایت زمانہ قریب اور زمانہ بعید دونوں ہوتی ہیں' اس کی تائید اس ارشادِ خداوندی سے ہوتی ہے: "تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَہَا وَ بَیْنَہٗٓ اَمَدًا بَعِیْدًا"؟

جواب "قریب" سے مراد حال ہے' اور "امد" سے مراد مدت ہے خواہ قریب ہو یا بعید

سورۃ المزمل

سوال ارشاد خداوندی ہے:"اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا" (تحقیق ہم اب ڈالیں گے اوپر تیرے بات بھاری) قرآن حکیم کے "ثقل" کے ساتھ موصوف ہونے کا کیا معنی ہے؟

جواب اس کے چند مطلب ہیں: ایک یہ ہے کہ وحی کا نزول آنحضرت ﷺ پر ثقل کا باعث ہوتا تھا حتی کہ سردی کے دنوں میں بھی آپؐ پسینہ مبارک سے شرابور ہو جاتے تھے۔ دوسرا یہ کہ قرآن حکیم کے تکلیفی احکام پر عمل شاق اور ثقیل ہے۔ تیسرا یہ کہ ثقل سے مراد قیامت کے دن میزانِ عمل میں ثقل ہے' چوتھا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد منافقین پر ثقل ہے' پانچواں مطلب یہ ہے کہ یہ ایسا کلام ہے جو وزن و ثقل رکھتا ہے۔ جیسے عقلمند آدمی کے لئے کہتے ہیں: رزین راجح' چھٹا معنی یہ ہے کہ ثقیل سے مراد ہے کہ حقیر نہیں ہے کیونکہ حقیر وادنی کلام خفیف ہوتا ہے۔

سوال ارشادِ ربانی ہے:"اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ" (آسمان پھٹ جانے والا ہے ساتھ اس کے) حالانکہ "السماء" مؤنث ہے تو اس اعتبار سے "منفطرۃ بہ" ہونا چاہئے؟

جواب اول یہ نسبت پر محمول ہے' یعنی ذات انفطار۔

جواب ثانی "السماء" کا ذکر چھت کے معنی میں ہے۔

جواب ثالث اس کا معنی ہے آسمان ایسی شے ہے جو پھٹ جانے والی ہے۔

جواب رابع "السماء" مذکر ومؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

سوال ارشاد فرمایا:"وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ" (اور اللہ اندازہ کرتا ہے رات کو اور دن کو جانا یہ کہ ہرگز نہ نباہ سکو گے تم اس کو) حالانکہ یوں ہونا چاہئے:"ان لن تحصوھما" یعنی تم ہرگز دن ورات کی ساعات کی مقدار نہیں جان سکتے؟

جواب ضمیر محذوف مصدر کی طرف راجع ہے: معنی یہ ہے کہ تم ان دونوں کی مقدار ہرگز شمار نہیں کر سکتے۔

سورۃ المدثر

سوال "فَذٰلِكَ یَوْمَئِذٍ یَّوْمٌ عَسِیْرٌ" (پس وہ اس دن دن بھاری ہے) فرما دینے کے بعد پھر اس ارشاد کا کیا فائدہ ہے"غَیْرُ یَسِیْرٍ" (نہیں آسان)؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دن ایسا سخت ہوگا کہ پھر اس کے آسان ہو جانے کی امید نہ کی

جائے۔ جیسے دنیا میں سختی کے بعد آسانی کی امید کی جاتی ہے۔

جواب ثانی یہ ماقبل کی تاکید ہے۔

سوال اس ارشادِ الٰہی میں تکرار کا کیا فائدہ ہے: ''لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ'' (نہیں باقی رکھتی اور نہیں چھوڑتی) جب کہ دونوں کا معنی ایک ہے؟۔

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ وہ آگ کافروں کا گوشت باقی نہ رہنے دے گی اور ان کی ہڈیاں نہ چھوڑے گی۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ وہ آگ ان کو زندہ بھی باقی نہ رکھے گی اور موت دے کر بھی نہ چھوڑے گی۔

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ''وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ'' (اور نہ شک کریں وہ لوگ کہ دیئے گئے ہیں کتاب اور ایمان والے) جب کہ اس سے پہلے ان کا وصف بیان ہوا کہ تاکہ اہلِ کتاب سننے کے ساتھ ہی یقین کرلیں اور ایمان والوں کا ایمان بڑھ جائے اس سے ان کا شک نہ کرنا بھی معلوم ہوگیا تھا کیوں کہ تمام جملوں کا تعلق داروغۂ جہنم کی تعداد کے ساتھ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب حضورﷺ کی بتائی ہوئی بات کو اپنی کتاب تورات کے مطابق پاکر یقین کرلیں کہ آنحضرتؐ کی بات حق ہے اور اِس سے اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والوں کا اپنے نبیؐ اور قرآن پر ایمان بھی بڑھ جائے کہ آنحضرتؐ نے جو کچھ ان کو بتایا وہ ان کی کتاب کے مطابق ہے؟ بہر حال! جب سابقہ جملوں سے ان کا عدمِ ارتیاب معلوم ہوگیا ہے تو پھر دوبارہ اس ارشاد کے فرمانے سے کیا فائدہ ہے؟۔

جواب اس کا فائدہ تاکید بھی ہے اور ان کے علاوہ دوسرے شک کرنے والوں کی حالت پر تعریض بھی ہے یعنی کفار و منافقین کی حالت پر۔ چنانچہ معنی ہوں گے کہ یہ لوگ بھی شک نہ کریں جیسے ان لوگوں نے شک کیا تھا۔

سوال اس سے کیا مراد ہے: ''مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا'' (کیا ارادہ کیا ہے اللہ نے ساتھ اس مثال کے) یعنی جہنم کے داروغوں کی تعداد کو انیس میں منحصر کرنے سے اللہ کا کیا مقصود ہے ظاہر یہ ہے مثال تو نہیں ہے؟۔

جواب اول یہ استعارۃً ہے عجیب وغریب کلام سے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عجیب و غریب عدد سے کس چیز کا ارادہ کیا ہے؟ اور اس میں کونسی حکمت ہے کہ جہنم کے داروغوں کی تعداد انیس مقرر کی ہے، بیس نہیں کی۔

جواب ثانی یہاں "مثل" "صفت کے معنی میں ہے۔ جیسے اس فرمانِ الٰہی میں ہے "مثل الجنة التی وعدالمتقون" "معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس عدد سے جہنم کے داروغوں کی کس صفت کا ارادہ کیا ہے؟

سوال ان دو جملوں میں تطبیق کس طرح ہوگی' پہلا جملہ ہے: "يَتَسَاءَلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِينَ" (پوچھتے ہوں گے مجرموں سے) اور دوسرا جملہ ہے "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ" (کیا چیز لے گئی تم کو بیچ دوزخ کے) کیوں کہ پہلے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں کے بارے سوال ہوگا اور دوسرے جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرموں سے سوال ہوگا۔ ہونا یوں چاہیے کہ وہ مجرموں سے پوچھیں گے یا وہ آپس میں پوچھیں گے کہ ان کو کس چیز نے دوزخ میں داخل کیا' یعنی اہلِ جنت ایک دوسرے سے جہنمیوں کے بارے میں پوچھیں گے؟

جواب اول "مَاسَلَكَكُمْ" ان کے آپس کے سوال کا بیان نہیں ہے' بلکہ یہ ان کے قول کی حکایت ہے جن سے مجرموں کے بارے میں سوال کیا گیا ہوگا' یعنی جب جنتیوں کے مابین مجرمین کی بات چل رہی ہوگی تو مسئولین جواب دیں گے۔ اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ مومنین کو ان کے گناہوں کے بقدر جہنم کا عذاب دینے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیں گے تو بعض اصحابِ یمین' مجرمین کی حالت اور ان کے خلود کا سبب ان سے پوچھیں گے تو مسئولین کہیں گے: ہم نے ان سے پوچھا تھا کہ "مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ" الآیة اور جبکہ یہ مومنین جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہونے کے بعد اصحابِ یمین بن گئے ہونگے۔

جواب ثانی اصحابِ یمین سے مراد ملائکہ علیہم السلام ہیں۔

جواب ثالث اطفال (بچے) ہیں' اس لئے کہ وہ اپنے گناہوں کے بدلہ گروی نہیں رکھے جائیں گے کیونکہ وہ گناہوں سے معصوم تھے۔

سورۃ القیامۃ

سوال اس فرمانِ مبارک کا کیا معنی ہے: "فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ" (پس جس وقت پڑھیں ہم اس کو پس پیروی کر پڑھنے ہمارے کی) جب کہ نبی کریم ﷺ پر پڑھنے والے حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ پس جب ہم اس کو آپ کے سینہ میں جمع کر دیں۔ اس کی تائید پچھلی آیت: "إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ" سے ہوتی ہے یعنی بے شک ہمارے ذمے ہے آپ کے قلب

میں اس کا جمع کر دینا پس آپ اسے جلدی نہ پڑھیں قبل اس کے کہ اس کا حفظ پورا ہو۔

جواب ثانی قراءت (پڑھنا) کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے کی گئی ہے کہ جبریل علیہ السلام بھی اللہ کے حکم سے ہی اسے پڑھتے تھے' جیسا کہ محض حکم کی وجہ سے بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرف افعال کو منسوب کر دیا کرتے ہیں' حالانکہ ان افعال کو براہِ راست اور بلا واسطہ اس کے وزراء اور متبعین بجالانے والے ہوتے ہیں۔

سوال اس سے کیا مراد ہے: "وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (کتنے چہرے اس دن تازے ہیں طرف پروردگار اپنے کے دیکھنے والے ہیں) حالانکہ دیکھنے کے ساتھ آنکھیں موصوف ہوتی ہیں اور ادراک آنکھ کا کام ہے نہ کہ چہرے کا؟۔

جواب بعض علماء کہتے ہیں کہ یہاں "وجوہ" سے مراد چہرہ نہیں ہے جو کہ ایک عضوِ جسم ہے بلکہ قیامت کے دن کے اہلِ سعادت و وجاہت مراد ہیں۔ میرے خیال میں یہ جواب اس ارشادِ خداوندی کے مطابق نہیں ہے جو یہ ہے: "وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ ' بَاسِرَةٌ" (اور بہت سے چہرے اس روز بدرونق ہوں گے) کیوں کہ لفظ بدرونقی کے ساتھ چہرے ہی موصوف ہوتے ہیں' جو کہ عضوِ جسم ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کی تائید کہ اس آیت سے معروف اعضاء مراد ہیں یہ ارشادِ باری بھی ہے: "تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ"

سوال جب نطفہ منی ہی کو کہتے ہیں تو اس ارشادِ مبارک میں: "اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ" (کیا نہ تھا ایک قطرہ منی) نطفہ کہنے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب یہاں "نطفة" قطرہ کے معنی میں مستعمل ہے کیونکہ لفظِ نطفہ کا اطلاق ماءِ قلیل و کثیر دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسے حدیثِ مبارک ہے: "حتى يسير الراكب بين النطفتين لا يخشى جوازا" اس سے مراد مشرق و مغرب کا بحر ہے۔

سورۃ الدھر

سوال ارشاد ہوتا ہے: "مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ" (مخلوط نطفے سے) اس کی کیا وجہ ہے کہ مفرد (نطفة) کو جمع (امشاج) کے ساتھ موصوف کیا ہے' کیونکہ امشاج مشج کی جمع ہے بمعنی مخلوط کرنا' اور مراد یہ ہے کہ انسان مرد اور عورت کے مخلوط نطفہ سے پیدا کردہ ہے؟

جواب زمخشریؒ فرماتے ہیں: امشاج مفرد ہے' جمع نہیں ہے۔ جیسے کہتے ہیں: "برمة اعشار' بيت اكباش' برأهدام" اور دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ اس سے موصوف نطفہ کے اجزاء اور

ابعاض ہیں۔

سوال اس آیت کا کیا مطلب ہے: "نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَهُ سَمِيعًا بَصِيرًا" (آزمائش کیا چاہتے ہیں ہم اس کو پس کیا ہم نے اس کو سننے والا دیکھنے والا) حالانکہ آزمائش اس کو سمیع و بصیر بنانے کے بعد ہوتی ہے؟۔

جواب اول فراء کہتے ہیں: عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے اصل یوں ہے: "فجعلنه سميعًا بصيرًا لنبتليه"۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو ایک حالت سے دوسری حالت کی جانب منتقل کرتے ہیں یعنی پہلے نطفہ پھر علقہ پھر مضغہ۔ چنانچہ اس کو استعارۃً ابتلاء کہا گیا۔

سوال اس کا کیا معنی ہے: "قَوَارِيْرَا۟ قَوَارِيْرَ مِنْ فِضَّةٍ" (شیشے کے شیشے کہ ہیں بنائے ہوئے چاندی کے) جب کہ "قواریر" اس چیز کا نام ہے جو شیشہ سے بنائی جاتی ہے؟۔

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ وہ آبخورے چاندی کے بنے ہوں گے اور وہ چاندی کی سفیدی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ شیشہ کی طرح صاف وشفاف ہوں گے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں: دنیا کی چاندی میں آر پار پانی نظر نہیں آتا خواہ اسے مکھی کے پر کے برابر بنادیا جائے جب کہ جنت کے قواریر جو چاندی کے ہوں گے اس کے اندر کی چیز باہر سے نظر آئے گی۔

سوال "كَانَتْ قَوَارِيْرَ" کا کیا معنی ہے؟

جواب اس کا معنی ہے کہ بنے ہوں گے جیسے یہ ارشادات ہیں "كُنْ فَيَكُوْنُ" اور "كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا"

سوال اللہ تعالیٰ نے "وِلْدَان" (لڑکوں) کو "لؤلوء منثور" (بکھرے موتی) کے ساتھ کیوں تشبیہ دی ہے؟۔

جواب اول اللہ تعالیٰ نے ان کو "لؤلوء منثور" کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان کو اس لؤلو منثور" کے ساتھ تشبیہ دینا ہے جس میں تا حال سوراخ نہ کیا گیا ہو کیونکہ جب اس میں سوراخ کردیا جائے تو اس کی صفائی اور چمک کم ہوجاتی ہے اور ایسا موتی جو ابھی چھیدا نہ گیا ہو وہ منثور ہی ہوتا ہے۔

جواب ثانی اللہ تعالیٰ نے ان کو "لؤلو منثور" کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ "لؤلو منثور" منظوم کی بہ نسبت زیادہ حسین منظر پیش کرتا ہے جب اسے کسی بساط پر بکھیرا گیا ہو۔

جواب ثالث "لولو منثور" کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی ہے کہ وہ ولدان (غلام) اہل جنت کی مجالس اور منازل میں اسی طرح منتشر اور پھیلے ہوئے ہونگے جس کی دلیل یہ ارشاد ہے "وَیطوف علیھم" اگر وہ ایک ہی جگہ ایک قطار میں کھڑے ہوتے تو پھر منظوم کے ساتھ تشبیہ دی جاتی۔

سوال ارشاد ہے: "وَحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ" (اور پہنائے جائینگے کنگن چاندی کے) حالانکہ یہ دنیا میں عورتوں اور باندیوں کی عادت ہے؟

جواب اول قرآن کے اوّل مخاطب اہلِ عرب ہیں، عرب کے شاہی مردوں اور عورتوں کی یہ عادت ہے کہ وہ ایک ساتھ یا الگ الگ سونے اور چاندی کا زیور پہنا کرتے ہیں۔

جواب ثانی اگر چہ چاندی نام کے اعتبار سے دنیا و آخرت دونوں میں مشترک ہے لیکن دونوں جہانوں کی چاندیوں میں بڑا بُعد اور فرق ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آخرت کی مثقال بھر چاندی دنیا و مافیہا سے کہیں بہتر ہے"۔ اسی طرح جنت کے استبرق اور سندس وغیرہ کا حال ہے۔

سوال اس میں دارِ آخرت کے لئے کیا شرف وفضل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنے بندوں کو "شرابِ طہور" (پاکیزہ شراب) پلائے گا؟ جبکہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ پلایا ہوگا، جس کی دلیل یہ ہے: "وَاَسْقَیْنٰکُمْ مَّآءً فُرَاتًا" نیز جیسے: "وانزلنا من السماء ماء فاسقینا کموہ"؟

جواب اس سے مراد بلا واسطہ ان کو پلانا ہے، پھر دونوں جہاں کی شرابوں، برتنوں اور مرتبوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

سوال اس آیتِ مبارکہ سے کیا مراد ہے؟: "وَلَا تُطِعْ مِنْھُمْ اٰثِمًا اَوْ کَفُوْرًا" (اور مت کہا مان ان میں سے گنہگار کا یا کفر کرنے والے کا) جب اس آیت میں ضمیر بالاتفاق مشرکینِ مکہ کی طرف راجع ہے تو پھر ان کو آثم اور کفور میں تقسیم کرنے کے کیا معنیٰ ہے؟ حالانکہ وہ سب کے سب آثم بھی تھے اور کفور بھی؟

جواب "آثم" سے مراد عتبہ بن ربیعہ ہے، کیونکہ وہ گناہوں میں پیش پیش تھا اور طرح طرح کے فسق وفجور کا مرتکب تھا، اور "کفور" سے مراد ولید بن مغیرہ ہے، کیوں کہ وہ غالی قسم کا کافر تھا اور کفر اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اگر چہ وہ دونوں آثم اور کافر تھے۔ اس آیت میں دراصل آپ کو ان کی اطاعت اور موافقت سے منع کیا گیا ہے کہ وہ آپ کو جس ترکِ دعوت کی طرف بلاتے ہیں آپ اس میں ان کا کہنا مانیں اور جس کفر وضلالت پر وہ جمے ہوئے ہیں اس میں ان کی موافقت نہ کریں۔

سوال اس کا کیا معنی کہ آثم اور کفور میں سے ایک کا کہنا نہ مانیں' یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ ان دونوں کا کہنا نہ مانیں؟

جواب اول بعض کہتے ہیں کہ یہاں پر ''اَو'' کلمۂ واوَ کے معنی میں ہے' جیسے اس فرمانِ الٰہی میں: ''اَوِالْحَوَایَا''۔

جواب ثانی جب یہ فرمایا کہ ان میں سے ایک کی بھی اطاعت نہ کرو تو یقینی سی بات ہے کہ یہ چیز ان دونوں کی اطاعت سے ممانعت پر لازمًا دال ہوگی' کیونکہ اگر یہ کہتے کہ ان دونوں کی اطاعت نہ کرو تو ممکن نہ تھا کہ آپؐ کے لئے ان دونوں میں سے ایک کی اطاعت جائز ہوتی۔ حالانکہ یہ مطلب نہیں ہے۔

سوال اس جگہ تو فرمایا ہے: ''وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ'' (اور ہم نے ان کے جوڑ بند مضبوط کئے) اور دوسری جگہ فرمایا: ''وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا'' (اور انسان کمزور پیدا کیا گیا) دونوں میں یکسانیت کیسے ہوگی؟

جواب حضرت ابن عباسؓ اور اکثر علماء فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اس میں کمزور ہے کہ وہ عورتوں سے صبر کرے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو باندی سے نکاح کی اجازت دی' جیسے اس آیت کا ماسبق اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام زجاجؒ فرماتے ہیں' اس کا معنی یہ ہے کہ انسان پر اس کی خواہشاتِ نفس غالب آجاتی ہیں اسی لئے انسان کو ضعف کے ساتھ موصوف کیا گیا۔ اور اس جگہ یہ فرمانا: ''وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ'' سو اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انسان کے جوڑ بند کو آپس میں رگوں اور پٹھوں کے ساتھ مضبوط کیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ''اَسْر'' سے مراد عُصعض (دم کی جڑ) ہے' کیوں کہ انسان قبر میں ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے مگر اس کی جڑ ریزہ ریزہ نہیں ہوتی ہے۔ امام مجاہدؒ فرماتے ہیں: ''اَسْر'' سے مراد بول و براز نکلنے کی جگہ ہے' کیونکہ وہ حاجت کے وقت ڈھیلی ہو جاتی ہے حتی کہ اس سے گندگی نکل جاتی ہے پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے سخت اور مضبوط ہو جاتی ہے۔

سورۃ المرسلات

سوال اس کا کیا معنی ہے؟ ''هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ'' الآية (یہ دن ہے کہ نہ بولیں گے) اس آیت میں اعتذار (عذر خواہی) کی نفی کی جارہی ہے' اور اعتذار' نطق (بولنا) سے ہی ہوتا ہے تو پھر نطق کی نفی کر دینے کے بعد اعتذار کی نفی کرنے میں کیا فائدہ ہے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دن ایسا ہوگا کہ جس میں وہ لوگ نہ ابتداءً مقبول عذر اور صحیح حجت کے ساتھ بول سکیں گے اور نہ بعد میں ان کو اعتذار کی اجازت ہوگی' کیوں کہ اسیر اور خوف زدہ مجرم عموماً فرطِ خوف و دہشت سے ابتداءً ہی عذر خواہی یا حجت بازی نہیں کر پاتا' لیکن جب اسے اظہارِ عذر یا بیانِ حجت کی اجازت مل جائے تو پھر اس کی زبان کھل جاتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی بافائدہ ہے۔

جواب ثانی اس معنی کی نفی ہے' یعنی وہ لوگ نہ ابتداءً عذر بیان کر سکیں گے اور نہ اجازت کے بعد۔

سوال پھر اس آیت سے کیا مراد ہے؟ ''یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ الظّٰلِمِیۡنَ مَعۡذِرَتُہُمۡ'' (اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کام نہ آئیگی) کیوں کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عذر کریں گے؟ پھر ماقبل کی آیت اور آیتِ ہٰذا میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟

جواب اس آیت میں ''ظالمین'' سے مراد بعض مسلمان ہیں۔ جبکہ ہم کفار کے بارے بحث کر رہے ہیں۔ مگر اس آیت کا آخر اس جواب کو کمزور بنا دیتا ہے' یعنی یہ ارشاد! ''وَلَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَلَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ''

سورۃ النباء

سوال ارشاد فرمایا: ''اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِہٰدًا'' (کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا) اس آیت کا ماقبل سے کیا ربط ہے؟

جواب جب کہ ''نباءِ عظیم'' (بڑا واقعہ) سے مراد جس کے متعلق وہ آپس میں سوال جواب کرتے تھے بعث بعد الموت تھی اور وہ اس کے منکر تھے اس لئے ان سے کہا گیا کہ کیا بعث و نشور کا وعدہ کرنے والے (اللہ تعالیٰ) نے یہ عظیم مخلوقات پیدا نہیں کیں جو اس کی قدرت علی البعث پر دلالت کرتی ہیں؟

سوال اگر آپ کے کہنے کے مطابق ''نباءِ عظیم'' سے مراد بعث و نشور ہے تو پھر اللہ جل جلالہ یہ نہ فرماتے: ''اَلَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ'' (جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں) اس لئے کہ کفارِ مکہ بعث کے مسئلہ میں اختلاف نہیں رکھتے تھے بلکہ ان سب کا انکارِ بعث پر اتفاق تھا؟

جواب اول ان میں بعض وہ تھے جو قطعی طور پر انکار کرتے تھے اور بعض اس مسئلہ میں متردد اور شک کرنے والے تھے۔ پس اختلاف ثابت ہوا' اس لئے کہ اختلاف کی جہت نہ جزم بلا اثبات میں

منحصر ہے اور نہ ہی جزم بالظن میں منحصر ہے۔

جوابِ ثانی بعض بعث بعد الموت کی تصدیق کر کے مومن ہو گئے اور بعض تکذیب کر کے اپنے کفر پر قائم رہے لہٰذا نفی اور اثبات میں اختلاف ثابت ہوا۔

جوابِ ثالث "یَتَسَآءَلُوْنَ" میں ضمیر اور "هُمْ" کی ضمیر فریقین یعنی مسلمانوں اور مشرکوں کی طرف راجع ہے۔ سب کے سب اس دن کی عظمتِ شان کی وجہ سے اس کے متعلق ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں، چنانچہ مسلمانوں نے اس کی تصدیق کر کے اس کا اثبات کیا اور مشرکین نے اس کی تکذیب کر کے اس کی نفی کی۔

سوال ارشادِ باری ہے: "فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا" (پس جو کوئی چاہے پکڑے طرف پروردگار اپنے کے جگہ پھر جانے کی) آیت میں یہ جملہ شرط کی جزا ہے تو پھر شرط کہاں ہے؟ اکیلا "شَآءَ" شرط نہیں بن سکتا کیونکہ وہ مفعول کے بغیر مفید نہیں، اگر مذکور شرط ہے تو پھر جزا کہاں ہے؟۔

جوابِ اول اس کا معنی یہ ہے: لہٰذا جو شخص ایسے دن سے نجات چاہتا ہے وہ اطاعت کے ذریعہ اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنا لے۔

جوابِ ثانی اس کا معنی یہ ہے: "فَمَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا" جیسے یہ ارشاد ہے: "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ" یعنی جو شخص ایمان لانا چاہے تو ایمان لے آئے اور جو کفر کرنا چاہے تو کفر کر لے۔

سورۃ النازعات

سوال اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے تمام اوصاف کو لفظ تانیث کے ساتھ ذکر فرمایا: ارشاد فرمایا: "وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا لا وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا۔ الآیۃ"
(قسم ہے ان فرشتوں کی کہ زور سے کھینچتے ہیں جان ڈوب کر اور قسم ہے ان فرشتوں کی کہ بند کھول دیتے ہیں جان کا بدن سے بند کھول دینے کے) حالانکہ فرشتے مؤنث نہیں ہیں؟۔

جواب یہ ملائکہ کی جماعتوں اور فرقوں کی قسم کھائی گئی ہے، ظاہر ہے کہ جماعتیں اور فرقے مؤنث ہیں۔

سوال ارشاد ہوتا ہے: "قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ" (کتنے دل اس دن دھڑکنے والے ہیں آنکھیں ان کی نیچے ہیں) اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ابصار کی اضافت

(نسبت) قلوب کی طرف کیسے کی ہے حالانکہ اس سے مراد بالاتفاق آنکھیں ہیں؟۔

جواب ابصار سے اصحابِ ابصار مراد ہے‘ جس کی دلیل یہ قول ہے؟ ”یَقُوْلُوْنَ“

سوال ارشادِ خداوندی ہے: ”فَاَرٰهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰی“ (پس دکھائی اس کو نشانی بڑی) جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو تمام آیات (معجزات) دکھائی تھیں‘ دلیل یہ ہے ”وَلَقَدْ اَرَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ“ اور ہر آیت (معجزہ) کبریٰ (بڑی) ہوتی ہے؟

جواب اس آیتِ مبارکہ میں اس معجزہ کی خبر دینا ہے جو اوّل ملاقات میں اس کو دکھایا گیا تھا‘ یقیناً اوّل ملاقات میں عصا اور یدِ بیضاء کا معجزہ ہی دکھایا تھا‘ پھر متحد المعنی ہونے کی وجہ سے ان دونوں پر ”آیتِ کبریٰ“ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جبکہ بعض کہتے ہیں کہ ”آیت کبریٰ“ سے مراد عصا کا معجزہ ہے‘ اس لئے کہ وہ مقدمہ اور اصل تھا جبکہ دوسرا معجزہ اس کے لئے بالتبع تھا‘ اس لئے آپ سے کہا گیا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال لے۔

سوال ارشاد فرمایا: ”وَاَغْطَشَ لَیْلَهَا“ (اور اس کی رات کو ڈھانک دیا) یہاں پر رات کی اضافت آسمان کی طرف فرمائی ہے۔ حالانکہ رات زمین میں ہوتی ہے‘ نہ کہ آسمان میں؟

جواب رات کی اضافت آسمان کی طرف اس لئے فرمائی کہ رات غروبِ آفتاب کے وقت سب سے پہلے ظاہر ہونے والی چیز ہے‘ جو غروب کی جگہ پر آسمان افق سے ظاہر ہوتی ہے‘ اور ”وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا“ (اور اس کے دن کو ظاہر کیا) سے مراد سورج کی روشنی ہے جس کی دلیل یہ ہے: ”وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا“ یعنی سورج کی اور اس کی روشنی کی قسم ہے۔ لہٰذا رات کی آسمان کی طرف اضافت کرنے میں کوئی اشکال نہیں۔

سورۃ عبس

سوال اس کا کیا سبب ہے کہ پہلے تو مؤنث کے ساتھ فرمایا: ”كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ“ (ہرگز نہیں یوں تحقیق یہ نصیحت ہے) پھر مذکر کے ساتھ فرمایا: ”فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ“ (پس جو کوئی چاہے یاد کرلے اس کو) یہاں یوں نہیں فرمایا: ”ذَكَرَهَا“؟

جواب اول مؤنث کی ضمیر قرآن کی آیات یا اس سورت کی طرف راجع ہے‘ اور ”ذکرہ“ میں ضمیر قرآنِ کریم کی طرف راجع ہے۔

جواب ثانی ضمیر لفظ کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ ”تذکرۃ“ کے معنی کی طرف راجع ہے‘ بمعنی وعظ بنصیحت۔

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا'' (اور میوہ اور چارہ) مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی' پھر فرمایا: ہم نے ان سب کو جان لیا مگر ''اَبٌّ'' کیا ہے؟ پھر فرمایا: اللہ کی قسم! یہ تکلف ہے' اے عمرؓ! تجھے یہ جاننا ضروری نہیں کہ ''اَبٌّ'' کا کیا مطلب ہے؟ پھر فرمایا: کتاب اللہ میں سے جو بات تمہارے لئے واضح ہو اس کی اتباع کرو اور جو ایسی نہ ہو اس کو چھوڑ دو''۔ یہ بات قرآن کے معانی و مشکلات کی بحث و تتبع سے منع کرنے کے مشابہ ہے؟۔

جواب حضرتِ عمرؓ کی یہ مراد نہیں ہے کہ تم اس کے معانی و مشکلات میں تتبع وغیرہ نہ کرو' اصل میں صحابہ کرامؓ کا زیادہ تر کام یہ تھا کہ وہ عمل بالقرآن میں لگے رہتے تھے' ان کے نزدیک علم بلا عمل میں مشغول ہونا محض تکلف ہوتا تھا' لہٰذا مراد یہ ہے کہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اس کے کھانے کا احسان جتایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کا فرمایا ہے۔ اور آیت کے سیاق و سباق سے یہ معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ ''اَبٌّ'' سے مراد بعض وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ انسان کے اور اس کے مویشیوں کے فائدے کے لئے اُگاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ جو بات سب سے زیادہ اہم ہو پہلے اس کا خیال کرو' یعنی اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر بجالانا جو کہ تمہارے لئے بالکل واضح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو نعمتیں ذکر کی ہیں ان کا سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے' کہیں تم ''اَبٌّ'' کے معنی کی تلاش میں پڑ کر اور کسی خاص بوٹی کی معرفت میں لگ کر اس اہم بات سے غافل نہ ہو جاؤ۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ ان سے ''اَبٌّ'' کا معنی پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کونسا آسمان مجھے سایہ دے گا اور کونسی زمین مجھے اٹھائے گی جب میں کتاب اللہ کے متعلق ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی علم نہیں''۔

اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ ''اَبٌّ'' ہر اس چارہ اور گھاس وغیرہ کو کہتے ہیں جسے جانور چرتے ہوں۔

سورۃ التکویر

سوال ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ'' (اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا) سوال تو قاتل سے ہونا چاہئے نہ کہ مقتول سے؟۔

جواب زندہ درگور لڑکی سے سوال اس کے قاتل کو نشانۂ ملامت بنانے کے لئے ہوگا' کیونکہ وہ اس کو کہے گی' میں بے گناہ قتل کی گئی۔ اس کی نظیر توبیخ و تبکیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے فرمائیں گے: ''ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ'' حضرت عیسیٰؑ فرمائیں گے: ''سُبْحَانَكَ

مَا يَكُونُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ"

سوال اس سے کیا مراد ہے: "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ" (جان لے گا جی جو کچھ حاضر کیا ہے) اس میں علم (جاننے) کو ایک نفس (شخص) کے لئے ثابت کیا گیا ہے جبکہ ہر شخص قیامت کے روز ان اعمال کو جان لے گا جو وہ لے کر آیا ہوگا' جس کی دلیل یہ فرمان ہے: "يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ"؟

جواب یہ کلام ان امور میں سے ہے جس سے اس کے مدلول کا عکس مراد لیا گیا ہے' اللہ تعالیٰ کے کلام اور کلامِ عرب میں اس کی مثالیں بہت موجود ہیں جیسے: "رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ" اب یہاں "رُبَّ" "کم" بمعنی کثیر کے معنی میں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی جس میں موسیٰ علیہ السلام کی حکایت کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: "وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ" نیز ایک شاعر کا قول ہے:

قَد اترك القرن مصفرًا انا مله ☆ کان اثوابه مُجت بفرصاد

سورۃ الانفطار

سوال ارشادِ الٰہی ہے: "مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ" (کس چیز نے فریب دیا تجھ کو ساتھ پروردگار تیرے کرم کرنے والے کے) اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کو چھوڑ کر صفت "کرم" ذکر کرنے میں کیا خاص نکتہ ہے؟۔

جواب بعض کہتے ہیں' صفتِ کرم' اس لئے ذکر کی تاکہ اپنے بندے پر لطف ومہربانی کا اظہار ہو اور اسے حجت اور عذر کی تلقین ہو کہ وہ یوں کہے: مجھے ذاتِ کریم کی کرم نوازی نے بھول میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ یہ سوال مجھ سے کرتے تو میں کہتا کہ آپ کے لٹکے ہوئے پردوں نے مجھے بھول میں ڈالے رکھا۔ مروی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے غلام کو کئی بار آواز دی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا' حضرت علیؓ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تجھے کیا ہوا کہ میری بات کا جواب نہیں دیتا؟ اس نے کہا: آپ کی بردباری مانع ہوئی اور میں آپ کی سزا کو آزما رہا تھا' غلام کا یہ جواب حضرت علیؓ کو پسند آیا اور اس کو آزاد کر دیا۔

اسی لئے علماء کہتے ہیں کہ غلاموں کا بے ادب ہونا آدمی کی کرم نوازی کا حصہ ہے۔

حق بات یہ ہے کہ انسان پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ظاہری اور باطنی نعمتوں کی فراوانی کو دیکھ کر اور اس کی کرم نوازی کی وجہ سے خود فریبی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ پھر اسکی نعمتوں کا کفران اور

اس کے حکموں کی نافرمانی کرنے لگے۔

یہ درحقیقت ایک ناپسندیدہ حرکت ہے اور حکمت و دانائی سے خالی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی تو فرمایا: انسان کی جہالت نے اس کو بھول میں ڈالے رکھا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: اس کی حماقت اور جہالت نے اس کو دھوکہ میں رکھا۔ حضرت حسنؒ فرماتے ہیں: خدا کی قسم! اس کو اس کے خبیث شیطان نے دھوکہ میں ڈالا جو گناہوں کو اس کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے' انسان کو کہتا ہے: جو دل میں آئے کرو' کیونکہ تیرا رب بڑا کریم ہے۔

سوال اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا'' (وہ ایسا دن ہے جس میں کسی شخص کا کسی شخص کے لئے کچھ بس نہ چلے گا) اس آیت سے تو بظاہر شفاعت کی نفی ہو رہی ہے' حالانکہ جن نفوس کی شفاعت مقبول ہوگی ان کو کچھ نہ کچھ نفع کا اختیار دیا جائے گا؟

جواب جس بات کی نفی کی گئی ہے وہ ہے اپنی سلطنت و حکومت سے دوسری کی نصرت کرنا۔ جبکہ شفاعت بطورِ سلطنت و حکومت نہیں ہوگی' لہٰذا یہ نفی میں داخل نہیں ہے' اس کی تائید اس ارشادِ مبارک سے ہوتی ہے: ''وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ'' یعنی اور تمام تر حکومت اس روز اللہ ہی کی ہوگی۔

سورۃ المطفّفین

سوال یوں کیوں نہیں فرمایا: ''اِذَا اكْتَالُوْا اَوْ وَزَنُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ'' یعنی جب لوگوں سے ناپ کرلیں یا تول کر دیں تو پورا لیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں فرمایا ہے: ''وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ'' (جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں)؟

جواب اس کی وجہ یہ ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی یہ عادت تھی کہ وہ خود تو ہر کیلی اور وزنی چیز کو ناپ کر ہی لیتے تھے' اس لئے کہ ناپ کر زیادہ وصول کرنا ان کے لئے تول کر لینے سے زیادہ ممکن اور آسان تھا لیکن جب دوسرے کو دیتے تو ناپ کر دیتے یا تول کر دیتے کیونکہ اس طرح ان کے لئے ان دونوں میں کمی کرنا ممکن تھا۔

سوال ارشاد ہوتا ہے: ''وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ'' (آپ کو کچھ معلوم ہے کہ سجین کیا ہے وہ لکھا ہوا دفتر ہے) اللہ تعالیٰ نے ''سِجِّيْنٌ'' کی تفسیر ''كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ'' سے اور ''عِلِّيِّيْنَ'' کی تفسیر بھی ''كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ'' سے فرمائی ہے۔ حالانکہ ''سِجِّيْنٌ'' ساتویں زمین کا نام ہے اور یہ سجن سے فعیل کے وزن پر ہے۔ اور ''عِلِّيِّيْنَ'' جنت کا یا بلند مقام کا یا ساتویں آسمان یا سدرۃ المنتہیٰ کا نام ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ" سِجِّیْنٌ اور عِلِّیِّیْنَ کی تفسیر نہیں ہے بلکہ فجار کے نامۂ اعمال اور ابرار کے نامۂ اعمال کا معنوی وصف ہے۔ اصل عبارت یہ ہے: "وھو کتاب مرقوم"۔

سورۃ الانشقاق

سوال ارشاد فرمایا: "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ" (جب آسمان پھٹ جائیگا) "اذا" شرط ہے اس کا جواب کہاں ہے؟

جواب اس میں چند وجوہ ہیں ایک وجہ یہ ہے کہ جوابِ شرط متروک ہے کیونکہ قرآن میں اس جیسا کلام مکرر ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ جوابِ شرط "اَذِنَتْ" ہے اور اس میں واؤ زائدہ ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جوابِ شرط اس قول "وَحُقَّتْ" کے بعد محذوف ہے اور وہ ہے: "بعثتھم یا جوزیتم یا لاقیتم ماعملتم" اور اس محذوف پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول: "فَمُلٰقِیْهِ" دلالت کرتا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ اصل میں یہاں تقدیم و تاخیر ہے۔ عبارت اس طرح ہے: "یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ"۔

سورۃ البروج

سوال جوابِ قسم کہاں ہے؟

جواب اس میں چند وجوہ ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ متروک ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ "قُتِلَ" ہے یعنی "لَقَدْ قُتِلَ" یعنی ملعون ہو گئے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ" ہے چوتھی وجہ یہ ہے کہ محذوف ہے اور وہ ہے "لتبعثن" وغیرہ۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ اس کا جوابِ قسم یہ ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوْا"

سورۃ الطارق

سوال جوابِ قسم کہاں ہے؟۔

جواب جوابِ قسم "اِنْ كُلُّ نَفْسٍ" ہے یہاں "اِنْ" ما کے معنی میں ہے اور "لَمَّا" تشدید کے ساتھ "اِلَّا" کے معنی میں ہے مطلب یہ ہوگا کہ نہیں ہر شخص مگر اس پر ہے نگہبان اور "لما" تخفیف کے ساتھ ہو تو اس میں "ما" زائدہ ہے اور "ان" مخففہ من المثقلہ ہے چنانچہ معنی ہوں گے کہ بے شک ہر شخص البتہ اس پر ہے نگہبان اور قسم ان کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔

سوال ارشاد ہوتا ہے: "فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ" (پس چاہیے کہ دیکھے آدمی) اس آیت کا ماقبل سے ربط کیا ہے؟

جواب وجہ ربط یہ ہے کہ جب پہلے یہ بات ذکر فرمائی کہ ہر شخص پر اعمال کا یادرکھنے والا فرشتہ مقرر ہے تو اس کے بعد انسان کو تاکید اور نصیحت کی جارہی ہے کہ اسے چاہیے کہ وہ اپنی ابتدائی حالت میں غور وفکر کرے، تاکہ اسے معلوم ہو کہ جس ذات نے اس کو پہلی بار پیدا کیا ہے وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، لہٰذا وہ اس روزِ جزا کے لئے اعمال بجالائے۔ اور اپنے فرشتہ کو وہی اعمال لکھوائے جو اس کے لئے آخرت میں کام آئیں۔

سوال ان دونوں لفظوں "فَمَهِّلْ" اور "أَمْهِلْ" کے لانے کا کیا فائدہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں کے معنی ایک ہیں؟۔

جواب اس کا فائدہ تاکید ہے، دونوں لفظوں کے درمیان فرق طلبِ خفت کے لئے کیا گیا ہے۔

سورۃ الاعلیٰ

سوال اس کا کیا معنی ہے: "فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى" (پس نصیحت کر اگر نفع دے نصیحت) حالانکہ نبی کریم ﷺ نصیحت پر مامور تھے خواہ نصیحت نفع دے یا نفع نہ دے؟

جواب اول اس کا معنی یہ ہے کہ نصیحت کیجئے جب نفع دے۔

جواب ثانی اس کا معنی یہ ہے کہ نصیحت نفع کی چیز ہے۔

جواب ثالث مطلب یہ ہے کہ نصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دے یا نفع نہ دے، ایک چیز کو حذف کر دیا کیونکہ مذکور چیز اس پر دلالت کرتی ہے۔ امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ "ان" ما کے معنی میں ہے، گویا ما ظرفیہ کا معنی مراد ہے اور انْ ما ظرفیہ کے معنی میں معروف نہیں ہے۔

سوال اس کا کیا مطلب ہے: "لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى" (پھر نہ مرے گا بیچ اس کے اور نہ جیئے گا) حالانکہ ہر جاندار ان دو وصفوں میں سے کسی ایک سے موصوف ضرور ہوتا ہے؟

جواب اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایسی موت نہیں مریں گے جس سے ان کو راحت حاصل ہو سکے اور نہ ہی ایسی زندگی جئیں گے جس سے وہ نفع اٹھا سکیں۔

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں: اس کی روح اس کے حلق تک پہنچے گی مگر اس سے جدا نہیں ہوگی کہ موت آجائے اور واپس اپنی جگہ نہ جائے گی کہ زندگی ملے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم

سورۃ الغاشیۃ

سوال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً'' (بہت سے چہرے اس روز ذلیل مصیبت جھیلنے والے خستہ ہونگے اور آتشِ سوزاں میں داخل ہوں گے) جب کہ ان کا سارا بدن دوزخ میں داخل ہوگا؟۔

جواب اول لفظ ''وَجْهٌ'' سے بدن بھی مراد لیا جاتا ہے' جیسے اس فرمانِ خداوندی میں لیا گیا: ''وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ''۔

جواب ثانی یہاں ''وُجُوْهٌ'' سے مراد اعیان اور رؤساء ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے ''ھؤلاء وجوہ القوم'' اور یا وجہ العرب: یعنی اے عرب کے وجیہ۔ اور اس قول کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپؓ نے فرمایا: اس سے مراد عیسائی راہب اور ان کے عبادت خانے والے ہیں۔

سوال ارشاد ہوتا ہے: ''اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ'' (کیا پس نہیں دیکھتے طرف اونٹوں کے کیونکر پیدا کیے گئے ہیں) اس آیت کا ماقبل سے کیا ربط و مناسبت ہے؟ نیز آسمان' پہاڑ' زمین اور اونٹوں کے درمیان کیا مناسبت ہے کہ ان کو اس آیت میں جمع کیا گیا ہے؟

جواب اول جب اللہ تعالیٰ نے جنت کے اوصاف بیان فرمائے تو اس سے کفار کو تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کو اپنی صنعت کے عجائبات بیان فرمائے۔

جواب ثانی حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں' جب اللہ تعالیٰ نے جنت کے تختوں کی بلندی بیان فرمائی تو وہ کہنے لگے کہ پھر ہم ان پر کس طرح سے چڑھیں گے؟ تو یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ: ''اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ'' الآیۃ یعنی کیا وہ لوگ اونٹ کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں کہ: ''كَيْفَ خُلِقَتْ'' یعنی کس طرح عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے بوجھ کس طرح اٹھا اٹھا کر دور دراز علاقوں میں لے جاتا ہے' حتیٰ کہ اسے ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نیچے بیٹھ جاتا ہے اور اس پر سامان لادا جاتا ہے اور اس پر بڑی آسانی سے سواری ہو جاتی ہے اور پھر وہ سارا لدا ہوا سامان وغیرہ اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے' تمام جانوروں میں صرف اونٹ ہی ایک ایسا جانور ہے کہ جب وہ بیٹھا ہوا ہو اور اس پر سامان لادا جائے تو وہ اٹھ سکتا ہے۔ اور پھر جو بھی اس کی نکیل پکڑ کر اسے لے چلے تو وہ اس کے تابع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کوئی چھوٹا بچہ بھی اس کی لگام کو پکڑ کر اس کو لے چلے تو وہ اس کے بھی تابع ہو جاتا ہے۔ چونکہ اونٹ کو خشکی کی کشتی بنایا گیا ہے اس لئے اس میں دس دن یا اس سے بھی

زیادہ دنوں تک پیاس برداشت کرنے کے لئے صبر کا مادہ رکھا گیا ہے' نیز اس کو ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ جنگل کی وہ تمام نباتات جسے دوسرے جانور نہیں چرتے یہ چر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ہاتھی' زرافہ' گینڈے وغیرہ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ جانور' اونٹ سے بڑے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب نے نہ ان کو دیکھا اور نہ ہی وہ ان جانوروں کو پہچانتے تھے' نیز اونٹ عرب کے ہاں نفیس ترین اموال میں سے شمار ہوتا ہے نیز یہ اونٹ ہی ان کے ہاں زیادہ ہوتے تھے' نہ یہ اونٹ ان سے جدا ہوتے اور نہ وہ اونٹ سے جدا ہوتے تھے۔ اور پھر ان اونٹوں کے ساتھ مابعد کی چیزوں کو اس لئے لائے ہیں کہ عرب لوگوں کی نظر اپنی وادیوں میں انہی چیزوں پر ہوتی تھی' اس لئے کثرتِ ملابست کی وجہ سے آیت میں ان امور کو ذکر کر دیا گیا۔

جن حضرات نے "ابل" کی تفسیر بادل اور پانی کے ساتھ کی ہے ان کی اس سے مراد بطریق تشبیہ مناسبت پیدا کرنا ہے' یعنی اونٹ کو چلنے اور نرمی کے اندر بادل کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے "ابل" سے بادل حقیقۃً مراد نہیں ہے۔ عرب کے اشعار میں بھی بادل کو اونٹ کے ساتھ بکثرت تشبیہ دی جاتی ہے۔ نیز ابن درید نے بھی اپنے قصیدہ میں اس کو بادل کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت عائشہؓ نے "ابلّ" کو بتشدید اللام پڑھا ہے۔ ابو عمرو کہتے ہیں کہ "ابلّ" آب بردار بادل کو کہتے ہیں۔

سورۃ الفجر

سوال "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" (قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی) "لیال" کو نکرہ اور باقی مقسم بہ کو معرفہ کیوں لائے۔ لیال کو بھی لام عہد کے ساتھ معرفہ کیوں نہ لایا گیا؟ حالانکہ یہ معہود راتیں ہیں یعنی ان سے مراد بقولِ جمہور ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں؟

جواب چونکہ یہ راتیں عام راتوں سے زیادہ فضیلت رکھتی ہیں اس لئے ان کو نکرہ لیا اور لام عہد کے ساتھ معہود نہ کر کے وجہ بھی یہی ہے۔ کہ نکرہ لانے کی صورت میں تنوین تفخیم و تعظیم پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی: "وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" میں "الٰہ" کو نکرہ لانا بھی تعظیم و تفخیم پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

اسی طرح "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ" میں "البلد" کو معرفہ اور اس کے بعد "وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ" میں "والد اور ولد" کو نکرہ لانا بھی تعظیم کے لئے ہے چنانچہ اس سے مراد حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ یا حضرت محمد ﷺ ہیں۔

سوال اللہ تعالیٰ نے انسان کو "رَبِّیْ اَکْرَمَنِ" (میرے رب نے مجھے عزت دی) کہنے پر مذمت کیوں کی حالانکہ وہ اپنے اس قول میں سچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسکا اکرام کیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: "فَاَکْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ" اور یہ تحدث بالنعمت بھی ہے تو اس پر تذمیم نہیں ہونی چاہئے؟۔

جواب یہ مذمت بطور فخر اور دوسروں ان پر اپنی برتری ظاہر کرنے اور خود کو اس کے مستحق سمجھنے والوں کے لئے ہے۔ یہ قابل مذمت ہے لیکن اگر یہ کلمہ "ربی اکرمن" اظہار تشکر اور تحدث بالنعمت کے طور پر کہا جائے تو نہ مذموم ہے اور نہ ممنوع۔

سوال پہلے جملے میں "فَاَکْرَمَهٗ" فرمایا لیکن دوسرے جملے میں فاھانہ نہیں فرمایا؟

جواب اس لئے کہ وسیع رزق دینا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اکرام اور انعام ہے اور اس میں کمی کرنا اہانت نہیں ہے۔ اس لئے کہ انعام نہ دینا توہین کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اکرام اور اہانت کے درمیان ایک درجہ ہے یعنی نہ انعام ہے اور نہ توہین۔ اس لئے کہ آقا کبھی اپنے غلاموں کا اکرام کرتا ہے اور کبھی اس کی توہین کرتا ہے اور کبھی اس کا نہ اکرام کرتا ہے اور نہ ہی بے توقیری۔
چنانچہ رزق میں تنگی کرنا قدر زائد عطاء نہ کرنے سے عبارت ہے لہٰذا یہ اہانت نہیں۔

سوال یہ کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے: "وَجَآءَ رَبُّكَ" جبکہ حرکت انتقال کرنے سے اللہ تعالیٰ بلند و برتر ہیں۔ یہ تو مخلوق کی صفات ہیں؟

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: اس سے مراد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے جلال کا ظہور ہے۔ بعض علماء نے کہا: قیامت کے دن اس کی معرفت کے لئے اس کا ظہور ہوگا جس سے تمام شکوک و شبہات زائل و مرتفع ہوں گے۔ جیسا کہ کسی کے آنے پر اس کے متعلق شکوک رفع ہوتے ہیں۔

سورۃ البلد

سوال "وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ" میں "ما" غیر عقل ہے ولد عاقل ہے "من ولد" ہونا چاہئے؟۔

جواب "من" کے مقابلے میں "ما" میں ابہام قدرے زیادہ ہے۔ لہٰذا نکرہ لا کر تفخیم و تعظیم کا قصد کیا گیا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی: "وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ" میں تعظیماً لفظ "ما" استعمال کیا گیا ہے۔

سورۃ الشمس

سوال "وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا" (نفس اور اسکی بناوٹ کی قسم) "ونفس" میں نفس نکرہ اور باقی دوسرے تمام منقسم بہ (مثلاً والشمس' والقمر' والنهار' والليل' والسماء' اور والارض کو معرفہ کیوں لایا گیا؟۔

جواب "ونفس" سے مراد انسانی نفس ہے' جو تمام حیوانات کے نفوس سے علیحدہ اور منفرد ہے "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور لام عہد کے ساتھ معہود اس لئے نہ کیا گیا کہ اس سے کوئی خاص معہود نفس مراد نہیں ہے۔ جو لوگ "ونفسٍ وما سواها" کی تفسیر حضرت آدم علیہ السلام سے کرتے ہیں وہ "نفس" کی تنوین کو تفخیم و تعظیم کے لئے مانتے ہیں۔

سوال اس میں قسم تو ہے مگر جوابِ قسم کہاں ہے؟

جواب امام زجاجؒ وغیرہ علماء فرماتے ہیں: جوابِ قسم "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" اور لامِ قسم کو تخفیفاً حذف کیا گیا ہے' ابن الانباریؒ فرماتے ہیں کہ جوابِ قسم محذوف ہے۔ امام زمخشریؒ نے کہا: تقدیر عبارت یوں ہے۔ "ليد مدمن الله على اهل مكه لتكذيبهم رسول الله صلى الله عليه وسلم كماد مدم على ثمود لتكذيبهم صالحا عليه السلام" یعنی رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی وجہ سے اہل مکہ پر ایسا عذاب آئیگا جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلانے کی وجہ سے قوم ثمود پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔ "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" کا جوابِ قسم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ماقبل کلام کے تابع ہے۔

سورۃ اللیل

سوال کیسے فرمایا اللہ پاک نے "لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى" جہنم میں سب سے زیادہ بدبخت ہی داخل ہوگا۔ جبکہ عام بدبخت بھی داخل ہوگا؟ اس کی گرمی اور عذاب کو برداشت کریگا۔

جواب ابوعبیدہ فرماتے ہیں: الاشقى یہاں شقی کے معنی میں ہے۔ مراد اس سے ہر کافر ہے۔ اہلِ عرب بسا اوقات اسم تفضیل کے صیغے کو اسم فاعل کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ سوال مع الجواب سورۃ الروم میں "وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ" کے تحت گذر چکا ہے۔ وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

امام زجاج نے کہا: جس آگ کا تذکرہ آیت میں ہے۔ اس سے مراد خاص قسم کی آگ ہے جو اشقیاء کے لئے معین ومختص ہے۔ زمخشریؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ الاشقی شقی کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ تفضیل ہی کے معنی ہیں۔ مراد اس سے ابوجہل اور امیہ بن خلف وغیرہ ہیں۔ "وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى" میں الاتقی سے حضرت ابوبکرؓ مراد ہیں۔ چنانچہ یہ آیت عظیم تر مومن اور عظیم تر مشرک کے درمیان موازنہ کے لئے نازل ہوئی ہے۔

بعض علماء نے "وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى" سے حضرت ابوبکرؓ کے افضل الصحابہؓ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ اس لئے کہ ان کی صفت "الاتقی" اسم تفضیل کے ساتھ لائی گئی ہے۔ فرمان باری ہے "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" جب کہ "اتقی" سب سے زیادہ مکرم ہے تو حضرت ابوبکرؓ کے لئے اتقی کا لفظ استعمال ہوا ہے تو معلوم ہوا تمام صحابہؓ کے مقابلے میں اللہ کے ہاں وہ سب سے زیادہ مکرم ہیں۔

سورۃ الضحیٰ

سوال "وَوَجَدَكَ ضَالًّا" اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو کیوں فرمایا۔ حالانکہ نبی کبھی ضال نہیں ہوتا، نہ قبل از نبوت اور نہ ہی بعد از نبوت؟۔

جواب اول "ضال" کا معنی یہاں بے خبر کے ہیں یعنی اس سے پہلے آپ معالم نبوت اور احکام شریعت سے بے خبر تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی فرمائی۔ یہ تشریح جمہور علماء کے اقوال کے مطابق ہے۔

جواب ثانی آپؐ جب چھوٹے تھے۔ شعاب مکہ میں گم ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے دادا عبدالمطلب کے پاس لوٹا دیا۔

جواب ثالث "ضالا" کا معنی "ناسیا" (بھولنے والا) ہے اس لئے کہ ضلال، نسیان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ نسیان کے معنی میں قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ استعمال ہوا ہے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ" ان تضل ان تنسی کے معنی میں ہے۔

سوال "ضلال" اگر نسیان کے معنی میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے ضلال اور نسیان کو عطف سے کیوں بیان کیا حالانکہ معطوف ومعطوف علیہ میں مغایرت ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا گیا "لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى"؟۔

جواب ہم یہ دعویٰ کب کر رہے ہیں کہ ضلال جہاں بھی آ جائے نسیان کے معنی میں ہوگا۔ بلکہ ہم کہتے ہیں کبھی کبھی نسیان کے معنی میں ہوگا۔ چنانچہ اس آیت میں "ضلال" خطاء کے معنی میں یا غفلت کے معنی میں ہے۔

سورۃ الانشراح

سوال "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ" میں لفظ "لَكَ" اور "عَنْكَ" لانے کا کیا فائدہ جبکہ کلام ان کے بغیر بھی مکمل ہے؟

جواب اس کا فائدہ ابہام کے بعد ایضاح ہے جو بلاغت کی ایک نوع ہے۔ جب "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ" فرمایا گیا تو مفہوم ہوا کہ کوئی چیز مشروح لہ ہے پھر "صَدْرَكَ" فرمایا تو "لَكَ" سے پیدا شدہ ابہام کی وضاحت ہوگئی۔ اسی طرح "وَوَضَعْنَا عَنْكَ" ہے۔

سوال "فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" میں کلمۃ "مع" مصاحبت کے لئے استعمال ہوا ہے تو عُسر اور یسر کے ملانے کا کیا مطلب ہے؟۔

جواب اس آیت کے نزول کا سبب مشرکین کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو فقر و تنگ دستی پر عار دلانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عسر و تنگی کے فوراً بعد یسر و آسانی کا وعدہ کیا۔ اور مزید ان کی تسلی کے لئے موعود یسر کو عسر کے ساتھ بیان کیا' یعنی عسر کے فوراً یسر ہوگا۔

سوال حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول "لن يغلب عسر يسرين" "ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب ہرگز نہیں سکتی" کا کیا مطلب ہے۔ بلکہ آپ ﷺ سے بھی اس قسم کے الفاظ مروی ہیں؟۔

جواب یہ قول قوتِ امید کی بناء پر ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے کو بہترین محل پر محمول کرنا چاہئے جہاں تک جملہ ثانیہ "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" کا تعلق ہے۔ تو وہ جملہ اول "فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" کی تاکید ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ جاء رجل جاء رجل اس سے مراد ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ دوسرا جملہ محض تاکید کے لئے ہے۔ یا "عسر" کو معرفہ لانا اس کے موجود اور معہود ہونے کی وجہ سے اور "یسر" کو نکرہ لانا اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے اور تعظیم و تفخیم کی غرض سے ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جملہ ثانیہ ایک علیحدہ وعدہ کے لئے ہو۔ تو اس صورت میں "یسر" متعدد ہوگا۔ یعنی کئی آسانیاں ہونے کا وعدہ ہے۔ لیکن پہلے قول (یعنی جملہ ثانیہ' جملہ اولیٰ کی تائید کے لئے ہے) کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت سے بھی ہوتی ہے جس میں دوسرا جملہ

نہیں ہے۔

سوال اگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں دوسرا جملہ ثابت نہیں ہے تو انہوں یہ جملہ "والذی نفسی بیدہ لو کان العسر فی جحر لطلبہ الیسر حتی یدخل علیہ انہ لن یغلب عسر یسرین" (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میری جان ہے اگر عسر وتنگی کسی بل میں بھی ہو تو یسر وہاں بھی داخل ہوگا۔ بے شک ایک عسر دو یسروں پر غالب نہیں آسکتا) کیوں فرمایا؟۔

جواب اس میں جو تفخیم ہے وہ مکرر بیان کے حکم میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کی تفسیر دو یسروں سے کی ہے وہ ان کے وقوع کے بارے کہتے ہیں کہ ایک یسر وہ فتوحات ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ہوئیں۔ اور دوسرے یسر کا وقوع حضرات خلفاء راشدین کے دور میں میسر آیا۔ بعض نے کہا "یسرین" سے مراد یسر الدنیا و یسر الآخرہ ہے۔

سورۃ التین

سوال "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" کا استثنیٰ ماقبل سے کیسے صحیح ہوگا؟۔

جواب اکثر علماء کی رائے یہ ہے یہاں "خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ" میں "الانسان" سے مراد جنس انسان ہے۔ اسفل سافلین سے مراد نار جہنم ہے۔ اس تشریح کے مطابق مستثنیٰ متصل ہوگا۔ اور "فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ" "فلا نردھم اسفل سافلین" کا قائم مقام ہے۔ اور جن لوگوں نے اسفل سافلین کی تفسیر نہایت بڑھاپے سے کی ہے انہوں نے کہا "السافلین" سے مراد ضعفاء، اطفال، شیخ فانی وغیرہ ہیں، اس تفسیر کے مطابق استثناء منقطع ہے اور "الا" "لکن" کے معنی میں ہے یعنی جنہوں نے زمانہ شباب میں نیک اعمال کئے ہوں گے اور زمانہ بڑھاپے میں ان اعمال کو بجالانے سے عاجز ہوں گے تو ان کے لئے ان اعمال کا ثواب تادم مرگ لکھا جاتا رہیگا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول "قرآن پڑھنے والا ارذل عمر کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا" کا بھی یہی مطلب ہے۔ بعض علماء کرام یہ فرماتے ہیں جو لوگ زمانہ شباب اور طاقت کے زمانے میں نیک اعمال پر کاربند رہیں گے ان پر ارذل عمر کی کیفیت طاری نہیں ہوگی اگرچہ طویل عمر کیوں نہ گذاریں۔ ان حضرات نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے ظاہر سے استدلال کیا۔

سورۃ العلق

سوال ''اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَo خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ'' دوسرے ''خلق'' کا مفعول ''الانسان'' ہے لیکن پہلے ''خلق'' کا مفعول کہاں ہے؟۔

جواب اس کے متعلق دو احتمال ہیں۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ اس کا کوئی مفعول نہ ہو۔ بلکہ اس سے مراد وہ ذات ہے جس سے خلق (پیدا کرنا) کا حصول ہو کہ اس کے سوا کوئی خالق نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمان باری ''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ'' میں ہے اور جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں۔ ''فلان یعطی ویمنع ویصل و یقطع'' کہ فلاں عطا کرتا ہے یا منع کرتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مفعول مقدر ہو۔ تقدیر عبارت یوں ہو ''اَلَّذِیْ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ'' پھر بطور خاص انسان کو اس کی شرافت بیان کرنے کے لئے ذکر فرمایا۔

سوال کیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ'' جمع کے ساتھ یوں نہیں فرمایا: ''خلق الانسان من علقة''؟

جواب اس لئے الانسان ! جمع کے معنی میں ہے دلیل اس کی ''اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' ہے۔

سوال فرمانِ الٰہی: ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ'' سے اس جواب کی تردید ہوتی ہے؟

جواب آیت کا مطلب ہے ''انا خلقنا اباکم من تراب ثم خلقنا کل واحد من اولاد من نطفه'' یعنی ہم نے تمہارے جدامجد (آدم) کو مٹی سے پھر ان کی اولاد کو نطفہ سے پیدا کیا۔ بعض نے جواب میں کہا ''علق'' کو رعایتِ فواصل کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

سورۃ القدر

سوال ''مِنْ کُلِّ اَمْرٍ'' کا کیا مطلب ہے؟

جواب یہاں لفظ ''من'' باء کے معنی میں ہے۔ یعنی بِکُلِّ امر ہے۔ جیسا کہ آیت ''یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ'' اور ارشادِ باری ''یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ'' میں دونوں

جگہ "من" "باء کے معنی میں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے اس سال جو کچھ رونما ہونے والا ہے اور جو تبدیلیاں ہونے والی ہیں ہر ایک کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم لیکر لوح محفوظ سے آسمان دنیا یا زمین کی طرف فرشتے آتے ہیں۔

سورۃ البیّنة

سوال "رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" (اللہ کا رسول جو ان کے سامنے تلاوت کرتا ہے ایسے صحیفے جو پاکیزہ ہیں) یہاں رسول سے بلا خلاف مراد محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اور ان کے بارے فرمایا جا رہا ہے "يَتْلُوْا صُحُفًا" اس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ کتاب میں دیکھ کر پڑھتے ہیں حالانکہ آپ اُمی تھے دیکھ کر نہیں پڑھ سکتے تھے۔

جواب "یتلوا" سے دیکھے بغیر پڑھنا مراد ہے۔ اس لئے کہ آپ سے یہی متواتر منقول ہے۔

سوال صُحف اور کتب میں کیا فرق ہے حتی کہ فرمایا جا رہا ہے "صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ"؟

جواب "صحف" سے کاغذ مراد ہے اور "مطہرہ" کا معنی شرک سے پاک اور "فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" کا مطلب ہے مکتوب سنقیمه ناطقة بالعدل مراد اس سے آیات اور احکام مراد ہیں۔

سوال "وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ" (نہیں مختلف و متفرق ہوئے اہل کتاب مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ثبوت آچکا)۔ اہلِ کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور "البینه" سے مراد حضور ﷺ یا قرآن ہے۔ یہود و نصاریٰ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل بھی آپس میں متفرق تھے ایک دوسرے کی تکفیر کیا کرتے تھے؟

جواب یہاں ان کے تفرق سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل ان کی تصدیق اور ان پر ایمان لانے کے متعلق اختلاف ہے۔ چنانچہ توراۃ اور انجیل کے بیان کے مطابق آپ ﷺ کی آمد سے پہلے یہود و نصاریٰ بھی متفق تھے کہ ایک نبی آئے گا۔ ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ لیکن جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو آپس میں مختلف ہو گئے۔ مختلف فرقوں میں بٹ گئے بعض ایمان لائے اور بعض آپ کی رسالت کے منکر ہو گئے۔

سورۃ الزلزلة

سوال "اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا" (جب ہلائے زمین کو اس کے بھونچال سے)

"زلزال" مصدر کی اضافت زمین کی طرف کرنے کا کیا مطلب۔ یوں کیوں نہ فرمایا گیا "اذا زلزلت الارض زلزالا" جیسا کہ "اذا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا" وغیرہ آیات میں مصدر بغیر اضافت کے لایا گیا؟۔

جواب اس سے مراد وہ زلزلہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مشیت کے مطابق صرف اسی دن ہوگا۔ اور اس کے بعد کوئی زلزلہ نہیں ہوگا۔ یہ زلزلہ اس دن کو مستوجب ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں۔ "اکرم التقی اکرامه" پرہیز کا حق اکرام اداء کرو۔ "اَهِنِ الفاسق اهانته" (فاسق کو اس کا حق اہانت دو) اور یہ بھی ممکن ہے کہ زمین کی طرف زلزال کی اضافت استغراق کے لئے ہو۔ جتنا ہلنا اس کے لئے ممکن ہوگا ہلے گی۔

سوال اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا: "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" (جو شخص ذرہ برابر بھی نیکی کریگا ضرور اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ذرہ برابر بدی کریگا اس کو دیکھ لیگا) حالانکہ کافر کی نیکیاں اس کے کفر میں مستور ہیں اور مؤمن کے صغائر گناہ کبیرہ سے اجتناب کی وجہ سے معاف ہیں تو ہر عامل کا اپنے ہر عمل کو دیکھنا کیسے ثابت ہوگا۔؟

جواب اس کا مطلب ہے۔ نیکیوں میں سے جو بھی نیکی کریگا قیامت کے روز اس کو دیکھے گا اور بدکاروں اور بدبختوں میں سے جو بھی ذرہ برابر بدی کریگا اسے دیکھے گا۔ اگلی آیت "يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا" (اس دن لوگ متفرق ہوں گے) بھی اس پر دلالت کر رہی ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت مدینہ کے دو اشخاص کے متعلق اتری ہے۔ ان میں سے ایک مستقل طور پر سائلوں کو کپڑے اور کھجوریں دیا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں اس کا بدلہ ہمیں ملیگا۔ اور ہم اس کو پسند کرتے ہیں۔ اور دوسرا شخص گناہِ صغیرہ کو ہلکا سمجھتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے گناہوں پر عذاب کی وعید سنائی ہے چھوٹے گناہوں پر نہیں۔

سورۃ العادیات

سوال اللہ پاک نے کیسے فرمایا: "اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ" (بے شک ان کا رب ان کے حال سے اس روز بڑا ہی باخبر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ ان کے احوال سے ہر وقت باخبر ہے؟۔

جواب آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کی جزا اور بدلہ دیگا یہاں علم مجازاً بدلہ دینے کے معنی میں ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت بھی ہے۔ "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ" یعنی جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اس کی جزاء دیگا تو یعلم 'یجازی کے معنی

میں ہے۔

سورۃ القارعۃ

سوال ''وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ'' (جس شخص کا (نیکیوں کا) پلہ ہلکا ہوگا تو بس اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا) یعنی جس کی برائیاں زیادہ ہوں گی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ حالانکہ اکثر مومنین کے سیئات ان کے حسنات سے زیادہ ہوں گے باوجود اس کے وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے؟۔

جواب ''فامه هاوية'' ان کے خلود فی النار پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ مؤمن اپنے گناہوں کے بقدر جہنم میں رہیگا۔ پھر جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہوگا۔

بعض علماء کی رائے ہے (خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ) سے مراد اعمال نامے کا نیکیوں سے خالی ہونا ہے۔ اور وہ کافروں کا اعمال نامہ ہی ہوسکتا ہے۔

سورۃ التکاثر

سوال ''كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ'' میں ''لَوْ تَعْلَمُوْنَ'' کا جواب کہاں ہے؟

جواب اس کا جواب محذوف ہے' تقدیر عبارت اس طرح ہے ''لو تعلمون الامر يقينا لشغلكم عن التكاثر والتفاخر'' (یعنی آخرت کے معاملے کا تمہیں علمِ ویقین ہوتو یقیناً تکاثر و تفاخر سے اعراض کرتے۔

سوال ''ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ'' (پھر اس دن تم سے نعمتوں کے متعلق پوچھا جائیگا) دنیا میں کوئی بھی انسان نعمت الٰہی سے خالی نہیں ہے۔ تو وہ کونسی نعمت ہے جس کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائیگا؟۔

جواب اس کے بارے سات اقوال ہیں۔ (۱) امن وسلامتی کی نعمت ہے۔ (۲) اس سے مراد ٹھنڈا پانی ہے (۳) اس سے مراد صحت وفراغت ہے (۴) لذیذ غذائیں اور مشروبات ہیں (۵) اس سے مراد گیہوں کی روٹی اور میٹھا پانی ہے (۶) حاصل شدہ دنیاوی لذت ہے (۷) صبح وشام کے کھانے کا ہمیشہ میسر آنا ہے۔

بعض کہتے ہیں۔ یہ سوال خاص کافروں کے متعلق ہے۔ مگر صحیح قول یہ ہے یہ ہر انسان اور ہر نعمت کے متعلق ہے۔ کافر سے بطور زجر وتوبیخ اور مؤمن سے نعمت کے شکر کے متعلق سوال کیا

جائیگا' اس کی تائید بھی ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' کہ میں اپنے بندے سے تین چیزوں کے شکر کے متعلق نہیں پوچھوں گا۔ ان تین کے علاوہ نعمتوں کے متعلق سوال جواب ہوگا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ گھر جسمیں وہ رہتا ہے۔ اس کی کمر کو سیدھا رکھنے والا طعام' اور اس کے ستر کو ڈھانپنے والا کپڑا۔

سورۃ العصر

سوال "وَالعَصرِ میں اِلَّا الَّذِینَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ" کا استثناء ان مؤمنین موصوفین کے نفع میں ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ باوجودیکہ یہ استثنی ان کی مدح کے لئے ہے؟ آیت تو صرف ان صفات سے متصف لوگوں کے خسارے میں نہ ہونے پر دلالت کر رہی ہے؟۔

جواب استثناء اگرچہ صراحۃً ان مؤمنین کے نفع میں ہونے پر دلالت تو نہیں کرتا لیکن ان کو عظیم صفات۔ (ایمان' عمل صالح' حق کی وصیت' صبر کی وصیت) سے متصف کرنا ان کے عظیم الشان فائدے میں ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیں کہ فائدہ میں نہیں ہیں لیکن خسارہ میں نہ ہونا کیا کچھ کم فائدہ ہے؟

سورۃ الھمزۃ

سوال ھُمَزَۃٍ اور لُمَزَۃٍ میں کیا فرق ہے؟۔

جواب دونوں ہم معنی ہیں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ دوسرا پہلے کی تاکید ہے۔ بعض نے کہا: مختلف المعانی ہیں" ھُمَزَۃ" غیبت کرنے والا اور اللمزۃ عیب لگانے والا۔ بعض نے کہا: ھمزۃ سامنے عیب لگانے والا۔ اور اللمزۃ پس پردہ عیب گو اور بقول بعض الھمزۃ لوگوں پر اور اللمزۃ لوگوں کے انساب پر عیب لگانے والا اور بعض کی رائے ہے: الھمزۃ آنکھ کے ذریعے عیب لگانے والا اور اللمزۃ زبان سے طعن و تشنیع کا عادی مراد ہے۔ بعض نے کہا کہ اس کا عکس ہے۔ یہ کل چھ اقوال ہوئے۔

سورۃ الفیل

سوال ابابیل کا کیا معنی ہے یہ جمع ہے یا مفرد؟۔

جواب اس کا معنی ہے مختلف ٹولیوں پر مشتمل مختلف جماعتیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ "ابابیل"

یکے بعد دیگرے آنے والوں کو کہتے ہیں بعض نے اس کا معنی کثیرہ لیا ہے۔
امام فراء اور ابوعبیدہ کا کہنا ہے کہ یہ جمع ہے مگر اس کا واحد کوئی نہیں ہے۔ بعض نے کہا۔ اس کا واحد ابال' ابول اور ابیل ہے۔

سورۃ قریش

سوال ''لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ'' میں ''لِاِیْلٰفِ'' کے لام کا متعلق کیا ہے؟۔

جواب سورۃ الفیل کا آخر اس کا متعلق ہے۔ یعنی ''فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ'' یعنی قریش کی تالیف قلب کے لئے ہم نے ان (حملہ آوروں) کو کھاتے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے مصحف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں بغیر فصل کے ان دونوں کو ایک سورۃ شمار کیا گیا ہے۔

یعنی اہل قریش کی خواہش کے مطابق ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جن سے وہ خائف تھے۔ تا کہ آسانی کے ساتھ گرمی و سردی میں سفر کرسکیں۔ اور بقول بعض علماء اس کا تعلق ماقبل سورۃ سے نہیں بلکہ بعد والی آیت کے ساتھ ہے' یعنی ''فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ'' ''اِيْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ' خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ان پر بے شمار ہیں اگر دیگر نعمتوں کے شکرانے کے طور پر عبادت نہیں کرتے تو ان کو اس نعمت کے بدلے عبادت کرنی چاہیے۔ اور بعض علماء نے کہا۔ یہ ''لام'' لامِ تعجب ہے یعنی قریش کے کردار پر تعجب!۔

قریش کا بغرضِ تجارت (جس پر ان کے معاش کا مدار تھا) سال میں دو سفر کرتے تھے موسم سرما میں یمن اور موسم گرما میں شام کا سفر کرتے تھے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: یہاں ''ایلاف'' مصدر ہے [ ] الف کے معنی میں ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں الفته ایلافا مد کے ساتھ' الفته الفا بغیر کے یعنی قصر کے ساتھ۔ دونوں متعدی بیک مفعول ہیں۔ تو لایلاف قریش کا معنی لالف قریش ہے۔ یعنی قریش کی پسند کیلئے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں الایلاف متعدی بدو مفعول ہے تو اس صورت میں آیت کا معنی ہو گا لایلاف اللہ تعالیٰ قریشا رحلتین) یعنی اللہ تعالیٰ کا قریش کے لئے دو سفر پسند فرمانے کے لئے۔ ''لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اِیْلٰفِهِمْ'' ایلافهم پہلے ایلاف سے بدل ہے۔ بعض نے پہلے ایلاف کی تاکید کیا ہے۔

سورۃ الماعون

سوال ''فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ'' (سو بڑی ہی ہلاکت و بربادی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لئے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں) یہاں نماز بھولنے والے پر وعید آئی ہے حالانکہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''رفع عن امتی الخطاء والنسیان'' ''میری امت سے خطاء اور بھول کا مواخذہ نہیں ہوگا' بظاہر آیت و حدیث میں تعارض ہے؟

جواب یہاں آیت میں ''ساھون'' سے مراد غافلون ہے یعنی کاہلی اور سستی کرنے والے اور نماز کی طرف کم توجہ دینے والے لوگ مراد ہیں۔ یہ فعل یعنی نماز میں سستی منافقین یا فساق کا کام ہے۔ اس سے مراد کسی وجہ سے نماز میں بھولنا نہیں ہے' انسان شیطانی وسوسہ یا کسی اور کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے بھول جاتا ہے جو غیر اختیاری ہے مراد نہیں ہے' حدیث میں رفع سے یہی بھول مراد ہے۔ اسی وجہ سے عَنْ صَلَاتِهِمْ فرمایا ہے فِیْ صَلَاتِهِمْ نہیں فرمایا۔ حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے کہ شکر ہے آیت میں فِیْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ نہیں فرمایا گیا۔

سورۃ الکوثر

سوال کوثر کیا چیز ہے؟

جواب اس میں دو قول ہیں: پہلا قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں اس سے مراد خیر کثیر ہے۔ کثرت سے فوعل کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں ''رجل نوفل'' یعنی زیادہ نفل والا۔ کسی شاعر کا شعر ہے۔

وانت کثیر یا ابن مروان طیب ☆ وکان ابوك ابن العقائل کوثرا

اے ابن مروان! تو بہت زیادہ پاکیزہ ہے' اور تیرا باپ ابن عقائل تو اس سے بھی بہت زیادہ پاکیزہ ہے

کسی دیہاتی عورت کا بیٹا سفر سے واپس آیا تو اس سے پوچھا گیا۔ کہ تیرا بیٹا کس طرح لوٹ کر آیا۔ تو جواب میں کہا' اٰب بکوثر'' بہت خیر کثیر کے ساتھ واپس آیا' آپ ﷺ کو خیر کثیر اور حکمت عطاء ہوئی تھی۔ ''وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا'' بعض حضرات نے اس خیر کثیر کی تفسیر نبوت سے کی ہے۔ بعض نے علم و حکمت سے اور بعض نے قرآن کریم سے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ''الکوثر'' جنت میں ایک نہر کا نام ہے۔ یہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی بھی ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں ''کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھ وعدہ سے فرمایا ہے۔ اس پر خیر کثیر ہے۔ قیامت کے دن میری امت وہاں پانی پینے کے لئے آئیگی۔ ایک اور حدیث میں ارشادِ گرامی ہے۔ جنت میں چلنے کے دوران ایک نہر سے گذر ہوا اس کے کنارے موتیوں سے مرصع تھے میں نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا! یہ وہ کوثر ہے جو آپ کے رب نے آپ کو عطاء کی ہے تو فرشتہ نے اس پر اپنا ہاتھ لگایا تو پتہ چلا اس کی مٹی مشک کی ہے۔ اس کی صفت کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ وہ شیرینی میں شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ اور دودھ سے زیادہ سفید ہے برف سے زیادہ ٹھنڈی ہے اور مکھن سے زیادہ نرم ہے۔ اس کے آس پاس زبرجد لگے ہوئے ہیں اور اس کے برتن چاندی کے ہیں۔ ستاروں کی طرح کثیر ہیں۔ جو اس سے ایک مرتبہ پیئے گا تو وہ زندگی بھر پیاسا نہیں ہوگا۔

سورۃ الکافرون

سوال ''وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ'' (اور نہ ہی تم عبادت کروگے اس معبود کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں) ''ما'' غیر عاقل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ''ما'' کے بجائے ''من'' ہونا چاہئے تھا؟ جو عاقل کے لئے مستعمل ہوتا ہے؟۔

جواب اس میں دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ: یہ ہے کہ ''من'' کے بجائے ''ما'' کا استعمال ماقبل جملہ ''لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' کے ساتھ تقابل کی رعایت کی وجہ سے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ''ما'' موصولہ نہیں ہے۔ بلکہ مصدریہ ہے' جو اپنے مابعد کو مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔

امام زمخشریؒ فرماتے ہیں: ''ما'' سے مراد صفت ہے' یعنی میں باطل کی عبادت نہیں کرتا اور تم حق کی عبادت نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ علماء کی رائے کے مطابق ''ما'' الذی کے معنی میں ہے۔ اور ضمیر عائد محذوف ہے۔

سوال تکرار کا کیا فائدہ ہے؟

جواب تکرار کی بھی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ تو تاکید ہے اور کفار کے مطلوب کے طمع کی نفی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شروع کے دو جملے فی الحال عبادت کی نفی کے لئے ہیں اور بعد کے دو جملے آئندہ عبادت کی نفی کے لئے ہیں تو اس صورت میں کوئی تکرار نہیں ہے۔ یہ قول امام ثعلب اور زجاج کا ہے۔

امام زمخشریؒ کہتے ہیں: شروع کے دو جملے مستقبل میں عبادت کی نفی کے لئے اور بعد کے دو جملے نفی عبادت فی الماضی کے لئے ہیں۔ اس لئے کہ لفظ لا ماضی پر داخل نہیں ہوتا وہ صرف مضارع پر داخل ہوتا ہے۔

سوال ''وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ'' کے بجائے ما عبدتُ صیغہ ماضی کے ساتھ کیوں نہ فرمایا۔ جیسا کہ ''وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ'' میں صیغہ ماضی استعمال کیا گیا؟

جواب اس لئے کہ کفار آپ کی بعثت سے قبل بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اور آپؐ بعثت سے قبل اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ بعثت کے بعد عبادت شروع کی مگر اس جواب پر یہ اعتراض واقع ہوگا کہ تمام انبیاء کرام بعثت سے قبل توحید پر کاربند ہوتے ہیں۔ اور توحید عظیم عبادت ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں: اس میں تکرار کفار کے سوال کی مطابقت کے لئے آیا ہے۔ چونکہ کفار کا سوال مکرر تھا اس لئے جواب بھی مکرر لایا گیا۔ کفار نے کہا تھا۔ محمد! تم ایک مدّت تک ہمارے معبودوں کی عبادت کرو ہم اتنی مدت تمہارے معبود کی عبادت کریں گے۔ پھر تم ہمارے معبودوں کی ایک مدت عبادت کرنا تو ہم ایک مدت تمہارے اِلٰہ کی عبادت کریں گے تو جواب بھی اس کے مطابق مکرر آیا۔ یہ بہت اچھا اور لطیف قول ہے۔

سورة النّصر

سوال ''فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ'' استغفار کا ماقبل کے ساتھ کیا ربط ہے۔ فتح نصیب ہونے اور نصرت الٰہی ملنے کے تو حمد و شکر مناسب ہے نہ کہ استغفار و توبہ؟

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو نبی اکرم ﷺ سمجھ گئے کہ آپ کے انتقال کا وقت قریب آ گیا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ سمجھ گئے کہ آپ کی اجل قریب آ گئی ہے آپ کو تسبیح، استغفار و توبہ کا حکم فرمایا گیا تا کہ آپؐ کی عمر شریف کا آخری حصہ عملِ صالح کی کثرت کے ساتھ گذر جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ کثرت سے ''سبحانك اللّٰھم اغفر لی انك انت التوّاب الرّحیم'' پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: اس سورۃ کو سورۃ تودیع بھی کہتے ہیں۔ روایت میں آتا ہے۔ اس سورۃ کے نزول کے بعد آپ ﷺ دو سال تک حیات رہے۔

سورۃ تبت

سوال ''تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ'' ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں'' ابولہب کو کنیت کے ساتھ ذکر کیا گیا نام کے ساتھ کیوں ذکر نہیں کیا گیا؟۔

جواب اس کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ نام سے معروف نہ ہو کنیت کے ساتھ زیادہ مشہور ہو۔ تو اس کی کنیت کے ساتھ ذکر کیا گیا تا کہ اس کی برائی میں زیادہ تشہیر ہو۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا نام تھا عبدالعزیز (عزی کا بندہ) جبکہ وہ عزی کا نہیں بلکہ اللہ کا بندہ تھا۔ اگر اس کو ان کے نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا تو خلاف واقع ہوتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ کنیت کے ساتھ ذکر اس لئے ہوا کہ اس کی حالت اس کی کنیت کے موافق ہے۔ اس کا ٹھکانہ نار ذات لہب ہے' ابولہب کنیت ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے رخسار (شعلہ کی طرح) زیادہ چمکدار تھے۔

سورۃ الاخلاص

سوال کلام عرب میں مشہور یہ ہے: کہ لفظ اَحَد نفی کے بعد اور لفظ ''واحد'' اثبات کے بعد استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: ''فی الدار واحد'' ''وما فی الدار احد'' ''جاءَ نی واحد'' ''ما جاء نی احد'' اس طرح فرمان الٰہی ہے ''وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' اور ''الواحدُ القهّار'' ''لَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ'' ''لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ'' ''لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ'' ''فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ'' وغیرہ ہے تو یہاں ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' میں احد کو اثبات کے بعد کیسے ذکر کیا گیا؟

جواب حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: ''الواحد اور الاحد'' میں معنوی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ابوعبیدہ نے اس کو پسند کیا' قرآن کی آیت ''فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ'' سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ تو جب ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے تو یہ کسی کے ساتھ خاص نہیں ہوگا اگر چہ ایک کا استعمال نفی میں اور ایک اثبات میں زیادہ ہے مگر کسی کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ غالب الاستعمال والے لفظ سے عدول کی وجہ لفظ الصمد کی رعایت بھی ہوسکتی ہے۔

سورۃ الفلق

سوال ''مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ'' لفظ من شر مابعد کو بھی شامل ہے تو مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ' مِنْ شَرِّ

النَّفّٰثٰتِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ کومکرر لانے کا کیا فائدہ؟۔

جواب ان اشیاء کے شر کی برائی کو بیان کرنے کے لئے ہر ایک کے ساتھ اسے مکرر لایا گیا جیسا کہ عطف الخاص علی العام تعظیم وشرف کو بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یا ہر ایک کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ ان اشیاء کے شر کا خفی ہونا ہے جو انسان کے ساتھ لاحق ہوتا ہے جس کا شعور بھی انسان کو نہیں ہوتا۔

سوال ''النَّفّٰثٰتِ'' کو معرفہ اور اس کے ماقبل اور مابعد کو نکرہ لانے کی کیا وجہ ہے۔

جواب اس لئے کہ ہر نفاثہ شر ہے لیکن ہر غاسق (رات) شر نہیں ہے اور نہ ہی ہر حسد شر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض حسد پسندیدہ بھی ہے۔ جیسا کہ نیکی کے کاموں میں حسد کرنا۔ جیسا کہ حدیث بھی ہے ''لا حسد الا فی اثنتین''۔

ابوتمام شاعر کہتا ہے وما حاسد فی المکرمات بحاسد۔

سورۃ النّاس

سوال ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ'' خاص کر ''الناس'' کو ذکر کیوں کیا جبکہ اللہ تعالیٰ صرف انسانوں کا رب نہیں ہے بلکہ تمام مخلوقات کا رب، ان کا مالک اور ان کا الٰہ ہے؟

جواب اول الناس کو بطور خاص ذکر کرنے کی وجہ اس کی شرافت وتفضیل ہے۔

اس لئے کہ انسان صاحب عقل وتمیز ہے۔

جواب ثانی جب انسان کو اس کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا تو اس کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ انسان بھی صاحب شر ہے کہ انسان اپنے شر سے پناہ مانگتا ہے۔

سوال کیا فرمان الٰہی ''مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ'' ''اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ'' کا بیان ہے کہ انسانوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالنے والے شیطان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ انسی شیطان اور جنّی شیطان یا الناس کا بیان ہے جس کی طرف وسوسے کی نسبت کی گئی ہے؟

جواب بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد معنی اول (یعنی شیطان کی تفسیر و قسمیں بیان کرنا ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا۔ وسواس جنی کے شر اور وسواس انسی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں یہ امام زجاجؒ کا قول ہے۔ اس قول کے مطابق لفظ خنّاس کا اطلاق انسان پر ہوگا۔ حالانکہ منقول ہے کہ یہ جنّی کا نام ہے۔ بقول بعض مفسرین اس سے مراد معنی ثانی ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا اس وسواس جنی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو الناس جنی، الناس انسی کے دلوں پر وسوسہ ڈالتا ہے۔ جنوں کو

الناس کہا جیسا کہ آیت ''اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ'' اور آیت ''وَيُعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ'' میں جنوں کو نفر اور رجال کہا۔ تو یہ اس جنی وسواس سے خود کو اللہ کی پناہ میں دینا ہے جو جنوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے اسی طرح انسانوں کے قلوب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے یہ امام فراءؒ کا اختیار کردہ قول ہے۔ مِنَ الْجِنَّةِ سے مراد پہلے قول کے مطابق شیاطین الجن اور دوسرے قول کے مطابق مطلق جن ہے۔ اس لئے کہ جن ہی وسوسہ ڈالتا ہے۔ خاص جن ہو یا مطلق؛ علامہ زمخشریؒ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور فرمایا ہے: کہ الناس جن مراد لینا بہتر نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن کو جن اس کے مستور ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں' انسان کو الناس سے اس کے ظہور کی وجہ سے کہتے ہیں جیسا کہ ان کو بشر ظہور بشرہ کی وجہ سے کہا جاتا ہے لہٰذا الناس سے جن مراد لینا فصاحت قرآن کے خلاف ہوگا۔

اور فرمایا: کہ بہتر تعبیر یہ ہے کہ پہلے ''الناس'' سے ناسی (بھولنے والا) مراد لیا جائے۔ جیسا کہ ''یوم یدع الداع'' سے الداعی مراد ہے' الناسی (بھولنے والے) میں ثقلان (جن وانسان) دونوں شامل ہیں۔ اس لئے کہ حقوق اللہ کے نسیان میں دونوں طبقے شامل ہیں۔ اور نسیان سے دونوں متصف ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمْ

اِدارہ اِسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ــــــ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور

فون ۷۳۲۴۴۱۲-فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲

★ ــــــ ۱۹۰/ انارکلی، لاہور، پاکستان

فون ــــــ ۷۲۴۳۹۹۱ - ۷۳۵۳۲۵۵

★ ــــــــــــــــ موہن روڈ

چوک اُردو بازار، کراچی۔ فون ۷۲۲۲۴۰۱

E-mail:idara@brain.net.pk